اردو شرح

انوار الباری

صحیح البخاری

مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

و دیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفہ تلمیذ علامہ کشمیری

حضرۃ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری رحمہ اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240)

مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

و دیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفۂ تلمیذ علامہ کشمیری

حضرۃ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری رحمہ اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

☎061-540513-519240

نام کتاب...........انوار الباری جلد ۱۷-۱۸-۱۹

تاریخ اشاعت............جمادی الثانیہ ۱۴۲۵ھ

ناشر...... اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ ملتان

طباعت..............سلامت اقبال پریس ملتان

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان

ادارہ اسلامیات انار کلی' لاہور

مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار' لاہور

مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور

مکتبہ رشیدیہ' سرکی روڈ' کوئٹہ

کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

دارالاشاعت اردو بازار کراچی

بک لینڈ اردو بازار لاہور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTRE)
119-121-HALLIWELL ROAD
BOLTON BLI3NE. (U.K.)

ضروری وضاحت: ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید' احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کیلئے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسان کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لئے پھر بھی کسی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گذارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما دیں تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

جامعہ تعلیم الاسلام

ن بازار سنت پورہ فیصل آباد پاکستان فون

علوم قرآن و حدیث جدید عربی بول چال کا معیاری ادارہ

25/8/97

بخدمت جناب مولانا محمد اسحاق صاحب زید مجدکم السامیہ ناظم ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ مورخہ 14/8/97 برائے اجازت طباعت انوار الباری شرح صحیح بخاری ملا جواباً عرض ہے آپ کتاب انوار الباری طبع فرما دیں میری طرف سے آپ کو طباعت کی اجازت ہے۔ انوار الباری کے مرتب مولانا احمد رضا مرحوم نے اس کتاب کے جملہ حقوق طباعت پاکستان میں میرا نام لکھ دیئے تھے لہذا میں آپ کو اس کی طباعت و اشاعت کی فی سبیل اللہ بغیر کسی لالچ کے اجازت دیتا ہوں۔

بطور سند یہ چند سطور تحریر کر دی ہیں اور میں اللہ تعالیٰ سے ثواب و اجر کا امیدوار ہوں آپ حضرات بھی میرے لئے حسن خاتمہ کی دعا فرمائیں۔

والسلام

حقیر عزیز الرحمن انوری

مدیر تعلیم الاسلام

فیصل آباد

25/8/97

فہرست عنوانات

کِتَابُ الْعِیْدَیْنِ ۱۴۰

جلد---۱۸

جلد---۱۹

انوار الباری ١٧

اردو شرح

صحیح البخاری

تقدمه

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

والحمد لله العلی العظیم الذی بیده تتم الصالحات والصلوٰة والسلام علی افضل رسله الذی ختم به سلسلة الرسالات۔

''انوارالباری'' کی پندرھویں جلد پیش ہے جو مقدمہ کی دو جلدوں کے ساتھ سترہواں حصہ ہے، اور اس سے اگلی جلد کی بھی کتابت ہو رہی ہے۔ واللہ المیسر،

ان نئی چار جلدوں میں علاوہ شرح احادیث البخاری بہت سے اہم و ضروری مباحث تفصیل سے آ گئے ہیں، مثلاً جمع بین الصلاتین و تزئین مساجد پر سیر حاصل کلام، حیاتِ خضر علیہ السلام، مسئلہ رفع الیدین و قضاءِ صلوٰۃ متروکہ عمداً کی مدلل بحث، عالمِ مثال کی حقیقت، امام بخاریؒ کے تفردات، طلقاتِ ثلاث و فاتحہ خلف الامام کی تحقیق بما لہ وما علیہ، جمعہ فی القریٰ، اجتماعِ جمعہ و عید کے مسائل، اہمیتِ تعامل و توارث، اقسامِ بدعت کی تفصیل و تنقیح وغیرہ۔

ہر بحث میں اکابرِ امت کی تحقیقات و افادات حوالہ کے ساتھ درج کئے گئے ہیں، اور خاص طور سے امام العصر عمدۃ المحققین حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کے علوم و محققانہ ارشادات بھی بطور حرفِ آخر پیش کئے گئے ہیں یوں تو خدائے تعالیٰ کا خصوصی فضل و انعام ہے کہ ہمارے بیشتر اکابر علوم و کمالات کے آفتاب و ماہتاب تھے، مگر حضرت شاہ صاحبؒ کے علم و تحقیق کی شان نرالی و نادر تھی۔ ع بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری، اور غالباً آپ کی اسی محدثانہ شانِ تحقیق سے متاثر ہو کر زبدۃ المحققین علامہ کوثری نے فرمایا تھا کہ شیخ ابن الہمامؒ کے بعد پانچ سو سال میں ایسا جامع کمالات حنفی محدث پیدا ہوا ہے۔ ظاہر ہے، ایسے بحر العلوم سے استفادہ میرا جیسا بے بضاعت، کم استطاعت کرہی کیا سکتا تھا، مگر سنا گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں ایک کھوٹی پونجی والی بڑھیا بھی تھی، شاید کچھ ایسا ہی حال اس ظلوم و جہول کا بھی ہے۔ حضرتؒ سے درسی و غیر درسی طور سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، ان میں سے بیشتر حضرات مجھ سے بہت کام کر سکتے تھے، مگر حضرتؒ کا مزاج ع ''خمولی اطیب الحالات عندی'' کا مصداق تھا، اس لئے شاید تقدیرِ الٰہی میں بھی ان کے مزاج کی رعایت کی گئی ہے، یا خدانہ کرے شاید اس غیر معمولی دورِ انحطاط کے بعد کوئی علمی و تحقیقی دور آئندہ آنے والا نہیں ہے، اس لئے ایسی بڑی رکاوٹ آ گئی، واللہ تعالیٰ اعلم۔

بہر حال! ''جہد المقل دموعہ'' کے طور پر محقق جامیؒ کے اس ارشاد کی تعمیل کر رہا ہوں۔

بیا جامی رہا کن شرمساری ز صاف و درہ پیش آر آنچہ داری

مجھے یاد ہے کہ جب تک حضرتؒ کی خدمتِ مبارکہ میں حاضر رہا، سفر و حضر میں اور ہر وقت آپ کے ملفوظاتِ علمیہ ضبط کیا کرتا تھا اور درسِ بخاری کے علاوہ کہ دو سال امالی لکھے، حضرت کے مواعظ بھی لکھ لیا کرتا تھا، اور جب حضرتؒ نے وعظ لکھنے پر ٹوکا تو میں نے مجلسِ وعظ

میں لکھنا بند کر دیا تھا، اور بعد کو اپنے کمرہ پر آ کر پورا وعظ یاد سے قلم بند کر لیا کرتا تھا۔

''امالی'' قلم بند کرنے کے وقت میرا بڑا اپنا مطمحِ نظر آپ کے وجدانیات خاصہ اور آپ کی ذاتی رائے اور فیصلے ہوتے تھے اور وہی انوارالباری میں میرے نزدیک خاصہ کی چیز ہے۔ دوسری تحقیقات اور اکابر سلف و خلف کے افادات ضمناً پیش کرتا ہوں تاکہ شرحِ بخاری بھی مکمل ہو۔ واللہ المعین۔

تفرداتِ اکابر

انوارالباری میں ایک اہم مقصد مؤلف کے سامنے اکابرِ امت کے تفردات پر بحث و نظر بھی ہے، کیونکہ بعض جلیل صحابۂ کرام سے لے کر اب تک کے تقریباً سب ہی اکابر کے یہاں کچھ مسائل میں تفرد کی شان ملتی ہے، اور چونکہ جمہور سلف و خلف کے خلاف کوئی تفرد بھی خواہ وہ کسی بھی بڑے کا ہو، مقبول نہیں ہوا ہے اس لئے اس کی نشاندہی کرنا اور اس کے مقابلہ میں جمہور کی تائید و تقویت ضروری اور نہایت اہم ہے، اس لئے اس کو بھی اپنے حضرت شاہ صاحبؒ اور دوسرے اکابرِ امت کی اقتدا اور تتبع میں خصوصی اور قابلِ لحاظ حصہ قرار دیا گیا ہے اور خاص طور سے اس سلسلہ میں اور دوسری ابحاث کے بارے میں بھی اہلِ علم حضرات مؤلف کی کسی فروگذاشت اور غلطی پر مطلع ہوں تو وہ متنبہ فرما کر ماجور ہوں تاکہ انوارالباری ہی کے دوسرے اگلے حصوں میں اس کا تدارک کر دیا جائے۔

علامہ مودودی کا ذکرِ خیر

ہمیں افسوس ہے کہ وہ ہماری اس علمی انجمن سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی علمی و دینی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کے تفردات اور لغزشوں سے درگزر فرمائے۔ یاد ہے کہ عرصہ ہوا انوارالباری کی کسی ابتدائی جلد میں جب مؤلف نے ان کی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' کا ضمناً ذکر کر کے اس کی جامعیت و افادیت کو سراہا تھا تو ناظرین انوارالباری کے خطوط آئے تھے، جن میں علامہ کی دوسری غلطیوں کی نشاندہی کر کے مؤلف کے حق میں مدحیہ کلمات کو مضر اور دینی مصلحت کے خلاف ظاہر کیا تھا، تو اس وقت مؤلف نے ان حضرات کو اس دینی نصیحت پر شکریہ کے ساتھ مطلع کیا تھا کہ علامہ کی اُن لغزشوں سے مؤلف بھی غافل نہیں ہے، اور جب موقع آئے گا تو علامہ کی غلطیوں پر بھی بلا کسی رورعایت کے تنقید کی جائے گی، چنانچہ پھر انوارالباری ہی میں ان کے فقہی، حدیثی و تفسیری غلطیوں پر خاصے مفصل ریمارک بھی درج ہوئے ہیں۔

مرحوم مدیرِ تجلی کی طرف سے دفاع

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ مدیرِ تجلی مرحوم نے ۱۹۷۳ء میں علامہ مودودی کی طرف سے دفاع میں مؤلف کے تفسیری انتقاد کی جواب دہی شروع کی تھی اور دو تین نمبروں میں مقالات بھی شائع کئے تھے، اس پر مرحوم اور مؤلف کے درمیان خط و کتابت ہوئی، جو محفوظ ہے اور ان کی طلب پر مؤلف نے جواب الجواب بھی تجلی میں اشاعت کے لئے ارسال کیا تھا، مگر پھر علامہ عامر عثمانی مرحوم نے نہ میرا وہ جواب الجواب ہی شائع کیا اور نہ اپنے دفاعی مورچہ ہی کو قائم رکھا۔ اس طرح اس سلسلہ میں پھر مسلسل خاموشی ہو گئی، اور انوارالباری میں ایسے انتقادات حسبِ ضرورت برابر آتے رہے۔ اب کچھ عرصہ سے تفسیر تفہیم القرآن کے مقدمہ اور تفسیر پر مولانا رومی کا تفصیلی نقد بھی سامنے آ رہا ہے اور ہمارے ضلع کے مشہور مؤلف و مصنف مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عم فیضهم نے بھی ''تفصیراتِ تفہیم'' کے نام سے ایک جائزہ شائع کیا ہے جو اہلِ علم و تحقیق کے لئے قابلِ مطالعہ ہے۔ مشہور ہے '' من صنف فقد استهدف '' لہٰذا ہر مصنف کو دوسروں کے نقد و جرح کا نشانہ تو ضرور ہی بننا پڑتا ہے، لیکن یہ بات بھی ماننی ہی پڑے گی کہ ہر شخص کو ہر فن میں تصنیف کا حق نہیں ہے۔ ایک زمانہ میں سر سیدؒ نے بھی

تفسیرِ قرآن مجید تالیف کی تھی، جو اُس زمانے کے تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت مقبول بھی ہوئی تھی، مگر علماءِ تفسیر وحدیث میں اس کو حسنِ قبول حاصل نہ ہوسکا تھا۔اور پھر بتدریج سب ہی کی نظروں میں اس کی افادیت مجروح ہوگئی، اور جوان کے دوسرے گراں قدر ملکی وملی کارنامے تھے وہ زندۂ جاوید قرار پائے۔فاما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض.

ہمارا یقین ہے کہ مودودی صاحب نے بھی جن تالیفات میں نیشنلزم، سوشلزم وکمیونزم وغیرہ پر ضرب کاری لگائی ہے اور جن میں نئی روشنی سے متاثر افراد کو اصول وعقائدِ اسلام کی حق وصداقت باور کرانے کے لئے اپنی خداداد بہترین صلاحیتوں کو آشکارا کر کے دادِ تحسین حاصل کی ہے یا معاشی وسیاسی نظام اور معاشرت کے مسائل پر جو موثر ودل پذیر انداز میں مقالات لکھے ہیں ان کی افادیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن فقہی مسائل، حدیثی ابحاث اور تفسیری مشکلات پر بھی بھرپور اور بلا جھجک کے قلمرانی کا بھی ان کو حق تھا؟ یہ ہمارے نزدیک محلِ نظر ہے، اسی لئے ان کو شیخ الاسلام کا لقب بخشنے والوں اور ان کی تفسیر کو ساری تفاسیر سے افضل کہنے والوں کی ہم تصویب نہیں کرسکتے جبکہ انہوں نے بیسیوں آیات میں جمہور سلف وخلف کے خلاف تفسیر کی ہے یا کسی مرجوح قول کو اختیار کرلیا ہے۔اب چونکہ وہ وفات پاچکے ہیں دعا ہے کہ ارحم الراحمین ان کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے۔مگر جو غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں، ان کی اشاعت جب تک ہوتی رہے گی، علماء اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوسکتے کہ غلط کو غلط کہیں اور صرف صحیح کو صواب بتلائیں۔اس بارے میں ادنیٰ مداہنت بھی جائز نہیں ہوسکتی۔واللہ یحق الحق وھو خیر الفاصلین.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حامدا ومصليا ومسلما

بَابُ مَا يَتَخَيَّرُ مِنَ الدُّعَآءِ بَعْدَ التَّشَهُّدِ وَلَيْسَ بِوَاجِبٍ

(جودعا بھی پسند ہو، تشہد کے بعد پڑھ سکتا ہے، اور دعا کا پڑھنا کوئی واجب نہیں ہے)

(۷۹۳) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنِ الْاَعْمَشِ قَالَ حَدَّثَنِيْ شَقِيْقٌ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ كُنَّا اِذَا كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الصَّلٰوةِ قُلْنَا اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ عِبَادِهٖ اَلسَّلَامُ عَلٰى فُلَانٍ وَّفُلَانٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْلُوْا اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّلَامُ وَلٰكِنْ قُوْلُوا اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِاللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ فَاِنَّكُمْ اِذَا قُلْتُمْ ذٰلِكَ اَصَابَ كُلَّ عَبْدٍ فِي السَّمَآءِ اَوْ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ لِيَتَخَيَّرْ مِنَ الدُّعَآءِ اَعْجَبَهٗ اِلَيْهِ فَيَدْعُوْ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم جب نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز میں ہوتے تھے تو اس کے (قعدہ) میں کہا کرتے تھے: اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ عِبَادِهِ السَّلَامُ عَلٰى فُلَانٍ وَّفُلَانٍ. تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ نہ کہو، کیونکہ اللہ تو خود ہی سلام ہے۔ بلکہ کہو اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِاللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ. (کیونکہ جب تم یہ کہہ دو گے، تو یہ (دعا) اللہ کے ہر (نیک) بندے کو پہنچ جائے گی خواہ وہ آسمان میں ہو، یا زمین میں) اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اس کے بعد جو دعا اسے اچھی معلوم ہو اختیار کر لے، اور مانگے۔

تشریح: حافظ نے لکھا ہے کہ پہلے باب میں آخر صلوۃ میں دعا کرنے کا ذکر تھا، اور یہاں بھی اس باب کی حدیث میں دعا کرنے کا حکم ہے، جس سے وجوب دعا کا شبہ ہوتا ہے، اس لئے امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں یہ ظاہر کیا کہ دعا واجب نہیں ہے اور یہ بھی بتلایا کہ کوئی دعا مخصوص نہیں ہے جو چاہے دعا اپنی دین و دنیا کی فلاح کیلئے کر سکتا ہے۔ اس کے بعد حافظ نے کہا کہ بعض اہلِ ظاہر نے اس کو واجب قرار دیا ہے۔ اور وہ دعا نہ کرنے سے نماز کا اعادہ لازم قرار دیتے ہیں۔ اسی کا امام بخاری نے رد کیا ہے، اور ابن حزم ظاہری نے اور بھی زیادہ افراط کی کہ تشہدِ اول کے ساتھ بھی دعا کو واجب کہا ہے۔ (فتح ص ۲۱۸ ج ۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اپنی حاجات کے موافق دعا کرے، اور بہتر یہ ہے کہ اُن دعاؤں کو اختیار کرے جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بصورتِ جوامع الکلم ماثور ہیں۔ مثلاً رَبَّنَا اٰتنا فی الدنیا حسنة و فی الاٰخرة حسنة وغیرہ۔

افادۂ انور اور مسئلہ علمِ غیب

قولہ السلام علیک ایھا النبی: فرمایا: لغت عرب میں اکثر ہے کہ نداء خطاب غائب کو بھی بیشتر ہوتا ہے، اور مقصد اس کا استحضار ہوتا ہے ذہن میں، نہ یہ کہ اس کو حاضر سمجھا جاتا ہے بطور عقیدہ کے اور اسی سے السلام علیک ایھا النبی! بھی ہے۔ اور اس میں یہ بھی عقیدہ نہ کرنا چاہئے کہ حضور علیہ السلام ہمارا کلام سن رہے ہیں یا اس کو جانتے ہیں، اگر ایسا کرے گا تو منکرِ شرعی کا مرتکب ہوگا، کیونکہ حضور علیہ السلام کا علم اطلاعی ہے ذاتی نہیں، اور جزئی ہے، کلی نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا علم غیر متناہی ہے۔ حضور علیہ السلام کا علم متناہی ہے، جیسا کہ بہ کثرت نصوص کتاب وسنت سے ثابت ہے، اسی لئے فقہاء نے اس کی تکفیر کی ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لئے علمِ غیب کلی وذاتی کا عقیدہ کرے اس کے لئے ''ردالمختار'' وغیرہ دیکھی جائیں۔

اس مسئلہ میں خود حضرت شاہ صاحبؒ کا بھی ایک رسالہ مسمّی " سھم الغیب فی کبد اھل الریب " شائع شدہ ہے مگر نادر ونایاب۔

یہاں ایک بحث یہ بھی ہوئی ہے کہ حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد اب ہمیں اسی طرح کہنا چاہئے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا یعنی بہ لفظ خطاب یا بطریقِ غیبت السلام علی النبی کہنا زیادہ بہتر ہے (جو بخاری میں بھی باب الاخذ بالیدین (کتاب الاستیذان ص ۹۲۶) میں مجاہد سے مروی ہے) اس بحث کو معارف السنن ص ۳/ ۸۷ میں مفصل دلائل کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ وہاں مجاہد کی زیادتی فنی حدیثی لحاظ سے بھی مرجوع اور غیر مقبول ہے، کیونکہ دوسرے تمام رواۃ ثقات نے اس کو روایت نہیں کیا لہٰذا بخاری کی حدیث الباب ہی راجح اور موید بالتعامل والتوارث بھی ہے۔

تفرداتِ اہل مکہ

علامہ بنوریؒ نے مزید لکھا کہ فرق کرنے والے حضرات ابن عباس اور مجاہد وغیرہ کا شمار مکیین میں ہے، اور مکہ معظمہ ہی میں ان کا علم پھیلا ہے، ان کی موافقت اس بارے میں نہ اہلِ مدینہ نے کی نہ اہلِ عراق نے، اور اہلِ مکہ کے تفردات بہ کثرت ہیں۔ پھر یہ کہ مسلم شریف میں جو روایت مجاہد سے مروی ہے، وہ بھی اس فرق کرنے والی زیادتی سے خالی ہے۔ حالانکہ اس کے راوی بھی بعینہ وہی ہیں جو بخاری کی روایت مذکورہ ص ۵۲۶ کے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کبھی تو مجاہد صرف اصل روایت کو بیان کرتے تھے اور کبھی زیادتی والے الفاظ بڑھا دیتے تھے، جو بظاہر ان کا اپنے شیخ ابن عباسؓ کے اجتہاد سے موافقت کی وجہ سے تھا۔ لہٰذا اس کو کلام ابن مسعود کے ساتھ جوڑنا محل نظر ہے۔

علامہ نے حافظِ حدیث جمال الدین ملطیؒ کا قول بھی المعتصر ص ۱/ ۳۵ سے نقل کیا کہ زیادتی مذکورہ منکر غیر صحیح ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ جو تشہد حضور علیہ السلام کی زندگی میں تھا وہ بعد کو بدل گیا، حالانکہ یہ بات عامۂ صحابہ اور آثارِ مرویہ صحیحہ کے خلاف ہے اور حضرت ابوبکر وعمرؓ اپنے دورِ خلافت میں تشہد السلام علیک ایھا النبی! کے ساتھ ہی لوگوں کو سکھایا کرتے تھے، جو حضور علیہ السلام کی زندگی میں تھا، اور جو کچھ غلطی آئی وہ مجاہد وغیرہ سے آئی ہے۔

علامہ ابوعبیدؒ نے کہا کہ حق تعالیٰ نے جو خاص عظمت وبزرگی اور جلالتِ قدر اپنے رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو دی ہے اسی سے یہ بھی ہے کہ ان پر بعد وفات بھی وہی سلام مشروع رہا جو آپ کی زندگی میں تھا، الخ (معارف ص ۳/ ۸۷)۔

خلاصۂ تحقیق انور: حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کی موجودگی اور غیبت کا فرق صحابۂ کرام میں عام طور سے نہ تھا۔ اسی لئے اس کا توارث جاری نہیں ہوا اور حضرت ابن مسعودؓ (راوی تشہد) اور آپ کے اصحاب نے بھی حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد صیغۂ خطاب کی تعلیم دی ہے اور جو حضور علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ میں تھا اس کو باقی رکھا ہے۔ ایک حرف کا بھی تغیر اس میں نہیں کیا، اور حضرت عمرؓ نے منبرِ نبوی پر صحابہ وتابعین کے مجمع میں بھی صیغۂ خطاب ہی کے ساتھ لوگوں کو تشہد سکھایا تھا۔

اس کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ اس قسم کے امورِ شرعیہ میں توارث ہی حجتِ قویہ اس بات کے لئے ہے کہ یہی طریقہ ان سب حضرات میں معروف و معمول بہ تھا۔

تعامل وتوارث کی اہمیت

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہوا کہ بخاری کی وہ احادیث زیادہ قابلِ ترجیح ہیں جن کی موافقت دوسری مرویاتِ صحاح اور تعاملِ سلف وتوارث سے ہوتی ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

تنبیہ: جیسا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اشارہ فرمایا کہ نماز میں تشہد کے اندر سلام بصیغۂ خطاب میں کسی کو یہ عقیدہ کرنے کی گنجائش ہرگز نہیں ہے کہ وہ حضور علیہ السلام کو حاضر وناظر سمجھے یا یہ خیال کرے کہ وہ ہمارے سلام کو اپنی گوشِ مبارک سے سنتے ہیں۔ کہ ایسا عقیدہ وخیال عقیدۂ علم غیب خداوندی کے خلاف ہوگا، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجالسِ میلاد میں جو لوگ سلام پڑھنے کے وقت کھڑے ہوتے ہیں، اس کی بھی کوئی اصلِ شرعی نہیں ہے، لہٰذا حدودِ شرعیہ سے تجاوز نہیں ہونا چاہئے۔

ہمارے اکابرِ دیوبند کا طریقہ نہایت معتدل اور محتاط ہے کہ ثابت شدہ امور میں کوئی تاویل تک بھی نہ کریں گے اور غیر ثابت کو کسی حالت میں بھی معمول بہ نہ بنائیں گے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

بَابُ مَنْ لَّمْ يَمْسَحْ جَبْهَتَهٗ وَاَنْفَهٗ حَتّٰى صَلّٰى قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ رَاَيْتُ الْحُمَيْدِيَّ يَحْتَجُّ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْ لَّا يَمْسَحَ الْجَبْهَةَ فِي الصَّلٰوةِ (اپنی پیشانی اور ناک نماز ختم کرنے تک صاف نہ کرے، اور ابوعبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا، کہ حمیدی ذیل کی حدیث سے اس امر پر دلیل لاتے تھے کہ نماز میں پیشانی سے (مٹی وغیرہ) صاف کرنا ٹھیک نہیں ہے۔)

(۷۹۴) **حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ يَحْيٰى عَنْ اَبِيْ سَلَمَةَ قَالَ سَاَلْتُ اَبَا سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيَّ فَقَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْجُدُ فِي الْمَآءِ وَالطِّيْنِ حَتّٰى رَاَيْتُ اَثَرَ الطِّيْنِ فِيْ جَبْهَتِهٖ.**

ترجمہ ۷۹۴: حضرت ابوسلمہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو پانی اور مٹی میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا، یہاں تک کہ مٹی کا دھبہ آپ کی پیشانی پر میں نے دیکھا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہی حنفیہؒ کا بھی مختار ہے کہ پیشانی یا ناک پر مٹی وغیرہ سجدہ کی حالت میں لگ جائے تو اس کو نماز کے بعد صاف کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بَابُ التَّسْلِيْمِ

(سلام پھیرنے کا بیان)

۷۹۵۔ **حَدَّثَنَا مُوْسَى بْنُ اِسْمٰعِيْلَ قَالَ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا الزُّهْرِيُّ عَنْ هِنْدٍ بِنْتِ الْحَارِثِ اَنَّ اُمَّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَلَّمَ قَامَ النِّسَآءُ حِيْنَ يَقْضِيْ تَسْلِيْمَهٗ وَمَكَثَ يَسِيْرًا قَبْلَ اَنْ يَّقُوْمَ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَاُرٰى وَاللّٰهُ اَعْلَمُ اَنَّ مُكْثَهٗ لِكَيْ تَنْفُذَ النِّسَآءُ قَبْلَ اَنْ يُّدْرِكَهُنَّ مَنِ انْصَرَفَ مِنَ الْقَوْمِ.**

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تھے تو جس وقت آپ اپنا سلام پورا کر چکتے تھے، عورتیں کھڑی ہو جاتی تھیں، اور آپ اپنے کھڑے ہونے سے پہلے تھوڑی دیر ٹھہر جاتے تھے، ابن شہاب کہتے ہیں کہ میں یہ سمجھتا ہوں، واللہ

اعلم، کہ آپ کا ٹھہرنا اس لئے تھا کہ عورتیں پہلے چلی جائیں۔ تا کہ قوم کے جو لوگ نماز ختم کر چکیں تو ان کے بعد علیحدہ سے واپس ہوں۔

تشریح: آخر نماز کے سلام میں اختلاف ہے، جمہور ائمہ (امام ابوحنیفہ، مالک، واحمدؒ) کے نزدیک دو سلام ہیں، پھر امام احمد وشافعی پہلے کو واجب اور دوسرے کو سنت کہتے ہیں (المغنی ص ۱/۵۹۴ وشرح المہذب) امام اعظم سے دو روایت ہیں ایک اسی طرح ہے۔ دوسری یہ کہ دونوں واجب ہیں۔

معارف السنن ص ۳/۱۱۳ میں ہے کہ دونوں سلام کی احادیث بلحاظِ سند متواتر ہیں اور ان پر عمل کا بھی تواتر ثابت ہے۔ اور ثقات کی زیادتی مقبول ہے، لہٰذا ان وجوہ سے جانب جمہور ہی کو ترجیح ملتی ہے۔

تنبیہ: تذکرۃ الرشید ص ۱/۱۷۹ میں حضرت گنگوہیؒ کی طرف مؤلف نے یہ بات منسوب کی ہے کہ اگر مقتدی امام کے سلام ختم ہونے سے پہلے اپنا سلام ختم کر لے گا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ اور حاشیہ میں اس کی تشریح پورے کلام "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" سے کی ہے تو بظاہر ایسا نہیں ہے، کیونکہ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ص ۱/۱۶۶ میں ہے کہ نماز سے خروج فقط لفظ السلام سے ہو جاتا ہے۔ بدوں علیکم کے، اسی لئے اگر مقتدی امام کے لفظ السلام سے پہلے اپنا سلام ادا کرے گا تب نماز فاسد ہوگی کہ امام پر تقدم ہو گیا، پورے جملہ کا اعتبار اس میں نہیں ہے، اسی طرح جو مقتدی امام کے السلام کا لفظ کہنے سے قبل جماعت میں شرکت کرے گا۔ اس کی شرکت درست ہوگی، اس کے بعد درست نہ ہوگی، کیونکہ لفظِ السلام سے امام کی نماز ختم ہو گئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

افادۂ حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم

اوجز المسالک ص ۱/۲۸۰ میں اچھی تفصیل ہے، ملاحظہ کی جائے، خلاصۂ مذہب حنفیہ یہ ہے کہ مقتدی کو تکبیر تحریمہ امام کے ساتھ کہنی چاہئے۔ اگر امام سے قبل اس سے فارغ ہو جائے گا تو نماز درست نہ ہوگی، تقدمِ سلام کے بارے میں "البرہان" سے نقل کیا کہ امام کے تشہد یا جلوس بقدرِ تشہد کے بعد اس کے سلام سے قبل مقتدی سلام پھیر لے گا تو یہ فعل مکروہ ہوگا، لیکن اس کی نماز فاسد نہ ہوگی، کیونکہ وہ پوری ہو چکی ہے۔

تیسرا مسئلہ بقیہ ارکانِ صلوٰۃ کا ہے، جس میں جمہور (مع حنفیہ) کے نزدیک امام سے تقدم کی صورت میں کراہتِ تحریمی کے ساتھ نماز درست ہو جائے گی، البتہ ایک روایت امام احمدؒ سے اس کے خلاف ہے، اور وہی اہلِ ظاہر کا بھی مذہب ہے اور شوکانی نے بھی نیل میں اسی کو اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ تحریمہ اور دوسرے ارکان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بَابٌ يُسَلِّمُ حِيْنَ يُسَلِّمُ الاِمَامُ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَسْتَحِبُّ اِذَا سَلَّمَ الْاِمَامُ اَنْ يُسَلِّمَ مَنْ خَلْفَهُ

(جب امام سلام پھیرے، تو مقتدی سلام پھیرے اور ابن عمر بہتر سمجھتے تھے کہ جب امام سلام پھیر چکے، اس وقت مقتدی سلام پھیرے)

(۷۹۶) حَدَّثَنَا حَبَّانُ بْنُ مُوْسٰى قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ اَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ مَّحْمُوْدٍ هُوَ ابْنُ الرَّبِيْعِ عَنْ عِتْبَانَ بْنِ مَالِكٍ قَالَ صَلَّيْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صلے اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَلَّمْنَا حِيْنَ سَلَّمَ.

ترجمہ (۷۹۶) حضرت عتبان بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، اور آپ کے ساتھ ساتھ ہم نے سلام پھیرا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس باب سے امام بخاریؒ نے مقارنت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مقتدی امام کے ساتھ ہی سلام پھیر دے، دعا وغیرہ میں مشغول نہ رہے۔ جو حنفیہ کا مذہب ہے، نہ کہ تعقیب جس کو دوسروں نے اختیار کیا ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عمرؓ کا اثر بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ جب امام سلام پھیرے تو اس کے مقتدی بھی سلام پھیر دیں۔

علامہ عینیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں امام ابوحنیفہؒ سے دو روایت ہیں ایک یہ کہ امام کے بعد سلام پھیرے، دوسری یہ کہ امام کے ساتھ ہی

پھیر دے، امام شافعیؒ کے نزدیک امام کے پہلے سلام سے فارغ ہونے کے بعد مقتدی سلام پھیرے۔
پھر مالکیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ امام کے بعد ہی سلام پھیرے، اگر ساتھ پھیرے گا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور امام شافعیؒ و احمد کے نزدیک مکروہ ہوگی۔ (الابواب والتراجم، شیخ الحدیث دام ظلہم ص ۲/۳۰۳)

بَابُ مَنْ لَّمْ يَرُدَّ السَّلَامُ عَلَى الْاِمَامِ وَاكْتَفٰى بِتَسْلِيْمِ الصَّلٰوةِ (بعض لوگ (نماز میں) امام کو سلام کرنے کے قائل نہیں اور نماز کے سلام کو کافی سمجھتے ہیں)۔

(۷۹۷) حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ قَالَ اَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ اَخْبَرَنِيْ مَحْمُوْدُ بْنُ الرَّبِيْعِ وَزَعَمَ اَنَّهٗ عَقَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَقَلَ مَجَّةً مَجَّهَا مِنْ دَلْوٍ كَانَتْ فِيْ دَارِهِمْ قَالَ سَمِعْتُ عِتْبَانَ بْنَ مَالِكِ نِ الْاَنْصَارِيَّ ثُمَّ اَحَدَ بَنِيْ سَالِمٍ قَالَ كُنْتُ اُصَلِّيْ لِقَوْمِيْ بَنِيْ سَالِمٍ فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ اَنْكَرْتُ بَصَرِيْ وَاِنَّ السُّيُوْلَ تَحُوْلُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ مَسْجِدِ قَوْمِيْ فَلَوَدِدْتُّ اَنَّكَ جِئْتَ فَصَلَّيْتَ فِيْ بَيْتِيْ مَكَانًا اَتَّخِذُهٗ مَسْجِدًا فَقَالَ اَفْعَلُ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ فَغَدَا عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبُوْ بَكْرٍ مَّعَهٗ بَعْدَ مَا اشْتَدَّ النَّهَارُ فَاسْتَاْذَنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَذِنْتُ لَهٗ فَلَمْ يَجْلِسْ حَتّٰى قَالَ اَيْنَ تُحِبُّ اَنْ اُصَلِّيَ مِنْ بَيْتِكَ فَاَشَارَ اِلَيْهِ مِنَ الْمَكَانِ الَّذِيْ اَحَبَّ اَنْ يُّصَلِّيَ فِيْهِ فَقَامَ وَصَفَفْنَا خَلْفَهٗ ثُمَّ سَلَّمَ وَسَلَّمْنَا حِيْنَ سَلَّمَ۔

ترجمہ (۷۹۷): محمود بن ربیع روایت کرتے ہیں کہ مجھے رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم یاد ہیں، اور میرے گھر میں میرے ڈول سے کلی کر کے میرے منہ پر پانی ڈالنا بھی مجھے یاد ہے، وہ کہتے ہیں، کہ میں نے عتبان بن مالک سے، پھر بنی سالم کے کسی شخص سے یہ سنا وہ کہتے تھے کہ میں اپنی قوم بنی سالم کی امامت کرتا تھا۔ تو میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور میں نے کہا کہ میں اپنی بینائی کو کمزور پاتا ہوں، میرے اور میری قوم کی مسجد کے درمیان میں بہت سے پانی (کے مقامات) حائل ہو جاتے ہیں، تو میں چاہتا ہوں کہ آپ تشریف لاتے، اور میرے گھر میں کسی مقام پر آپ نماز پڑھ لیتے کہ اس کو میں مسجد بنا لیتا، آپ نے فرمایا، میں ان شاء اللہ ایسا کروں گا، پس دوسرے دن دن چڑھے رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے، آپ کے ہمراہ ابوبکر بھی تھے۔ پس نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اجازت طلب کی، اور میں نے آپ کو اجازت دی بیٹھنے سے پہلے ہی آپ نے فرمایا کہ تم گھر کے کس مقام پر نماز پڑھوانا چاہتے ہو، وہیں میں نماز پڑھ دوں، انہوں نے آپ کو اس مقام کی طرف اشارہ کیا جہاں وہ اپنے لئے نماز پڑھنا پسند کرتے تھے، پس آپ کھڑے ہو گئے اور ہم لوگوں نے آپ کے پیچھے صف باندھی، اس کے بعد آپ نے سلام پھیرا ہم نے بھی (آپ کے ہمراہ) سلام پھیرا۔

تشریح: امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ امام اور منفرد پر تو صرف ایک سلام ہے سامنے کی طرف اور مقتدی کے لئے تین سلام مستحب ہیں، ایک داہنی طرف پھر امام کے لئے اور ایک بائیں طرف، یہاں امام بخاریؒ نے اسی کا رد کیا ہے اور بتلایا کہ صرف دو سلام دائیں اور بائیں کافی ہیں، اور عتبان کی حدیث پیش کی، جس میں ہے کہ ہم نے بھی حضور علیہ السلام کے ساتھ دونوں طرف سلام پھیرا، اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی کے لئے تیسرا اور سلام نہیں ہے۔

امام بخاریؒ نے یہاں جمہور کی موافقت کی ہے، کہ مقتدی امام کے لئے سلام میں نیت دائیں یا بائیں سلام ہی میں کرے گا، تیسرے سلام کی ضرورت نہیں ہے۔ حاشیۂ لامع ص ۱/۳۳۹ میں یہ بھی لکھا کہ نماز کے سلام میں انسانوں کے علاوہ ملائکہ اور جنوں کی بھی نیت کی جائے کہ وہ بھی نماز میں شرکت کرتے ہیں۔

قوله فاشا راليه من المكان

حافظ نے لکھا کہ اشارہ کر کے جگہ بتلانے والے حضرت عتبان ہیں، یہاں التفات ہوا ہے کہ فاشرت کی جگہ فاشار مروی ہوا (فتح ص ۲/۲۲۰) علامہ عینیؒ نے حافظ کی بات پر نقد کر کے علامہ کرمانی کی توجیہ کو راجح بتلایا جس سے فاشار کی ضمیر حضور علیہ السلام کی طرف راجع ہوتی ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حضرت عتبان کی حدیث الباب آٹھ جگہ اور بھی بخاری میں آئی ہے، اور لفظ اشار صرف ایک جگہ اور آیا ہے ص ۹۳ میں، باقی چار جگہوں میں فاشرت موجود ہے (ص ۶۰، ص ۹۵، ص ۱۵۸، ص ۸۱۳) جس سے کرمانی کی تائید نہیں ہوتی، اور حافظ کی تائید ہوتی ہے۔ اور تین جگہ نماز کا ذکر نہیں ہے، دوسرے امور ثابت کرنے کیلئے امام بخاری روایت کو مختصر لائے ہیں۔ نیز مسلم شریف میں فاشرت ہی ہے (فتح الملہم ص ۲/۲۲۴)۔ نسائی شریف ص ۱/۱۳۵ میں اور ابن ماجہ ص ۵۵ میں بھی فاشار کی جگہ فاشرت ھی ہے۔ ابن ماجہ میں حدیثِ عتبانؓ کے علاوہ ایک دوسرے نابینا انصاری کا بھی واقعہ ہے کہ ان کی درخواست پر حضور علیہ السلام نے ان کے گھر جا کر مسجد کی جگہ خط لگا کر متعین فرمائی تھی، اور تیسری حدیث میں حضرت انسؓ کی درخواست ہے کہ میری پھوپھی نے کھانا تیار کیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے گھر میں کھانا کھائیں اور اس میں نماز بھی پڑھیں۔ اس مقام پر بھی محشی ابن ماجہ نے کہا کہ ان احادیث سے تبرک بآثار الصالحین کا ثبوت ہوتا ہے۔

تبرک بآثار الصالحین

اس حدیث کے جملہ " اتخذہ مصلے " پر فتح الملہم ص ۲/۲۲۳ میں علامہ محدث نووی شافعیؒ سے نقل کیا کہ اس حدیث صحیح سے ثابت ہوا کہ آثارِ صالحین سے برکت حاصل کرنا۔ اور ان مواضع میں نماز پڑھنا جن میں صالحین نے نماز پڑھی ہے، مشروع ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے ایک صحابی کی درخواست قبول فرما کر ان کے گھر جا کر نماز پڑھی تھی اور اس جگہ کو بابرکت سمجھ کر ہی حضرت عتبانؓ نے اس کو گھر کی مسجد بنالیا تھا، اور حضرت ابن عمرؓ بھی آثار نبویہ کی تلاش کیا کرتے تھے اور حضور علیہ السلام کی نمازوں کی جگہ پر نماز پڑھنے کو مستحب خیال کرتے تھے، جس کا ذکر صحیح بخاری کی احادیث باب المساجد بین مکة والمدينه ص ۶۹ میں ہے، اور لکھا کہ بعض احادیث اسراء و معراج میں بھی یہ وارد ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے دورانِ سفر معراج میں یثرب (مقامِ ہجرت مدینہ طیبہ) طور سینا (مقامِ کلام سیدنا موسیٰ علیہ السلام) مدین (مسکن سیدنا شعیب علیہ السلام) بیت اللحم (مولدِ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام) پر اتر کر حضور علیہ السلام سے نمازیں پڑھوائیں۔ کیا ان سب نصوص سے تبرک بآثار الصالحین کی مشروعیت ثابت نہیں ہوتی؟ یہ اور بات ہے کہ ایسے متبرک مقامات میں کوئی شخص غلو اور تجاوز عن الحد کرے یا بدعات و رسوم کا ارتکاب کرے تو وہ ضرور شریعت کے خلاف ہوگا۔

حضرت علامہ عثمانیؒ نے لکھا کہ ۱۳۴۴ھ میں جب ہم لوگ جمعیۃ علماء ہند کے نمائندے بن کر موتمر اسلامی مکہ معظمہ میں گئے تھے تو ہم نے علماءِ نجد اور ان کے شیخ الاسلام عبداللہ بن بلیہد اور سلطان عبدالعزیز سے بھی ان مسائل میں بحث کی تھی اور ان آثار کو پیش کیا تھا جن سے ان کے مزعومات کی تردید ہوتی تھی، کہ وہ ایسے مقاماتِ متبرکہ پر حاضری اور نماز وغیرہ کو بدعت اور غیر مشروع کہتے تھے، تو اس کے مقابلہ میں ان کے پاس کوئی جواب شافی نہ تھا، بجز معارضہ قطعِ شجرہ کے جو طبقات ابن سعد میں بسندِ منقطع ذکر ہوا ہے اور اس کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ (فتح الملہم شرح صحیح المسلم)

جو متشددین ہر فعل کو بدعت اور ہر بدعت کو شرک کے درجہ تک پہنچادینا ضروری خیال کرتے ہیں وہ یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ جو فعل حضور علیہ السلام سے ایک یا دو بار ثابت ہوا، اس پر مواظبت و مداومت کرنا بھی بدعت ہے، تو کوئی ان سے کہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت عتبانؓ کے گھر جا کر کتنی بار نمازیں پڑھی تھیں؟ اور جب انہوں نے صرف ایک بار حضور کی نماز پڑھنے کی جگہ کو اپنے لئے مستقل طور سے مصلے

اور مسجد بنالیا تو کیا ان کی یہ مواظبت و مداومت بدعت نہ تھی اور حضور علیہ السلام نے اسی وقت کیوں نہ فرمادیا تھا کہ اس جگہ کا التزام ہمیشہ کے لئے نہ کر لینا، کہ اس طرح سے تمہارا یہ فعل غیر مشروع ہو جائے گا، ان لوگوں نے تو یہاں تک بھی جرأت کر کے کہہ دیا کہ اعمالِ خیر میں اکثار بھی بدعت ہے۔ یعنی نوافل وغیرہ کی کثرت کرنا بھی غیر مشروع ہے، جس کے جواب میں حضرت مولانا عبدالحئی لکھنوی کو مستقل رسالہ لکھنا پڑا تھا۔ حضرت مولاناؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی تالیفاتِ نافعہ میں بڑی عمدہ تحقیقات اور علوم ہیں، مگر افسوس کہ وہ نادر و نایاب ہیں۔

ان متشددین نے اتنا بھی نہ سوچا کہ حضور علیہ السلام کی عبادات کے مدارجِ عالیہ کا تو ٹھکانہ ہی کیا کہ آپ کی ایک رکعت کے برابر بھی ساری امت کی ساری نمازیں بھی نہیں ہوسکتیں۔ آپ کے تو صحابۂ کرام کی بھی یہ شان تھی کہ ایک صحابی کا جو برابر صدقہ بھی غیر صحابی کے احد پہاڑ کے برابر سونے کے صدقہ سے بھی اعلیٰ و افضل ہے، تو اگر حضور علیہ السلام یا صحابۂ کرام کے اعمالِ صالحہ طیبہ کے ظاہری قلیل عدد پر نظر کر کے اس سے زیادہ کرنے کو بدعت کہیں گے، یا حضور علیہ السلام کے ایک دو بار کے فعل کی اقتداء بطریق مواظبت و مداومت کو بدعت و غیر مشروع کہا جائے گا تو امت کے پاس عملِ خیر کی مقدار رہ ہی کیا جائے گی؟ اسلاف کے جبالِ طیبات و حسنات کے مقابلہ میں شاید تولوں ماشوں کی حیثیت رہ جائے گی۔ اور اس طرح (خاکم بدہن) خدانہ کرے یہ خالی ہاتھ میدانِ حشر میں جا کھڑے ہوں گے۔

بہر حال! ہمارا حاصلِ مطالعہ تو یہ ہے کہ جس کسی نے بھی خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو جمہور سلف و خلف کے خلاف کوئی بات کہی ہے وہ کسی درجہ میں قابلِ قبول نہیں ہے۔ اور اسی کو ہم تفرد کہتے ہیں۔ جس کے ہم کسی طرح بھی روادار نہیں ہیں۔ بعض حضرات اکابر امت نے ایسے بے محل تشدد پر نکیر بھی کی ہے اور ہمارے حضرت تھانویؒ بھی جور دِ بدعت و شرک میں خود بھی صحیح طور سے بڑے متشدد تھے۔ اور نجدیوں کے خلاف سخت تنقید کو پسند بھی نہ کرتے تھے تاہم ان کا ارشاد تھا کہ جو مسائل مجھ کو معلوم ہیں، ان میں سے بعض میں اُن (نجدیوں) کے ساتھ مجھ کو سخت اختلاف ہے جیسے مفہوم شرک میں غلو، توسل یا شدِ رحال میں تشدد یا طلقات ثلاثہ کا ایک ہونا۔ مگر فرماتے تھے کہ میں ان کے رد میں بھی سخت الفاظ کا استعمال پسند نہیں کرتا (بوادر ص ۶۳)

بَابُ الذِكْرِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ

(نماز کے بعد ذکر کا بیان)

(۷۹۸) حَدَّثَنَا اِسْحٰقُ بْنُ نَصْرٍ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ اَخْبَرَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عَمْرٌو اَنَّ اَبَا مَعْبَدٍ مَّوْلٰی ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَخْبَرَهٗ اَنَّ بْنَ عَبَّاسٍ اَخْبَرَهٗ اَنَّ رَفْعَ الصَّوْتِ بِالذِّكْرِ حِيْنَ يَنْصَرِفُ النَّاسُ مِنَ الْمَكْتُوْبَةِ كَانَ عَلٰی عَهْدِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كُنْتُ اَعْلَمُ اِذَا انْصَرَفُوْا بِذٰلِكَ اِذَا سَمِعْتُهٗ.

(۷۹۹) حَدَّثَنَا عَلِیٌّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا عَمْرٌو وَقَالَ اَخْبَرَنِیْ اَبُوْ مَعْبَدٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنْتُ اَعْرِفُ انْقِضَآءَ صَلٰوةِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالتَّكْبِيْرِ قَالَ عَلِیٌّ حَدَّثَنَا سُفْيٰنُ عَنْ عَمْرٍو وَقَالَ كَانَ اَبُوْ مَعْبَدٍ اَصْدَقَ مَوَالِی ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ عَلِیٌّ وَّاِسْمُهٗ نَافِذٌ.

(۸۰۰) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اَبِیْ بَكْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا مُعْتَمِرٌ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ عَنْ سُمَیٍّ عَنْ اَبِیْ صَالِحٍ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ جَآءَ الْفُقَرَآءُ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا ذَهَبَ اَهْلُ الدُّثُوْرِ مِنَ الْاَمْوَالِ بِالدَّرَجَاتِ الْعُلٰی وَالنَّعِيْمِ الْمُقِيْمِ يُصَلُّوْنَ كَمَا نُصَلِّیْ وَيَصُوْمُوْنَ كَمَا نَصُوْمُ وَلَهُمْ فَضْلٌ مِّنْ اَمْوَالٍ يَحُجُّوْنَ بِهَا وَيَعْتَمِرُوْنَ وَيُجَاهِدُوْنَ وَيَتَصَدَّقُوْنَ فَقَالَ اَلَا اُحَدِّثُكُمْ بِمَا اِنْ اَخَذْتُمْ بِهٖ اَدْرَكْتُمْ مَّنْ سَبَقَكُمْ وَلَمْ يُدْرِكْكُمْ اَحَدٌ

بَعْدَكُمْ وَكُنْتُمْ خَيْرَ مَنْ أَنْتُمْ بَيْنَ ظَهْرَا نَيْهِمْ الَّا مَنْ عَمِلَ مِثْلَهٗ تُسَبِّحُوْنَ وَ تَحْمَدُوْنَ وَتُكَبِّرُوْنَ خَلْفَ كُلِّ صَلٰوةٍ ثَلاثًا وَّثَلٰثِيْنَ فَاخْتَلَفْنَا بَيْنَنَا فَقَالَ بَعْضُنَا نُسَبِّحُ ثَلٰثًا وَّ ثَلٰثِيْنَ وَنَحْمَدُ ثَلٰثًا وَّثَلٰثِيْنَ وَنُكَبِّرُ اَرْبَعًا وَّثَلٰثِيْنَ فَرَجَعْتُ اِلَيْهِ فَقَالَ تَقُوْلُ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ حَتّٰى يَكُوْنَ مِنْهُنَّ كُلِّهِنَّ ثَلاثٌ وَّثَلٰثُوْنَ.

ترجمہ(۷۹۸): ابومعبد (ابن عباس کے آزاد کردہ غلام) روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس نے ان سے بیان کیا کہ جب لوگ فرض نماز سے فارغ ہوتے، اس وقت بلند آواز سے ذکر کرنا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں (رائج) تھا اور ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب میں سنتا تھا، کہ لوگ ذکر کرتے ہوئے لوٹے، تو مجھے معلوم ہو جاتا تھا کہ نماز ختم ہوگئی۔

ترجمہ(۷۹۹): ابومعبد حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نماز کا اختتام تکبیر سے معلوم کرلیا کرتا تھا علی بن مدینی نے کہا کہ ہم سے سفیان نے بیان کیا، انہوں نے عمرو بن دینار سے کہ ابن عباسؓ کے غلاموں میں سب سے سچا ابومعبد تھا، علی نے کہا، اس کا نام نافذ تھا۔

ترجمہ(۸۰۰): حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ فقیر آئے اور انہوں نے کہا کہ مالدار لوگ بڑے بڑے درجے اور دائمی عیش حاصل کر رہے ہیں، کیونکہ وہ نماز بھی پڑھتے ہیں، جیسی کہ ہم نماز پڑھتے ہیں اور روزہ بھی رکھتے ہیں جس طرح ہم روزہ رکھتے ہیں (غرض جو عبادت ہم کرتے ہیں، وہ اس میں شریک ہیں اور ان کے پاس مالوں کی زیادتی ہے، جس سے وہ حج کرتے ہیں، عمرہ کرتے ہیں اور جہاد کرتے ہیں اور صدقہ دیتے ہیں، آپ نے فرمایا، کیا میں تم کو ایسی بات نہ بتلاؤں کہ اگر اس پر عمل کرو، تو جو لوگ تم سے آگے نکل گئے ہوں، تم ان تک پہنچ جاؤ گے، اور تمہیں تمہارے بعد کوئی نہ پہنچ سکے گا، اور تم تمام لوگوں میں بہتر ہو جاؤ گے، اس کے سوائے جو اسی کے مثل عمل کرے۔ تم ہر نماز کے بعد تینتیس مرتبہ تسبیح اور تحمید اور تکبیر پڑھ لیا کرو۔ بعد اس کے ہم لوگوں نے اختلاف کیا، اور ہم میں سے بعض نے کہا کہ ہم تینتیس مرتبہ تسبیح پڑھیں گے۔ اور تینتیس مرتبہ حمد پڑھیں گے اور تکبیر چونتیس مرتبہ پڑھیں گے۔ تو میں نے پھر آپ سے پوچھا، آپ نے فرمایا: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَر پڑھا کرو۔ یہاں تک کہ ہر ایک ان میں سے تینتیس مرتبہ ہو جائے۔

(۸۰۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ عَبْدِالْمَلِكِ بْنِ عُمَيْرٍ عَنْ وَرَّادٍ كَاتِبِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ اَمْلٰى عَلَيَّ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ فِيْ كِتَابٍ اِلٰى مُعَاوِيَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلٰوةٍ مَّكْتُوْبَةٍ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ وَقَالَ شُعْبَةُ عَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بِهٰذَا وَقَالَ الْحَسَنُ جَدُّ غِنًى وَّعَنِ الْحَكَمِ عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُخَيْمِرَةَ عَنْ وَّرَّادٍ بِهٰذَا.

ترجمہ(۸۰۱): مغیرہ کے منشی روایت ہیں کہ مغیرہ بن شعبہؓ نے مجھ سے ایک خط میں معاویہ کو یہ لکھوایا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہر فرض نماز کے بعد لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الخ (یعنی کوئی معبود نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے وہ ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں، اسی کی ہے بادشاہت اور اسی کے لئے ہے تعریف اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔ اے اللہ جو کچھ تو دے اس کا کوئی روکنے والا نہیں اور جو چیز تو روک لے اس کا کوئی دینے والا نہیں، اور کوشش والے کی کوشش تیرے سامنے کچھ فائدہ نہیں دیتی) پڑھا کرتے تھے۔ اور شعبہ نے بھی عبدالملک سے ایسی ہی روایت کی ہے اور حسن بصری نے کہا جَدّ کہتے ہیں مالداری کو اور شعبہ نے اس حدیث میں حکم بن عقبہ سے انہوں نے قاسم بن مخیمرہ سے۔ انہوں نے وراد سے یہی روایت کیا ہے۔

تشریح: امام بخاریؒ نے یہاں تو باب الذکر بعد الصلوٰۃ کا باب قائم کیا ہے اور کتاب الدعوات میں باب الدعاء بعد الصلوٰۃ ص ۹۳۷ لائیں گے۔ حافظ نے یہاں لکھا کہ حدیث الباب سے ذکر بعد الصلوٰۃ کی فضیلت نکلتی ہے، اور اسی سے امام بخاری نے کتاب الدعوات میں دعاء بعد

الصلوٰۃ کی بھی فضیلت ثابت کی ہے، کیونکہ نمازوں کے اوقات فضل وشرف کے لمحات ہیں، ان میں قبولیتِ دعا کی امید ہے۔ (فتح الباری ص۲/۲۲۵)

نماز کے بعد اجتماعی دعا

حافظؒ نے باب الدعاء بعد الصلوٰۃ میں لکھا کہ نماز سے مراد فرض نماز ہے، اور امام بخاری کا مقصد اس سے اس کا رد کرنا ہے جو نماز کے بعد دعا کو غیر مشروع کہتا ہے اور حدیثِ مسلم سے استدلال کرتا ہے کہ حضور علیہ السلام سلام پھیرنے کے بعد صرف اتنا ٹھہرتے تھے کہ اللھم انت السلام و منک السلام تبارکت یا ذاالجلال والاکرام کہہ لیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نفی مذکور سے مراد اسی نماز کی ہیئتِ سابقہ پر استمرارِ جلوس کی نفی ہے، کیونکہ یہ بھی مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نماز کے بعد اپنے صحابہ کی طرف متوجہ ہوتے تھے، لہٰذا دعا بعد الصلوٰۃ والی احادیث کا محمل یہی ہوگا کہ وہ صحابہ کی طرف توجہ فرما کر (اجتماعی) دعائیں کرتے تھے۔

ادعاء ابن القیم رحمہ اللہ

حافظ نے لکھا کہ ابن القیم نے ''الہدی النبوی'' میں کہا کہ ''سلام نماز کے بعد مستقبل القبلہ دعا خواہ امام کی ہو یا منفرد کی۔ یا مقتدی کی کوئی بھی قطعاً حضور علیہ السلام کے طریقہ سے ثابت نہیں ہے اور نہ آپ سے بہ اسنادِ صحیح یا حسن ایسا ثابت ہوا ہے اور جن لوگوں نے نمازِ فجر، عصر کیلئے اس کو خاص کیا وہ بھی حضور علیہ السلام یا خلفا سے ثابت نہیں ہے، اور نہ اس کے لئے امت کو ہدایت کی گئی، لہٰذا اس کو ان دونوں نمازوں کے بعد جس نے بھی مستحسن سمجھ کر کیا وہ گویا اس نے سنت کی جگہ ایک نئی بات ایجاد کی ہے۔

پھر لکھا ہے کہ نماز کے بارے میں اکثر ادعیہ مرویہ کا تعلق نماز کے اندر پڑھنے سے ہے، اسی میں آپ نے پڑھی ہیں اور اسی میں پڑھنے کا حکم بھی کیا ہے اور یہی نمازی کے لائق بھی ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس سے مناجات کرتا ہے۔ اور سلام پھیر کر تو اس کی حالتِ مناجات ختم ہو جاتی ہے اور اس کا وہ موقف وقرب بھی ختم ہو جاتا ہے، تو اب اُس سے دعا کا کیا موقع ہے، جو وقت سوال کا تھا اس مناجات وقرب کے وقت تو دعا نہ کی، اور اب اس سے فراغت کے بعد دعا اور سوال کرتا ہے۔

البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ نماز کے بعد پہلے اذکارِ ماثورہ پڑھے، پھر درود شریف پڑھے اور پھر جو چاہے دعائیں مانگے تو اس طرح اس کی دعا اس دوسری عبادت (اذکار ماثورہ بعد الصلوٰۃ) کے عقب میں ہوگی، فرض نماز کے بعد نہ ہوگی۔

ردِ ابن القیم رحمہ اللہ

حافظ نے علامہ کی پوری بات نقل کر کے لکھا میں کہتا ہوں کہ ابن القیمؒ کا ادعاءِ مذکور نفی مطلق کی صورت میں مردود ہے کیونکہ مندرجہ ذیل احادیث سے اس کی تردید ہوتی ہے۔

(۱) نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو دعاء بعد الصلوٰۃ اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک تلقین فرمائی، (ابوداؤد ونسائی وصححہ ابن حبان والحاکم)

(۲) حدیث ابی بکرہ میں ہے کہ حضور علیہ السلام ہر نماز کے بعد اللھم انی اعوذبک من الکفر والفقر وعذاب القبر پڑھتے تھے (ترمذی، نسائی، وصححہ الحاکم)

(۳) حدیثِ سعد جو باب التعوذ من البخل میں قریب ہی بخاری میں آ رہی ہے جس کے بعض طرق میں ہمارا مقصود ہے۔

(۴) حدیثِ زید بن ارقم کو حضور علیہ السلام ہر نماز کے بعد اللھم ربنا ورب کل شئی الخ پڑھا کرتے تھے، (ابوداؤد ونسائی)

(۵) حدیثِ صہیب مرفوعا کہ نماز سے فارغ ہوکر اللھم اصلح لی دینی الخ پڑھا کرتے تھے۔ (نسائی وصحہ ابن حبان) وغیرہٗ لک اس کے بعد حافظ نے لکھا کہ احادیث کے الفاظ میں جو دبر کل صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے اس سے قرب آخرِ صلوٰۃ یعنی تشہد کے ساتھ دعا مراد لینا اس لئے صحیح نہیں کہ ذکر بعد الصلوٰۃ کا امر بھی وارد ہوا ہے اور اس سے مراد اجتماعی طور سے بعد سلام ہی ہے تو اسی طرح یہاں بھی ہوگا۔ الا یہ کہ اس کے خلاف کوئی دلیل صحیح لائی جائے، اور ترمذی میں یہ حدیث بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے جوف اللیل الآخر اور فرض نمازوں کے بعد کی دعاؤں کو مقبول فرمایا ہے، اور محدث طبری نے ایک روایت حضرت جعفر بن محمد الصادقؒ سے روایت کی کہ فرض نمازوں کے بعد دعا نفل نمازوں کے بعد کی دعاء سے زیادہ افضل ہے، جیسا کہ خود فرض نماز کو نفل نماز پر فضیلت حاصل ہے (فتح الباری ۱۱/۱۰۴)

حافظ ابن حجرؒ کے اجمالی تبصرہ مندرجہ بالا سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ یہ دعا بعد الصلوٰۃ اور اس سے متعلقہ مسائل میں حافظ ابن القیم کا موقف جمہور سلف سے الگ ہے، اس لئے حافظ نے مندرجہ بالا نقد ضروری سمجھا اور علامہ قسطلانی شارح بخاریؒ نے بھی "المواہب" میں ابن القیم کے مندرجہ بالا ادعاء کا ردمدلل کیا ہے، اور انہوں نے حافظ ابن حجرؒ کے تعقب مذکور کا ذکر بھی اپنی تائید میں کیا ہے، (ملاحظہ ہو اعلاء السنن ص ۳/۲۱۱)

لیکن یہاں مزید وضاحت اس امر کی بھی ضروری ہے کہ دعاء بعد الصلوٰۃ وغیرہ کے بارے میں یہی بلکہ اس سے بڑھ کر اور ادعات حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی کئے ہیں، اور ان کے فتاویٰ مطبوعہ مصر کی جلد اول میں تین جگہ اور جلد دوم میں دو جگہ یہ بحث موجود ہے، غالباً حافظ کے مطالعہ میں ان کے فتاویٰ نہیں آئے ہیں، اسی لئے فروعی مسائل مندرجہ فتاویٰ کا ذکر ان کے یہاں نہیں ملتا اور وہ صرف ابن القیم کا رد کرتے ہیں، حالانکہ وہی مسلک وتحقیق علامہ ابن تیمیہ کی بھی ہوتی ہے، البتہ اصول وعقائد کے مسائل میں وہ علامہ ابن تیمیہ کا بھی بہت سے مواضع میں رد کرتے ہیں کیونکہ ان کے عقائد ونظریات شائع ذائع ہو چکے تھے، جس طرح ہمارے حضرت شاہ صاحب اور حضرت مدنیؒ رد کرتے تھے۔

افسوس ہے کہ اس موقع پر سارے حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے اچھی طرح واضح ہو کر صحیح طور سے آپ کے کسی مجموعۂ امالی میں نہیں آسکی، اس لئے ہم اس کو بھی منقح کر کے درج کریں گے، اور حضرتؒ نے درسِ بخاری میں حافظ ابن تیمیہ وابن القیم کا رد بھی کیا تھا، اوپر ہم نے حافظ ابن القیم کی تحقیق فتح الباری سے نقل کر دی ہے۔ اور حافظ ابن تیمیہ کی تحقیق کا خلاصہ بھی پیش کرتے ہیں، کیونکہ اس کو صاحبِ اعلاء السنن نے بھی نقل نہیں کیا اور محترم علامہ بنوریؒ نے معارف السنن ص ۴/۴۰ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ جملہ نقل فرما کر کہ "ابن تیمیہ کی غرض اثبات دعاء داخل الصلوٰۃ ہے اور دعاء بعد الصلوٰۃ کی نفی ہے، اس طرح لکھا کہ ان کا قول فتاویٰ میں ہے، جو اس وقت میرے پاس نہیں ہے، اور انہوں نے اپنے فتاویٰ جز واول میں دو جگہ اس سے تعرض کیا ہے۔ پھر لکھا کہ احادیث تسبیح میں دبر الصلوۃ سے مراد یقیناً بعدِ صلوۃ ہی ہے، پھر روایتِ بخاری باب الدعوات میں دبر کل صلوۃ ہے اور نماز کے بیان میں خلف کل صلوٰۃ ہے اور حدیث ابی ذرؓ میں اثر کل صلوۃ ہے، اور ترمذی کی حدیث الباب میں فاذا صلیتم فقولوا وارد ہے، یہ سب اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ اذکار وادعیہ نماز سے فراغت کے بعد کی ہیں۔ الخ (معارف السنن ص ۴/۴۱)

اس کے بعد ہم علامہ ابن تیمیہؒ کے ارشادات نقل کرتے ہیں تا کہ ان کا نظریہ اور طریقِ استدلال بھی سامنے آجائے اور یہ بھی معلوم ہو کہ جب کوئی سب سے الگ ہو کر کوئی منفرد رائے قائم کرتا ہے تو اس کو کیسے پیچ وتاب کھانے پڑتے ہیں، اور طول لاطائل کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، واللہ المدد۔

(۱) آپ نے فتاویٰ ص ۱/۱۸۷ میں لکھا کہ فرض نمازوں کے بعد صحاح میں صرف اذکار مسنونہ پڑھنے کا ذکر ہے، اور امام ومقتدیوں کی اجتماعی دعا بعد نماز کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کسی نے بھی نقل نہیں کیا، لیکن اتنی بات نقل ہوئی کہ حضور علیہ السلام نے حضور معاذؓ کو نماز کے بعد اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک پڑھنے کا حکم دیا اور مثل اس کے اور بھی ہے (یہاں علامہ نے پہلے تو قطعی انکار کیا، پھر لیکن سے حضرت معاذؓ کے اثر کو قبول کر لیا اور پھر اس کے مثل دوسرے آثار نبویہ کو بھی قبول کر گئے، مگر تفصیل ترک کر دی تا کہ اپنی بات کمزور نہ ہو جائے، واللہ تعالیٰ اعلم)

اس کے بعد لکھا کہ دبر صلوٰۃ سے مراد نماز کے اندر ہی کا آخری حصہ ہے، جیسا کہ دبر الیشی سے اس کا موخر حصہ مراد ہوا کرتا ہے، البتہ کبھی اس سے مراد وہ حصہ بھی ہوتا ہے جو اس کے ختم ہونے کہ بعد ہوتا ہے جیسے کہ قولہ تعالیٰ وادبار السجود میں ہے، اور کبھی دونوں معنی ایک ساتھ بھی مراد ہوا کرتا ہے۔ لیکن بعض احادیث بعض کی تفسیر کرتی ہیں، اس کے لئے تتبع وتلاش کی ضرورت ہوتی ہے۔

بہر حال! یہاں دو الگ چیزیں ہیں، ایک تو منفرد نمازی کی دعا، خواہ وہ امام ہو یا مقتدی جیسے نمازِ استخارہ وغیرہ کی دعائیں، دوسرے امام اور مقتدیوں کی اجتماعی دعا، تو یہ دوسری دعا ایسی ہے کہ جس کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہوسکتا کہ اس کو حضور علیہ السلام نے مکتوبات کے بعد کبھی نہیں کیا جیسے کہ وہ اذکار ماثورہ کرتے تھے، اس لئے کہ اگر آپ ایسا کرتے تو اس کو آپ کے صحابہ، پھر تابعین، پھر علماء ضرور نقل کرتے، جیسا کہ انہوں نے اس سے کم درجہ کی چیزوں تک کو بھی نقل کیا ہے، اور اسی لئے اس دعاء بعد الصلوٰۃ کے بارے میں متاخرین کے اقوال مختلف ہوگئے۔ بعض نے نمازِ فجر وعصر کے بعد اس کو مستحب قرار دیا، جیسا کہ ایک جماعت نے اصحابِ امام ابوحنیفہ ومالک واحمد وغیرہ سے اس کو ذکر کیا ہے، لیکن ان حضرات کے پاس کوئی سنت وحدیث استدلال کیلئے نہیں ہے، انہوں نے صرف اس امر سے استدلال کرلیا کہ ان دونوں نمازوں کے بعد نوافل وسنن نہیں ہیں، اور ان میں سے بعض حضرات نے اس کو سب ہی نمازوں کے بعد مستحب کہا ہے، اور کہا کہ ان دعاؤں کو بلند آواز سے نہ کہے، بجز اس کے کہ تعلیم کا قصد ہو، جیسا کہ اس کو ایک جماعت نے اصحابِ امام شافعیؒ وغیرہم میں سے کہا ہے، مگر ان کے پاس بھی اس کیلئے کوئی حدیث وسنت نہیں ہے بجز اس کے کہ دعا مشروع ہے اور وہ نمازوں کے بعد اقرب الی الا جابة ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ان حضرات نے دعاء بعد الصلوٰۃ کے لئے کہا اس کو شارع علیہ السلام نے نماز کے اندر مقرر کیا تھا، لہٰذا آخرِ صلوٰۃ میں قبل الخروج من الصلوٰۃ دعا مشروع ومسنون ہوئی تھی، جس کا ثبوت سنت متواترہ سے اور باتفاقِ مسلمین ہوا ہے بلکہ بعض سلف وخلف نے تو اس دعا کو واجب بھی کہا ہے، پھر یہ کہ نمازی نماز کے اندر حق تعالیٰ سے مناجات کرتا ہے، لہٰذا جب تک وہ نماز میں ہے وہی وقت وحالت دعا کے لئے ہر طرح موزوں، مناسب بھی ہے۔ اس سے نکلنے کے بعد اس کے لئے نہ مناجاۃ کا موقع ہے نہ دعا کا۔ البتہ ذکر وثناء کا موقع رہتا ہے۔

پھر لکھا کہ بعض علماء نے نماز کے بعد ایسی دعاؤں کو بھی مستحب سمجھا ہے جو حدیث میں وارد نہیں ہوئیں، اور کچھ لوگوں نے تو اس کے مقابل یہ کیا کہ وہ نماز کے بعد کے قعودِ مشروع کو بھی مستحب نہیں سمجھتے، اور نہ ذکرِ ماثور کرتے ہیں بلکہ وہ اس کو مکروہ سمجھتے ہیں اور اس سے روکتے ہیں۔ پس یہ لوگ حدِ شرع سے تجاوز کر گئے کہ مشروع سے تو روکتے ہیں اور امرِ غیر مشروع کو جائز قرار دیتے ہیں حالانکہ دین تو امرِ مشروع کا نام ہے نہ امرِ غیر مشروع کا۔

رہا نماز میں رفعِ یدین کا مسئلہ کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کی جائے تو اس کیلئے احادیث کثیرہ صحیحہ وارد ہوئی ہیں، اور دعاء کے بعد چہرے پر ہاتھوں کے پھیرنے کیلئے صرف ایک دو حدیث آئی ہیں، جن سے احتجاج واستدلال نہیں ہوسکتا۔ واللہ اعلم (فتاویٰ ص ۱۸۹/ ۱۸۷ جلد اول)

ایک جگہ لکھا کہ صحاح وغیرہ میں جو دعا منقول ہوئی ہیں وہ سب نماز کے اندر کی اور نماز سے نکلنے سے قبل کی ہیں، اور حدیثِ ابی امامہ میں جو یہ ہے کہ جوفِ لیل آخر اور فرض نماز کے بعد دعا قبول ہوتی ہے تو اس کو بعد السلام کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں، لہٰذا اس کو ماقبل السلام کے لئے بھی عام رکھنا چاہئے، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس فضیلت میں بعد سلام کے امام ومقتدیین کی اجتماعی دعا بھی شامل ہو، بلکہ اس سے صرف تنہا نماز پڑھنے والے کے لئے دعا مراد لی جائے تو یہ سنت کی مخالفت بھی نہ ہوگی، آخر میں علامہ نے لکھا کہ جن احادیثِ صحیحہ میں دبر الصلوٰۃ کا لفظ آیا ہے ان سب میں مراد قبل السلام کی دعا ہے، (فتاویٰ ص ۲۰۶/ ۲۰۱ جلد اول)۔

پھر علامہ نے اسی جلد کے ص ۲۱۹ میں کھل کر صاف طور سے لکھ دیا کہ نماز کے بعد امام ومقتدی کی اجتماعی دعاء "بدعت ہے، کیونکہ یہ عہدِ نبوی میں نہ تھی، اور آپ کے دعا صرف نماز کے اندر تھی۔ اور نماز کے بعد صرف اذکارِ مسنونہ ماثورہ ہی وارد ہیں۔

اس کے بعد جلد دوم ص ۲۱۲ میں لکھا کہ پانچوں نمازوں کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقتدی کوئی دعانہیں کرتے تھے، جیسے کہ اس زمانہ میں بعض لوگ نماز فجر وعصر کے بعد کرتے ہیں۔ نہ اس کو کسی نے ائمہ اربعہ میں سے مستحب کہا ہے، اور امام شافعیؒ کی طرف نسبت غلط ہے اور ایسے ہی امام احمد وغیرہ نے بھی اس کو مستحب نہیں قرار دیا ہے، البتہ ایک جماعت نے اصحابِ امام ابوحنیفہ وامام احمد وغیرہما نے نمازِ فجر وعصر کے بعد اس کو مستحب کہا ہے اور ایسی بات پر، مداومت کرنا جس پر حضور علیہ السلام سے مداومت ثابت نہ ہو وہ مشروع نہ ہوگی بلکہ مکروہ ہوگی۔ (ص ۲/۲۱۲)۔

اس کے بعد لکھا کہ احادیثِ معروفہ صحاح وسنن ومسانید کی یہ بتلاتی ہیں کہ حضور علیہ السلام نماز کے آخر میں اس کو ختم کرنے سے پہلے دعا کرتے تھے۔ اور اس کا اپنے اصحاب کو حکم کرتے تھے، اور اسی کی تعلیم دیتے تھے، کسی نے بھی یہ نقل نہیں کیا کہ جب آپ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے تو نماز ختم کر کے وہ اور مقتدی سب مل کر اجتماعی دعا کرتے تھے، نہ فجر میں نہ عصر میں۔ نہ ان کے علاوہ کسی نماز میں، بلکہ یہ ثابت ہوا کہ نماز کے بعد آپ صحابۂ کرام کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور ان کو ذکر اللہ کی تعلیم کرتے تھے، الخ (ص ۲/ ۴۶۷)

ص ۲/ ۴۷۱ میں لکھا کہ اصحابِ امام شافعی واحمد میں سے جو حضرات امام ومقتدیوں کی اجتماعی دعا بعد الصلوٰۃ پر عمل کرتے ہیں، پھر بعض پانچوں نمازوں کے بعد اور بعض فجر وعصر کے بعد ایسا کرتے ہیں، ان کے پاس کوئی دلیل حدیث وسنت سے نہیں ہے اس کے بعد حسبِ سابق دوسرے حضرات کی پیش کردہ احادیث میں تاویل کر کے جوابات دیئے ہیں۔ (تا ص ۲/۴۷۴)۔

علامہ ابن تیمیہ کے دلائل وارشادات پر نظر

اوپر حافظ ابن حجرؒ کا جواب گذر چکا ہے۔ اور اعلاء السنن ص ۳/ ۱۹۸ تا ص ۳/ ۲۱۵ میں سب دلائل وجوابات ایک جگہ کر دیئے ہیں۔
ان احادیث سے استقبالِ قبلہ کے ساتھ بھی دعا ثابت ہے جس کا انکار علامہ ابن القیم اور امیر یمانی نے سبل السلام میں کیا ہے اور اسی لئے علامہ جزری شافعیؒ نے استقبالِ قبلہ کو آدابِ دعا میں شمار کیا ہے۔ بعض احادیث سے دعا برفع الیدین بھی ثابت ہے اور علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس کو صحیح احادیث سے ثابت مانا ہے، تو کیا رفع یدین کے ساتھ دعا بھی نماز کے اندر والی تھی؟ اور نمازِ استسقاء کے بعد اور بیت ام سلیم میں بھی نماز کے بعد حضور علیہ السلام نے اجتماعی دعا کی ہے، تو حضور علیہ السلام سے ثابت شدہ امر کو ''بدعت'' قرار دینا کیوں کر درست ہوگا؟

اکابرِ امت سلف وخلف نے فیصلہ کیا ہے کہ جو امر حضور علیہ السلام سے بطریق مواظبت ثابت ہو وہ سنت کا درجہ حاصل کرتا ہے اور جو ایک دوبار کے فعل سے ثابت ہو وہ مستحب کے درجہ میں ہوتا ہے، اور اس کو ''بدعت'' کہنے کا کوئی جواز بھی کسی طرح نہیں ہوسکتا۔

جب اجتماعی دعا بعد الصلوٰۃ نمازِ استسقاء اور نمازِ بیت ام سلیم کی احادیث صحیحہ قویہ سے ثابت ہوگئی تو اس کو بدعت بتلانا مشروع کو غیر مشروع کہنا نہیں تو اور کیا ہے؟

احادیث وآثار کثیرہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام نمازوں کے بعد مختصر ذکر کرتے تھے۔ اور وہی ذکرِ ماثور مختصر سارے متبعین مذاہب اربعہ بھی بہ استقبالِ قبلہ کرتے ہیں، اس سے زیادہ وہ صرف فجر۔ عصر میں کرتے ہیں اور صرف ان دو میں اذکارِ ماثورہ کے بعد اجتماعی دعا بھی کرتے ہیں۔

ص ۳/ ۲۰۷ اعلاء السنن میں مصنف ابن ابی شیبہ سے اسود عامری کی حدیث عن ابیہ پیش کی گئی ہے، جس میں انہوں نے کہا کہ میں نے حضور علیہ السلام کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی، آپ نے سلام وانصراف کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ اس حدیث کی تائید دوسری احادیث سے بھی ہوتی ہے اور غالباً اسی پر قیاس کر کے بعد عصر بھی ایسا معمول اصحابِ ائمہ ثلاثہ نے اختیار کیا ہے کیونکہ ان دونوں نمازوں کے بعد سنن و

نوافل نہیں ہوتے تو پھر اس کو بدعت کیسے کہہ سکتے ہیں۔

واضح ہو کہ اجتماعی دعا کی اہمیت سے انکار کسی طرح بھی نہیں ہوسکتا، اور اسی لئے حضور علیہ السلام نے عورتوں کے لئے فرمایا کہ وہ عیدگاہ جا کر مسلمانوں کی دعا میں شامل ہوں، ظاہر ہے کہ یہ دعا نہ نماز سے قبل تھی۔ نہ خطبہ کے بعد تھی، لہٰذا اس کا مقام نماز کے بعد ہی متعین ہوجاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

صاحب تحفہ کا ارشاد بابۃ جوازِ دعا بعد الصلوٰۃ

علامہ مبارکپوریؒ نے تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی شریف ص ۱/ ۲۴۶ میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کی بہت سی احادیث نقل کیں اور لکھا کہ اس کے لئے علامہ سیوطیؒ نے مستقل رسالہ بھی لکھا ہے، اور اس کے لئے ان کا استدلال حدیثِ بخاری (کتاب الدعوات) سے بھی ہے کہ ایک اعرابی نے جمعہ کے دن حضور علیہ السلام سے قحط سالی اور بارش نہ ہونے کی شکایت کی تو آپ نے اسی وقت دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور سب لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ صاحبِ تحفہ نے لکھا کہ اجتماعی دعا بعد الصلوٰۃ والے اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور یہ درست بھی ہے کیونکہ اگرچہ یہ واقعہ استسقاء کا ہے، مگر ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ خاص نہیں ہے وہ اسی لئے امام بخاریؒ نے بھی اس سے مطلق دعا میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا جواز ثابت کیا ہے۔ پھر لکھا کہ میرے نزدیک بھی راجح یہی ہے کہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے اس میں کوئی حرج نہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ واللہ تعالیٰ اعلم پھر تنبیہ کے عنوان سے لکھا کہ اس زمانہ میں حنفیہ ہر نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے پر مواظبت کرتے ہیں، جیسے اس کو واجب سمجھتے ہیں اور اسی لئے جو ایسا نہ کرے اس پر نکیر کرتے ہیں، یہ انکا طریقہ خود ان کے امام ابوحنیفہ کے ارشاد اور ان کی معتبر کتابوں کے خلاف ہے۔ الخ۔

صنیع ابن تیمیہ سے سکوت

علامہؒ کے اس اعتدال و انصاف سے خوشی ہوئی، اور جو لوگ اس کو واجب کا درجہ دیتے ہیں، وہ ضرور غلطی پر ہیں، مگر موصوف کو اس کے ساتھ علامہ ابن تیمیہ و ابن القیم کے بارے میں بھی جرأت کر کے یہ لکھ دینا چاہئے تھا کہ ان کا اس کو بدعت قرار دینا بھی نادرست ہے۔

علامہ ابن القیم کی غلطی

ہم انصاف کو خیر الاوصاف سمجھتے ہیں اس لئے ہمیں صاحب مرعاۃ کی یہ بات پسند آئی کہ حافظ ابن حجر نے جو غلطی ابن القیمؒ کی درود شریف میں بابۃ ابراہیم۔ وآل ابراہیم پکڑی تھی، وہ مرعاۃ ص ۱/ ۶۸۰ میں پوری نقل کردی۔ اگرچہ یہ کمی انہوں نے بھی کردی کہ بعینہ یہی غلطی تو ان کے شیخ ابن تیمیہؒ نے بھی کی تھی، تو ہوسکتا ہے حافظ کے علم میں نہ آئی ہو، اس لئے صرف ابن القیم کی طرف منسوب کردی مگر صاحبِ مرعاۃ کے علم میں تو ابن تیمیہ کی غلطی بھی ضرور آ گئی ہوگی کہ ان کے فتاویٰ وغیرہ ساری کتابیں بار بار اور بڑے اہتمام کے ساتھ طبع ہو کر مفت شائع ہورہی ہیں، خود مجھے فتاویٰ ابن تیمیہ کی ۳۳ جلدیں بلا قیمت حاصل ہوئیں جو سعودی حکومت کے اہتمام سے شائع ہوئیں۔ تو ایسی صورت میں جو غلطی دونوں کی تھی، اس کو صرف ایک کی طرف منسوب کرنا مناسب نہیں تھا۔

واضح ہو کہ صاحبِ تحفہ کی طرح غالباً دعا بعد الصلوٰۃ کو صاحبِ مرعاۃ بھی بدعت یا ناجائز نہیں سمجھتے، اسی لئے انہوں نے مرعاۃ ص ۱/ ۷۱۶ میں باب الذکر بعد الصلوٰۃ پر لکھا: ای بعد الفراغ من الصلوٰۃ المکتوبۃ والمراد بالذکر اعم من الدعاء وغیرہ بخلاف ابن تیمیہ و ابن القیم کے کہ وہ بعد الصلوٰۃ دعا کو بدعت قرار دے کر اس کی نفی کرتے ہیں بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ اگر دعا کرنی ہی ہو تو

ذکر بعد الصلوٰۃ سے فارغ ہو کر حمد وثنا وغیرہ کر کے پھر دعا کرے تاکہ اس کی یہ دعا نماز کے بعد نہ ہو بلکہ دوسری عبادت ذکر بعد الصلوٰۃ کے بعد متصور ہو۔

دو بڑوں کا فرق

امام بخاریؒ اپنی صحیح میں صرف اپنے مسلکِ فقہی کے موافق احادیث لاتے ہیں، البتہ دوسرے رسائل میں انہوں نے دوسروں کے دلائل سے بھی تعرض کیا ہے لیکن حافظ ابن تیمیہ کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنے مسلک کی احادیث لا کر ان کی خوب تقویت کی بھی سعی کرتے ہیں، اور دوسروں کے موافق احادیث ذکر کر کے ان کو گرانے کی بھی پوری کوشش کرتے ہیں، جیسے کہ احادیثِ زیارۃ وتوسل سب کو ضعیف، موضوع باطل وغیرہ کہہ دیا اور اپنی ضعاف کو بھی قوی ثابت کیا پھر ان ضعاف سے نہ صرف فضائل یا احکام بلکہ عقائد تک بھی ثابت کر دیتے ہیں۔ **وللتفصیل محل آخر . ان شاء الله وبه نستعين۔**

علامہ کشمیریؒ کے ارشادات

آپ نے فرمایا۔ امام بخاری نے باب الدعاء قبل السلام کے بعد ابواب اذکار بعد الصلوٰۃ کا باب قائم کیا ہے، جیسا کہ کتاب الدعوات میں پہلے باب ادعیہ خلالِ صلوٰۃ کے بعد باب الدعا بعد الصلوٰۃ لائیں گے، جس سے ثابت کریں گے کہ دعا بعد الصلوٰۃ بھی مشروع ہے۔

پھر فرمایا کہ دعائیں دو طرح سے مروی ہیں، ایک تو وہ ہیں جو فرض نمازوں کے بعد سنتوں سے قبل کے لئے وارد ہیں، دوسری وہ ہیں جو حضور علیہ السلام سے متفرق ومنتشر اوقات میں ثابت ہوئی ہیں۔ اور امام بخاری صرف قسم اول کا بیان کر رہے ہیں، جس پر عمل کی صورت یہ ہے کہ جس طرح حضور علیہ السلام نے کوئی دعا کی ہے، کبھی دوسری، تو اسی طرح اس کا اتباع کیا جائے، کہ کم وقت ہوتا ہے، اس میں جمع کرنے سے سنن ونوافل بعد الصلوٰۃ میں تاخیر بھی ہوگی) اور جب حضور علیہ السلام سے ہی کبھی کوئی دعا آتی ہے، کبھی دوسری تو اسی طرح ہمیں بھی کرنا اتباع سنت ہوگا۔

لیکن اس کے باوجود بھی اگر کوئی ان کو جمع کرے گا تو ہم اس کو منع بھی نہیں کر سکتے کیونکہ عبادات سے روکنا جائز نہیں پھر ذکر سے روکنا تو اس لئے بھی درست نہ ہوگا کہ وہ افضلِ عبادات ہے، دوسرے یہ کہ ان کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں ہے بخلاف دوسری عبادات کے کہ ان کے اوقات مقرر ہیں۔ اور ان کے لئے بعض اوقات ممنوعہ بھی ہیں۔ پھر بھی ہم ان کو نہیں روک سکتے تو اذکار کو کیسے روک سکتے ہیں؟۔

تاہم بہتر یہی ہے کہ نمازوں کے بعد کبھی کسی ذکر کو اختیار کرلے کبھی دوسرے کو، اور ان کو ایک وقت میں جمع نہ کرے، اگرچہ جائز وہ بھی ہے، البتہ دوسری قسم کی وہ دعائیں جو حضور علیہ السلام سے اوقاتِ منتشرہ میں وارد ہیں، ان کے بارے میں تمہیں اختیار ہے کہ انکو چاہے ایک وقت میں جمع کر کے کرو یا الگ الگ پڑھو۔ اسی لئے ادعیۂ نبویہ کو اکابر علماء امت نے بطور اوراد کے بھی جمع کر دیا ہے، مثلاً علامہ نوویؒ نے **کتاب الاذکار** تالیف کی، ابن السنی نے **عمل الیوم واللیلہ** لکھی، علامہ جزری شافعیؒ نے الحصن، الحصین، تالیف کی، حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ تین کتابیں تو بہت مشہور ہیں اور شاید نووی کی سب سے بہتر ہے، یہ کتاب روح ہے حدیث کی، لیکن بعض اعتبارات سے حصنِ حصین بھی اچھی ہے، کیونکہ نکھری نکھرائی چیزیں ہیں، اگرچہ نووی کا زمانہ قریب ہے زمانۂ نبوت سے۔

نیز فرمایا کہ میرے نزدیک اول درجہ میں تو متشابہات کو رکھنا چاہئے کہ وہ حسبِ تحقیق مجدد صاحبؒ روح ہے قرآن مجید کی، اور دوسرے درجہ میں دعوات کو رکھا جائے گا کہ وہ میرے نزدیک روح ہیں حدیث کی۔ یہ اس لئے کہ محکمات کا تعلق احکام سے ہے جو انسانوں پر واجب ہیں، اور متشابہات معاملاتِ خداوندی کو بتلاتی ہیں، پس سمجھ لیا جائے کہ محکمات کا مرتبہ بمقابلہ متشابہات کیا ہے؟ وہی نسبت بھی نہ ہوگی جو قطرہ کو بحر سے ہے، اور ادعیہ اس لئے حدیث کی روح ہیں کہ وہ رب کی معرفت کراتی ہیں۔ اور احکام تو دنیا کی زندگی تک کے لئے ہیں، لیکن ادعیہ جنت میں بھی جاری رہیں گی، پس سمجھ لو کہ فانی اور باقی میں کتنا فرق ہے؟!

نیز فرمایا کہ دعا بعد نافلہ اجتماعی طور سے ماثور ہے حضور علیہ السلام سے، پس بعد فریضہ بھی اس سے ملحق ہوگی، اور ہاتھ اٹھا کر مانگنا بھی مستحب ہے، پھر رہا سوال مواظبت کا تو وہ تو تمام ہی مستحباب میں ہوتی ہے کہ کوئی بات حضور علیہ السلام سے ایک یا دو بار ثابت ہوئی تو امت اس پر مواظبت اختیار کر لیتی ہے اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ باقی ایسا التزام کہ اس کے تارک کو منسوب بہ بدعت کریں یا ملامت کریں تو یہ بدعت ہوگا۔

حافظ ابن تیمیہ وابن القیم نے دعا بعد الصلوٰۃ کو بدعت کہا ہے، اور یہ خیال نہ کیا کہ جس فعل کی اصل شارع سے ثابت ہو وہ بدعت نہ ہوگی۔ (افسوس ہے کہ ایسے ہی تشددات کو ان دونوں کی وجہ سے علماء نجدیہ نے اختیار کر لیا ہے۔)

آیۃ الکرسی بعد الصلوٰۃ کا حکم

بیہقی میں یہ حدیث مروی ہے، جس میں ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھنے کی فضیلت ہے، مرعاۃ ص ۱/ ۷۲۷ میں لکھا کہ اس حدیث کا پہلا حصہ نسائی طبرانی وابن حبان میں بھی ہے، اور حافظ نے بلوغ المرام میں لکھا کہ یہ روایت نسائی میں ہے اور اس کی تصحیح ابن حبان نے کی ہے۔

محدث منذری نے کہا کہ اس حدیث کی روایت نسائی اور طبرانی نے متعدد اسانید سے کی ہے جن میں سے ایک صحیح کے درجہ میں ہے اور شیخ ابوالحسن نے کہا کہ وہ روایت شرطِ بخاری پر ہے، علامہ شوکانی نے بھی دوسری روایات موید کی وجہ سے اس کو قوی کہا ہے۔ الخ (مرعاۃ)

حافظ ابن تیمیہ کا انکار

آپ کے فتاویٰ ص ۱/ ۱۸۶ میں ہے کہ قراءۃ آیۃ الکرسی بعد الصلوٰۃ کی حدیث ضعیف ہے، اسی لئے اس کی روایت کسی نے اہلِ کتب معتمدہ میں سے نہیں کی ہے لہٰذا اس سے حکم شرعی ثابت نہیں ہوسکتا، پھر ص ۱/ ۱۸۸ میں بھی لکھا کہ یہ روایت ایسی سند سے ہے کہ اس سے سنت ہونا ثابت نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک صحیح حدیث کو ترک کرنا دین کو ڈھانا ہے۔

لہٰذا اب خیال کیا جائے کیا نسائی بھی اصحابِ کتب معتمدہ میں سے نہیں ہیں؟ اور جب خود ابن تیمیہ کو ضرورت ہوئی ہے تو کیا اسی قسم کی احادیث سے انہوں نے کتنی ہی جگہ استدلال نہیں کیا ہے؟ اور جب انہوں نے احادیث توسل کو بھی اسی طرح رد کرنا چاہا تو کیا علامہ شوکانی وغیرہ نے ہی ان کا رد نہیں کیا ہے؟ اور خود حافظ ابن تیمیہ وابن القیم نے ابوداؤد کی حدیث شاذ ومنکر او عال والی سے تو عقیدہ بھی ثابت کر دیا ہے اور یہاں نسائی وغیرہ کی حدیث سے آیۃ الکرسی پڑھنے کی سنیت بھی ثابت ہونے کو غیر ممکن بتلا رہے ہیں۔ **فیاللعجب!!**

مجموعی ادعیہ واوراد پڑھنے کا مسئلہ

اوپر ہم نے ذکر کیا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے حضور علیہ السلام سے مرویہ ادعیہ بہ اوقاتِ مختلفہ کو ہر طرح سے پڑھنا درست فرمایا، خواہ سب کو ایک ساتھ پڑھے یا منتشر اوقات میں۔ اور اس سلسلہ میں کتاب الاذکار نووی اور حصن حصین جزری وغیرہ کا بھی ذکر فرمایا، مگر ہمارے سلفی بھائی ادعیہ واوراد کے مجموعوں کا پڑھنا بھی بدعت بتلاتے ہیں، چنانچہ ۱۹۳۷ء میں جب احقر اور مولانا بنوریؒ حج پر گئے اور وہاں سے مصر گئے تھے، تو دیکھا تھا کہ سعودی حکومت کے موظفین **ھیئتہ الامر بالمعروف والنھی عن المنکر** والے حرم شریف میں مناجاتِ مقبول اور الحزب الاعظم کسی کو پڑھتے دیکھتے تھے تو ان کتابوں کو چھین لیتے تھے اور ضبط کر لیتے تھے تاکہ پھر ایسی بدعت کا ارتکاب نہ کریں، ہم نے اس بارے میں بھی ان کے شیخ سلیمان الصنیعؒ سے متعدد بار تبادلۂ خیالات کیا تو وہ اس سے متاثر سے تھے، اور ان لوگوں کی اس حرکت کو تشدد اور جہل پر محمول کرتے تھے، اور انہوں نے نجدیوں کے بہت سے تفردات وتشددات کے بارے میں یہی کہا تھا وہ ایک بڑے وسیع النظر، وسیع الحوصلہ اعتدال پسند اور متبحر عالم تھے، **وما وجدنا مثلہ فی علماء النجد الی الآن**۔ معلوم ہوا کہ ایک دفعہ مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم

نے بھی جو اسلامی جماعت اور نجدیت سے متاثر تھے اپنے استاذ محترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کو حرم شریف ہی میں مناجات مقبول پڑھنے پر ٹوکا تھا اور اس کو بدعت کہا تھا اس وقت حضرت سید صاحبؒ بہ لحاظِ ادب حرم شریف خاموش ہو گئے تھے۔ اور بحث سے اجتناب کیا تھا، مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ایسی اوراد و ادعیہ کی مجموعاتِ کتب کو اب تک بھی سعودی نجدی علماء اپنے متبوعین کے اتباع میں خلافِ سنت ہی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ مستحبات پر مواظبت کو بھی بدعت بتلا گئے اور حضور علیہ السلام سے جو امور احیاناً صادر ہوئے ہیں، اس سے زیادہ کرنے کو بھی بدعت سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ ماثورہ عبادات کے اکثار کو بھی خلافِ سنت خیال کرتے ہیں۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے وہی بات اوپر صاف کردی ہے جو سارے اسلاف سے منقول ہے کہ جس امر کی اصل شارع علیہ السلام کے قول و فعل میں مل جائے خواہ وہ ایک یا دوبار ہی ہو، وہ مستحب کا درجہ لے لیتی ہے اور اس پر مواظبت و مداومت جائز ہے، اور ایسے کسی فعل کو بدعت یا خلافِ سنت کہنا خود ہی بدعت ہے۔ البتہ مواظبت کرنے والا اس کو مستحب سے زیادہ نہ سمجھے، اور نہ کرنے والے پر نکیر نہ کرے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ارشاد

''میرا مسلک اہل نجد کے بارے میں سکوت ہے، کیونکہ ان کے بارے میں اب تک صحیح معلومات حاصل نہیں ہیں، البتہ ان کے جو مسائل مجھ کو معلوم ہیں ان میں سے بعض میں ان کے ساتھ مجھ کو سخت اختلاف ہے جیسے مفہوم شرک میں غلو، اور جیسے توسل میں یا شدِ رحال میں تشدد، یا طلقاتِ ثلاثہ کا ایک ہونا، مگر ان کے رد کے وقت میں بھی سخت الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ (بوادر النوادر ص ۶۲)

لمحۂ فکریہ

یہاں جبکہ فرقِ سنت و بدعت کی غامض ترین بحث چلی تو اس امر کو بھی اپنے ذہن میں رکھیں کہ ان ہی حافظ ابن تیمیہ و ابن القیم کی وصیت کے مطابق سلفی حضرات نے مصر میں دارمی سنجری کی کتاب النقض اور شیخ عبداللہ بن الامام احمد کی طرف منسوب کتاب السنہ اور کتاب التوحید لابن خزیمہ طبع کرا کر شائع کیں، جن میں عقائد سلف کے خلاف بہ کثرت چیزیں مذکور ہیں، کیا ان سب کے لئے ہماری سلفی حضرات احادیث صحیحہ قویہ پیش کر سکتے ہیں، حالانکہ ضرورت تو اثباتِ عقائد کے لئے ان سے بھی زیادہ قوی دلائل و براہین کی ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقالاتِ کوثری ص ۲۸۰ تا ص ۳۳۲) ان کتابوں میں حق تعالیٰ کے لئے اثبات حد، مکان اور جہت کا بھی ہے، عقیدۂ تجسم کا بھی اقرار ہے۔ حق تعالیٰ کے جلوس علی الکرسی کا بھی ذکر ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ عرش پر اپنے پاس حضور علیہ السلام کو بٹھائیں گے، ثمانیہ اوعال اور اطیط عرش لاجلہ سبحانہ کی منکر و شاذ احادیث بھی ثبوت میں پیش کی گئی ہیں اور علامہ ابن قیمؒ نے اپنی مشہور کتاب سیرت زاد المعاد میں ایک طویل حدیث منکر و شاذ پیش کی ہے، جس میں حق تعالیٰ شانہ کے لئے طواف فی الارض کا بھی ذکر ہے، جس پر اکابر محدثین نے سخت تنقید و جرح کی ہے۔ ایسی احادیث عقائد و اصول ثابت کرنے کے لئے خود پیش کرتے ہیں اور زیارت و توسل اور کلماتِ درود شریف اور دعاء بعد الصلوٰۃ وغیرہ بے شمار مسائل میں احادیث ثابتہ کو گرانے کی سعی کرتے ہیں۔ والی اللہ المشتکی۔

نماز کے درود شریف میں سیدنا کا استعمال

اعلاء السنن ص ۳/ ۱۶۸ میں حضرت ابن مسعودؓ کا ارشاد مروی ہے کہ جب تم رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھو تو بہت اچھے الفاظ میں پڑھو، کیونکہ وہ حضور پر پیش ہوگا لہٰذا کہو اللھم اجعل صلواتک ورحمتک برکاتہ علی سید المرسلین و امام المتقین وخاتم النبیین محمد عبدک ورسولک امام الخیر الخ (رواہ ابن ماجہ) محدث شیخ مغلطائی نے اس حدیث کو صحیح کہا اور حافظ

نے فتح الباری میں ابن القیم سے نقل کیا کہ اس حدیث کی تخریج ابن ماجہ نے قوی سند سے کی ہے۔ پھر ص ۱۷۱/۳ میں لکھا اسنوی نے کہا کہ لفظ محمد سے قبل سیدنا کی زیادتی اکثر درود پڑھنے والوں سے مشہور ہوئی ہے تاہم اس کے افضل قرار دینے میں نظر ہے، اور ابن عبدالسلام نے اس کو بابِ سلوک ادب سے شمار کیا، اور کہا کہ طریقِ ادب کا اختیار کرنا امتثالِ امر سے بھی زیادہ محبوب ہوتا ہے، جس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ادب کی رعایت کی بہ نسبت امتثال امر نبوی کے جو نماز میں اپنی جگہ ثابت رہنے کے لئے تھا، اور حضرت علیؓ نے محمد اسم مبارک کے لئے حضور علیہ السلام کے ارشاد کی تعمیل نہ کی کہ اس کو خلافِ ادب نبوی سمجھا۔ اوجز ص ۱۵۷/۲ میں بھی اچھی بحث ہے، جس میں در مختار کے حوالہ سے زیادتی لفظِ سیادۃ کو مندوب کہا، اور رملی شافعی وغیرہ سے بھی نقل کیا کہ اس کی زیادتی بہ نسبت ترک کے افضل ہے، اس پر انوار الباری میں پہلے بھی کچھ آچکا ہے۔ اور وجہ تکرار یہ بھی ہے: الکلام اذاتکرر علے اللسان تقرر فی القلب.

دلائل الخیرات وقصیدۂ بوصیری رحمہ اللہ

علامہ کوثریؒ کے زمانہ میں بعض سلفی حضرات نے ان دونوں پر بھی نقد کیا تھا، کہ ان میں توسل ہے، جو شرک ہے، اس کا جواب علامہ نے مفصل و مدلل دیا تھا۔ ملاحظہ ہو مقالات کوثری ص ۳۷۲ تا ص ۳۹۷، اس میں علامہ نے بوصیریؒ کے شعر "ومن علومک علم اللوح والقلم" کے نقد پر جواب دیا ہے کہ حق تعالیٰ کا سارا علمِ غیب اور سارا علم صرف لوح میں محصور نہیں ہے تاکہ علمِ غیب کی نفی سے علم بمافی اللوح کی بھی نفی لازم ہو جائے، اور بتلایا کہ حضور علیہ السلام سے نفی علم غیب کا مطلب نفی جمیع علمِ غیب کی ہے، بعض کی نفی نہیں ہے، اور جبکہ وہ بھی ذاتی نہیں بلکہ عطیۂ خداوندی ہے، اور اس کی تحقیق علامہ سعد نے شرح المقاصد میں کردی ہے۔ علامہ نے اس کے ذیل میں "توسل کی بھی مکمل بحث کردی؟ جو لائق مطالعہ ہے۔

بعض کلماتِ درود شریف کا حکم

حافظ ابن تیمیہؒ سے سوال کیا گیا کہ درود میں حتی لا یبقی من صلاتک شئی وغیرہ کہنا کیسا ہے؟ اس کا جواب آپ نے دیا کہ "یہ دعا سلف میں سے کسی سے منقول نہیں ہے، پھر اگر اس سے مراد یہ ہو کہ حق تعالیٰ کے پاس جتنی بھی صلوات برکات اور رحمتیں ہیں وہ سب حضور کو دیدیں اور اللہ کے پاس کچھ باقی نہ رہے تو یہ جہالت ہے، کیونکہ ما عند اللہ من الخیر ختم نہیں ہوسکتیں۔ اور اگر اس کا یہ خیال ہے کہ اس کی دعا مذکور کی وجہ سے اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام کو وہ سب کچھ دیدے گا، تو یہ بھی جہالت ہے۔ کیونکہ اس کی دعا اس کے لئے سبب نہیں بن سکتی۔ (فتاویٰ ص ۱۹۹/۱)

علامہ نے اس دعا کا تیسرا مطلب نظر انداز کر دیا جو مقصود و مراد اور جائز بھی تھا وہ یہ کہ حضور علیہ السلام کے لئے وہ اتنی زیادہ رحمتوں اور برکتوں کی درخواست کر رہا ہے جو بے شمار ہوں اور کسی حد پر ختم ہونے والی نہ ہوں اور ازل میں تو خدا کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔ مگر آخرت میں تو سب کی زندگی بھی ہمیشہ کے لئے ہوگی اور وہاں کی نعمتیں، رحمتیں اور برکات بھی اس کے فضل و کرم سے ہمیشہ کے لئے ابدی اور لاتقف عند حد ہوں گی۔ پھر ان کے مانگنے میں اور وہ بھی حضور اکرم سردارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے کیا مانع ہے؟

پھر حیرت ہے کہ یہ ممانعت کی بات بھی ان کی طرف سے پیش کی جارہی ہے جو حسب تحقیق حافظ ابن حجرؒ حوادث لا اول اور قدیم عرش وقدمِ عالم کے ازل کے اعتبار سے بھی قائل ہیں جبکہ اس کا قائل جمہور سلف وخلف میں سے کوئی نہیں ہوا۔ واللہ المستعان۔

ہر عمل خیر بدعت نہیں ہے

آخر میں عرض ہے کہ ہر عمل خیر کی مواظبت پر بدعت کا حکم کرنا اور اسی طرح ہر بدعت کو شرک کا درجہ دے دینا حدودِ شرع سے تجاوز

ہے، ہم کسی بدعت کے ذرہ برابر بھی روادار نہیں۔ لیکن احادیث ثابتہ سے خواہ وہ ضعاف ہی ہوں، ثابت شدہ اعمالِ خیر کے تعامل اور مستحبات پر مداومت و مواظبت کو بدعت تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں، اسی طرح ہم تمام بدعات کے ارتکاب کو ناجائز اور غیر مشروع تو مانیں گے مگر ہر بدعت کو شرک نہیں کہہ سکتے، اسی لئے ہم اس دور میں اکابرِ دیوبند کے مسلک کو ارجح المسالک یقین کرتے ہیں۔ رحمھم اللہ تعالیٰ۔

آدابِ دعاء: ان کی تفصیل تو بہت ہے، ہم یہاں چند اہم امور نقل کرتے ہیں: حدیثِ صحیح میں ہے کہ حق تعالیٰ بندے کی ہر دعا قبول کرتے ہیں خواہ فوراً وہ مطلوب دیدیں یا آخرت کا ذخیرہ بنا دیں۔ بشرطیکہ وہ کسی گناہ کی بات یا قطع رحم کی درخواست نہ کرے۔ علامہ جزری مؤلف ''حصن حصین'' نے مندرجہ ذیل شروط و آداب لکھے۔ (۱) حرام غذا ولباس اور ناجائز کمائی سے اجتناب (۲) اخلاص (۳) دعا سے پہلے کوئی عملِ صالح نماز وغیرہ (۴) شدائد و مصائب کے وقت خدا کو یاد کرنا (۵) طہارت وضو وغیرہ (۶) استقبال قبلہ (۷) حمد وثناء خداوندی اول و آخر (۸) درود شریف اول و آخر۔ (۹) ہاتھوں کو پھیلانا مونڈھوں تک (۱۰) ادب و خشوع عاجزی وغیرہ (۱۱) دعا کے وقت آسمان کی طرف نگاہ نہ اٹھانا (۱۲) حق تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور صفاتِ عالیہ کے ساتھ سوال کرنا وغیرہ (اوجز ص ۱/۵۶)

حضرت تھانویؒ کی مناجاتِ مقبول کے شروع میں بھی آداب ذکر ہوئے ہیں۔ جن میں یہ بھی ہیں (۱۳) دعا کے وقت انبیاء علیہم السلام اور دوسرے مقبول و صالح بندوں کے ساتھ توسل کرنا کہ یا اللہ! ان بزرگوں کے طفیل سے میری دعا قبول فرما۔ (بخاری) (۱۴) دعا میں آواز پست کرنا (صحاح ستہ) (۱۵) دعا کے بعد دونوں ہاتھ اپنے چہرہ پر پھیرنا (ابوداؤد) (۱۶) قبولیت دعا کے لئے جلدی نہ کرے (بخاری و مسلم) (۱۷) بار دعا کرنا (بخاری و مسلم) (۱۸) ایسی دعا کرنا جو اکثر حاجات دینی و دنیوی کو حاوی و شامل ہو (ابوداؤد) (۱۹) کسی امرِ محال و ناممکن کی دعا نہ کرے (بخاری) (۲۰) دعا کرنے والا بھی آخر میں آمین کہے اور سننے والا بھی (بخاری) اس سے اجتماعی دعا کا ثبوت و فضیلت بھی نکلتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تشریحات: **قوله ان ابن عباس اخبره** الخ اور دوسری حدیث میں **كنت اعرف انقضاء صلاته عليه السلام** الخ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ان روایات کے ظاہری الفاظ سے ابنِ حزم ظاہری نے نماز کے بعد بلند آواز سے تکبیر کہنے کو سنت کہا ہے، لیکن جمہور نے اس کو تسلیم نہیں کیا، پھر بعض نے یہ توجیہ کی کہ مراد تکبیراتِ انتقال ہیں کہ ان کے انقطاع سے میں سمجھ لیتا تھا کہ نماز ختم ہوگئی، بعض نے کہا کہ تسبیحِ فاطمہ مراد ہے کہ جب لوگ اس میں مشغول ہوتے تو میں سمجھ لیتا کہ نماز پوری ہو چکی۔ بعض نے کہا کہ نعرۂ تکبیر ہے۔ جو جہاد کے مواقع میں امراءِ لشکر اختیار کرتے تھے، میرے نزدیک دونوں حدیث چونکہ سنداً و متناً متحد ہیں، لہٰذا تکبیر سے مراد مطلقاً ذکر ہے، جیسا کہ حدیث اول میں ہے۔ اور خاص تکبیر مراد نہیں ہے۔ یہ مواضع مشکلہ میں سے ہے کہ امام بخاری جیسے امام حدیث کو بھی تعیینِ لفظ میں دشواری پیش آئی ہوگی، کیونکہ لفظِ تکبیر کی رعایت کریں تو لامحالا یہ اس کی سنیت کی دلیل ہوگی، اور اگر لفظِ ذکر کا خیال کریں تو وہ اس کے مناقض ہوگا۔

یہ ایسا ہی ہے کہ امام بخاری کو آمین والی حدیث میں بھی مشکل پیش آتی ہے، ایک لفظ میں **اذا امن القارى** آیا تو دوسری میں **اذا قال الامام غير المغضوب عليهم** وارد ہوا ہے اور امام بخاری فیصلہ نہ کر سکے تو ہر ایک حدیث پر اس کے مناسب ترجمہ و عنوان قائم کر دیا۔ لہٰذا کسی حدیث کے تغایرِ لفظین کے موقع پر یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ دونوں لفظ متبادل ہیں یا متصادق ہیں یا جامع ہیں تاکہ صورتِ عمل متعین ہو سکے۔ غرض یہاں پر میرے نزدیک اصل لفظِ حدیث تو ذکر ہے اور تکبیر کا لفظ راوی کی مسامحت ہے۔

جہرِ تکبیر وغیرہ کا حکم

حضرتؒ نے فرمایا کہ ان احادیث کے جہرِ تکبیر کو امام شافعیؒ نے تعلیم پر محمول کیا ہے، تو اسی طرح صاحبِ ہدایہ حنفی نے بھی تسمیہ کے جہر کو

تعلیم پر محمول کیا ہے اور برکلی و جرجانی نے آمین کے بارے میں بھی یہی کہا ہے۔

غرض اصل جملہ اذکارین اخفاء ہی ہے، اور جہر کی صورت احیانا ہوئی ہے کسی فائدہ یا داعیہ کے تحت، للہٰذا اس سے جہر کی سنیت ثابت نہ ہوگی، اس کا ثبوت جب ہوتا کہ حضور علیہ السلام کے اکثری عمل سے جہر ثابت ہوتا۔

اس کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے پاس تشہد و تسبیحات کے علاوہ تقریباً سب ہی اذکار و ادعیہ کے جہر کا ثبوت موجود ہے، حتیٰ کہ جہر آیت کا سری نماز میں بھی ہے، للہٰذا معلوم ہوا کہ عند الشرع جہر و اخفا کا معاملہ غیر اہم ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ جہر امین کرنے والا تو متبع سنت ہے اور اخفا کرنے والا مخالفِ سنت ہے، البتہ اس بارے میں مبالغہ آرائی کرنے والوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔

تسبیح فاطمہ

حضرتؒ نے فرمایا کہ اصل تسبیح فاطمہ تو وہ ہے جس کی تعلیم حضور علیہ السلام نے حضرت فاطمہؓ کو سونے کے وقت پڑھنے کی دی تھی وہ نمازوں کے بعد کی نہ تھی، پھر اس کو بھی تسبیحِ فاطمہ اس لئے کہنے لگے کہ دونوں کی نوعیت متحد ہے۔

پھر اس تسبیح کی تین صورتیں ماثور ہیں، تسبیح ۳۳ بار تحمید، ۳۳ بار اور تکبیر ۳۴ بار۔ دوسری صورت یہ کہ ہر ایک ۳۳ بار اور کلمۂ توحید ایک بار، تیسری یہ کہ یہ تینوں ۲۵، ۲۵ بار اور ان کے ساتھ کلمۂ توحید بھی ۲۵ بار مسلم شریف میں جو چوتھی صورت ذکر ہوئی وہ وہم راوی ہے، اور وہ مستقل صورت نہیں ہے۔

ذکرِ اہم تالیفات بابۃ دعاء بعد الصلوات

شروع میں ہم نے ذکر کیا تھا کہ امام بخاری دعاء بعد الصلوٰۃ کے قائل ہیں۔ چنانچہ اس کا باب کتاب الدعوات میں قائم کریں گے، اور اعلاء السنن للتھانوی، آثار السنن للنیموی واستجاب الدعوات عقیب: الصلوات للشیخ التھانویؒ (ذکر فیہا حدیث انس مرفوعاً عن ابن السنیؒ) وفضل الدعاء فی احادیث رفع الیدین فی الدعاء للسیوطیؒ، ان سب میں احادیث وآثار صحیحہ سے دعاء بعد الصلوٰۃ کا ثبوت دیا گیا ہے اور علامہ سیوطی نے آخر میں یہ بھی لکھا کہ ان سب دلائل سے ثابت ہوا کہ نمازوں کے بعد دعا چاروں مذاہب ائمہ میں مسنون و مشروع ہے، الابواب ص ۲/۳۰۴)

علامہ ابن تیمیہ کا تفرد

اس سے معلوم ہوا کہ اس بارے میں علامہ ابن تیمیہ وابن القیم نے جمہور سلف و خلف اور ائمہ اربعہ اکابر امت سب کے خلاف تفرد کر کے رائے اختیار کی ہے۔ حتیٰ کہ دورِ حاضر کے بڑے متبع ابن تیمیہ وابن القیم سلفی عالم صاحبِ تحفۃ الاحوذی نے بھی ان دونوں کے خلاف جوازِ دعاء برفع الیدین بعد الصلوٰۃ کو تسلیم کر لیا ہے۔ کما ذکرناہ سابقا.

بَابٌ یَسْتَقْبِلُ الْاِمَامُ النَّاسَ اِذَا سَلَّمَ (امام لوگوں کی طرف منہ کر لے، جب سلام پھیرے۔

۸۰۲. حَدَّثَنَا مُوْسٰی بْنُ اِسْمٰعِیْلَ قَالَ ثَنَا جَرِیْرُ بْنُ حَازِمٍ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْرَجَآءٍ عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰی صَلٰوةً اَقْبَلَ عَلَیْنَا بِوَجْهِهٖ.

۸۰۳. حَدَّثَنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِکٍ عَنْ صَالِحِ بْنِ کَیْسَانَ عَنْ عُبَیْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ زَیْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِیِّ اَنَّهٗ قَالَ صَلّٰی لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةَ الصُّبْحِ بِالْحُدَیْبِیَةِ عَلٰی اِثْرِ سَمَآءٍ کَانَتْ مِنَ اللَّیْلِ فَلَمَّا انْصَرَفَ اَقْبَلَ عَلَی النَّاسِ فَقَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَاذَا قَالَ رَبُّکُمْ عَزَّوَجَلَّ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ اَصْبَحَ مِنْ عِبَادِیْ مُؤْمِنٌ بِیْ وَکَافِرٌ فَاَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهٖ فَذٰلِکَ

مُؤْمِنٌ بِیْ وَ كَافِرٌ بِالْكَوَاكِبِ وَاَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَ كَذَا فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِیْ وَمُؤْمِنٌ بِالْكَوَاكِبِ.

۸۰۴. حَدَّثَنَا عَبْدُاللهِ بْنُ مُنِيْرٍ سَمِعَ يَزِيْدَ بْنُ هَارُوْنَ قَالَ اَخْبَرَنَا حُمَيْدٌ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ اَخَّرَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلٰوةَ ذَاتَ لَيْلَةٍ اِلٰى شَطْرِ اللَّيْلِ ثُمَّ خَرَجَ عَلَيْنَا فَلَمَّا صَلّٰى اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ اِنَّ النَّاسَ قَدْ صَلُّوْا وَرَقَدُوْا وَاِنَّكُمْ لَنْ تَزَالُوْا فِیْ صَلٰوةٍ مَا انْتَظَرْتُمُ الصَّلٰوةَ.

ترجمہ۸۰۲۔ابورجاء سمرہ بن جندبؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خداﷺ جب نماز پڑھ چکتے تھے، تو اپنا منہ ہماری طرف کر لیتے تھے۔

ترجمہ۸۰۳۔ حضرت زید بن خالد جہنیؓ روایت کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہﷺ نے حدیبیہ میں بارش کے بعد جو شب میں ہوئی تھی، صبح کی نماز پڑھائی، جب آپ (نماز سے) فارغ ہوئے۔ تو لوگوں کی طرف اپنا منہ کر کے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ تمہارے پروردگار عزوجل نے کیا فرمایا ہے، وہ بولے کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے (آپ نے فرمایا کہ) اس نے یہ ارشاد فرمایا ہے، کہ میرے بندوں میں کچھ لوگ مومن بنے، اور کچھ کافر تو جنہوں نے کہا کہ ہم پر اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی، تو ایسے لوگ مومن ہیں ستاروں (وغیرہ) کے منکر ہوئے، لیکن جنہوں نے کہا، کہ ہم پر فلاں ستارے کے سبب سے بارش ہوئی، وہ میرے منکر بنے، اور ستاروں پر ایمان رکھا۔

ترجمہ۸۰۴۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت ہیں کہ ایک شب رسولِ خداﷺ نے (عشاء کی) نماز میں نصف شب تک تاخیر کر دی، اس کے بعد تشریف لائے، پھر جب نماز پڑھ چکے تو آپ نے ہماری طرف منہ کر لیا، اور فرمایا کہ لوگ نماز پڑھ کر سو رہے اور تم برابر نماز میں رہے، جب تک کہ تم نے نماز کا انتظار کیا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: انصراف کے معنی پھرنے اور جانے کے ہیں، یعنی نماز کے بعد قبلہ کی طرف سے پھر کر اپنی ضرورتوں کے لئے دائیں یا بائیں جانب کو چلے جانا، جیسا کہ محدثین کبار نے اس کو سمجھا ہے، کیونکہ ان کی اکثری عادت یہی رہی کہ وہ نماز کے بعد کسی طرف کو چلے جاتے تھے، اور یہی بات اکابر میں سے امام شافعی و امام بخاری وغیرہ نے بھی سمجھی ہے، دیکھو شرح المہذب ص ۳/۴۹۰، عمدہ ص ۳/۲۱۳، وفتح الباری ص ۲/۲۸۰، ترمذی میں حضرت علیؓ سے بھی یہی مراد متعین ہوئی ہے، آپ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا معمولِ مبارک تھا کہ نماز کے بعد اگر دائیں جانب آپ کی کوئی ضرورت ہوتی تو اُدھر کو تشریف لے جاتے تھے اور بائیں طرف ہوتی تو اس کو اختیار فرماتے تھے، مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱/۳۰۵ میں حضرت علیؓ کے یہ الفاظ مروی ہیں کہ جب نماز ختم ہو جائے اور تمہیں کوئی ضرورت دائیں جانب ہو یا بائیں طرف تو تم اپنی ضرورت کی جانب جانے کو اختیار کرو۔ اور ابوداؤد باب کیف الانصراف من الصلوٰۃ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ اس میں حدیث ابن مسعود" لا یجعل احدکم نصیبا للشیطان من صلوته وارد ہے، اور اس میں راوی حدیث حضرت عمارؓ کا قول بھی ہے کہ میں نے مدینہ طیبہ میں دیکھا کہ حضورِ اکرمﷺ کے بیوتِ مبارکہ مسجد نبوی کے بائیں جانب تھے، اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کا انصراف بیوتِ مبارکہ کی طرف ہوتا تھا۔

اسی لئے حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے تھی کہ اس باب میں احادیثِ واردہ سے غرض یہی معلوم ہوتی ہے کہ سنت نبویہ یہ ہے کہ امام نماز کے بعد یا تو قوم کی طرف توجہ کرے، یا اپنی ضرورت کی جانب رُخ کر لے یا اپنے گھر کی طرف دائیں یا بائیں طرف جائے۔ اور امام بخاریؒ نے بھی " باب الانفتال والانصراف عن الیمین والشمال " سے یہی ارادہ کیا ہے، انفتال سے اشارہ قوم کی طرف مڑ کر متوجہ ہونے کی طرف ہے۔ اور انصراف اپنی ضرورت کے مطابق سمت میں جانے کی جانب ہے، اور حافظ نے ابن المنیر سے بھی یہی نقل کیا ہے (یہ باب قریب ہی بخاری میں آرہا ہے)۔

بخاری کی پہلی حدیث الباب حضرت سمرہؓ والی سے اشارہ پہلی بات کی طرف ہے کہ کبھی آپ قوم کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور دوسری حدیثِ خالدؓ اور تیسری حدیثِ انسؓ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، اور حدیثِ علی عند الترمذی سے دوسری بات نکلتی ہے۔ (یعنی حاجت

کے مطابق سمت میں جانا) اور حدیث باب ترمذی اور حدیث عبداللہ بن مسعودؓ بخاری و مسلم وغیرہما، اور حدیث انس مسلم سے تیسری بات ثابت ہوتی ہے کہ اپنے بیت کو دائیں یا بائیں جائے۔

پھر حدیثِ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اکثر انصراف بائیں جانب معلوم ہوا، اور حدیثِ انس سے اکثر یمین کی طرف آیا، تو اس میں ترجیح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کو ہے کہ وہ اعلم و اسن و اکثر متابعة للنبی علیه السلام تھے۔ اور روایت انس میں ایک راوی متکلم فیہ بھی ہے جبکہ حدیثِ ابن مسعود بخاری و مسلم دونوں کی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ تحقیق منقح شکل میں معارف السنن ص ۳/ ۱۲۵ میں ذکر کی گئی ہے اور اس کے بعد ص ۳/ ۱۲۷ میں علامہ بنوریؒ نے لکھا کہ غرض حدیث وہی معلوم ہوتی ہے جو حضرت شیخ نے متعین کی ہے۔ لیکن اگر امام کسی ضرورت کے لئے نہ جائے، اور لوگوں کی طرف متوجہ ہونا چاہے تو بظاہر بہتر یہ ہے کہ داہنی جانب مڑ کر بیٹھے، اس لئے نہیں کہ احادیث الباب کا منشاوہ ہے (کیونکہ وہ تو اوپر متعین ہو چکا) بلکہ صرف اس لئے کہ تیامن ہر عمل صالح کے اندر مستحب ہے اور شاید یہی مقصد علامہ طیبیؒ کا بھی ہے اور اس طرح فقہاءِ حنفیہ اور دوسرے علماء کے اختیارِ جانب یمین کا بھی محمل حسن بن جاتا ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ مولانا بنوریؒ نے تقریب مذکور کی صورت اچھی نکالی ہے، مگر میں جہاں تک سمجھا ہوں اور حضرت شاہ صاحبؒ کے درسِ بخاری شریف کے دونوں سال کی یادداشتیں بھی اس وقت سامنے ہیں، حضرتؒ اس بارے میں نرم نہ تھے اور فرماتے تھے کہ امام بخاریؒ نے اس معنی پر جزم کیا ہے اور امام محمدؒ کی مبسوط (جوزجانی) میں اسی کی صراحت موجود ہے اس عبارت کی نقل میرے پاس موجود ہے۔ لہٰذا تیامن و تیاسر جو ہمارے زمانہ میں معمول بن گیا ہے، اس کا استناد سنت نبویہ سے کسی طرح درست نہیں ہے، کیونکہ وہ انصراف الی الحاجة یا الی البیت تھا، جلوس بعد الصلوٰة کیلئے نہ تھا جیسا کہ حضرت علیؓ سے بھی اسی کی صراحت ہے اور حدیثِ براء (ابی داؤد) کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ کو یہ محبوب تھا کہ پہلے سلام پر پہلی نظر حضور علیہ السلام کی ان پر پڑے، نہ یہ کہ حضور علیہ السلام ان کی طرف نماز کے بعد رُخ کر کے بیٹھتے تھے۔

درحقیقت بعض متاخرین کی عبارات سے یہ مغالطہ ہوا ہے، حالانکہ انہوں نے صرف جوازِ فقہی بتلایا تھا جس کو غلطی سے بیان سنت پر محمول کر لیا گیا۔ پس اگر اتباعِ سنت مقصود ہے تو سنت استقبال میں ہے اور اگر جواز چاہئے تو جیسے چاہو کرو۔

نطقِ انور: مسئلہ زیرِ بحث پر کلام کرتے ہوئے حضرتؒ نے زمانہ صدارت دارالعلوم دیوبند کا واقعہ ذکر کیا کہ میں نے یہی اپنی بات پیش کی تو قاری محمد طیب نے پوچھا تھا کہ عمل یوں کیوں ہوتا ہے؟ میں نے کہا: تصویر کا بہتر رخ سامنے کیا جاتا ہے، پھر انہوں نے میاں صاحب سے (مولانا سید اصغر حسینؒ جو اس زمانہ میں ابوداؤد شریف پڑھایا کرتے تھے، پوچھا تو انہوں نے میری تغلیط کی اور کہا کہ حدیث میں صحابہ سے منقول ہے کہ ہم دائیں جانب نماز پڑھتے تھے تاکہ ہم پر حضور علیہ السلام کی نظر پڑے، میں نے کہا اس کا یہ مطلب غلط ہے کہ یمین کی طرف کو بیٹھتے تھے۔

مراقی الفلاح وغیرہ کتب فقہ میں جواز لکھا ہے، وہ متقدمین سے نقل نہیں ہے، پھر میں نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی اس کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ ایک بار حضرت تھانوی دیوبند تشریف لائے اور دو تین روز قیام فرمایا۔ کسی طالب علم نے اسی مسئلہ کو چھیڑ دیا اور مولانا نے مشہور پر جمود کیا، اُس طالب علم نے میری تقریر ترمذی کے ذریعہ مولانا کو مفحم کر دیا۔ پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ حضرت علیؓ زیادہ سمجھ والے ہیں یا میاں صاحب اور حضرت تھانوی۔ رحمهم الله رحمة واسعة. اولئک آبائی فجئنی بمثلہم۔

فائدہ: "مبسوط" امام محمدؒ کی ابتدائی اور نہایت جلیل القدر تالیف ہے اور اسی لئے اس کو کتاب الاصل بھی کہتے ہیں اسی کو امام شافعی نے حفظ کیا تھا۔ اس میں دسیوں ہزار مسائل حرام و حلال کے ہیں، بروایتِ علامہ جوزِجانی م بعد ۳۰۰ھ تلمیذ امام محمدؒ مرتب ہوئی ہے۔ ۶ ضخیم جلدوں میں ہے۔ ہر جلد میں پانچ سو ورق ہیں۔ مکمل حالات علامہ کوثری کی بلوغ الامانی میں ہیں۔ (ص ۶۲/ ۶۱) امام محمد کی اسی کتاب کو پڑھ کر ایک بڑا عیسائی

عالم مسلمان ہو گیا تھا، اس نے کہا کہ یہ تمہارے چھوٹے محمد کی کتاب ہے تو تمہارے بڑے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی کتاب کیسی کچھ ہوگی؟!

بحث تاثیراتِ نجوم

حدیث الباب میں مطرنا بنوء کذا پر حضرت شاہ صاحبؒ نے مفصل تبصرہ فرمایا جو پیش کیا جاتا ہے، آپ کی تحقیق یہ تھی کہ نجوم کی تاثیرات بہ لحاظِ سعادت ونحوست بالکل نہیں ہیں، اور فرماتے تھے کہ نہ اس کا ثبوت نقل سے ہے نہ عقل سے اور نہ تجربہ سے البتہ ان کے آثار طبیعیہ ہیں، مثلاً موسموں کی تبدیلی، بارشیں، یا حرارت و برودت وغیرہ مگر امام غزالی اور شاہ ولی اللہؒ نے دوسری تاثیرات کا بھی کچھ اقرار کیا ہے، بہر حال! میں ان کا بالکل انکار کرتا ہوں اور میرے نزدیک سعادت ونحوست کچھ نہیں ہے۔ پھر فرمایا کہ اس سلسلہ میں اور بھی کئی بحثیں چھڑ گئی ہیں، وہ قابلِ ذکر ہیں۔

خواصِ اشیاء کا مسئلہ

علامہ اشعری سے روح المعانی میں نقل ہوا کہ اشیاء میں آثار وخواص بالذات موجود نہیں ہیں، لہٰذا اگر کوئی کہے کہ آگ بالذات خود ہی محرق ہے تو وہ کافر ہو گیا، میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کہنے والے کی نیت معلوم کریں گے، اگر وہ بالذات احراق کا معتقد ہوگا تو کافر کہیں گے۔ ورنہ بطورِ عادت مانتا ہوگا تو کافر نہ ہوگا۔ ماتریدیہ کا مذہب یہ ہے کہ اشیاء میں آثار وخواص تو ہیں مگر ان کی تاثیر اذنِ خداوندی پر موقوف ہوتی ہے، (جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اذنِ خداوندی نہ ہونے کی وجہ سے آگ نہ جلا سکی) پھر فرمایا کہ ماتریدیہ نے جو کہا اس سے بہتر قول باعتبارِ شرع نہیں ہو سکتا، اور اس کی وجہ بھی دوسرا حسب ذیل مسئلہ ہے۔

سلسلۃ العلل کا مسئلہ

فرمایا: بحر العلوم نے شرح مثنوی میں لکھا ہے کہ جب سلسلہ معلومات وعلل کا ہو تو عقلاً مختلف ہیں اس میں کہ وجودِ معلول کے لئے علتِ اولی موثر ہے اور باقی علل بطور شرائط ہیں یا علت قریبہ یا دونوں کا مجموعہ۔ معتزلہ علت موثرہ قریبہ کو بتلاتے ہیں اور فلاسفہ کے نزدیک مجموعۂ سلسلہ موثر وموجب ہے۔ اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک علتِ موثرہ فقط علتِ اولی ہے، لہٰذا سارے عالم کون میں حق تعالیٰ ہی موثر ہیں اور باقی امور بطور شرائط ہیں۔ اسی کو ماتریدیہ نے اختیار کیا ہے۔ اور اس کی بہتر تعبیر فاعل ومفعول سے ہے کہ فاعل مختار ہوتا ہے نہ کہ علت ومعلول سے۔

توحید افعال کا مسئلہ

حضرت نے فرمایا کہ یہ کتبِ کلامیہ کا سب سے زیادہ مشکل مسئلہ ہے، لیکن توحید افعال کے نام سے یہ مسئلہ شیخ اکبر یا صدر شیرازی کے کلام میں ملے گا۔ بعض نے کہا کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں، اس میں اصلِ فعل تو خالق کا ہے لیکن اس سے متصف بندہ ہوتا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ خدا خالق اور بندہ کاسب ہے۔ صدر شیرازی اور ابن رشد مغالطہ میں پڑ گئے کہ کیسے فیصلہ کریں، میں نے بعض تحریروں میں کچھ وضاحت کی ہے۔ باقی علامہ دوانی[1] نے شرح عقائد جلالی میں جو قدرتیں سے افعال کا صدور لکھا ہے، وہ محض باطل ہے، کیونکہ مجموعہ تو جب ہی بنتا ہے کہ دونوں بذاتہ متقوم ہوں، اور یہاں عبد کا تقوم ہی نہیں ہے بغیر باری تعالیٰ کے، پھر میں نے دوانی کا دوسرا قلمی رسالہ دیکھا تو اس سے اندازہ ہوا کہ مسئلہ کو کچھ سمجھے ہیں اور میرا گمان ہے کہ انہوں نے شیخ اکبر[2] کی کوئی چیز دیکھی ہوگی، اس کے بعد یہ رسالہ لکھا ہوگا جیسا کہ ان کے اس قول

---

[1] علامہ دوانی م ۹۱۸ھ کا تذکرہ فوائد جامعہ ص ۲۹۲ میں دیکھا جائے، وہ شافعی المذہب تھے، اور حدیث بھی پڑھی تھی، مگر اشتغال بالحدیث نہیں رہا۔ متعدد مفید تالیفات کیں۔ علوم عقلیہ کے ماہر تھے۔ نام محمد اور جلال الدین لقب تھا۔ (مؤلف)

[2] شیخ محمد بن علی بن محمد بن احمد بن عبداللہ الطائی (محی الدین ابن عربی) م ۶۳۸ھ شیخ اکبر کے عظیم لقب سے مشہور ہیں، اندلسی تھے، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سے اشارہ ملتا ہے کہ شمس مغرب سے نکلا ہے (شیخ اکبر کے متعلق)

افاداتِ عثمانی رحمہ اللہ: حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم ص ۱/۲۳۹ میں اسی حدیث الباب بخاری والی بروایتِ مسلم پر اکابر کے اقوال وافادات نقل کئے ہیں، اس میں فتح الباری ص ۲/۳۵۶ سے کچھ حصہ نقل ہوا ہے، اصل میں مطالعہ کیا جائے، ابن القیم اور شاہ ولی اللہؒ کے ارشادات بھی نقل ہوئے ہیں، اور آخر میں امام بخاری پر ایک اعتراض کا جواب بھی حافظؒ کی طرف سے نقل کیا ہے۔ (فتح الملہم ص ۱/۲۴۱)

نوء (نچھتر) کے بارے میں پوری تحقیق عمدۃ القاری ص ۳/۲۰۶ میں اور فتح الباری ص ۲/۳۵۶ میں دیکھی جائے۔

بَابُ مَكْثِ الْإِمَامِ فِيْ مُصَلَّاهُ بَعْدَ السَّلَامِ وَقَالَ لَنَا اٰدَمُ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ اَيُّوْبَ عَنْ نَافِعٍ قَالَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ يُصَلِّيْ فِيْ مَكَانِهِ الَّذِيْ صَلّٰى فِيْهِ الْفَرِيْضَةَ وَفَعَلَهُ الْقَاسِمُ وَيُذْكَرُ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَفَعَهُ لَا يَتَطَوَّعُ الْاِمَامُ فِيْ مَكَانِهِ وَلَمْ يَصِحَّ.

(امام کا سلام کے بعد اپنے مصلے پر ٹھہرنے کا بیان، اور ہم سے آدم نے بواسطۂ شعبہ، ایوب ونافع بیان کیا، کہ ابن عمر اسی مقام میں (نفل) نماز (بھی) پڑھتے تھے، جہاں فرض نماز پڑھتے تھے اور ایسا ہی قاسم نے بھی کیا ہے، البتہ ابو ہریرہ سے مرفوعاً منقول ہے کہ امام اپنے (اس) مقام میں! جہاں اس نے فرض نماز پڑھی ہے نفل نہ پڑھے، مگر یہ صحیح نہیں۔

۸۰۵. حَدَّثَنَا اَبُو الْوَلِيْدِ هِشَامُ بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ قَالَ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا الزُّهْرِيُّ عَنْ هِنْدٍ بِنْتِ الْحَارِثِ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا سَلَّمَ يَمْكُثُ فِيْ مَكَانِهِ يَسِيْرًا قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَنَرٰى وَاللّٰهُ اَعْلَمُ لِكَيْ يَنْفُذَ مَنْ يَّنْصَرِفُ مِنَ النِّسَآءِ وَقَالَ ابْنُ اَبِيْ مَرْيَمَ اَخْبَرَنَا نَافِعُ بْنُ يَزِيْدَ قَالَ حَدَّثَنِيْ جَعْفَرُ بْنُ رَبِيْعَةَ اَنَّ ابْنَ شِهَابٍ كَتَبَ اِلَيْهِ قَالَ حَدَّثَتْنِيْ هِنْدُ بِنْتُ الْحَارِثِ الْفِرَاسِيَّةُ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ مِنْ صَوَاحِبَاتِهَا قَالَتْ كَانَ يُسَلِّمُ فَيَنْصَرِفُ النِّسَآءُ فَيَدْخُلْنَ بُيُوْتَهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّنْصَرِفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ ابْنُ وَهْبٍ عَنْ يُوْنُسَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَخْبَرَتْنِيْ هِنْدُ الْفِرَاسِيَّةُ وَقَالَ عُثْمَانُ بْنُ عُمَرَ اَخْبَرَنَا يُوْنُسُ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ حَدَّثَتْنِيْ هِنْدُ الْقُرَشِيَّةُ وَقَالَ الزُّبَيْدِيُّ اَخْبَرَنِي الزُّهْرِيُّ اَنَّ هِنْدًا بِنْتَ الْحَارِثِ الْقُرَشِيَّةَ اَخْبَرَتْهُ وَكَانَتْ تَحْتَ مَعْبَدِ بْنِ الْمِقْدَادِ وَهُوَ حَلِيْفُ بَنِيْ زُهْرَةَ وَكَانَتْ تَدْخُلُ عَلٰى اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ حَدَّثَتْنِيْ هِنْدُ نِ الْقُرَشِيَّةُ وَقَالَ ابْنُ اَبِيْ عَتِيْقٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ هِنْدَ نِ الْفِرَاسِيَّةِ وَقَالَ اللَّيْثُ حَدَّثَنِيْ يَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ حَدَّثَهُ ابْنُ شِهَابٍ عَنِ امْرَأَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ حَدَّثَتْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

ترجمہ ۸۰۵: حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سلام پھیرنے کے بعد تھوڑی دیر اپنی جگہ پر ٹھہر جاتے تھے، ابن شہاب کہتے ہیں، کہ میں سمجھتا ہوں، واللہ اعلم (کہ آپ) اس لئے (ٹھہر جاتے تھے) کہ جو عورتیں نماز سے فراغت پائیں، وہ چلی جائیں، اور ابن ابی مریم کہتے ہیں کہ ہم کو نافع نے خبر دی۔ نافع کہتے ہیں کہ مجھ سے جعفر بن ربیعہ نے بیان کیا کہ مجھ کو ابن شہاب نے یہ لکھ بھیجا کہ مجھ سے ہند نے ام سلمہؓ زوجہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے (نقل کر کے) روایت کی (اور یہ ہند ام سلمہ کے پاس بیٹھنے والیوں میں سے تھیں) وہ کہتی ہیں کہ آپ سلام پھیر دیتے تھے تو (پہلے) عورتیں واپس ہو کر اپنے گھروں میں داخل ہو جاتی تھیں۔ اس سے پہلے کہ رسول خدا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) آخر میں سکونت دمشق میں رہی اور وہیں آپ کا مزار مرجع خواص وعوام ہے، آپ کی فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم وغیرہ تالیفات قیمہ مشہور ومعروف ہیں۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ ان کے مدارج عالیہ اور علوم وکمالات کا اکثر ذکر درس وغیرہ درس میں بھی کیا کرتے تھے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ (مؤلف)

صلے اللہ علیہ وسلم واپس ہوں، اور ابن وہب نے بواسطہ یونس ابن شہاب، ہند فراسیہ سے روایت کیا، عثمان بن عمرؓ نے بواسطہ یونس زہری ہند قریشیہ سے روایت کیا۔ زبیدی نے کہا کہ مجھ سے زہری نے بیان کیا، کہ ان سے ہند بنت حارث قرشیہ نے بیان کیا، اور وہ بنی زہرہ کے حلیف معبد بن مقداد کی بیوی تھیں۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے پاس آیا جایا کرتی تھیں۔ اور شعیب نے بواسطہ زہری، ہند قرشیہ سے روایت کیا، اور لیث نے کہا کہ مجھ سے یحیٰی بن سعید نے بیان کیا، ان سے ابن شہاب نے اور ابن شہاب نے قریش کی ایک عورت سے اور اس عورت نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ عہدِ نبوی میں اکثری سنت یہی تھی کہ فرائض کی بعد بغیر ٹھہرنے کے گھروں کو چلے جاتے تھے، اور صرف اتنا ٹھہرتے تھے کہ عورتیں پہلے مسجد سے نکل کر چلی جائیں تاکہ مردوں عورتوں کا اختلاط نہ ہو، عام طور سے لوگ ادعیہ واذ کار بھی اپنے اپنے طور پر پڑھ لیا کرتے تھے، موجودہ اجتماعی صورت سے یہ بات نہ تھی، بجز بعض مواقع کے۔ تفصیل پہلے آ چکی ہے۔

امام بخاری اس باب میں یہ بھی بتلانا چاہتے کہ جس جگہ فرض پڑھے ہیں اسی جگہ سنن ونوافل پڑھے جائیں یا نہیں؟ لہٰذا اشارہ کیا کہ جائز تو یہ بھی ہے کہ اسی جگہ پڑھ لے لیکن بہتر یہی ہے اور خاص طور سے امام کے لئے کہ وہ دوسری جگہ پڑھے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ نماز کے بارے میں سجدہ سہو یا اعادہ وغیرہ کی صورت بھی باقی نہیں رہی ہے اور نئے آنے والے بھی یقین کرلیں کہ جماعت ہو چکی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ سنن ونوافل کے لئے بہتر تو یہی ہے کہ گھر جا کر پڑھیں، مگر اس زمانہ میں امورِ دین میں تساہل زیادہ ہو گیا ہے، اس لئے ممکن ہے گھر جا کر دوسرے غیر اہم امور میں لگ کر سنن ونوافل سے غفلت ہو جائے، لہٰذا اس زمانہ میں فرضوں کے بعد سنن ونوافل بھی مسجد ہی میں پڑھ لینا بہتر معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ بہتر تو یہی ہے کہ لوگ امام کے بعد جگہ چھوڑیں، مگر اس کی بھی گنجائش ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ امام سے پہلے ہی اپنی ضرورتوں یا بعد کی سنن ہوں تو ان میں لگ جائیں۔

نمازوں کے بعد اجتماعی دعا

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعاؤں کو لازم وضروری نہ سمجھا جائے، اس لئے اگر احیاناً (یعنی کبھی کبھی) حنفی امام یا کچھ مقتدی یا سب بھی کسی ضرورت سے یا بلا ضرورت بھی نماز کے بعد بغیر اجتماعی دعا کے منتشر ہو جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس سے یہ ثابت ہوگا کہ حنفیہ کے یہاں التزام مالا یلزم نہیں ہے اور جیسا کہ اوپر بتلایا گیا چونکہ حضور علیہ السلام سے اجتماعی دعا کا نفل نمازوں کے بعد ثبوت بھی ہو چکا ہے، اس لئے اس کو بے اصل کہہ کر بدعت بھی کہنا غلط ہے، کیونکہ جو بات حضور علیہ السلام سے ایک یا دو بار بھی ثابت ہو اس کو مستحب سمجھ کر اس پر مواظبت ومداومت کرنے میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ صرف اس امر کا ثبوت کبھی کبھی دینے کی ضرورت ہے کہ ہم اس کو لازم وضروری نہیں سمجھتے اور یہ احتیاط بھی اجتماعی امور میں ہے۔ انفرادی طور سے کسی) امرِ مستحب پر مداومت یا نفل عبادتوں نماز روزہ اور تلاوت وغیرہ میں اکثار اور زیادتی جلی ہو، اس کو غیر مشروع یا بدعت بتلانا سخت غلطی اور مزاجِ شریعت سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بَابُ مَنْ صَلَّے بِالنَّاسِ فَذَكَرَ حَاجَتَهُ فَتَخَطَّاهُمْ (نماز پڑھ چکنے کے بعد اگر کسی کو اپنی ضرورت یاد آئے، اور لوگوں کو پھاندتا ہوا چلا جائے، تو جائز ہے یا نہیں)۔

۸۰۶. حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُبَيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عِيسَى بْنُ يُونُسَ عَنْ عُمَرَ بْنِ سَعِيْدٍ قَالَ أَخْبَرَنِي ابْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ عَنْ عُقْبَةَ قَالَ صَلَّيْتُ وَرَآءَ النَّبِيِّ صَلَّے اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ الْعَصْرَ فَسَلَّمَ فَقَامَ مُسْرِعًا فَتَخَطَّے رِقَابَ

النَّاسِ اِلٰی بَعْضِ حُجَرِ نِسَآئِهٖ فَفَزِعَ النَّاسُ مِنْ سُرْعَتِهٖ فَخَرَجَ اِلَیْهِم فَرَایٰ اَنَّهُمْ قَدْ عَجِبُوْا مِنْ سُرْعَتِهٖ قَالَ ذَکَرْتُ شَیْئًا مِّنْ تِبْرٍ عِنْدَنَا فَکَرِهْتُ اَنْ یحبسنی فَاَمَرْتُ بِقِسْمَتِهٖ۔

ترجمہ ۸۰۶:۔ حضرت عقبہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے مدینہ میں عصر کی نماز پڑھی تو آپ سلام پھیر کر عجلت کے ساتھ کھڑے ہوگئے، اور آدمیوں کی گردنیں پھاند کر آپ اپنی بی بیوں کے کسی حجرہ کی طرف تشریف لے گئے۔ لوگ آپ کی اس سرعت سے گھبرا گئے، پھر آپ ان کے پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ آپ کی سرعت سے متعجب ہیں، آپ نے فرمایا مجھے کچھ سونا یاد آ گیا تھا جو ہمارے ہاں (رکھا ہوا) تھا، میں نے اس بات کو برا سمجھا کہ وہ مجھے خدا کی یاد سے روکے، لہٰذا میں نے اس کے تقسیم کرنے کا حکم دے دیا۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ حدیث الباب سے تخطی کا جواز بھی ثابت ہوا، جس کی ممانعت دوسری احادیث نبوی سے ثابت ہو چکی ہے، اور یہ جواز ایسے وقت ہے کہ اس سے لوگوں کو ان کی گردنیں پھلانگ کر آگے جانے میں تکلیف نہ ہو یا وہ اس کو خوشی سے برداشت کریں، جیسے یہاں حدیث میں ہے کہ لوگ اس کی وجہ سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی برکت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ایک واقعہ: راقم الحروف کو خوب یاد ہے کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی وفات سے کچھ روز قبل مسلمانوں کو اور خاص طور سے اہلِ کشمیر کو محفوظ کرنے کے لئے ''دعوتِ حفظ ایمان'' کے نام سے ایک اپیل شائع کی تھی، جس کو احقر نے ہی طبع کرایا تھا، پھر حضرتؒ نے بعد نمازِ جمعہ دیوبند کی جامع مسجد میں اس کو پڑھ کر سنانے کے لئے احقر کو طلب کر لیا، احقر مسجد کے ایک کنارے پر تھا، جامع مسجد میں بہت بڑا اجتماع تھا اور سب لوگ حضرتؒ کے ارشادات سننے کے لئے اندر کے پورے حصہ میں بھر چکے تھے، اس لئے میرے واسطے حضرتؒ کے پاس منبر تک پہنچنے کی کوئی سبیل بغیر تخطیِ رقاب کے نہ تھی اور میری حیرت کی انتہا نہ تھی کہ لوگوں نے بڑی خوشی کے ساتھ مجھے اپنے کاندھوں پر سے گزار کر حضرتؒ تک پہنچنے کی آسانی بہم پہنچائی، اور میں نے حضرت کے ارشاد پر وہ مضمون لوگوں کو سنایا میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں کی طرف سے ایسی بڑی عزت افزائی جو صرف حضرتؒ کی وجہ سے احقر کو حاصل ہوئی پھر کبھی حاصل نہیں ہو سکی۔ اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے لئے صحابہ کرام نے کتنے فخر اور خوشی کے ساتھ تخطی کا موقع دیا ہوگا۔

بَابُ الْاِنْفِتَالِ وَالْاِنْصِرَافِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشِّمَالِ وَکَانَ اَنَسُ بْنُ مَالِکٍ یَّنْفَتِلُ عَنْ یَّمِیْنِهٖ وَعَنْ یَّسَارِهٖ وَیَعِیْبُ عَلٰی مَنْ یَّتَوَخّٰی اَوْمَنْ تَعَمَّدَ الْاِنْفِتَالَ عَنْ یَّمِیْنِهٖ. (نماز سے فارغ ہو کر، داہنے، اور بائیں طرف پھرنے اور چلے جانے کا بیان، انس بن مالکؓ (کبھی) اپنی داہنی طرف اور (کبھی) بائیں طرف پھرا کرتے، جو شخص (خاص کر) اپنی داہنی جانب پھرنے کا قصد کرتا تھا، اسے معیوب سمجھتے تھے)۔

۸۰۷. حَدَّثَنَا اَبُوالْوَلِیْدِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ سُلَیْمَانَ عَنْ عُمَارَةَ بْنِ عُمَیْرٍ عَنِ الْاَسْوَدِ قَالَ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ لَا یَجْعَلُ اَحَدُ کُمْ لِلشَّیْطَانِ شَیْئًا مِّنْ صَلٰوتِهٖ یَرٰی اَنَّ حَقًّا عَلَیْهِ اَنْ لَّایَنْصَرِفَ اِلَّاعَنْ یَّمِیْنِهٖ لَقَدْ رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَثِیْرًا یَنْصَرِفُ عَنْ یَّسَارِهٖ.

ترجمہ ۸۰۷: اسود روایت کرتے ہیں۔ (ایک مرتبہ) عبداللہ (بن مسعود) نے کہا کہ (دیکھو کہیں) تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز میں سے شیطان کا کچھ حصہ نہ لگائے (اس طرح پر) کہ وہ یہ سمجھے کہ اس پر ضروری ہے کہ (بعد نماز کے) اپنی دائیں جانب ہی پھرے میں نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اکثر اپنی بائیں جانب پھرتے دیکھا ہے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ پہلے تفصیل سے بتلا چکا ہوں کہ نماز کے بعد دائیں یا بائیں گھروں کی طرف جانا ہی احادیث میں ذکر ہوا ہے جس کو بعض حضرات نے نماز کے بعد دائیں یا بائیں رخ کر کے بیٹھنے پر محمول کیا ہے۔ یہاں امام بخاریؒ نے بھی انصراف سے انصراف

الی البیت ہی مراد لیا ہے۔اور حضرت علیؓ سے اسی معنی مراد کی تعیین ہو چکی ہے۔اور حضور علیہ السلام کا انصراف بائیں جانب اکثر اس لئے تھا کہ ازواجِ مطہرات کے بیوت اسی طرف تھے۔

قولہ ویعیب علی من یتوخی الخ پر فرمایا: اس سے معلوم ہوا کہ شریعت نے دو امر میں وسعت دی ہو تو کسی ایک پر جمود یا انحصار نہ کر لینا چاہئے، اور ترکِ مستحب وغیرہ پر تادیب وتنبیہ بھی کر سکتے ہیں، اسی لئے شریعت نے شوہر کو تادیب زوجہ کی اور باپ کو تادیب اولاد کی اجازت دی ہے، اور اسی طرح دوسروں کو بھی تادیب کر سکتے ہیں۔ جن پر کوئی حق واختیار ہو۔ البتہ دوسرے لوگوں کو اس کا حق نہ ہوگا۔

فائدہ علمیہ: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ارشاد **و لا یجعل احدکم للشیطان شیئا من صلوته** الخ سے بعض لوگ استدلال کیا کرتے ہیں کہ جواز کو زیادہ سخت پکڑنا اچھا نہیں ہے اور اسے میلاد کے مسئلہ میں بھی کام لیتے ہیں۔ اور علامہ سیوطی وحافظ ابن حجرؒ نے **قوموا السیدکم** سے قیامِ میلاد کو جائز کر دیا ہے، ان دونوں نے عالمِ ارواح ومثال کو عالم اجسام پر اور موہوم کو متیقن ومحقق پر قیاس کیا ہے؟ لہٰذا یہ استدلال بھی مہمل ہے، درحقیقت یہ لوگ نرے محدث تھے۔ ان کو فقہ وغیرہ سے مناسبت نہ تھی۔ اگرچہ ایسی غلطی فقہاء سے بھی ہو سکتی ہے، شیخ ابن الہمامؒ نے صاحبِ ہدایہ کے اس مسئلہ کو غلط بتلایا کہ حلقِ ربع راس سے احرام کی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے اس کو مسح ربع راس پر قیاس کیا تھا، شیخ ابن الہمام نے کہا کہ یہ قیاس بوجہ تشاکل صوری ہے، معنوی نہیں ہے، جس سے بوجہ شبہ معنوی مسائل نکالے جا سکتے ہیں، شیخ چونکہ اپنے فن اصول فقہ کے حاذق ہیں اس لئے ان کو ایسے نقد کا حق ہے، لیکن ان دونوں حضرات کو اگر سارے مسائل از بریاد ہوں تب بھی فقیہ کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکتے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ اسی طرح صاحب ہدایہ نے جو استقبالِ حجر اسود کو مثل استقبال عندالتحریمہ قرار دیا ہے، اس پر بھی شیخ ابن الہمام نے قیاس صوری بتلا کر اعتراض کیا ہے۔ اور اس طرح شیخ نے ۸۔۱۰ مسائل میں عام حنفی مسلک سے الگ اپنی تحقیق قائم کی ہے اور میں نے مذہب کی طرف سے دوسرے طریقہ پر ان کے جوابات دیئے ہیں۔

مروجہ مجالس میلاد کی تاریخ ابتداء

حضرتؒ نے فرمایا: اس میں شک نہیں کہ موجودہ مروج طریقہ پر ذکرِ میلاد کی بدعت ساتویں صدی کے شروع میں اربل بادشاہ کے ذریعہ ہوئی ہے اور تاریخ ابن خلکان میں اس کی پوری تفصیل مذکور ہے وہ اس کو بطور جشن سالانہ مناتا تھا، ماہِ صفر سے تیاریاں شروع کرا دیتا اور مجلسِ مولود کے لئے بیس قبے لکڑی کے عالی شان بنواتا، ان کو مزین کراتا، اور ہر قبہ میں پانچ پانچ طبقے ہوتے تھے، اور ہر طبقہ میں ایک ایک جماعت راگ گانے والوں اور باجے گاجے کے ساتھ کھیل تماشے، ناچ ورنگ والوں کی بٹھائی جاتی تھیں، اور بادشاہ مع ارکین وہزار ہا مخلوق کے شرکت کرتا وہ خود بھی ناچتا اور اپنے قبہ میں تمام رات راگ رنگ اور لہو ولعب میں مشغول رہتا تھا، وغیرہ (فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۳۲ میں عربی عبارت اور ترجمہ اردو دیا گیا ہے)

قیام مولود کا مسئلہ

حضرتؒ نے فرمایا کہ اگر ذکرِ میلاد صحیح روایات کے ساتھ ہو اور اس میں دوسری غیر مشروع رسوم نہ ہوں تو وہ بلا قیدِ وقت وزماں ہر وقت درست ہے، اور اس میں قیام بھی میرے نزدیک مکروہ تنزیہی سے نہیں بڑھے گا اور ایسی چیزوں پر جھگڑنا اور اختلافات قائم کرنا فضول ہے، بدعت ضرور ہے اور بعد کی چیز ہے۔

ایک دفعہ ہم کاٹھیاواڑ گئے، میاں صاحب (مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ) بھی تھے، ایک شخص نے اسی قیام کے بارے میں مجھ سے سوال کیا، میں نے کہا کہ بدعت ہے اور بے اصل بھی ہے مگر معصیت کے درجہ میں نہیں ہے، وہ شخص چلا گیا تو میاں صاحب نے

کہا کہ حضرت بدعت کی تو سخت وعید ہے، میں نے کہا کہ جن امور کی شریعت میں صریح نہیں ہے، اس میں بھی مراتب نکالے جاتے ہیں کہ کسی کو مکروہ تحریمی، کسی کو مکروہ تنزیہی اور کسی کو حرام بتلاتے ہیں، پھر یہ تو صریح بھی نہیں ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حضرتؒ کا اشارہ قریبی پیش آمدہ امور کی طرف بھی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ابھی اوپر گزرا کہ تخطیِ رقاب کی بہت سی احادیث میں صریح ممانعت ہے، پھر بھی اس کے مراتب ماننے پڑیں گے اور بعض جگہ تو وہ جائز اور مباح کے درجہ میں بھی آ جائے گی کما مر۔ اسی طرح آگے کچا لہسن پیاز وغیرہ کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت آنے والی ہے مگر اس کے لئے بھی مراتب نکلیں گے۔ پھر یہ اس پر ہے کہ اس قیام کے لئے حضور علیہ السلام کے حاضر و ناظر یا عالم الغیب وغیرہ کا غلط عقیدہ نہ ہو نہ اس کو واجب و ضروری سمجھ کر کرے، وغیرہ بلکہ صرف تعظیم ذکرِ نبوی کے جذبہ سے متاثر ہو کر قیام کر لے، تو اس کو حضرتؒ نے مکروہ تنزیہی یا غلافِ اولیٰ کا درجہ بھی اس لئے دیا کہ قرونِ مشہور لہا بالخیر سے اس کی کوئی دلیل منقول نہیں ہے، اگر وہ مل سکے تو کراہتِ تنزیہی بھی ختم ہو سکتی ہے۔ حضرت تھانویؒ قیام والوں کو کہتے تھے کہ اگر تم اس کو ضروری نہیں سمجھتے ہو تو ایک دفعہ تم قیام مت کرو۔ ہمارے ساتھ بیٹھے رہو تو ہم ایک دفعہ تمہارے ساتھ قیام کرنے کو تیار ہیں۔ یہ اس امر کا ثبوت ہوگا کہ قیام کو نا جائز یا حرام ہم بھی نہیں کہتے۔

بدعت کی اقسام

یہ بھی حضرتؒ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ بدعات میں بھی تقسیم جاری ہوتی ہے، کوئی مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ کے درجہ کی ہے، کوئی مکروہ تحریمی اور حرام تک بھی ہوتی ہے، جس طرح نہی شارع میں مراتب و تقسیم ہے۔

ذکرِ عظیم و رفیع

جس طرح رب العالمین جل وعلا کا ذکرِ مبارک اعظم و ارفع ہے، دوسرے درجہ میں سرورِ کائنات رحمۃ للعالمین، افضل المرسلین علماً، وعملاً صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر، اور آپ کے تمام حالات و سیرتِ طیبہ کا بیان بھی نہایت عظیم و جلیل ہے، **ورفعنا لک ذکرک** کہ آپ کے ذکر کو حق تعالیٰ نے بھی بلند و بالا کیا ہے، اسی لئے تمام اکابرِ امت نے حضور علیہ السلام کی شان میں نعتیہ قصائد کہے ہیں اور سیرتِ مبارکہ پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں، عوام نے اپنی تسکین کا سامان آپ کے ذکرِ میلاد میں ڈھونڈا۔ اور کم علمی کی وجہ سے اس میں بہت سی غلطیوں کا بھی ارتکاب کر بیٹھے، عام رسمی طریقے موضوع روایات پڑھنا، اضاعت مال، قیام کے التزام کے ساتھ عقیدہ کی کمزوری وغیرہ ناپسندیدہ امور بھی ذکرِ محبوب کے ساتھ جمع ہو گئے اور ایسے ہی بے جا اور ناروا امور ہی سے علماء نے روکنے کی کوشش کی ورنہ کسی کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے کسی بھی چھوٹے یا بڑے ذکر کو روکنے کی ہمت کر سکے۔

ہمارے اکابر میں سے حضرت تھانویؒ نے کئی سال ولادتِ نبوی پر مستقل بیانات کئے ہیں، جو النور، الظہور اور لمولد البرزخی وغیرہ کے نام سے طبع شدہ ہیں۔ ان میں حضور علیہ وسلم کی ولادتِ طیبہ اور حیاتِ مبارکہ کے عجیب و غریب حالات و کمالات بیان کئے ہیں اور ایک مستقل کتاب بھی ''نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب'' لکھی، جس میں سب روایات بہ سندِ صحیح جمع کر دی ہیں۔ اس عجیب و غریب نادرہ روزگار تالیفِ انیف میں ۴۱ فصل ہیں، سب سے پہلی پیدائشِ نورِ محمدی کے بیان میں ہے، جو اول الخلق بھی ہے اور افضل الخلق بھی۔ پھر عالمِ ظہور کی ولادت طیبہ کے حالات، پھر بچپن شباب اور آغازِ دورِ نبوت کے احوال، معراجِ معظم کے نہایت مفصل و صحیح حالات، ایک جگہ معجزات نبویہ کو ایسی خوبی سے جمع کیا ہے کہ آپ کے معجزات نباتات، جمادات، حیوانات زمین و آسمان و فضا سب قسم کے الگ الگ کر کے دکھائے ہیں، آپ کے انوار و برکات نہ صرف دنیا سے بلکہ کئی فصول میں برزخ و میدانِ حشر و جنت کے بھی جو حالات سامنے آئیں گے، وہ بھی بیان کر دیئے ہیں، اور ایک

فصل میں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ حضور علیہ السلام کے احوال کا ذکر بڑی فضیلت رکھتا ہے، آپ پر درود بھیجنا بھی ایک عبادت ہے، اور توسلِ نبوی کو درود کا اہم اثر ثابت کیا ہے۔ اور کمالاتِ رسالت ونبوت میں سے کسی کی بھی تنقیص[1] بدعت اور کفر تک پہنچانے والی ہے۔

جابجا حضور علیہ السلام کی شان میں لکھے گئے اکابر امت کے قصائد مدحیہ میں سے اشعار اور ان کے ترجمے پیش کئے ہیں اور آپ کو علمی و عملی کمالات دونوں کے لحاظ سے افضل الخلق ثابت کیا، یہ کتاب اگر دینی اجتماعات میں پڑھ کر سنائی جائے تو اس سے بڑا فائدہ ہو سکتا ہے۔ میں تو اس کتاب کا بچپن سے عاشق ہوں۔

ہمارے اکابرِ دیوبند حضرت نانوتوی، حضرت شیخ الہند، حضرت علامہ کشمیریؒ وغیرہ کے قصائد مدحیہ نعتیہ عربی وفارسی وغیرہ میں شائع شدہ ہیں جن میں حضور علیہ السلام کے اعلیٰ وارفع مدارج وکمالات کا ذکر انتہائی عقیدت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

فتاویٰ رشیدہ وغیرہ میں جو جوابات دیئے گئے ہیں وہ مروجہ مجالسِ میلاد سے متعلق ہیں، جن میں موضوع روایات اور رسوم وقیود غیر مشروعہ اختیار کی جاتی ہیں اور قیام کو لازمی وضروری یا غلط عقیدہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ورنہ مطلق ذکرِ ولادت کی ممانعت نہیں کی گئی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ندائے نبی کا حکم

حضرت گنگوہیؒ سے سوال ہوا کہ اشعار میں نداء نبی کا کیا حکم ہے، جیسے اس شعر میں۔ زمہجوری برآمد جان عالم ترحم یارسول اللہ ترحم! حضرتؒ نے جواب دیا کہ ایسے اشعار میں شرک تو نہیں ہے مگر عوام کو موجب اضلال کا ہو جاتا ہے، لہٰذا کسی کے روبرو نہ پڑھے اور بایں خیال پڑھے کہ حق تعالیٰ اس میری عرض کو فخر عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے پیش کر دے۔ رشید احمد عفی عنہ (فتاویٰ ص ۹۴، نیز حضرتؒ نے لکھا کہ بلا عقیدہ غیب حضور علیہ السلام سے ضرورت میں فریادرسی جائز ہے۔ (فتاویٰ ص ۹۴)

بَابُ مَاجَآءَ فِی الثُّوْمِ النِّیِّ وَالْبَصَلِ وَالْکُرَّاثِ وَقَوْلِ النَّبِیِّ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَکَلَ الثُّوْمَ اَوِالْبَصَلَ مِنَ الْجُوْعِ اَوْ غَیْرِہٖ فَلَا یَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا (ان روایتوں کا بیان جو کچے لہسن اور پیاز اور گندنا کے بارے میں بیان کی گئی ہیں اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمانا کہ جس شخص نے بھوک کے مارے، یا بغیر بھوک کے لہسن یا پیاز کھایا، وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے)۔

۸۰۸۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ عَاصِمٍ قَالَ اَخْبَرَنَا ابْنُ جُرَیْجٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عَطَآءٌ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَکَلَ مِنْ ھٰذِہِ الشَّجَرَۃِ یُرِیْدُ الثُّوْمَ فَلَا یَغْشَانَا فِیْ مَسْجِدِنَا قُلْتُ مَا یَعْنِیْ بِہٖ قَالَ مَا اَرَاہُ یَعْنِیْ اِلَّا نِیَّہٗ وَقَالَ مَخْلَدُ بْنُ یَزِیْدَ عَنِ ابْنِ جُرَیْجٍ اِلَّا نَتْنَہٗ۔

ترجمہ ۸۰۸۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص اس پودے کی چیز یعنی لہسن کھائے، وہ ہماری مسجد میں ہمارے پاس نہ آئے (عطاء کہتے ہیں) میں نے کہا کس قسم کا لہسن مراد ہے، جابر بولے کہ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ کچا لہسن مراد ہے اور مخلد بن یزید نے ابن جریج سے یوں بتلایا کہ اس کی بو مراد ہے۔

۸۰۹۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا یَحْیٰی عَنْ عُبَیْدِ اللّٰہِ قَالَ حَدَّثَنِیْ نَافِعٌ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ فِیْ غَزْوَۃِ خَیْبَرَ مَنْ اَکَلَ مِنْ ھٰذِہِ الشَّجَرَۃِ یَعْنِی الثُّوْمَ فَلَا یَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا۔

ترجمہ ۸۰۹۔ حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر میں فرمایا کہ جو شخص اس درخت سے یعنی

---

[1] بعض حضرات کی طرف جو بعض کلمات تنقیص کے منسوب ہوئے ہیں، اغلب یہ ہے کہ ان کی طرف وہ نسبت غلط ہے۔ ورنہ ہم اس سے بری ہیں۔ والحق احق ان یقال۔ بجز انبیاء کرام کے (علیہم السلام) کوئی معصوم نہیں ہے۔ "مؤلف"

لہسن کھائے تو ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔

۸۱۰. حَدَّثَنَا سَعِيْدُ بْنُ عُفَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ عَنْ يُوْنُسَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ زَعَمَ عَطَآءٌ اَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ زَعَمَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَكَلَ ثُوْمًا اَوْبَصَلاً فَلْيَعْتَزِلْنَا اَوْ فَلْيَعْتَزِلْ مَسْجِدَنَا وَلْيَقْعُدْ فِي بَيْتِهٖ وَاَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُتِيَ بِقِدْرٍ فِيْهِ خَضِرَاتٌ مِّنْ بُقُوْلٍ فَوَجَدَلَهَا رِيْحًا فَسَأَلَ فَاُخْبِرَبِمَا فِيْهَا مِنَ الْبُقُوْلِ فَقَالَ قَرِّبُوْهَا اِلٰى بَعْضِ اَصْحَابِهٖ كَانَ مَعَهٗ فَلَمَّا رَاٰهُ كَرِهَ اَكْلَهَا فَقَالَ كُلْ فَاِنِّيْ اُنَاجِيْ مَنْ لَّا تُنَاجِيْ وَقَالَ اَحْمَدُ بْنُ صَالِحٍ عَنِ ابْنِ وَهْبٍ اُتِيَ بِبَدْرٍ قَالَ ابْنُ وَهْبٍ يَّعْنِيْ طَبَقًا فِيْهِ خَضِرَاتٌ وَلَمْ يَذْكُرِ اللَّيْثُ وَاَبُوْ صَفْوَانَ عَنْ يُّوْنُسَ قِصَّةَ الْقِدْرِ فَلَا اَدْرِيْ هُوَ مِنْ قَوْلِ الزُّهْرِيِّ اَوْفِي الْحَدِيْثِ.

۸۱۱. حَدَّثَنَا اَبُوْ مَعْمَرٍ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيْزِ قَالَ سَاَلَ رَجُلٌ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ مَّا سَمِعْتَ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الثُّوْمِ فَقَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ فَلَا يَقْرَبَنَّا وَلَا يُصَلِّيَنَّ مَعَنَا.

ترجمہ۸۱۰۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لہسن یا پیاز کھائے، وہ ہم سے علیحدہ رہے، یا (یہ فرمایا کہ) ہماری مسجد سے علیحدہ رہے، اور اپنے گھر میں بیٹھے (ایک مرتبہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک ہانڈی لائی گئی، جس میں چند سبز ترکاریاں تھیں، آپ نے اس میں کچھ بو پائی تو دریافت فرمایا کہ اس میں کیا ہے؟ تو جتنی ترکاریاں اس میں تھیں، وہ آپ کو بتادی گئیں، آپ نے فرمایا کہ اسے میرے بعض اصحاب کی طرف { جو (اس وقت) آپ کے پاس تھے } قریب کردو، جب آپ نے اسے دیکھا، کہ اس نے بھی کھانا پسند نہ کیا، تو فرمایا کہ تم کھاؤ میں نہ کھاؤں گا، کیونکہ میں اس ذات سے مناجات کرتا ہوں، جس سے تم مناجات نہیں کرتے، اور احمد بن صالح نے ابن وہب سے یوں نقل کیا ہے کہ آپ کے اس سامنے بدر لایا گیا، یعنی طباق، جس میں ترکاریاں تھیں، اور لیث اور ابوصفوان نے یونس سے ہانڈی کا قصہ بیان نہیں کیا، امام بخاری نے کہا، میں نہیں جانتا یہ زہری کا کلام ہے، یا حدیث ہے۔

ترجمہ۸۱۱۔ حضرت انس بن مالکؓ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ آپ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے لہسن کے بارے میں کیا سنا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے (اس کی نسبت یہ) فرمایا ہے، کہ جو شخص اس درخت سے کھائے گا وہ نہ ہمارے قریب آئے، اور نہ ہمارے ساتھ نماز پڑھے۔

تشریح: لہسن کے ساتھ کچے کی قید لگی ہوئی ہے، اسی طرح پیاز وغیرہ بھی کچا کھا کر مساجد اور دینی اجتماعات میں جانا شریعت نے ناپسند کیا ہے کیونکہ اس سے انسانوں اور فرشتوں کو ایذا ہوتی ہے، اسی طرح جذامی، برص والا یا مچھیرا وغیرہ بھی احتیاط کرے، مھاً میں ہے کہ ایسے لوگوں کو مسجد سے بقیع کی طرف نکال دیا جاتا ہے، نیز اذکار و تلاوتِ قرآن مجید وغیرہ کے وقت بھی منہ میں بو نہ آنی چاہئے۔

یہ تو جمہور کا مذہب ہے، ابن حزم ظاہری اس بارے میں بہت سخت ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی چیزوں کا کھانا بھی حرام ہے اور ایسے حال میں رہنا بھی جائز نہیں جس کی وجہ سے بدن یا کپڑوں سے بو آتی ہو، کیونکہ ان کے نزدیک جماعت سے نماز پڑھنا فرض عین ہے اور یہ صورتیں اس سے مانع ہیں، جمہور نے کہا کہ ایسی چیزوں کا کھانا تو حلال ہی رہے گا، مگر نماز وغیرہ کے وقت احتیاط کرنا ہوگی۔ بہت سے لوگ جو بیڑی پیتے ہیں ان کے منہ سے بھی پاس والے کو بو کی وجہ سے سخت تکلیف ہوتی ہے، اور وہ خود عادی ہونے کی وجہ سے اس کا احساس نہیں کرتے، ایسے لوگوں کو منہ کو اچھی طرح صاف کر کے اور الائچی وغیرہ چبا کر مساجد میں جانا چاہئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جو چیزیں حضور علیہ السلام کے زمانہ میں اور آپ کے علم و اطلاع کے اندر کھائی گئیں ان کو حرام کیسے

کہہ سکتے ہیں، البتہ بعض کتابوں میں تمباکوں یا بدبو والی چیزوں کو اس لئے ممنوع لکھا ہے کہ بعض اوقات امراءِ اسلام مباح چیز سے بھی روک سکتے ہیں کیونکہ اولی الامر کی اطاعت ضروری ہے۔ لیکن یہ ممانعت کا حکم اس امیر کی امارت کے زمانہ تک ہی رہے گا لہٰذا یہ حرمتِ موقتہ ہوئی، تمباکو کو بھی بعض سلاطین، اسلام نے ممنوع قرار دے دیا تھا۔

علمی فائدہ: حضرتؒ نے فرمایا کہ امام زیلعی حنفی کی عادت ہے کہ جب وہ کسی مسئلہ پر بحث کے دوران کوئی حدیثِ غریب ذکر کرتے ہیں تو ساتھ ہی اس کی غرابت بھی بتلا دیتے ہیں، پھر اس کے ہم معنی دوسری احادیث لاکر اپنے مقصد کی تائید کرتے ہیں، اس کے برخلاف ابن حجر شافعی کی عادت یہ ہے کہ وہ شافعی مسلک کی تائید کے لئے احادیث غریبہ لاتے ہیں تو ان کی غرابت کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ (اسی سے حنفی مسلک کی قوت اور شافعی مسلک کی کمزوری سمجھ میں آ سکتی ہے)۔

بَابُ وُضُوْءِ الصِّبْيَانِ وَمَتٰى يَجِبُ عَلَيْهِمُ الْغُسْلُ وَالطُّهُوْرُ وَحُضُوْرِ هُمُ الْجَمَاعَةَ وَالْعِيْدَيْنِ وَالْجَنَآئِزَ وَصُفُوْ فِهِمْ. (بچوں کے وضو کرنے کا بیان، اوران پر غسل اورطہارت کب واجب ہے اور جماعت، اورعیدین اور جنازوں میں حاضر ہونے اوران کی صفوں کا بیان)

۸۱۲. حَدَّثَنِیْ مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَ حَدَّثَنَا غُنْدَرٌ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ سَمِعْتُ سُلَيْمَانَ الشَّيْبَانِیَّ قَالَ سَمِعْتُ الشَّعْبِیَّ قَالَ اَخْبَرَنِیْ مَنْ مَّرَّمَعَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى قَبْرٍ مَّنْبُوْذٍ فَاَمَّهُمْ وَصَفُّوْا عَلَيْهِ فَقُلْتُ يَا اَبَاعَمْرٍو مَنْ حَدَّثَکَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ.

۸۱۳. حَدَّثَنَا عَلِیُّ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيٰنُ قَالَ ثَنِیْ صَفْوَانُ بْنُ سُلَيْمٍ عَنْ عَطَآءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِیْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْغُسْلُ يَوْمَ الْجُمْعَةِ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُحْتَلِمٍ.

۸۱۴. حَدَّثَنَا عَلِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيٰنُ عَنْ عَمْرٍو وَقَالَ اَخْبَرَنِیْ كُرَيْبٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بِتُّ عِنْدَ خَالَتِیْ مَيْمُوْنَةَ لَيْلَةً فَنَامَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا كَانَ فِیْ بَعْضِ اللَّيْلِ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَوَضَّاَ مِنْ شَنٍّ مُّعَلَّقٍ وَضُوْءً اخَفِيْفً يُّخَفِّفُهُ عَمْرٌو وَّيُقَلِّلُهُ جِدًّا ثُمَّ قَامَ يُصَلِّیْ فَقُمْتُ فَتَوَضَّاْتُ نَحْوًا مِّمَّا تَوَضَّاَ ثُمَّ جِئْتُ فَقُمْتُ عَنْ يَّسَارِهٖ فَحَوَّ لَنِیْ فَجَعَلَنِیْ عَنْ يَّمِيْنِهٖ ثُمَّ صَلّٰى مَاشَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ اضْطَجَعَ فَنَامَ حَتّٰى نَفَخَ فَاَتَاهُ الْمُنَادِیْ يُؤْذِنُهٗ بِالصَّلٰوةِ فَقَامَ مَعَهٗ اِلَى الصَّلٰوةِ فَصَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّاْ قُلْنَا لِعَمْرٍو اِنَّ نَاسًا يَقُوْلُوْنَ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَنَامُ عَيْنُهٗ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهٗ قَالَ عَمْرٌو سَمِعْتُ عُبَيْدَ بْنَ عُمَيْرٍ يَقُوْلُ اِنَّ رُؤْيَا الْاَنْبِيَآءِ وَحْیٌ ثُمَّ قَرَاَ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُکَ.

ترجمہ ۸۱۲۔ سلیمان شعبی روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے اس شخص نے بیان کیا، جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ الگ ایک قبر پر گیا تھا کہ آپ نے لوگوں کی امامت کی اور لوگوں نے آپ کے پیچھے صف باندھی، اور اس کی نماز پڑھی (سلیمان کہتے ہیں) میں نے کہا کہ اے ابوعمرتم سے یہ کس نے بیان کیا؟ انہوں نے کہا، ابن عباس نے۔

ترجمہ ۸۱۳۔ حضرت ابوسعید خدریؓ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جمعہ کے دن ہر بالغ پر غسل واجب ہے۔

ترجمہ ۸۱۴۔ حضرت ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ میں ایک شب اپنی خالہ میمونہ کے یہاں رہا، میں نے دیکھا کہ جب کچھ رات رہ گئی تو رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوگئے اور آپ نے ایک لٹکی ہوئی مشک سے ہلکا سا وضو کیا۔ {عمرو (راوی) اس وضو کو بہت خفیف اور قلیل بتاتے تھے} اس کے بعد آپ نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے تو میں بھی اٹھا اور جیسا وضو آپ نے کیا تھا، ویسا ہی میں نے بھی کیا، پھر میں

آیا اور آپ کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا، تو آپ نے مجھے اپنی داہنی جانب کھڑا کر لیا۔ پھر جس قدر اللہ نے چاہا آپ نے نماز پڑھی، اس کے بعد آرام فرمایا اور سو گئے، یہاں تک کہ سانس کی آواز آنے لگی، پھر موذن آپ کو نماز (فجر) کی اطلاع دینے کے لئے آپ کے پاس آیا، اور آپ اس کے ساتھ نماز کے لئے تشریف لے گئے، اور آپ نے وضو نہیں کیا{ سفیان کہتے ہیں، کہ ہم نے عمرو سے کہا کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی آنکھ سوئی تھی مگر آپ کا دل نہ سوتا تھا، عمرو نے کہا، کہ میں نے عبید بن عمیر کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ انبیاء کا خواب وحی ہے، پھر انہوں نے پڑھا اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُکَ۔

۸۱۵. حَدَّثَنَا اِسْمٰعِیْلُ قَالَ حَدَّثَنِیْ مَالِکٌ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ اَبِیْ طَلْحَۃَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ اَنَّ جَدَّتَہٗ مُلَیْکَۃَ دَعَتْ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِطَعَامٍ صَنَعَتْہُ فَاَکَلَ مِنْہُ فَقَالَ قُوْمُوْا فَلِاُصَلِّیَ بِکُمْ فَقُمْتُ اِلٰی حَصِیْرٍ لَّنَا قَدِ اسْوَدَّ مِنْ طُوْلِ مَالُبِسَ فَنَضَحْتُہٗ بِمَآءٍ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالْیَتِیْمُ مَعِیَ وَالْعَجُوْزُ مِنْ وَّرَآءِ نَا فَصَلّٰی بِنَا رَکْعَتَیْنِ۔

۸۱۶. حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ مَسْلَمَۃَ مَالِکٍ عَنِ ابْنِ شِہَابٍ عَنْ عُبَیْدِ اللّٰہِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُتْبَۃَ عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّہٗ قَالَ اَقْبَلْتُ رَاکِبًا عَلٰی حِمَارٍ اَتَانٍ وَّاَنَا یَوْمَئِذٍ قَدْنَاھَزْتُ الْاِحْتِلَامَ وَرَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُصَلِّیْ بِالنَّاسِ بِمِنًی اِلٰی غَیْرِ جِدَارٍ فَمَرَرْتُ بَیْنَ یَدَیْ بَعْضِ الصَّفِّ فَنَزَلْتُ وَاَرْسَلْتُ الْاَتَانَ تَرْتَعُ وَدَخَلْتُ فِی الصَّفِّ فَلَمْ یُنْکِرْ ذٰلِکَ عَلَیَّ اَحَدٌ۔

ترجمہ ۸۱۵۔ حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ ان کی دادی ملیکہ نے رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو کھانے کیلئے جو انہوں نے آپ کیلئے تیار کیا، بلایا، تو آپ نے اس میں سے کھایا اور فرمایا کہ کھڑے ہو جاؤ، تاکہ میں تمہیں نماز پڑھا دوں تو میں اپنی ایک چٹائی کی طرف کھڑا ہو گیا جو کثرتِ استعمال سے سیاہ ہو گئی تھی اور اس کو میں نے پانی سے صاف کیا۔ پھر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور ایک بچہ میرے ہمراہ تھا اور بڑھیا ہمارے پیچھے کھڑی ہوئی، پس آپ نے ہمارے ساتھ دو رکعت نماز پڑھی۔

ترجمہ ۸۱۶۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں ایک گدھی پر سوار ہو کر سامنے آیا، اور میں اس وقت قریب بلوغ تھا، اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم (مقام) منٰی میں بغیر دیوار کی آڑ کے لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے، تو میں بعض صف کے آگے سے گزرا اور اتر پڑا، اور گدھی کو میں نے چھوڑ دیا تاکہ وہ چرے، اور میں صف میں شامل ہو گیا، پھر کسی نے مجھے اس پر برا بھلا نہیں کہا۔

۸۱۷. حَدَّثَنَا اَبُو الْیَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَیْبٌ عَنِ الزُّھْرِیِّ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عُرْوَۃُ بْنُ الزُّبَیْرِ اَنَّ عَآئِشَۃَ قَالَتْ اَعْتَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ عَیَّاشٌ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْاَعْلٰی قَالَ حَدَّثَنَا مَعْمَرٌ عَنِ الزُّھْرِیِّ عَنْ عُرْوَۃَ عَنْ عَآئِشَۃَ قَالَتْ اَعْتَمَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْعِشَآءِ حَتّٰی نَادَاہُ عُمَرُ قَدْنَامَ النِّسَآءُ وَالصِّبْیَانُ قَالَتْ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَدْ اِنَّہٗ لَیْسَ اَحَدٌ مِّنْ اَھْلِ الْاَرْضِ یُصَلِّیْ ھٰذِہِ الصَّلٰوۃَ غَیْرُکُمْ وَلَمْ یَکُنْ اَحَدٌ یَّوْمَئِذٍ یُصَلِّیْ غَیْرَ اَھْلِ الْمَدِیْنَۃِ۔

۸۱۸. حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَلِیٍّ قَالَ حَدَّثَنَا یَحْیٰی قَالَ حَدَّثَنَا سُفْیٰنُ قَالَ حَدَّثَنِیْ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَابِسٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ وَّقَالَ لَہٗ رَجُلٌ شَھِدْتَّ الْخُرُوْجَ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ نَعَمْ وَلَوْلَا مَکَانِیْ مِنْہُ مَاشَھِدْتُّہٗ یَعْنِیْ مِنْ صِغَرِہٖ اِلَی الْعَلَمِ الَّذِیْ عِنْدَ دَارِ کَثِیْرِ بْنِ الصَّلْتِ ثُمَّ خَطَبَ ثُمَّ اَتَی النِّسَآءَ فَوَعَظَھُنَّ وَذَکَّرَھُنَّ اَنْ یَّتَصَدَّقْنَ فَجَعَلَتِ الْمَرْاَۃُ تَھْوِیْ بِیَدِھَا اِلٰی حَلْقِھَا تُلْقِیْ فِیْ ثَوْبِ بِلَالٍ ثُمَّ اَتٰی ھُوَ وَبِلَالٌ الْبَیْتَ۔

ترجمہ ۸۱۷۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ (ایک دن) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز میں تاخیر کر دی اور عیاش نے بواسطہ عبدالاعلی، معمر، زہری، عروہ، حضرت عائشہ سے روایت کیا کہ انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کی نماز میں تاخیر کی، یہاں تک کہ عمرؓ نے آپ کو آواز دی کہ عورتیں اور بچے سو رہے، حضرت عائشہ کہتی ہیں، پھر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے، اور آپ نے فرمایا کہ زمین والوں میں سے سوائے تمہارے کوئی نہیں ہے جو اس وقت میں نماز کو پڑھے اور اس وقت مدینہ والوں کے سوا کوئی نماز نہ پڑھتا تھا۔

ترجمہ ۸۱۸۔ عبدالرحمٰن بن عابس روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس سے ایک شخص نے کہا کہ کیا تم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ (عیدگاہ) جانے کیلئے حاضر ہوئے ہو، انہوں نے کہا، ہاں اگر میری قرابت آپ سے نہ ہوتی، تو میں حاضر نہ ہو سکتا (یعنی کمسنی کے سبب سے) آپ اس نشان کے پاس آئے جو کثیر بن صلت کے مکان کے پاس ہے، پھر آپ نے خطبہ پڑھا، اس کے بعد عورتوں کے پاس آئے اور انہیں نصیحت کی۔ اور انکو (خدا کے احکام کی) یاد دلائی اور انہیں حکم دیا کہ صدقہ دیں، پس کوئی عورت اپنا ہاتھ اپنی انگوٹھی کی طرف بڑھانے لگی اور کوئی اپنی بالی کی طرف اور کوئی کسی زیور کی طرف اور اس کو اتار کر) بلال کی چادر میں ڈالنے لگیں، پھر آپ اور بلال گھر تک آئے۔

تشریح: وضوء الصبیان، بچوں کا وضو حنفیہ کے نزدیک بھی صحیح ہے، جن لوگوں نے اس کے خلاف نقل کیا، انہوں نے غلطی کی۔ **متی یجب علیہم الغسل**، امام بخاری نے اس کا جواب نہیں دیا، کیونکہ ظاہر ہے وضوء اور غسل کا وجوب بھی دوسرے احکام کی طرح بلوغ کے بعد ہوتا ہے اور اس سے پہلے اس لئے حکم کرتے ہیں کہ ان کی عادت پڑے، البتہ امام احمدؒ بچہ دس سال کا ہو جائے تو اس پر غسل فرض بتلاتے ہیں۔ **حضور ھم الجماعۃ** بچے اگر فرض نمازوں میں شریک ہوں تو ان کی نماز نفل ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک یہ بھی مستبعد نہیں کہ ان سے فرض ہی کے طور پر قبول ہو اگرچہ وہ اس کے مکلف نہیں ہیں، جیسے بچہ اگر اسلام لائے تو وہ اس کے لئے بطور فرض ہی قبول ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس وقت وہ اس پر فرض نہیں ہے، ایسے ہی نماز میں بھی ہو سکتا ہے، مگر کسی سے اس امر کی صراحت موافقت یا مخالفت میں منقول نہیں ہے۔

علامہ نوویؒ حنفیہ کا مذہب نقل کرنے میں بہت بڑی غلطی کرتے ہیں، انہوں نے کہہ دیا کہ حنفیہ کے نزدیک نابالغ کا حج صحیح نہیں ہوتا حالانکہ یہ غلط ہے، البتہ اس کا یہ حج نفل ہوگا، پھر بلوغ کے بعد حج فرض ہوگا تو وہ بھی کرنا پڑے گا۔

صفوفِ صبیان کا مسئلہ یہ ہے کہ نمازِ جنازہ میں بچے بڑوں کے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں اور بعض صورتوں فرض نمازوں میں بھی جس کی تفصیلِ فقہ میں ہے۔

غسل یوم الجمعہ کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ حنفیہ کے نزدیک مستحب ہے، لیکن بعض صورتوں میں واجب بھی ہو جاتا ہے، مثلاً جبکہ بدن سے پسینہ کی بو آتی ہو وغیرہ، جس سے دوسروں کو تکلیف ہو۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک وجوب واستحباب وغیرہ ایک ہی امر کے تحت ثابت ہو سکتے ہیں جیسے **قولہ تعالٰی صلوا علیہ وسلموا تسلیما** میں کہ اس کے امر میں فرض ونفل سب داخل ہیں، لہٰذا اس کا محل ومصداق عمر میں فقط ایک بار درود پڑھنے کو متعین کرنا اور الامر للوجوب کے تحت اسی کا ایک فرد مذکور مقرر کرنا درست نہیں حق یہ ہے کہ امر لغت میں فقط طلب کے لئے ہے اور وجوب وتطوع وغیرہ کی صفات خارج سے اس کے ساتھ لگتی ہیں۔ البتہ کوئی امر موقت ومقید ہو تو اس کو وجوب پر محمول کریں گے، رسالہ فصل الخطاب اور کشف الستر میں اس کی مزید تشریح کر دی گئی ہے۔

بَابُ خُرُوْجِ النِّسَآءِ اِلَى الْمَسَاجِدِ بِاللَّيْلِ وَالْغَلَسِ

(رات کے وقت اور اندھیرے میں عورتوں کے مسجد جانے کا بیان)

۸۱۹. حَدَّثَنَا اَبُوالْيَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ اَعْتَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْعَتَمَةِ حَتّٰى نَادَاهُ عُمَرُ نَامَ النِّسَآءُ وَالصِّبْيَانُ فَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَايَنْتَظِرُهَا اَحَدٌ غَيْرُكُمْ مِّنْ اَهْلِ الْاَرْضِ وَلَا يُصَلّٰى يَوْمَئِذٍ اِلَّا بِالْمَدِيْنَةِ وَكَانُوْا يُصَلُّوْنَ الْعَتَمَةَ فِيْمَا بَيْنَ اَنْ يَّغِيْبَ الشَّفَقُ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ الْاَوَّلِ.

ترجمہ۸۱۹: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے (ایک دن) عشاء (کی نماز) میں تاخیر کردی، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے آپ کو آواز دی کہ عورتیں اور بچے سو رہے ہیں پس نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ زمین والوں میں سے سوائے تمہارے کوئی اس نماز کا منتظر نہیں ہے اور اس وقت مدینہ کے سوا کہیں نماز نہ پڑھی جاتی تھی، اور عشاء کی نماز شفق کے غائب ہونے کے بعد سے تہائی رات تک پڑھ لیتے تھے۔

۸۲۰. حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ مُوْسٰى عَنْ حَنْظَلَةَ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَاذَنَكُمْ نِسَآءُ كُمْ بِاللَّيْلِ اِلَى الْمَسْجِدِ فَاْذَنُوْا لَهُنَّ تَابَعَهُ شُعْبَةُ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ مُّجَاهِدٍ.

۸۲۱. حَدَّثَنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ مَحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ عُمَرَ قَالَ اَخْبَرَنَا يُوْنُسُ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ حَدَّثَتْنِيْ هِنْدُ بِنْتُ الْحَارِثِ اَنَّ اُمَّ سَلَمَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخْبَرَتْهَا اَنَّ النِّسَآءِ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُنَّ اِذَا سَلَّمْنَ مِنَ الْمَكْتُوْبَةِ قُمْنَ وَثَبَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ الرِّجَالُ.

۸۲۲. حَدَّثَنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَّالِكٍ ح وَحَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ يُوْسُفَ اَخْبَرَنِيْ مَالِكٌ عَنْ يَّحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ اِنْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيُصَلِّي الصُّبْحَ فَيَنْصَرِفُ النِّسَآءُ مُتَلَفِّعَاتٍ بِمُرُوْطِهِنَّ مَايُعْرَفْنَ مِنَ الْغَلَسِ.

۸۲۳. حَدَّثَنَا مَحَمَّدُ بْنُ مِسْكِيْنٍ قَالَ حَدَّثَنَا بِشْرُبْنُ بَكْرٍ قَالَ اَخْبَرَنَا الْاَوْزَاعِيُّ قَالَ حَدَّثَنِيْ يَحْيَى بْنُ اَبِيْ كَثِيْرٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ قَتَادَةَ الْاَنْصَارِيِّ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ لَاَقُوْمُ اِلَى الصَّلٰوةِ وَاَنَا اُرِيْدُ اَنْ اُطَوِّلَ فِيْهَا فَاَسْمَعُ بُكَآءَ الصَّبِيِّ فَاَتَجَوَّزُ فِيْ صَلٰوتِيْ كَرَاهِيَةَ اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمِّهٖ.

۸۲۴. حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ يَّحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ عَمْرَةَ عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ لَوْ اَدْرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَحْدَثَ النِّسَآءُ لَمَنَعَهُنَّ الْمَسْجِدَ كَمَا مُنِعَتْ نِسَآءُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فَقُلْتُ لِعَمْرَةَ اَوَمُنِعْنَ قَالَتْ نَعَمْ.

ترجمہ۸۲۰۔ حضرت ابن عمرؓ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جب تم سے تمہاری عورتیں رات کو مسجد میں جانے کی اجازت مانگیں تو انہیں اجازت دے دو۔

ترجمہ۸۲۱۔ حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں جب فرض کا سلام پھیرتی تھیں۔ تو

(فوراً) کھڑی ہو جاتی تھیں اور رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم اور وہ مرد جو آپ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے جتنی دیر اللہ چاہتا تھا، ٹھہر جاتے تھے، پھر جب رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوتے تو سب مرد بھی کھڑے ہو جاتے۔

ترجمہ ۸۲۲۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم جب صبح کی نماز پڑھ چکتے تھے تو عورتیں اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی لوٹتی تھیں، اندھیرے کے سبب سے پہچانی نہ جاتی تھیں۔

ترجمہ ۸۲۳۔ عبداللہ بن ابی قتادہ انصاری اپنے والد ابوقتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ اس میں طول دوں، مگر بچے کی رونے کی آواز سن کر میں اپنی نماز میں تخفیف کر دیتا ہوں، اس بات کو برا سمجھ کر کہ اس کی ماں پر سختی کروں۔

ترجمہ ۸۲۴۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اگر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت کو معلوم کرتے، جو عورتوں نے نکالی ہے تو بیشک انہیں مسجد جانے سے منع کر دیتے، جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کر دیا گیا تھا {یحییٰ بن سعید کہتے ہیں} میں نے عمرہ سے کہا کیا نساء بنی اسرائیل کو منع کر دیا گیا تھا بولیں ہاں۔

تشریح: امام بخاریؒ نے یہاں عورتوں کے لئے رات اور اندھیرے کے وقت مساجد میں جانے کے جواز کا مسئلہ بتایا ہے، حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ وہ جواز کو عدم فتنہ کے ساتھ مقید کر رہے ہیں، کیونکہ رات کا وقت اور اندھیرا فتنہ سے محفوظ رہنے کا سبب بنتا ہے، اور فتنہ سے بچنا نہایت ضروری ہے۔

امام بخاری نے اس باب میں چھ حدیثیں پیش کی ہیں اور حدیث نمبر ۸۲۰ عن ابن عمرؓ میں یہ ہے کہ اگر تم سے رات کے وقت مسجد میں جانے کیلئے عورتیں اجازت طلب کریں تو ان کو اجازت دے دو، اس سے حضرت گنگوہیؒ کے بیان کی تائید ہو جاتی ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے بھی رات کے وقت کی قید لگائی ہے۔ باقی احادیث الباب میں دوسرے ارشادات ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس کے بعد امام بخاری اس کتاب کے آخری باب استیذان المرأۃ میں بھی حدیث ابن عمرؓ نمبر ۸۲۸ لائیں گے جو اسی کے قریب اور ہم معنی ہے، غرض دونوں حدیث حضرت ابن عمرؓ ہی سے مروی ہیں، اس لئے قیدِ مذکور وہاں بھی ملحوظ رہے گی۔

حضرت گنگوہیؒ سے جو تقریر حضرت مرشدی مولانا حسین علی صاحبؒ نے نقل فرمائی ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ حدیث استیذان سے یہ بات ثابت ہوئی کہ عام طور سے عورتوں کا گھروں سے نکلنا بلا اذنِ ازواج متعارف نہ تھا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کو بلا اذن کے نہ نکلنا چاہئے اور جب مسجد اور نماز کیلئے بھی نہیں تو اور کسی جگہ یا کام کیلئے بدرجۂ اولیٰ نظرِ شارع میں ناپسندیدہ ہوگا، اور چونکہ مسجد کے لئے نکلنا بظاہر جواز کے اندر معلوم ہوتا تھا، اس لئے اس امر کو واضح کرنا ضروری سمجھا گیا نیز معلوم ہوا کہ ازواج مخیّر ہیں کہ اجازت دینا مناسب اور غیر مضر سمجھیں تو دیں ورنہ نہ دیں۔ ان پر ضروری نہیں کہ ضرور ہی اجازت دیدیں۔ حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اجازت دینا فتنہ و شر نہ ہونے کیساتھ مشروط ہے، اسلئے اگر رات یا دن کے کسی وقت بھی فتنہ کا خوف ہو تو اجازت دینا جائز نہ ہوگا۔

حاشیۂ لامع میں لکھا کہ اسی کو حافظ ابن حجرؒ نے بھی جزم کے ساتھ اختیار کیا ہے، انہوں نے لکھا کہ یہ اجازت دینا جب ہی درست ہے کہ نہ مردوں کی طرف سے ان عورتوں کے لئے فتنہ کا خوف ہو اور نہ عورتوں کی طرف سے مردوں کے لئے ہو، (کیونکہ یہ دونوں طرف سے ہوسکتا ہے)۔

علامہ عینیؒ نے بھی لکھا کہ یہ جب ہی ہے کہ دونوں جانب سے فتنہ کا خوف نہ ہو، اور یہ بھی اس دورِ صلاح میں تھا۔ اب ہمارے زمانہ میں تو فتنہ و فساد کا دروازہ ہر وقت اور عام طور سے کھلا ہوا ہے اور غنڈہ ایلیمنٹ کی کثرت ہے، حضرت عائشہؓ کی حدیث بھی یہی بتلا رہی ہے کہ زمانہ تیزی سے خرابی کی طرف بڑھتا رہا ہے، اس کے بعد علامہ عینی نے اپنے زمانہ کی عورتوں کی آزادی اور اس کی شناعتوں اور قباحتوں کا ذکر

کر کے لکھا کہ "اگر حضرت عائشہؓ اس زمانہ کی عورتوں کا حال دیکھ لیتیں تو اور بھی زیادہ تشدد پر مائل ہوتیں۔ کیونکہ ان کے اور حضور علیہ السلام کے زمانہ میں تو بہت ہی تھوڑی مدت کا فاصلہ تھا، اور اُس زمانہ کی عورتوں میں تو ایک ہزارواں جز و بھی ان خرابیوں کا نہیں آیا تھا جو ہمارے اس زمانے میں آ گئی ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے علامہ عینی کا قول مذکور نقل کر کے لکھا کہ اب دیکھو کہ علامہ عینیؒ کی وفات بھی ۸۵۵ھ میں ہوئی تھی، جس کو پانچ سو برس کا زمانہ اور بھی گزر گیا، تو اب جو حالت ہے وہ سب پر عیاں ہے کہ زمانہ شر و ساد سے بھر چکا ہے اور اس کی کوئی حد و نہایت نہیں معلوم ہوتی۔ پھر لکھا کہ بخاری کتاب الفتن میں آئے گا کہ کوئی زمانہ ایسا نہ آئے گا کہ اس کے بعد والا زمانہ اس سے بدتر نہ ہوگا۔ اور اس کو حضرت انسؓ نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی نقل کیا ہے۔ (لامع ص ۱/ ۳۵۸)

افاداتِ انور: حضرتؒ نے فرمایا کہ احادیث سے یہ ثابت ضرور ہوا ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں عورتیں مسجد اور عید گاہ میں جاتی تھیں اور ان ہی کو سامنے کر کے غیر مقلدین مسجد میں تو کم مگر عید گاہ میں عورتوں کو لے جانے کا اہتمام ضرور کرتے ہیں، وہ لوگ عمل بالحدیث کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایسے امور میں بہت پیش پیش ہوتے ہیں تا کہ عوام ان کے فریب میں آ جائیں اور وہ ایسے مسائل میں دوسری احادیثِ صحیحہ قویہ اور جمہور سلف وخلف کے تعامل سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔

ساری امت کے اکابر نے فیصلہ کیا کہ خیر القرون کے بعد عورتوں کو گھروں سے نکال کر مساجد اور عید گاہوں میں لے جانا فتنوں کو دعوت دینا ہے مگر یہ عامل بالحدیث اپنی الگ راہ پر چلنے میں ہی مگن ہیں، یہ لوگ بخاری وغیرہ کو اپنی غرض کے لئے آگے کیا کرتے ہیں، مگر کیا بخاری میں ہی یہ قیدیں رات اور اندھیرے وغیرہ کی مروی نہیں ہیں؟

حضرتؒ نے فرمایا کہ اصل بات وہی ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ شریعت کا یہ مزاج نہیں کہ وہ کسی امرِ خیر کو روکے، اسی لئے عورتیں مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کی اجازت طلب کریں تو حضور علیہ السلام نے ان کے اولیاء کو فرمایا کہ اس سے ان کو مت روکو اور بعض احادیث میں ہے کہ وہ اجازت طلب کریں تو اجازت دے دو، لیکن دوسری طرف یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ عورتوں کے مسجد میں حاضر ہو کر نماز پڑھنے کی ترغیب بھی کسی حدیث میں وارد نہیں ہے، بلکہ ترغیب اس امر کے لئے ہے کہ وہ گھروں میں پڑھیں اور ان میں بھی ایسی جگہ جو سب سے زیادہ محفوظ ہو تا کہ کسی کی غلط نگاہ ان کے سجدہ وغیرہ کی حالت میں نہ پڑے اور اسی لئے ترمذی کی حدیثِ ابی ہریرہؓ میں یہ بھی آیا ہے کہ جماعت کی نماز میں مردوں کی صفوں میں سب سے بہتر پہلی اور آگے کی صفیں ہیں اور بری پچھلی ہیں، اور عورتوں کی صفوں میں سے سب سے اچھی آخری اور پچھلی صفیں ہیں اور بری اگلی ہیں۔ شبہ ہو سکتا ہے کہ نماز تو سراسر اچھی ہی اچھی ہے، اس میں شر اور برائی ہونے کا کیا موقع؟ لیکن سمجھنا چاہئے کہ جو شر یا برائی اس میں آئی ہے وہ عورتوں کے مردوں سے قریب ہونے کی وجہ سے آئی ہے، مردوں کی پچھلی صفیں عورتوں کی اگلی صفوں سے قریب ہوں گی تو اس افضل ترین عبادت میں بھی شیطانی وساوس اور نفسانی خیالات کی وجہ سے خرابی آ سکتی ہے اور ایسے مواقع میں شیطان اور نفس کے مکائد اپنا پورا کام کرتے ہیں، لہٰذا اس حدیث سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے کہ عورتوں کا جماعت کی نمازوں میں مردوں کے ساتھ شرکت کرنا شریعت کو پسند نہیں ہے، چونکہ جماعت کی نماز خیرِ محض ہے، اس لئے صاحبِ شریعت نے اس کو اپنے زمانہ میں نہیں روکا، کہ وہ زمانہ بھی خیر ہی کا تھا۔

مثالِ صدقہ

حضرتؒ نے فرمایا کہ ایسی ہی صورت باب الصدقہ میں بھی پیش آئی ہے کہ صدقہ کرنے والوں کو تو تاکید فرمائی کہ اپنے عاملوں کو راضی کریں، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! خواہ وہ ظلم ہی کریں، اور اچھے سے اچھا مال لے جانا چاہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! جیسے وہ چاہیں دو، لیکن آپ نے الگ سے عاملوں اور کارندوں کو بھی سخت تاکید کی کہ ظلم نہ کریں۔

مثالِ نکاح: حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ عورت کا نکاح بغیر ولی کے نہ ہوگا، پھر آپ ہی نے عورت کو یہ حق بھی دیا کہ وہ اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی ہے۔

مثالِ اطاعتِ سلطان

حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تک کھلا کفر ہی نہ دیکھ لو، کسی حال میں اپنے سلطان کی اطاعت سے انحراف نہ کرو۔ جس سے ایسا معلوم ہوا کہ سارا حق سلطان کا ہی ہے۔ رعیت کا کچھ بھی نہیں، پھر ظالم سلاطین کو بھی خدا کے عذابِ آخرت سے ڈرایا تا کہ وہ ظلم سے باز آئیں۔ کیونکہ بغیر ہدایات دیئے ہوئے کام نہیں چل سکتا، خصوصاً انتظامی امور میں، کیونکہ حضور علیہ السلام جانتے ہیں کہ جماعت میں سارے صالح ہی نہیں ہوا کرتے اور منظورِ شریعت یہ ہے کہ کام چلنے دیا جائے، اگر چہ نقائص وقبائح بھی موجود ہوں گے۔

فاتحہ خلف الامام

حضرتؒ نے فرمایا کہ ایسی ہی صورت امام کے پیچھے قراءت فاتحہ کے لئے بھی پیش آئی ہے مگر غیر مقلدین اس کو نہیں سمجھتے اور کیونکر سمجھیں کہ وہ دوسرے دلائل سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فہمِ صحیح سے محروم کر دیا ہے۔

غرض عورتوں کو ترغیب تو یہی ہے کہ مسجدوں کو مت جاؤ، گھروں میں پڑھو وہ زیادہ افضل ہے۔ تاہم ہمیں حکم دیا کہ تم مت روکو کہ کہیں ہم ان کو دوسری جائز چیزوں سے بھی نہ روکنے لگیں۔ اور گھروں میں جھگڑے نہ ہونے لگیں۔ پھر یہ بھی ان کو حکم ہوا کہ میلی کچیلی نکلیں۔ بجنے والا زیور پہن کر نہ نکلیں، پرانے کپڑوں میں نکلیں اور دوسری قیود بھی لگا دی ہیں، تو من حیث المجموع سب باتوں پر نظر کی جائے تو یہی بات نکلے گی کہ مسجدوں میں جا کر عورتوں کا نماز پڑھنا شارع کو پسند نہیں ہے، ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ اگر عورتوں کو نکلنا ہی ضروری ہے تو وہ میلی کچیلی حالت میں نکلیں، بدون زینت کے اور خوشبو لگا کر بھی نہ نکلیں، اگر وہ ایسا کریں گی تو وہ بدکردار شمار ہوں گی، لہٰذا یہ بھی ایک درجہ کی اباحت ہے، مرضی نہیں ہے، شارع کی۔ جیسے مقتدیوں کے لئے فاتحہ کی اباحت بھی، اسی لہجہ میں دی ہے۔

حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ پہلے حنفیہ کے نزدیک بھی بوڑھیوں کو رات کی نمازوں میں اور سب کو عیدگاہ کی بھی اجازت تھی۔ مگر متاخرین نے منع کر دیا۔ اور سفیان ثوری و امام شافعی وغیرہ بھی حنفیہ کی طرح منع کرتے ہیں۔ لہٰذا غیر مقلدوں کی بات چھوڑو۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ ہمارے اصل مذہب میں تو عیدین کے لئے نکلنے کا جواز ہی تھا، پھر اربابِ فتویٰ نے روک دیا، اور دوسرے مذاہبِ فقہیہ میں تو ہم سے بھی زیادہ اس بارے میں تنگی وشدت ہے۔ پھر بھی بے انصاف غیر مقلدین حنفیہ پر ہی طعن کرتے ہیں۔ ہمارا اصل مذہب ہدایہ میں بھی مذکور ہے۔ (ہمارے سلفی بھائی حنفیہ کے خلاف اقوالِ سفیان ثوری، ابن مبارک و امام شافعی وغیرہ تلاش کیا کرتے ہیں، لیکن یہاں وہ سب ہی حنفیہ کے ساتھ ہیں، پھر بھی مطعون حنفیہ ہیں۔)

حضرتؒ نے فرمایا: فقہاء متاخرین نے مطلقاً نکلنے سے اس لئے منع کر دیا کہ ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ترمذی یوں ہے کہ اگر حضور علیہ السلام اس زمانہ کی عورتوں کی آزادروی کو دیکھ لیتے تو عورتوں کو مساجد جانے سے ضرور روک دیتے، جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو بھی (خرابی کی وجہ سے) عبادت گاہوں میں جانے سے روک دیا گیا تھا اور یہی حدیث کا مضمون میرے پاس حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی مرفوعاً موجود ہے اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے بھی ترمذی (**باب خروج النساء فی العیدین**) میں ہے۔ آپ نے فرمایا میں آج کل عورتوں کا عیدگاہ میں جانا پسند نہیں کرتا، اگر وہ بہت ہی اصرار کریں تو شوہر اس طرح اجازت دیں کہ وہ پرانے کپڑوں میں نکلیں، اور کسی قسم کی زینت نہ کریں، اگر وہ اس طرح نہ مانیں تو شوہر ان کو بالکل روک سکتے ہیں۔ حضرت سفیان ثوری نے بھی اپنے زمانہ میں عیدگاہ جانے کو ناپسند کیا ہے (تحفہ ص ۱/ ۳۷۹)

حضرت شاہ صاحبؒ نے درسِ ابی داؤد دیوبند میں علامہ عینیؒ کا قول حدیث خروج النساء فی العید پر نقل کیا تھا کہ حدیث الباب سے جوازِ خروج النساء الی المصلی معلوم ہوتا ہے، مگر علماء نے فرمایا کہ یہ حضور علیہ السلام کے زمانہ کی بات تھی، ہمارے زمانہ میں جو ان عورت قبول صورت کا نکلنا جائز نہیں، اور حضرت عائشہؓ نے بھی فرمایا تھا کہ جو آزادی اب عورتوں نے اختیار کر لی ہے، وہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ہوتی تو وہ ان کے نکلنے کی ضرور ممانعت فرمادیتے۔ جیسے پہلے بنی اسرائیل کی عورتوں کے نکلنے کی ممانعت ہوگئی تھی۔

حضرت عائشہؓ کا یہ قول تو دورِ نبوت سے قریب ہی کا تھا اور اب جو حالت ہے اس سے تو خدا کی پناہ، لہٰذا عید وغیرہ کے لئے ان کے نکلنے کی رخصت نہیں دی جاسکتی، خصوصاً مصر کی عورتوں کے لئے "کمالا یخفی،،۔

علامہ طحاویؒ نے فرمایا کہ اولِ اسلام میں عورتوں کا عیدگاہ کے لئے نکلنا اس لئے تھا کہ شان وشوکت ظاہر ہو اور مسلمانوں کی تعداد کفار کو زیادہ نظر آئے، علامہ عینی نے کہا کہ وہ زمانہ امن واطمینان کا بھی تھا، اب تو امن وامان بھی نہیں ہے اگرچہ مسلمان بہت ہوگئے ہیں۔

حسبِ تحقیق صاحبِ بدائع حنفی جوان عورگوں کے لئے تو کوئی گنجائش مسجد وعیدگاہ کے لئے نکلنے کی ہے ہی نہیں البتہ بوڑھی عورتیں امن واطمینان ہو تو جاسکتی ہیں، تاہم افضل ان کے لئے بھی کسی نماز کے لئے بھی نہ جانا ہی ہے۔ پھر اگر وہ عیدگاہ جائیں تو امام ابوحنیفہ سے بروایتِ حسن یہ ہے کہ وہ نمازِ عید پڑھیں گی اور بروایت ابی یوسف یہ ہے کہ نہ پڑھیں گی بلکہ سوادِ مسلمین بڑھائیں گی اور مسلمانوں کی اجتماعی دعا سے استفادہ کریں گی۔ (انوارالمحمود ص ۱/۳۷۷)

قوله كن اذا سلمن من المكتوبة قمن

حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ اس لئے تھا کہ نماز سے فراغت کے بعد واپسی میں عورتوں مردوں کا اختلاط نہ ہو کیونکہ نظرِ شریعت میں یہ بھی ناپسندیدہ ہے۔

بَابُ صَلٰوةِ النِّسَآءِ خَلْفَ الرِّجَالِ

(مردوں کے پیچھے عورتوں کے نماز پڑھنے کا بیان)

۸۲۵. حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ قَزَعَةَ قَالَ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ هِنْدٍ بِنْتِ الْحَارِثِ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَلَّمَ قَامَ النِّسَآءُ حِيْنَ يَقْضِيْ تَسْلِيْمَهُ وَيَمْكُثُ هُوَ فِيْ مَقَامِهٖ يَسِيْرًا قَبْلَ اَنْ يَّقُوْمَ قَالَ نَرٰى وَاللّٰهُ اَعْلَمُ اَنَّ ذٰلِكَ لِكَيْ تَنْصَرِفَ النِّسَآءُ قَبْلَ اَنْ يُّدْرِكَهُنَّ مِنَ الرِّجَالِ.

۸۲۶. حَدَّثَنَا اَبُوْ نُعَيْمٍ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ اِسْحٰقَ عَنْ اَنَسٍ قَالَ صَلَّى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَيْتِ اُمِّ سُلَيْمٍ فَقُمْتُ وَيَتِيْمٌ خَلْفَهٗ وَاُمُّ سُلَيْمٍ خَلْفَنَا.

ترجمہ ۸۲۵۔ حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تھے، تو آپ کے سلام پھیرتے ہی عورتیں اٹھ کھڑی ہوتی تھیں، اور آپ اٹھنے سے پہلے اپنی جگہ میں تھوڑی دیر ٹھہر جاتے تھے، (زہری کہتے ہیں) ہم یہ جانتے ہیں واللہ اعلم، کہ یہ (ٹھہرنا آپ کا) اس لئے تھا کہ عورتیں قبل اس سے کہ مرد انہیں ملیں۔ لوٹ جائیں۔

ترجمہ: ۸۲۶۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے ام سلیم کے گھر میں (ایک دن) نماز پڑھی تو میں اور ایک لڑکا آپ کے پیچھے کھڑا ہوا اور ام سلیم ہمارے پیچھے (کھڑی ہوئیں)۔

تشریح:۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ اس باب اور احادیث سے معلوم ہوا کہ عورتوں کا مقام مردوں سے پیچھے ہے اور یہ روایت کے الفاظ قبل ان یدرکھن سے ثابت ہوا کیونکہ یہ جب ہی ممکن ہے کہ عورتیں پیچھے ہوں، اگر وہ آگے یا درمیان میں ہوں تو مردوں سے پہلے نہیں نکل سکتیں۔

علامہ عینی نے لکھا کہ غرضِ ترجمہ یہ ہے کہ عورتوں کی صفیں مردوں کی صفوں سے پیچھے ہوں، کیونکہ ان کے لئے ستر چاہئے اور مردوں سے پیچھے رہنے میں ہی ان کے لئے ستر زیادہ ہے۔ (الابواب ص۲/۳۰۸)

اس دور کی ترقی نے شریعت کے مقتضیات کو الٹ دیا ہے، کیونکہ ہر جگہ عورتوں کو آگے رکھا جاتا ہے، حتیٰ کہ مخلوط تعلیم کے کالجوں میں بھی لڑکیاں اگلی بنچوں پر اور لڑکے پیچھے بیٹھتے ہیں اور اس کے جو نتائج ہیں وہ ظاہر ہیں۔

بَابُ سُرْعَةِ انْصِرَافِ النِّسَآءِ مِنَ الصُّبْحِ وَقِلَّةِ مَقَامِهِنَّ فِيْ الْمَسْجِدِ

(صبح کی نماز پڑھ کر عورتوں کے جلد واپس ہونے اور مسجد میں کم ٹھہرنے کا بیان)

۸۲۷. حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ مُوْسٰى قَالَ حَدَّثَنَا سَعِيْدُ بْنُ مَنْصُوْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا فُلَيْحٌ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّے اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّى الصُّبْحَ بغلس فَيَنْصَرِفْنَ نِسَآءُ الْمُوْمِنِيْنَ لَا يُعْرَفْنَ مِنَ الْغَلَسِ اَوْلَا يَعْرِفُ بَعْضُهُنَّ بَعْضًا.

ترجمہ ۸۲۷۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھتے تھے تو مسلمانوں کی عورتیں (ایسے وقت) لوٹ جاتی تھیں کہ اندھیرے کے سبب سے پہچانی نہ جاتی تھیں، یا (یہ کہا کہ) باہم ایک دوسرے کو نہ پہچانتی تھیں۔

تشریح: حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ اس باب میں بھی یہ ثابت کیا گیا کہ عورتوں کو فتنہ کی وجہ سے صبح کی نماز میں شرکت نہ کرنی چاہئے، کیونکہ اگر ان کو مسجد میں دیر لگی تو اسفار میں واپس ہونگی، جو ان کے ستر کیخلاف ہے، اور اسی لئے عورتوں کیلئے سب سے پچھلی صفیں زیادہ بہتر ہیں، تاکہ نماز کے بعد جلد نکل سکیں۔ حافظ نے لکھا کہ ترجمہ میں صبح کی قید اس لئے لگائی کہ اس میں تاخیر سے دن کی روشنی بڑھے گی، لہٰذا جلدی واپسی بہتر ہوگی، بخلاف نمازِ عشا کے کہ اس میں تاخیر سے رات کی تاریکی بڑھے گی، لہٰذا تاخیر مضر نہ ہوگی، (الابواب ص۲/۳۰۸)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا مقصدِ ترجمہ یہ ہے کہ مردوں کو تو چاہئے کہ وہ نکلنے میں جلدی نہ کریں اور عورتوں کو تیزی سے نکل جانا چاہئے اور عورتیں مسجد میں زیادہ نہ ٹھہریں کہ اس سے مردوں کو تکلیف ہوگی۔

قولہ اولا یعرف بعضھن بعضا پر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں سے صراحۃً معلوم ہوگیا کہ عدمِ معرفتِ شخص مراد ہے کہ زید کو عمرو سے تمیز نہ کر سکیں، معرفت مرد کی عورت سے مراد نہیں ہے۔ جس کو علامہ نووی نے اختیار کیا۔ بعض **امالی میں لا یعرفن من الغلس** کے آگے ای **لا یعرف الرجال من النساء** درج ہوگیا ہے وہ غلط ہے، حضرت شاہ صاحبؒ اور سارے حنفیہ کے نزدیک مراد عدمِ معرفتِ شخص ہی ہے، جس کے لئے بہت اندھیرا ضروری نہیں، جھٹ پٹا اندھیرا چاہئے جو اول اسفار میں ہوتا ہے اور اتنا اندھیرا کہ جس میں مرد اور عورت کی تمیز نہ ہو سکے، صبح کی نماز کے لئے نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بَابُ اِسْتِيْذَانِ الْمَرْاَةِ زَوْجَهَا بِالْخُرُوْجِ اِلَى الْمَسْجِدِ

(عورت کا اپنے شوہر سے مسجد جانے کی اجازت مانگنے کا بیان)

۸۲۸. حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَزِيْدُ بْنُ زُرَيْعٍ عَنْ مَّعْمَرٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّے اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اسْتَاْذَنَتِ امْرَاَةُ اَحَدِكُمْ فَلَا يَمْنَعْهَا.

ترجمہ ۸۲۸۔ حضرت ابن عمرؓ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا جب تم میں سے کسی عورت (مسجد جانے کی) اجازت مانگے، تو وہ اس کو نہ روکے۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر حضرت عمرؓ کی زوجہ محترمہ عاتکہ بنت زیدؓ کا قصہ بیان کیا کہ وہ حضرت عمرؓ نے جب ان سے نکاح کرنا چاہا تو انہوں نے تین شرطیں رکھیں، ماریں گے نہیں، حق بات سے نہ روکیں گے، مسجد نبوی میں نماز کو جانے سے نہ روکیں گے۔ حضرت عمرؓ نے شرطیں قبول کیں اور نکاح ہوگیا، چنانچہ وہ نکاح کے بھی بکثرت مسجد نبوی جاتی رہیں، حضرت عمرؓ گو یہ بات ناگوار تھی مگر ان کو منع بھی نہ کر سکتے تھے، شرط مذکور کی وجہ سے یا اس لئے کہ حضور علیہ السلام کے ارشاد کی مخالفت ہوتی۔ تاہم حضرت ابن عمرؓ نے ان کو روکا تو انہوں نے کہا کہ وہ (حضرت عمرؓ) خود مجھے کیوں نہیں روکتے؟! وہ روکیں گے تو رک جاؤں گی، اس پر بھی حضرت عمرؓ نے نہیں روکا۔

پھر ایک دن حضرت عمرؓ نے ایسا کیا کہ صبح منہ اندھیرے جیسے ہی وہ مسجد گئیں، ایک گلی میں جا کر پیچھے سے ان کی چادر پر پاؤں رکھ دیا اس کی وجہ سے وہ فوراً ہی گھر لوٹ گئیں اور کہا کہ اب زمانہ باہر نکلنے کا نہیں رہا۔

دوسرا قصہ یہ ہے کہ ان ہی عاتکہ کا نکاح حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد حضرت زبیر بن العوامؓ سے ہوگیا تھا، اب حضرت عمرؓ ایسے سخت گیر شخص سے واسطہ نہ تھا، اس لئے پھر مسجد نبوی جانے لگی ہوں گی، اور حضرت زبیرؓ نے بھی صراحۃ ممانعت نہ کی۔ مگر پھر یہ تدبیر کی کہ ایک دن جب وہ عشا کی نماز کے لئے گھر سے نکلیں تو پیچھے سے جا کر ان کے ایک ہاتھ مارا۔ تو وہ لوٹ کر بولیں کہ اناللہ، لوگوں میں بہت ہی فساد آ گیا ہے، اور پھر کبھی نہ نکلیں۔ اس کے بعد حضرت زبیرؓ نے ان سے کہا کہ اب تم مسجد کیوں نہیں جاتیں؟ تو جواب دیا کہ ہم جب جایا کرتے تھے کہ لوگوں میں شرافت وانسانیت تھی۔

كِتَابُ الْجُمُعَةِ

(جمعہ کا بیان)

بَابُ فَرْضِ الْجُمُعَةِ لِقَوْلِ اللهِ تَعَالٰى اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ فَامْضُوْا ذَا مْضُوْا ۔ (جمعہ کی فرضیت کا بیان اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان کہی جائے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف چل پڑو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ فاسعوا فامضوا کے معنی میں ہے۔

۸۲۹۔ حَدَّثَنَا اَبُوْالْيَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُو الزِّنَادِ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ هُرْمُزَ الْاَعْرَجِ مَوْلٰى رَبِيْعَةَ بْنِ الْحَارِثِ حَدَّثَهٗ اَنَّهٗ سَمِعَ اَبَاهُرَيْرَةَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بَيْدَ اَنَّهُمْ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا ثُمَّ هٰذَا يَوْمُهُمُ الَّذِيْ فُرِضَ عَلَيْهِمْ فَاخْتَلَفُوْا فِيْهِ فَهَدَانَا اللهُ لَهٗ فَالنَّاسُ لَنَا فِيْهِ تَبَعٌ الْيَهُوْدُ غَدًا وَّالنَّصَارٰى بَعْدَ غَدٍ.

ترجمہ ۸۲۹۔ حضرت ابوہریرہؓ سے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہم دنیا میں آنے والوں کے اعتبار سے پیچھے ہیں۔ لیکن قیامت کے دن آگے ہوں گے، بجز اس کے کہ انہیں کتاب ہم سے پہلے دی گئی پھر یہی ان کا دن بھی ہے، جس میں اُن پر عبادت فرض کی گئی تھی، ان لوگوں نے تو اس میں اختلاف کیا، لیکن ہم لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت دی، پس لوگ اس میں ہمارے پیچھے ہیں، کل یہود کی عبادت کا دن ہے، اور پرسوں نصاریٰ کی عبادت کا دن ہے۔ تشریح:۔ امام بخاریؒ نے کتاب الجمعہ میں چالیس باب قائم کئے ہیں، جن میں سے پہلا باب فرضیت جمعہ کا گیارہواں باب جمعہ فی القریٰ کا اور باب نمبر ۳۱ و ۴۳ بابۃ نماز وقت خطبہ زیادہ اہم ہیں۔ کیونکہ ان میں اختلافی ابحاث اور مشکل حدیثی مباحث ہیں۔

ابتداءِ فرضیتِ جمعہ اور حافظ کا تفرد

اکابرِ امت میں سے بجز حافظ ابن حجرؒ کے سب یہ کہتے ہیں کہ جمعہ مکہ معظمہ میں فرض ہو چکا تھا مگر وہاں چونکہ حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابۂ کرام کھل کر آزادی سے نمازِ جماعت قائم نہ کر سکتے تھے، اور جمعہ کے لئے یہ شرط ہے کہ کھلی جگہ میں بلا کسی روک ٹوک کے تمام لوگ جمع ہو کر پڑھیں، اسی لئے قید خانہ یا کسی کے خاص محل میں جہاں لوگ آزادی سے جا کر شرکت نہ کر سکیں، جمعہ درست نہیں ہے مکہ معظمہ میں ظاہر ہے ایسی آزادی اور خود مختاری حاصل نہ ہوئی تھی، اس لئے وہاں جمعہ قائم نہ ہو سکا تھا، پھر حضور علیہ السلام ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ کے قریب قبا میں ٹھہرے۔ اور جمعہ کے دن مدینہ طیبہ پہنچ کر سب سے پہلا جمعہ آپ نے مسجد بنی سالم میں پڑھایا۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا کہ جمعہ کہاں فرض ہوا؟ اس میں اختلاف ہے، اور اکثر نے اس کو مدینہ میں قرار دیا ہے اور آیت سورۂ جمعہ **اذا نودی للصلوة من یوم الجمعة فاسعوا الی ذکر اللہ** سے بھی یہی معلوم ہوا کہ وہ مدینہ میں فرض ہوا کیونکہ یہ سورت مدنی ہے، اور شیخ ابو حامد کی یہ بات قابلِ تعجب ہے کہ انہوں نے اس کی فرضیت مکہ معظمہ میں بتلائی۔

حافظ نے جو قولِ ابی حامد کو غریب کہا، وہ اس لئے غریب نہیں کہ ایسی مثالیں شریعت میں موجود ہیں کہ آیاتِ قرآنیہ کا نزول بعد میں ہوا اور عمل پہلے سے شروع ہو گیا تھا، جیسے فرضیتِ وضو کی آیت بھی بعد کو مدنی سورۂ مائدہ میں نازل ہوئی اور عمل پہلے سے ہی مکہ معظمہ میں ہوتا رہا تھا۔

اکابر مفسرین اور علماءِ امت نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ جمعہ کے بارے میں آیتِ مذکورہ مدینہ میں اتری ہے اور جمعہ مکہ معظمہ میں فرض ہو چکا تھا۔ اسی لئے حضور علیہ السلام نے اپنی ہجرت سے قبل ہی اہلِ مدینہ کو حکم بھیج دیا تھا کہ وہ جمعہ قائم کر لیں چنانچہ طبرانی و دارقطنی میں ہے کہ آپ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو تحریر بھجوادی تھی کہ جمعہ کے دن زوال کے بعد دو رکعت نمازِ جمعہ پڑھ کر حق تعالیٰ کا تقرب حاصل کرو، حضرت مصعبؓ نے مدینہ طیبہ میں ۱۲ آدمیوں کے ساتھ نماز جمعہ پڑھی تھی اور مسندِ احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، بیہقی وغیرہ کی روایات سے معلوم ہوا کہ اس سے بھی پہلے حضرت اسعد بن زرارہؓ نے بنی بیاضہ کے علاقہ میں ۴۰ آدمیوں کے ساتھ نماز جمعہ پڑھی تھی۔

امام شافعی پر شوکانی کا اعتراض

علامہ سیوطیؒ نے "الاتقان" میں واضح کیا کہ بعض آیات قرآن مجید کی ایسی بھی ہیں کہ وہ بعد کو نازل ہوئیں، مگر شریعت کے حکم پر عمل پہلے سے ہو گیا تھا، امام شافعیؒ کے نزدیک چونکہ جمعہ قائم کرنے کے لئے شہر اور قریۂ کبیرہ کی شرط نہیں ہے، بلکہ کسی بستی میں اگر ۴۰ آدمی مسلمان ہوں تو وہاں بھی قائم ہو جاتا ہے اور اس کے لئے انہوں نے حضرت اسعد بن زرارہ کے واقعہ سے استدلال کیا ہے تو علامہ شوکانی نے اس پر اعتراض کیا ہے اور لکھا کہ یہ تو ایک خاص واقعہ تھا کہ چالیس آدمیوں کے ساتھ نماز جمعہ ہوئی، کسی حدیث میں تو ۴۰ کی شرط نہیں آئی ہے، صرف یہ واقعہ کیسے حجت و دلیل بن سکتا ہے؟

شوکانی کا یہ اعتراض درست ہے اور ظاہر ہے کہ اگر واقعاتِ خاصہ سے استدلال کرنے لگیں تو حضرت اسعد بن زرارہ نے تو حضور علیہ السلام کے حکم کے بعد ۱۲ آدمیوں کے ساتھ جمعہ پڑھایا تھا تو کیا اس سے بھی کوئی استدلال کر کے یہ مذہب بنا سکتا ہے کہ جہاں ۱۲ آدمی ہوں جمعہ کر لو۔

علامہ مودودی کی مسامحت

آپ نے تفہیم القرآن ص ۴۸۲/۵ میں لکھا کہ حضور علیہ السلام نے مدینہ طیبہ پہنچتے ہی پانچویں روز جمعہ قائم کر دیا تھا، پھر ص ۴۹۴/۵ میں لکھا کہ مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے آپ پیر کے روز قبا پہنچے، چار دن قیام کیا، پانچویں روز جمعہ کے دن وہاں سے مدینہ طیبہ کی طرف روانہ

ہوئے، راستہ میں بنی سالم بن عوف کے مقام پر تھے کہ نماز جمعہ کا وقت آ گیا، اسی جگہ آپ نے پہلا جمعہ ادا فرمایا (ابن ہشام)۔

پہلے جملے سے تو یہ تاثر ملتا ہے کہ قبا بھی گویا مدینہ ہی کا ایک حصہ تھا، حالانکہ وہ الگ ایک چھوٹی بستی تھی اور اب بھی الگ ہی ہے اور گویا وہ مدینہ کے قریب پہنچ کر راستہ کا قیام تھا، اور اسی لئے وہاں جمعہ آپ نے نہیں پڑھا حالانکہ حسب روایت بخاری وغیرہ آپ نے وہاں ۱۴ روز قیام کیا ہے، اور وہاں مسجد بھی بنوائی اور وہیں آ کر حضرت علیؓ بھی آپ سے ملے تھے، علامہ نے صرف ۴ دن قیام قبا کا ذکر کیا ہے، جو مرجوع قول ہے۔ راجح قول ۱۴ کا ہے بلکہ دوسرا قول زیادہ کا بھی ہے، واضح ہو کہ علامہ ابن قیم نے بھی زاد المعاد جمعہ کے بیان میں چار دن کا ہی قیام لکھا ہے۔ اگلے جملہ میں علامہ نے یہ تاثر دیا کہ حضور علیہ السلام نے نمازِ جمعہ راستہ میں جیسے کسی چھوٹی بستی میں پڑھی تھی، حالانکہ بنی سالم کا قبیلہ بجانب قبا مدینہ ہی کے ایک حصہ میں آباد تھا۔ اس طرح آپ مدینہ طیبہ ہی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے، اور مدینہ کے ایک سو صحابہ نے آپ کے ساتھ یہ پہلی نماز جمعہ مدینہ میں پڑھی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے تاریخ طبری سے نقل کیا کہ حضور علیہ السلام نے جو سب سے پہلا جمعہ پڑھا وہ مدینہ طیبہ میں بنی سالم بن عوف کے اندر تھا، وقال راجع شرح المواہب ص ۱/۳۵۴ وص ۱/۳۸۲ نیز لکھا کہ اہلِ تاریخ نے جو ۴ دن قبا کا قیام لکھا ہے وہ ان کی غلط فہمی ہے، درحقیقت حضور علیہ السلام پیر کے دن قبا پہنچے تھے اور وہاں اگلے پیر کے بعد جمعرات تک قیام کر کے جمعہ کو مدینہ طیبہ کے لئے نکلے ہیں، اور اسی کے مطابق ابن خلدون کی عبارت بھی ہے اور مسند ص ۱/۷۷ میں بھی یہی مراد ہے، اس کے ساتھ وہ رات بھی ملائی جاسکتی ہے جس میں حضور علیہ السلام نے بنی النجار کے پاس قبا سے پہلے قیام کیا تھا، **كما قال بعضهم وهو فى الحلبية**.

پھر حضرتؒ نے لکھا کہ قبا میں حضور علیہ السلام کا صرف چار روز قیام مانیں تو اس کے ساتھ یہ بھی مطابق نہ ہوگا کہ حضرت علیؓ نے حضور کے بعد تین دن مکہ میں قیام کرنے کے بعد (پیدل) سفر کیا اور قبا میں آ کر آپ سے ملے تھے۔ کمافی الوفاء ص ۲/۷۷ والحلبیہ عن الشامیۃ اور ایسے ہی مسجدِ قبا کی تعمیر سے بھی مطابقت نہ ہوگی۔ کیونکہ ان دونوں کے لئے چار دن کافی نہ ہوں گے۔ (قلبی حاشیہ آثار السنن ص ۲/۸۱)

علامہ نیموی نے بھی متعدد دلائل سے ثابت کیا ہے کہ بنو سالم کا محلہ مدینہ طیبہ کے محلات میں سے ہی ایک تھا اور بیہقی کی عبارت سے جو یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی بستی قبا اور مدینہ کے درمیان تھی، وہ بات بغیر تاویل کے صحیح نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ بات سب ہی نے تسلیم کی ہے کہ حضور علیہ السلام کا وہ پہلا جمعہ مدینہ طیبہ ہی کے اندر ہوا تھا۔ پوری تفصیل ہی قابلِ مطالعہ ہے (آثار السنن ص ۲/۸۱)

یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ قبا اور مدینہ طیبہ میں فاصلہ زیادہ نہیں ہے اب بھی وہی ہے اور دیکھا جاسکتا ہے اور حضور علیہ السلام مع صحابۂ کرام کے قبا سے دن چڑھے روانہ ہوگئے تھے۔ مدینہ طیبہ کی حدود میں زوال کے وقت پہنچے، اور محلۂ بنی سالم میں جمعہ کا وقت ہو جانے کی وجہ سے وہیں نمازِ جمعہ ادا فرمائی، اس کے بعد شہر کے وسط میں داخل ہوئے، آپ کو مستقل مقام تک پہنچنا تھا، جہاں جا کر اونٹنی کو مامور من اللہ ہونے کی وجہ سے بیٹھنا تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس کی تفصیل سب جانتے ہیں، لہٰذا یہ بات بہت مستبعد بھی ہے کہ قبا سے چل کر مدینہ سے پہلے ہی آپ کو کسی اور بستی میں پہنچ کر جمعہ کے لئے قیام کی ضرورت پیش آئی۔ اسی لئے بیہقی کے قول کی تاویل کرنی ضروری ہوئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فرضیتِ جمعہ کی شرائط

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ تو سب ہی نے مان لیا ہے کہ نمازِ جمعہ دوسری نمازوں سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے، اس لئے سب کے نزدیک اس کی شرائط وقیود الگ الگ ہیں، مثلاً حنفیہ کے یہاں اس کے لئے ایک بڑی شرط شہر یا قریہ کبیرہ ہے اور امام شافعی وغیرہ نے نماز جمعہ ادا کرنے والوں کی خاص تعداد پر انحصار کیا ہے، اب اس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

حنفیہ کا مسلک: نمازِ جمعہ جب صحیح ہوگی کہ وہ شہر یا بڑے قریہ (قصبہ) میں ہو یا شہر کی عیدگاہ میں ہو، منیٰ میں بھی جائز ہے موسمِ حج کے موقع پر، جبکہ امیر وقت ہی امیر الحاج ہو، یا خلیفۂ وقت مسافر ہو، تاہم امام محمد منیٰ میں بھی صحیح نہیں مانتے، اور عرفات میں تو کسی کے نزدیک صحیح نہیں، اس کے علاوہ دیہات (چھوٹی بستیوں) میں نمازِ جمعہ درست نہیں ہے، اور صحراؤں میں اور دیہات کے چشموں پر تو کسی مذہب میں بھی درست نہیں ہے۔

مالکیہ کا مسلک: جس گاؤں میں مسجد یا بازار ہو، وہاں جمعہ واجب ہے، اور ڈیروں خیموں میں رہنے والوں پر نہیں ہے، خواہ وہ تعداد میں کتنے ہی زیادہ ہوں۔ کیونکہ وہ مسافروں کے حکم میں ہیں۔

امام شافعی واحمدؒ: جس گاؤں میں چالیس مرد عاقل بالغ ہوں جو کبھی بلاضرورت وحاجت کے موسمی سفر نہ کرتے ہوں ان پر جمعہ واجب ہے اگر گرما یا سرما میں نقلِ آبادی کرتے ہوں تو ان پر بھی جمعہ نہیں ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے گھر ایک ساتھ ملے ہوئے ہوں، خواہ وہ لکڑی کے بنے ہوئے ہوں یا پتھروں سے یا مٹی وغیرہ سے البتہ اگر ان کے گھر منتشر ومتفرق ہوں تو ان کا جمعہ صحیح نہ ہوگا۔

ڈیروں خیموں میں رہنے والے اگر گرمی یا سردی کے موسموں میں انتقالِ مکانی کرتے ہوں تو ان کا جمعہ بھی درست نہ ہوگا اگر ہمیشہ ایک ہی جگہ رہتے ہوں اور ان کے خیمے بھی ایک جگہ مجتمع ہوں، تو ان کے بارے میں دو قول ہیں، اصح یہ ہے کہ اُن پر جمعہ واجب وصحیح نہ ہوگا، امام احمد وداؤد کے نزدیک واجب وصحیح ہوگا۔ (بزل ص ۲/ ۱۶۹)

غیر مقلدین کا موقف: اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ چاروں مذاہب کے اندر جمعہ کے لئے کچھ قیود ضرور ہیں، اور اسی لئے دوسری نمازوں کی طرح جمعہ نہیں ہے کہ وہ صحراؤں اور کھلے غیر آباد مقامات میں بھی ادا کیا جا سکے۔ لیکن بقول صاحبِ اعلاء السنن ہمارے زمانہ کے غیر مقلدین اس کے بھی قائل ہوئے کہ جمعہ بھی ہر جگہ درست ہے کیونکہ آیت میں فاسعوا الی ذکر اللہ آتا ہے وہ عام ہے، لہٰذا اس کی تخصیص اثرِ حضرت علیؓ سے نہیں ہوسکتی جو آحاد میں سے ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت بالا جماع اپنے اطلاق وعموم پر محمول نہیں ہے، اور عام جب مخصوص یا بالبعض ہو جاتا ہے تو اس کی تخصیص خبرِ واحد اور قیاس سے بھی ہو سکتی ہے۔ پھر یہ کہ وجوبِ سعی تو جب ہے کہ کہیں جمعہ کے لئے اذان ہو اور وہ اسی مقام پر ہوگی جہاں جمعہ قائم ہوسکتا ہو، تو جب ہر جگہ جمعہ کی اذان ہی نہ ہوگی، تو وجوبِ سعی اور نمازِ جمعہ پڑھنے کا سوال کیسے پیدا ہوگا؟ اور آیت میں محل اقامتِ جمعہ سے تعرض نہیں کیا گیا، اس لئے اس کی تعیین خارج سے کرنی پڑے گی، جس کے لئے فقہاء مجتہدین نے مندرجہ بالا فیصلے کئے ہیں۔

جواب مذکور اور دوسرے دلائل مذاہبِ اربعہ سے متاثر ہو کر کچھ سمجھدار غیر مقلدین نے دوسرے اپنے ہم مشرب لوگوں کی بات کو رد بھی کر دیا ہے اور اس امر کا اقرار کر لیا ہے کہ آیتِ وجوب جمعہ کا تعلق بلاد وامصار اور قیود وشرائطِ معلومہ ہی سے ہے اور ہونا چاہئے اس کو ذکر کر کے صاحبِ اعلاء نے لکھا کہ جب یہ بات غیر مقلدین کے سنجیدہ حضرات نے تسلیم کر لی ہے تو اب ان کو حنفیہ پر اعتراض بھی نہ کرنا چاہئے، جنھوں نے اثرِ علی کی وجہ سے تخصیص کر دی ہے الخ پوری بحث قابلِ مطالعہ ہے (اعلاء السنن ص ۸/۴)۔

دلائل حنفیہ: (۱) حضرت علیؓ نے فرمایا کہ عید وجمعہ کی نماز نہ ہوگی مگر مصر جامع میں (رواہ اعبدالرزاق و ابن ابی شیبہ والبیھقی فی المعرفہ و ھو اثر صحیح) مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۰۱ میں مصر جامع کے ساتھ یا مدینۂ عظیمہ کا بھی اضافہ ہے۔

علامہ نیموی نے اس حدیث پر مکمل بحث کی ہے اور اس کو اسانید صحیحہ سے ثابت کیا ہے اور بیہقی کے اس قول کا بھی جواب دیا ہے کہ یہ صرف حضرت علیؓ کا اثر ہے، حضور علیہ السلام سے کوئی روایت نہیں ہے، علامہ نیموی نے علماء اصول حدیث کے اقوال سے ثابت کیا کہ غیر مدرک بالرائی امور میں قول صحابی بھی بحکم مرفوع ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے تعلیقات آثار السنن ص ۲/ ۸۷ میں لکھا کہ المغنی میں امام احمد سے اس اثر علیؓ کے مرفوع ہونے کا بھی ثبوت ہے، جس میں انقطاع ہے، مگر دوسری کوئی قدح نہیں ہے۔

علامہ نیمویؒ نے نووی کے اس اثر کوضعیف متفق علی ضعفه کا جواب یہ دیا کہ انہوں نے اس کو بطریق حارث ضعیف کہا ہے،ہم نے جو بطریقِ عبدالرحمٰن السلمی حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے اس کی تمام اسانید صحیحہ ہیں،اور غالباً نووی ان پر مطلع نہیں ہوئے ہوں گے ورنہ اتنا بڑادعویٰ نہ کرتے۔

(۲) حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد کہ مسجد نبوی کے جمعہ کے بعد پہلا جمعہ مسجد عبدالقیس میں پڑھا گیا جو بحرین کے مقام جواثی میں ہے،علامہ نیموی نے لکھا کہ اس اثر سے بھی یہی ثابت ہوا کہ جمعہ صرف شہروں میں ہوسکتا ہے جیسے مدینہ میں ہوااور پھر جواثی میں بھی ہوالیکن دیہات میں جائزنہیں ہے۔

علامہ نیموی نے لکھا کہ جمعہ شہروں کے ساتھ اس لئے خاص تھا کہ جمعہ کی فرضیت مکہ معظمہ میں سورۃ جمعہ کے نزول سے قبل ہی ہو چکی تھی،جیسا کہ شیخ ابوحامد،علامہ سیوطی،ابن حجر مکی اور شوکانی نے کہا ہے،اور یہی اصح بھی ہے (خلافاللحافظ ابن حجر عقلانیؒ) حضور علیہ السلام مکہ معظمہ میں جمعہ کو قائم نہ کر سکے تھے،اس لئے آپ نے سب سے پہلا جمعہ مدینہ طیبہ میں پڑھا پھر اہلِ جواثی نے اپنے یہاں پڑھا جب ان کا وفد حضور علیہ السلام کے پاس سے لوٹ کر گیا تھا،جیسا کہ حافظ نے بھی فتح الباری میں کہا ہے،اوران کا آنا تحریم خمر بلکہ فرضیتِ حج کے بعد بتلایا ہے۔حسب روایت احمد عن ابن عباس،جس میں حج کا بھی ذکر ہے،اور حج ۶ ھ میں فرض ہو گیا تھا،علی الاصح۔اور واقدی کے قول پر وفدِ عبدالقیس کی آمد ۸ھ میں فتح مکہ سے قبل ہوئی ہے۔اس اثناء میں اسلام خوب پھیل چکا تھا،اگر جمعہ کا جواز دیہات میں بھی ہوتا تو بیسیوں دیہات میں جمعہ کی نمازادا کرنے کی شہرت ہو جاتی،اس لئے اتنی مدت کے بعد صرف جواثی میں جمعہ ہونے کا ذکر آنا ہی بتلاتا ہے کہ ہر جگہ اور دیہات میں جمعہ نہ ہوتا تھا۔(آثارالسنن ص۲/ ۸۷)۔

حضرت اقدس مولانا گنگوہیؒ نے بھی حدیث جواثی سے دوطریق پر استدلال کیا ہے ایک یہ کہ حضور علیہ السلام نے اہل عوالی اور مدینہ کے اردگرد بسنے والوں کو جمعہ قائم کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔حالانکہ آپ کے زمانہ میں ہی بکثرت چاروں طرف مسلمان ہو چکے تھے اور آپ کے زمانے میں صرف جواثی میں جمعہ ہونیکا ذکر ملتا ہے۔دوسرے یہ کہ خود جواثی بھی ایک شہر تھا،گاؤں نہ تھا،علامہ عینی نے اکابر علمائے حدیث واہلِ لغت سے بھی نقل کیا کہ جواثی ایک شہر تھا،اور بحرین میں ایک قلعہ کے طریقہ پر تھا،گویا وہ بڑا شہر تھا،جس میں قلعہ بھی تھا،علامہ عینی نے مفصل بحث کی ہے۔(لامع ص۲/ ۹)

علامہ نیموی نے لکھا کہ جواثا کھجور کی منڈی تھی اور بڑی تجارت گاہ بھی تھی،جہاں کھجوراور دوسری اشیاء لے جانے اور لانے والے آتے رہتے تھے اوراس لحاظ سے عرب میں اس شہر کی بڑی شہرت تھی اور امراءالقیس کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں ضرب المثل ہو گیا تھا،دوسرے وہ آبادی کے لحاظ سے بھی کافی بڑا تھا،علامہ عینی نے لکھا کہ اس میں چار ہزار نفوس رہتے تھے،یہ بھی بڑے قصبات اوراس زمانے کے لحاظ سے شہریت کے آثار تھے،پھر وہاں قلعہ بھی تھا،اور یہ بھی شہر کی شان تھی،لڑائیوں کے وقت لوگ قلعوں میں پناہ لیا کرتے تھے،اور حضرت ابوبکرؓ کے دورِخلافت میں جب بہت سے اہلِ بحرین مرتد ہو گئے،اور آپ نے علاء بن الحضرمی کوان سے قتال کے لئے بھیجا تھا،تواس وقت قتالِ عظیم پیش آیا تھا،اور مسلمانوں نے جواثی کے قلعہ میں پناہ لی تھی،الخ غرض ایسے بڑے قلعہ والی بستی کوشہر کہنا صحیح ہوگا یا گاؤں؟(آثارالسنن ص ۷/ ۸۱)

بعض شافعیہ نے جواثی کے بارے میں یہ کہا ہے کہ وہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں چھوٹا قریہ ہوگا اور بعد کوشہر بن گیا ہوگا،اس لئے جواثی سے استدلال دیہات کے جمعہ کے واسطے صحیح ہونا چاہئے،لیکن اس کوتو حضور علیہ السلام کے دور سے قبل امراء بالقیس کے زمانہ میں بھی شہر کی حیثیت حاصل تھی،اسی لئے اس نے اپنے مشہور اشعار میں اپنے ساتھ سفر میں پورے ساز وسامان ہونے کواس سے تشبیہ دی ہے کہ جیسے ہم جواثی کے اندر ہیں جہاں ہر قسم کی ضرورتوں کا اور آرائش وآرام کا سامان بازاروں میں بھرا رہتا ہے۔تو کیا شافعیہ کی تاویل کواس طرح صحیح مانا

جا سکتا ہے کہ وہ سابقہ ادوار میں بھی بڑا اور تجارتی شہر تھا اور بعد کو بھی ایسا ہی ہو گیا، مگر صرف حضور علیہ السلام کے زمانہ میں چھوٹا سا قریہ بن گیا تھا۔

(۳) امام بخاری کے استاذِ حدیث ابن ابی شیبہ م ۲۳۵ھ نے اپنے مصنف میں پہلا باب اس کا قائم کیا کہ جمعہ وعید کی نماز بجز مصرِ جامع کے دوسری جگہ نہیں ہو گی، پھر دوسرے باب میں ان لوگوں کا متدل بتلایا جو دیہات میں بھی اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ پہلے باب میں پہلی حدیث حضرت علیؓ والی ان الفاظ سے روایت کی کہ جمعہ وعید اور ان کی نمازوں کا قیام نہ ہو گا مگر مصرِ جامع میں یا مدینہ عظیمہ میں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱/۱۰۱)

(۴) حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ دیہات والوں پر جمعہ نہیں ہے۔ جمعہ صرف امصار (شہروں) اور مدائن (بڑے قصبات) میں ہے جیسے مداین کا شہر ہے، (//)

(۵) حسن بصری اور محمد بن سیرین نے فرمایا کہ جمعہ امصار (شہروں) میں ہے (//)

(۶) حسن بصری سے پوچھا گیا کیا ابلہ میں رہنے والوں پر جمعہ ہے؟ فرمایا نہیں! (//)

(۷) ابوبکر بن محمد نے ذوالحلیفہ والوں کی طرف پیغام بھیجا کہ تم اپنے یہاں جمعہ نہ کرو، اور جمعہ پڑھنا ہو تو مسجد نبوی میں جا کر پڑھا کرو (//)

(۸) ابراہیم سے نقل کیا گیا ہے کہ پہلے لوگ عساکر (چھاؤنیوں) میں جمعہ نہ پڑھتے تھے، نیز فرمایا کہ جمعہ وعید صرف شہروں کے لئے ہے اور مجاہد سے نقل ہوا کہ ری مصر و شہر ہے۔ (//)

(نوٹ) دوسرے باب میں محدث ابن ابی شیبہ نے صرف حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ کے ۲. ۳ اثر پیش کئے، کوئی حدیث مرفوع اس بارے میں نہیں لائے، جس سے دیہات میں جوازِ نماز جمعہ کا ثبوت ہو سکے۔

(۹) ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہؓ کا ارشاد نقل ہوا کہ جمعہ اس پر ہے، جو (قریب کیشہر میں نماز ادا کر کے) رات تک اپنے گھر آ سکے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ خود اپنے قریہ میں اس کے لئے نمازِ جمعہ صحیح نہیں ہے، نہ اس پر واجب ہے، شہر سے قریب کے نواحی دیہات والوں پر کچھ علماء کے نزدیک جمعہ واجب ہو جاتا ہے، دوسرے حضرات اس کو صرف مستحب کے درجہ میں رکھتے ہیں۔

(۱۰) ترمذی شریف میں یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے ہمیں حکم دیا تھا کہ قبا سے آ کر جمعہ پڑھا کریں، اس سے بھی معلوم ہوا کہ قبا ایسی جگہ میں بھی جمعہ فرض نہ تھا۔

(۱۱) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ لوگ اپنے منازل اور عوالی سے نوبت بہ نوبت نمازِ جمعہ کے لئے مدینہ طیبہ آیا کرتے تھے (بخاری و مسلم) حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا کہ وہ اسی طرح آیا کرتے تھے کہ کبھی کچھ آ گئے اور دوسرے وقت دوسرے لوگ آئے، سب نہ آتے تھے اور علامہ قرطبیؒ نے جو یہ یقین کر کے کہہ دیا کہ اس حدیث سے کوفیوں (حنفیہ وغیرہ) کا رد ہوتا ہے کہ وہ شہر سے باہر رہنے والوں پر جمعہ کو فرض نہیں بتلاتے تو اس کا رد خود حافظ ابن حجر نے ہی کر دیا ہے کہ علامہ قرطبی کی یہ بات محلِ نظر ہے اس لئے کہ اگر ان پر جمعہ فرض ہوتا تو اس صورت میں تو ہر جمعہ میں ان سب ہی کو آنا چاہئے تھا، نوبت بہ نوبت آنا تو خود ہی بتلا رہا ہے کہ ان لوگوں پر جمعہ فرض نہ تھا۔

(نوٹ) منازل سے مراد مدینہ سے قریب کے مکانات ہیں (**کذافی القسطلانی شرح البخاری**) عوالی سے مراد مدینہ طیبہ سے شرقی جانب کی بستیاں ہیں اس کے مقابل دوسری جانب کی بستیاں سوافل تھیں۔ (آثار السنن ص ۲/۸۸)

(۱۲) حضرت انسؓ اپنے قصرِ زاویہ میں رہتے تھے تو کبھی آپ جمعہ پڑھتے تھے، اور کبھی نہ پڑھتے تھے (**رواہ مسدد فی مسندہ الکبیر واسنادہ صحیح واخرجہ البخاری تعلیقا ص ۱۲۳**) زاویہ، بصرہ سے دو فرسخ پر تھا، جب آپ بصرہ جاتے تو وہاں جمعہ پڑھا کرتے تھے، اور جب اپنے قصرِ زاویہ میں رہتے تو نہ پڑھتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ زاویہ میں جموعہ نہ تھا۔ دوسری روایت ابن ابی شیبہ کے الفاظ اس طرح ہیں کہ وکیع نے ابوالبختری سے نقل کیا کہ میں نے حضرت انسؓ کو دیکھا کہ وہ زاویہ سے بصرہ آ کر جمعہ کی نماز میں شرکت

کیا کرتے تھے، راجح الوفاص ۲/ ۳۸۸ (آ ثار السنن ص ۲/ ۸۷)۔

(۱۳) امام شافعی نے فرمایا کہ حضرت سعید بن زید اور حضرت ابو ہریرہؓ شجرہ میں رہتے تھے جو شہر سے ۶ میل سے کم فاصلہ پر تھا کبھی تو دونوں جمعہ میں شرکت کرتے تھے اور کبھی چھوڑ دیتے تھے، اور ان میں سے ایک عقیق میں ہوتا تو جمعہ چھوڑ بھی دیتے تھے اور کبھی جا کر پڑھ بھی لیتے تھے، اور حضرت عمرو بن العاصؓ طائف سے ۲ میل پر تھے تو طائف جا کر جمعہ پڑھتے تھے، اور کبھی نہ جاتے اور جمعہ کو چھوڑ دیا کرتے تھے (وہ طائف سے ۲. ۳ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں رہتے تھے جس کا نام رہط تھا) آ ثار السنن ص ۲/ ۸۷) اوجز المسالک ص ۱/ ۳۵۲ میں اور بھی آ ثار اسی مضمون کے نقل کئے ہیں۔ اور لکھا کہ اس بارے میں روایاتِ قولیہ وفعلیہ اور آ ثار صحابہ وتابعین اتنے ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جاسکتا، اور ان سب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دیہات اور شہروں سے ملحقہ چھوٹی آبادیوں کے بسنے والوں پر جمعہ نہ تھا اور نہ وہاں جمعہ جائز تھا، اور نہ ان لوگوں نے وہاں جمعہ کی نماز جاری کی تھی (اوجز ص ۳۵۳/ ۳۵۱ اول)

(۱۴) اثرِ حضرت ابن عمرؓ بخاری کتاب المغازی ص ۵۶۹ میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو خبر ملی کہ **سعید بن زید بن عمرو بن فضیلؓ علیل** ہیں جو بدری تھے، تو جمعہ کے روز ہی دن چڑھے کہ جمعہ کا وقت بھی قریب ہی تھا وہ ان کی عبادت کے لئے روانہ ہو گئے، اور نمازِ جمعہ کو ترک کر دیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقعہ پر درسِ بخاری شریف میں فرمایا کہ حضرت ابن عمرؓ اس وقت ذوالحلیفہ میں تھے، جو مدینہ طیبہ سے ۶ میل پر ہے، اگر جمعہ وہاں پر واجب ہوتا تو عیادت کے لئے ایسے وقت نہ نکلتے اور ترکِ فرض کا ارتکاب نہ فرماتے۔

(۱۵) اثرِ حضرت عثمانؓ، بخاری کتاب الاضاحی میں ہے، اور موطا امام مالک میں بھی ہے کہ آپ نے نمازِ عید پڑھا کر بعد خطبہ اعلان کیا کہ اہلِ عوالی میں سے جو شخص رک کر جمعہ کا انتظار کرنا چاہے وہ رک جائے اور جو اپنی بستی میں جانا چاہے تو اس کو جانے کی اجازت ہے، اگر ان لوگوں پر جمعہ فرض ہوتا تو حضرت عثمانؓ ان کو رخصت کیسے دے سکتے تھے۔

آثار السنن، اوجز المسالک، اعلاء السنن اور **تعلیقاتِ مخطوطه علی آثار السنن للعلامة الکشمیری** میں حنفیہ کی تائید کیلئے نہایت اعلیٰ درجہ کا قیمتی ذخیرہ ہے، اور دوسری طرف کے دلائل کا مکمل رد بھی موجود ہے، افسوس ہے کہ ہم وہ ساری تفصیل نقل نہیں کر سکتے اور اس موقع پر حضرت شیخ الہندؒ کی اس بات کا پورا ثبوت ملتا ہے کہ جب حنفیہ کا مسلک سب سے الگ ہو تو وہاں ان کی احقیت اور بھی زیادہ روزِ روشن کی طرح عیاں معلوم ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی مجھے کہنا پڑتا ہے کہ اس حقیقت کو عیاں کرنے کے لئے علامہ عینی، شیخ ابن الہمام وغیرہ، اور قریبی دور کے اکابر میں سے صاحبِ بذل المجہود، محدث نیموی وعلامہ کشمیری جیسے حضرات کے افادات اور علمی کمالات کی ضرورت ہے۔ اور نہایت ہی افسوس ہے کہ اب ان حضرات کی علمی تحقیقات کو پڑھنے اور سمجھنے والے اور ان کو سلیقہ سے پیش کرنے والے بھی نادر ہوتے جارہے ہیں۔

ایک ضروری تنبیہ: اوپر بتلایا گیا کہ دیہات میں جمعہ قائم کرنے والوں کے پاس سب سے بڑی دلیل جواثی میں جمعہ پڑھنے کی ہے، جس کو امام بخاری نے بھی پیش کیا ہے۔ اور اس کا تعلق وفدِ عبدالقیس کے واقعہ سے ہے۔ اس میں تاریخی نقطہ نظر سے یہ بحث بھی ضمناً آ گئی ہے کہ یہ وفد کس سن میں حاضرِ خدمت نبوی ہوا تھا۔ اوپر ہم نے لکھا ہے کہ وہ وفد ۶ھ یا ۸ھ میں مدینہ طیبہ حاضر ہوا تھا۔ اور محققین نے جن میں حافظ ابن حجرؒ بھی ہیں یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ وفد دو بار آیا ہے، ۶ھ میں بھی اور پھر ۸ھ میں بھی۔ اس کی تفصیل **لامع الدراری** کے حاشیہ ص ۲/ ۹ میں بھی درج ہے، مگر یہاں خاص طور سے ذکر کرنا ہے کہ حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے دوسری بار کی ۸ھ کی آمد حضرت علامہ کشمیریؒ کی طرف سے نقل کر کے یہ ریمارک فرمادیا کہ علامہ کشمیری کی یہ بات سارے اہلِ سیر کے خلاف ہے، کیونکہ ان سب نے یقین کے ساتھ یہ فیصلہ کیا ہے کہ وفدِ عبدالقیس سنۃ الوفود (۹ھ) میں آیا تھا اور اسی کو جزم ویقین کے ساتھ ابن القیم اور حافظ ابن حجر نے بھی اختیار کیا ہے۔ جہاں تک ہمارا تجربہ، بلکہ مشاہدہ اور یقین کے قریب ہے وہ یہ کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کبھی کوئی کچی بات نہیں کہتے تھے اور آپ

کی علمی تحقیقات اکابر علماء سلف وخلف کی طرح نہایت بلند پایہ اور مستحکم ہوتی تھیں، یہ الگ بات ہے کہ آپ کے جو امالی درسِ ترمذی و بخاری کے شائع ہوئے، ان میں قلم بند کرنے والوں کی مسامحت اور طباعت کی بے احتیاطی سے بے شمار غلطیاں ہوگئی ہیں اور افسوس ہے کہ وہ غلطیاں بھی حضرت کی طرف منسوب کردی جاتی ہیں، اور اہلِ حدیث صاحبان نے بھی اِن سے غلط فائدہ اٹھایا اور اعتراضات قائم کئے جن کا دفاع معارف السنن اور انوار الباری میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے مگر حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم سے ایسی توقع نہ تھی کہ وہ اس طرح جزم و یقین کے ساتھ حضرت کے ارشاد کا رد کریں، اس لئے ہمیں یہاں کچھ عرض کرنا ہے۔

بعض اہلِ سیر نے تو وفدِ عبدالقیس کی حاضری ایک ہی بار مانی ہے جیسے ابن القیم نے ۹ھ میں اور ابن ہشام نے ۱۰ھ میں، ان دونوں کے قول پر احادیث بخاری و مسلم میں جو یہ آتا ہے کہ وفد مذکور نے کہا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفارِ مضر پڑتے ہیں ہم ان کی وجہ سے بجز اشہر حرم کے (کہ ان میں قتال اور لڑائیاں بند ہوتی ہیں) خدمتِ نبوی میں نہیں آ سکتے اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ فتح مکہ (۸ھ کے بعد کفارِ عرب اور اعداء اسلام کا زور ختم ہوگیا تھا، لہٰذا اس امر کو بنیاد بنا کر کہ احادیث وفد مذکور میں حج کا ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا ان کی آمد بعد فرضیت کے ۹ھ میں یا ۱۰ھ میں ماننی چاہئے، درست نہیں، کیونکہ اول تو حسبِ اقوال محققین حج کی فرضیت ۶ھ میں ہوگئی تھی، دوسرے یہ کہ بعض روایات میں حج کا ذکر بھی آ گیا ہے اور سنۃ الوفود کے ضمن میں جو اس وفدِ عبدالقیس کا ذکر اہلِ سیر اور امام بخاری وغیرہ نے کیا ہے تو یہ بھی ۹ھ کی دلیل نہیں بنتی، کیونکہ ان وفود میں وفد دوس بھی ہے جو ۷ھ میں حاضر ہوا تھا، ایسے ہی وفدِ عبدالقیس کی آمد کو جو دو بار مانتے ہیں، وہ پہلی بار ۵ھ یا اس سے بھی قبل کہتے ہیں، جیسے حافظ ابن حجر، علامہ عینی اور علامہ زرقانی وغیرہ۔

ان حالات میں دو بار کی آمد مان کر الگ سے یہ رائے قائم کرنا کہ سب سے پہلے ۸ھ میں وہ لوگ آئے تھے اور پھر ۹ھ میں عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ علامہ زرقانی نے پہلی بار ۶ھ میں بتلایا اور دوسری بار کو ۸ھ یا ۹ھ میں شک کے ساتھ لکھا ہے۔ (شرح المواہب ص ۴/ ۱۸)

حافظ ابن حجر نے لکھا کہ وفدِ عبدالقیس دوسرے وفود سے بہت قبل اسلام لایا ہے، اس لئے پہلے ۵ھ یا اس سے قبل ان کا پہلا وفد آیا تھا اور دوسری بار ۸ھ میں فتحِ مکہ سے پہلے آیا ہے، اس کے علاوہ ۹ھ اور ۱۰ھ کے اقوال بھی نقل کردیئے ہیں، مگر بظاہر ان کا رجحان ۶ھ اور ۸ھ ہی کے لئے ہے۔

قاضی عیاض نے تو وفد عبدالقیس کی آمد ۸ھ میں ہی اور قبل فتح مکہ پر جزم کیا ہے۔ (شرح المواہب ص ۴/ ۱۷)

علامہ واقدی نے بھی ۸ھ قبل فتح مکہ کا جزم کیا ہے (شرح المواہب ص ۴/ ۱۷)

محمد بن اسحٰق نے بھی ۸ھ قبل الفتح پر ہی یقین کیا ہے (عمدۃ القاری ص ۱/ ۳۶۲) علامہ عینی نے ۵ھ یا قبل کا قول بھی لیا ہے فرضیتِ حج کے سلسلہ میں واقدی سے ۵ھ، ۶ھ، ۸ھ اور ۹ھ کے اقوال نقل ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیل کے بعد ہمارے حضرت شاہ صاحب کا ارشاد پہلی حاضری وفدِ عبدالقیس کے لئے ۶ھ کا اور دوسری کے لئے ۸ھ کا اکثر اہلِ سیر اور روایاتِ محدثین کے موافق ہے، ۹ھ و ۱۰ھ کا قول مرجوح ہے۔

قاضی عیاض مالکی صاحبِ شفا اہلِ سیر کے سردار ہیں اور علامہ قسطلانی شافعی م ۹۲۲ھ اور علامہ و محدث زرقانی مالکی م ۱۱۲۲ھ بڑے محدث و مورخ بھی ہیں اسی طرح علامہ واقدی م ۲۰۷ھ اور محمد بن اسحٰق م ۱۵۱ھ کا درجہ حدیث کے لحاظ سے کم ہو مگر سیرت و تاریخ اسلام کے لئے ان کی شخصیت نہایت ممتاز ہیں، پھر یہ کہ دو بار وفد کی آمد کے قائلین (حافظ ابن حجر اور زرقانی وغیرہ) نے ۶ھ اور ۸ھ کو متعین کیا ہے، جبکہ شیخ الحدیث بھی دو بار کی صحت مان کر ۸ھ اور ۹ھ کو متعین کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا غالباً ابن القیم کی وجہ سے یا سنۃ الوفود کے ضمن وفدِ مذکور کا ذکر آنے کے سبب سے ہوا، مگر جیسا ہم نے اوپر لکھا ۹ھ کی بات روایاتِ بخاری و مسلم بابۃ کفارِ مضر کی وجہ سے مرجوح ہو جاتی ہے اور ابن القیم

نے جو فرضیتِ حج ۹ھ کی وجہ سے ۹ھ کو اختیار کیا تو وہ بھی مرجوح ہو گیا کیونکہ محققین نے فرضیتِ حج کو ۶ھ میں علی الاصح کہہ کر متعین کیا ہے۔

بہر حال محدثانہ اور مورخانہ دونوں نقاطِ نظر کو جمع کرنے سے حضرت شاہ صاحبؒ کا ارشاد ہی راجح معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کو تمام اہلِ سیر کے خلاف قرار دینا تو ہمیں کسی طرح بھی مناسب وموزوں معلوم نہیں ہوا، والعلم عنداللہ۔

کیونکہ ایک محدث کی نظر روایاتِ بخاری ومسلم ودیگر صحاح کے کفارِ مضر والے معاملہ سے قطع نظر نہیں کر سکتی، کہ وہ ۸ھ فتح مکہ کے بعد درست نہیں ہوسکتا، دوسرے محدثین حافظ ابن حجر وغیرہ نے ہی یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ عبدالقیس کے لوگ دوسروں سے بہت پہلے اسلام لا چکے تھے، اس لئے صرف یہ امر کہ ان کا قصہ بھی دوسرے وفود کے ضمن میں پیش ہو گیا ہے، ان کی آمد ۹ھ میں متعین نہیں کر سکتا، نیز علماء نے لکھا ہے کہ سنۃ الوفود نام اس لئے رکھا گیا تھا کہ زیادہ وفود اس سنہ میں آئے تھے، یہ نہیں کہ سارے ہی اس میں آئے تھے جیسا کہ ہم نے اوپر بتلایا کہ قبیلۂ دوس کا ذکر بھی وفود کے ساتھ ہی کیا جاتا ہے حالانکہ وہ ۷ھ میں اسلام لا چکے تھے۔

مکرر عرض ہے کہ حافظ ابن حجر سے ۹ھ (سنۃ الوفود) کے لئے جزم کی بات صحیح نہیں، کیونکہ ۹ھ کے علاوہ ۸ھ قبل الفتح کے اقوال بھی انہوں نے نقل کئے ہیں، اور ابن القیم کا جزم بسبب زعم فرضیت حج کے ہے کہ ان کے نزدیک وہ ۹ھ تک فرض نہ ہوا تھا بلکہ ۱۰ھ میں ہوا ہے حالانکہ دوسرے حضرات اکابر نے اس کو علی الاصح ۶ھ میں مانا ہے۔ یہاں زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ورنہ ہم یہ بھی بتلاتے کہ حافظ ابن قیم بلکہ ان کے استاذِ محترم علامہ ابن تیمیہؒ کے بھی کتنے ہی جزم سارے اکابرِ ملت کے خلاف واقع ہوئے ہیں تو کیا ان کے جزم کو ایسے تحقیقی مواقع میں پیش کرنا بہتر وخوشتر ہوسکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

آخر میں ہم حضرت شاہ صاحبؒ کے کلمات پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ وفد عبدالقیس کی حاضری دوبار ہوئی ہے، پہلی ۶ھ میں اور شاید یہ واقعہ اسی سن کا ہے کہ انہوں نے واپس ہو کر اپنے شہر جواثی میں جمعہ قائم کیا تھا پھر اس سے خیال کرو کہ ۶ھ تک کتنی ہی بستیوں میں لوگ مسلمان ہو چکے ہوں گے لیکن راوی کہتا ہے کہ مسجد نبوی کے بعد پہلا جمعہ جواثی کے اندر (۶ھ میں) قائم ہوا تھا، اگرچہ جمعہ ہر چھوٹے گاؤں میں قائم ہوسکتا تھا، جہاں ۲۰ یا ۴۰ ساکن ہوں جیسا کہ دوسرے لوگ کہتے ہیں تو کیا اتنی بڑی مدت میں کوئی ایک قریہ بھی نہ تھا۔ جہاں ۲۰ یا ۴۰ آدمیوں نے جمعہ قائم کیا ہو، جس کو جواثی کے سوا پیش کیا جاتا، اگر نہیں تو اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے نفاذ و اجراء کا عمل دیہات میں نہیں بلکہ صرف شہروں میں تھا۔

اہم ترین ضروری فائدہ

یہاں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ واقعات وحقائقِ تاریخیہ کو کسی فقہی وفروعی مسلک کی وجہ سے بدلنا مناسب نہیں اس لئے کسی کا قبا میں صرف چار روز قیام بتلانا، یا کسی کا یہ کہنا کہ حضور علیہ السلام نے پہلا جمعہ مدینہ میں نہیں بلکہ قبا اور مدینہ کے درمیان کی کسی بستی میں پڑھا تھا، یا کسی کا اپنے مسلک وجوبِ حج علی الفور کی وجہ سے وفد کی آمد ۹ھ میں قرار دینا، یا فرضیت حج کو ۶ھ کے اصح ترین قول سے ہٹا کر ۹ھ میں لے جانا وغیرہ حدیثی روایات یا تاریخی حقائق کو اپنے مسلک کے تابع کرنا ہے، حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ فقہی مسلک کو ان کے تابع کیا جائے۔ واللہ الموفق۔

قولہ نحن الآخرون السابقون ۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ آخرت اور محشر میں ایام وجہات سب بدل جائیں گی، یہاں تکوینِ عالم کی ابتداء سنیچر سے شروع ہو کر جمعرات پر ختم ہوتی تھی اور سب سے فارغ ہو کر استواء علی العرش ہوا تھا، کما یلیق بشانہ جل مجدہ، پھر کافی مدت کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش جمعہ کے دن آخر ساعت میں واقع ہوئی (شاید جمعہ کے دن آخری ساعت میں دعا کی قبولیت بھی اسی وجہ سے ہو، واللہ اعلم لہٰذا یہ جمعہ اس ہفتہ کا جمعہ نہ تھا جس میں سارے عالم کی تخلیق ہوئی تھی پھر قیامت بھی جمعہ کے

دن قائم ہوگی اور اسی دن سب سے پہلے امتِ محمدی کا حساب و کتاب ہوکر وہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگی اور اگلے دن سنیچر سے دوسری امتوں کا حساب و کتاب شروع ہوکر جمعرات تک ختم ہوگا۔ لہٰذا امتِ محمدیہ سب سے آخری امت ہوکر بھی آخرت میں سب پر سابق ہوجائے گی۔ جس کی طرف نحن الآخرون السابقون سے اشارہ ہوا، اگرچہ دوسرا اشارہ اس طرف بھی ہے کہ ہم جمعہ کا دن افضل اور عبادت کا سمجھتے ہیں اور یہود اگلے دن سنیچر کو اور اس سے بھی اگلے دن اتوار کو نصاریٰ افضل سمجھتے ہیں، اس سے بھی معلوم ہوا کہ ہم ان سب کے بعد آئے، مگر فضیلت و عبادت کا سب سے بہتر دن جمعہ کا ہمیں ان سے پہلے میسر ہوگیا۔

صحیفۂ بخاری: امام بخاری کی یہ حدیث الباب ان کے اس خاص صحیفہ میں سے سب سے پہلی حدیث ہے، جس میں تقریباً ایک سو احادیث درج ہیں، اسی طرح امام مسلم کے یہاں ایک صحیفہ ہے، جس کی طرف وہ دوسرے طور پر اشارہ کرتے ہیں۔

تخلیق آدم علیہ السلام: واضح ہو کہ یہ تخلیق حضرت آدم علیہ السلام کی تاخیر عالمِ تکوین کے لحاظ سے ہے، جس کے لحاظ سے افضل المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم کی خلقت بھی سب انبیاء علیہم السلام کے بعد ہوئی ہے، مگر ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسے عالم وجود وکون کی ابتداء پیدائش نورِ محمدی سے ہوئی تھی، لہٰذا وہی اول اخلق اور افضل الخلق بھی ہیں اور بعض روایات سے معلوم ہوا کہ عرشِ اعظم پر حضور علیہ السلام کا اسمِ گرامی پیدائش عالم سے بیس لاکھ سال قبل لکھا ہوا تھا (نشر الطیب حضرت تھانویؒ ص ۱۵۷)

سبت اور جمعہ: یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سبت عبرانی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی تعطیل منانے کے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے تتبع و تلاش کی تو معلوم ہوا کہ سبت جمعہ کا نام تھا، پھر معلوم نہیں کہ کب اور کس طرح اس میں تحریف ہوئی اور سبت سنیچر کو کہنے لگے، نصاریٰ (شروحِ توراہ) کی نقول سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو جمعہ کے روز کسی کام کی اجازت نہ تھی، اور جمعہ کے روز حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وعظ ہوا کرتا تھا، اس میں بطور بشارت کے یہ بھی بتلاتے تھے کہ بنی سبتی آخرالانبیاء آنے والے ہیں، اور حدیثِ بخاری میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام نے عمالقہ سے جنگ کی تو شام کے وقت غروبِ آفتاب نہ ہونے کے لئے یعنی تاخیر کی دعا فرمائی تاکہ غروب سے قبل فتح ہوجائے، کیونکہ اگلا دن جمعہ کا تھا، جس میں جنگ بند رہتی نیز انجیل میں ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دینی چاہی تو وہ جمعرات کا دن تھا، اس لئے کوشش کی کہ غروب سے قبل سولی پر چڑھا دیں تاکہ سبت (جمعہ) کا عمل شروع نہ ہوجائے (کہ اس میں کچھ نہ کرسکیں گے پھر انہوں نے اپنے خیال وزعم کے مطابق مثیل حضرت مسیح کو مسیح سمجھ کر غروب سے قبل سولی دے دی اور وہ سولی پاکر جمعہ و سنیچر کو قبر میں رہے اور اتوار کو اٹھائے گئے، اسی لئے مسیحی اتوار کو مقدس مانتے ہیں۔

قوله فهد انا الله

اس سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ نے جو جمعہ کو ترک کرکے سنیچر و اتوار کو اپنا مقدس ترین دن بنایا یہ ان کی بھول تھی، اور امت محمدی کو حق تعالیٰ نے اپنی رحمتِ خاصہ سے نواز کر ہدایت فرمائی کہ جمعہ کے دن کو انہوں نے افضل الایام قرار دیا۔

فللّٰه الحمد والشکر لهذه النعمة الجلیلة العظیمه۔

بَابُ فَضلِ الْغُسْلِ يَوْمَ الجُمَعَةِ وَهَلْ عَلَى الصَّبِيِّ شُهُوْدُ يَومِ الْجُمُعَةِ اَوْعَلَى النِّسَآءِ

(جمعہ کے دن غسل کی فضیلت کا بیان، اور یہ کہ کیا بچوں اور عورتوں پر نماز جمعہ میں حاضر ہونا فرض ہے۔)

۸۳۰. حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَاجَآءَ اَحَدُكُمُ الجُمُعَةَ فَلْيَغْتَسِلْ.

۸۳۱. حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ اَسْمَآءَ قَالَ حَدَّثَنَا جُوَيْرِيَةُ عَنْ مَّالِكٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ ابْنَ الخَطَّابِ رِضِيَ اللهُ عَنْهُ بَيْنَمَا هُوَ قَآئِمٌ فِي الْخُطْبَةِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اِذْجَاءَ رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ الْاَوَّلِيْنَ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَادَاهُ عُمَرُ اَيَّةُ سَاعَةٍ هٰذِهٖ قَالَ اِنِّيْ شُغِلْتُ فَلَمْ اَنْقَلِبْ اِلٰى اَهْلِيْ حَتّٰى سَمِعْتُ التَّاذِيْنَ فَلَمْ اَزِدْاَنْ تَوَضَّأْتُ قَالَ وَالْوَضُوْءُ اَيْضًا وَقَدْ عَلِمْتَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْمُرُ بِالغُسْلِ.

۸۳۲. حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ عَنْ عَطَآءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ غُسْلُ يَوْمِ الْجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُحْتَلِمٍ.

ترجمہ۸۳۰۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کی نماز کے لئے آئے تو چاہئے کہ غسل کرے۔

ترجمہ۸۳۱۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ جمعہ کے دن خطبہ پڑھ رہے تھے کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور اگلے مہاجرین میں سے ایک شخص آئے، تو انہیں حضرت عمرؓ نے آواز دی کہ یہ کون سا وقت آنے کا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ میں ایک ضرورت کے سبب سے رک گیا تھا، چنانچہ میں ابھی گھر بھی نہیں لوٹا تھا کہ میں نے اذان کی آواز سنی تو میں صرف وضو کرسکا، حضرت عمرؓ نے فرمایا اور کیا وضو بھی نہ کرتے، حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غسل کا حکم دیتے تھے۔

ترجمہ۸۳۲۔ حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر بالغ پر جمعہ کے دن غسل کرنا واجب ہے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری نے فضل الغسل کے عنوان سے عدمِ وجوب کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ غسل صرف مستحب وافضل ہے۔ اور اس سے اہلِ ظاہر کا رد ہوا جو کہتے ہیں کہ یہ غسل فرض ہے (ہدایۃ المجتہد ص ۱/۱۴۰) پھر سوال قائم کیا کہ بچوں اور عورتوں پر بھی جمعہ کی حاضری واجب ہے یا نہیں؟ لیکن اس کا جواب نہ دیا کیونکہ وجوب کے لئے کوئی دلیل شرعی نہ تھی، اور اسی لئے جمہور کے نزدیک ان سب پر جمعہ واجب نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس پر سب متفق ہیں کہ اگر یہ جمعہ میں شریک ہوں تو ان سے فرضِ وقت ادا ہوجائے گا۔ ان کا استثناء ابوداؤد وغیرہ کی صریح روایت میں بھی موجود ہے **قولہ اذاجاء احدکم** میں لفظ احدکم نے بتلایا کہ سب کو جمعہ میں آنا ضروری نہیں ہے لہٰذا ان پر غسل بھی نہ ہوگا اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ جمعہ کا حال دوسری جماعتوں جیسا نہیں ہے بلکہ اس کے لئے کچھ شرائط ہیں، جو ان کے لئے نہیں ہے۔

علامہ عینیؒ نے فرمایا کہ حدیثِ ابن عمرؓ سے من حیث المفہوم ترجمۃ الباب کی مطابقت ہو جاتی ہے کیونکہ منطوق تو عدم وجوب غسل ان کے لئے ہے جو جمعہ کو نہ آئیں اور جو نہ آئیں گے وہ جمعہ میں شریک بھی نہ ہوں گے، اور اس سے اس پر بھی تنبیہ ہوگئی کہ استفہام سے مراد حاضر نہ ہونے والوں پر عدمِ وجوب بتلانا ہے۔

شافعیہ کے نزدیک بھی غسل مستحب اور موکد ضرور ہے، مگر واجب نہیں، اور درمختار میں بھی ہے کہ نمازِ جمعہ وعید کے لئے غسل مسنون ہے اور اگر نماز کے بعد غسل کرے گا تو وہ اجماعاً معتبر نہ ہوگا (حاشیہ لامع ص ۲/۱۳)

وجوب واستحبابِ غسل کی بحث

امام بخاریؒ کی ایک حدیث الباب میں فلیغتسل آیا کہ جمعہ کے لئے جو آئے وہ غسل کر کے آئے اور تیسری حدیث میں ہے کہ ہر بالغ پر جمعہ کے دن غسل واجب ہے، حالانکہ تمام ائمہ کبار عدم وجوب پر متفق ہیں تو اس کے جوابات حافظ ابن حجر و دیگر حضرات نے متعدد لکھے ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ واجب ہے، آپ نے فرمایا نہیں، البتہ زیادہ طہارت و پاکیزگی غسل میں ہی ہے لیکن جو غسل نہ کرے گا تو اس پر واجب بھی نہیں ہے، اور حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ غسل جمعہ کی ابتدا اس وجہ سے ہوئی تھی کہ لوگ محنت ومزدوری سے گزر کرتے تھے اور اونی موٹے کپڑے پہنتے تھے، اور اس وقت مسجد بھی تنگ تھی، جب حضور علیہ السلام نے دیکھا کہ ان لوگوں کو ایک دوسرے سے تکلیف پہنچ رہی ہے اور پسینہ کی وجہ سے بو محسوس ہو رہی ہے تو آپ نے غسل کا حکم دیا اور خوشبو کے استعمال کی بھی ہدایت فرمائی ہے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس کے بعد وہ زمانہ نہ رہا، لوگ مالدار ہوگئے، محنت مزدوری کے بھی محتاج نہ رہے، کپڑے بھی بجائے صوف کے دوسرے اچھے پہننے لگے، مسجد میں بھی وسعت ہوگئی، تو پھر پسینہ وغیرہ کی تکلیف ختم ہوگئی لہٰذا غسل کا وجوب بھی باقی نہ رہا، یہ حدیث ابوداؤد وطحاوی کی ہے اور اس کی سند حسن ہے، الخ (فتح الباری ص ۲/ ۳۴۶)

ایک حدیث حضرت عائشہؓ سے بھی بخاری ومسلم میں ہے، آپ نے فرمایا کہ لوگ جمعہ پڑھنے کیلئے اپنے گھروں سے اور عوالی مدینہ سے چل کر گرد وغبار کے اندر آتے تھے اور غبار و پسینہ کے اثرات ان پر ہوتے تھے، ایک دن ایسا ہی ایک شخص حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ میرے ہی پاس تھے، آپ نے اس سے فرمایا، اچھا ہوتا کہ تم آج کے دن کیلئے نہا دھو کر صاف ستھرے ہوتے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا جمعہ کے دن غسل سنت ہے (معارف ص ۴/۳۲۳) عوالی مدینہ طیبہ سے ملحقہ بستیاں جو ۴ میل یا زیادہ فاصلہ پر تھیں (فتح الباری ص ۲/۲۶۳)

ان آثار سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ غسل کا تاکد جمعہ کے بڑے اجتماع کے سبب سے ہے کہ کسی کو اذیت نہ ہو، اور وہ تاکدِ حالات کے ماتحت وجوب تک بھی پہنچ سکتا ہے جبکہ اس کے بدن سے بدبو آ رہی ہو، کیونکہ سبب موثر معلوم ہو گیا، اس میں ضعف وشدت کی وجہ سے حکم بھی بدل جائے گا، اور عام حالات میں صرف استحباب یا تاکد ہی رہے گا، جو جمہور سلف وخلف کا مختار ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

علامہ ابن القیم کا تشدد

انہوں نے زاد المعاد میں لکھا کہ غسلِ جمعہ کا وجوب وتر وغیرہ کے وجوب سے بھی زیادہ قوی ہے، (اس موقع پر انہوں نے بہت سے واجبات گنائے اور حسبِ عادت مذاہب ائمہ پر تعریضات کی ہیں) معارف السنن ۴ص ۳۲۰ میں ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور جمہور سلف وخلف کا مذہب یہ ہے کہ غسل یوم الجمعہ سنت ہے واجب نہیں، اور اسی کو علامہ خطابی شافعی نے عامۂ فقہاء سے نقل کیا ہے اور قاضی عیاض مالکی نے بھی اس کو عامۂ فقہا وائمۃ الامصار سے نقل کیا ہے، علامہ ابن عبد البر مالکی نے اس بارے میں اجماع نقل کیا ہے اور کہا کہ تمام

علماءِ اسلام کا قدیماً وحدیثاً یہ فیصلہ ہے کہ جمعہ کا غسل فرض نہیں ہے، (قالہ العراقی فی شرح التقریب ۳ص۱۶۱) اور عمدۃ القاری ۳ص۲۲۵ میں ابن عبدالبر کی الاستذکار سے نقل کیا کہ میں نہیں جانتا کہ کسی نے بھی غسلِ جمعہ کو واجب کہا ہو بجز اہل الظاہر کے۔ مع ہذا ائمۂ مجتہدین کے تمام معتمد اصحاب کے نزدیک غسل کی صرف سنیت واستحباب ہے، وجوب نہیں ہے، اور امام مالک سے جو کئی اصحاب نے اس کے خلاف نقل کیا ہے اس کو ان کے اصحاب نے ہی رد کر دیا ہے، ابن حزم نے جو حضرت عمرؓ وغیرہ صحابہ سے وجوب نقل کیا ہے، حافظ ابن حجر نے اس کے بارے میں فتح الباری میں لکھا کہ ان کے آثار میں سے کسی میں کسی سے بھی اس امر کی صراحت وارد نہیں ہے، الا نادراً، درحقیقت اس بارے میں اشیاءِ محتملہ پر اعتماد کر لیا گیا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام مالک کی طرف جو وجوب کا قول منسوب ہوا، ہوسکتا ہے وہ اس لئے ہو کہ وہ سنتِ مؤکدہ پر بھی وجوب کا اطلاق کرتے ہیں، اور مالکیہ کے کلام میں لفظِ وجوب کا اطلاق سنت پر بکثرت ہوا ہے (معارف ۴ص۳۲۱) علامہ ابن دقیق العید مالکی شافعیؒ نے فرمایا کہ امام مالک نے وجوبِ غسل کی صراحت تو کی ہے مگر اس کو ان لوگوں نے جن کو امام مالک کے مذہب کی ممارست نہیں ہے غلطی سے ظاہر پر محمول کر لیا، اسی لئے ان کے اصحاب نے اس سے انکار کیا ہے اور امام مالکؒ سے التمہید میں اس کے لئے ایک روایت بھی ہے کہ ان سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ غسل جمعہ بہتر ہے واجب نہیں ہے اور ابن خزیمہ کی طرف بھی وجوب کا قول منسوب ہو گیا ہے حالانکہ انہوں نے اپنی صحیح میں تصریح کر دی ہے کہ غسل میں اختیار ہے الخ (فتح الملہم ۲ص۳۸۴) فتح الملہم میں کافی مفصل بحث ہے۔ دیکھی جائے۔

علامہ خطابی وغیرہ نے اس پر بھی اجماع نقل کیا ہے کہ نمازِ جمعہ بلا غسل کے درست ہو جاتی ہے (ج ۲ص۳۸۵) اور اگر غسل واجب ہوتا تو سب کے نزدیک کیونکر درست ہو جاتی؟ معلوم نہیں ابن القیم میں اتنی شدت کہاں سے آئی؟!

صاحبِ تحفہ کی معتدل رائے

آپ نے غسلِ جمعہ کی احادیث وجوب واستحباب کے بعد آخر میں لکھا کہ اس بارے میں مختلف احادیث وارد ہوئی ہیں۔ بعض سے وجوب اور بعض سے صرف فضیلت واستحباب ثابت ہوتا ہے میرے نزدیک سنتِ مؤکدہ ہونے کو ترجیح ہے کیونکہ اس سے سب مختلف احادیث میں جمع کی صورت بن جاتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم (تحفۃ الاحوذی ۱ص۳۵۸)

بَابُ الطِّيبِ لِلْجُمُعَةِ

(جمعہ کے دن خوشبو لگانے کا بیان)

۸۳۳. حَدَّثَنَا عَلِيٌّ قَالَ اَخْبَرَنَا حَرَمِيُّ بْنُ عُمَارَةَ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ اَبِیْ بَكْرِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ قَالَ حَدَّثَنِیْ عَمْرُو بْنُ سُلَيْمِ نِ الْاَنْصَارِیُّ قَالَ اَشْهَدُ عَلٰی اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ اَشْهَدُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْغُسْلُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلٰی كُلِّ مُحْتَلِمٍ وَّاَنْ يَّسْتَنَّ وَاَنْ يَّمَسَّ طِيْبًا اِنْ وَّجَدَ قَالَ عَمْرٌو وَاَمَّا الْغُسْلُ فَاَشْهَدُ اَنَّهٗ وَاجِبٌ وَّاَمَّا الْاِسْتِنَانُ وَالطِّيْبُ فَاللّٰهُ اَعْلَمُ وَاجِبٌ هُوَ اَمْ لَا وَلٰكِنْ هٰكَذَا فِی الْحَدِيْثِ قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ هُوَ اَخُوْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ وَلَمْ يُسَمَّ اَبُوْ بَكْرٍ هٰذَا رَوٰی عَنْهُ بُكَيْرُ بْنُ الْاَشَجِّ وَسَعِيْدُ بْنُ اَبِیْ هِلَالٍ وَّعِدَّةٌ وَّكَانَ مُحَمَّدُ بْنُ الْمُنْكَدِرِ يُكْنٰی بِاَبِیْ بَكْرٍ وَّ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ.

ترجمہ ۸۳۳۔ عمرو بن سلیم انصاری نے کہا کہ میں ابوسعید خدری پر گواہی دیتا ہوں کہ انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر

گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے فرمایا کہ جمعہ کے دن ہر بالغ پر غسل کرنا واجب ہے اور یہ کہ مسواک کرے اور میسر ہونے پر خوشبو لگائے، عمرو بن سلیم نے بیان کیا کہ غسل کے متعلق میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ واجب ہے لیکن مسواک کرنا اور خوشبو لگانا تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے کہ وہ واجب ہے یا نہیں، مگر حدیث میں اسی طرح ہے، ابوعبداللہ (بخاری) نے کہا کہ وہ (ابوبکر بن منکدر) محمد بن منکدر کے بھائی ہیں اور ابوبکر کا نام معلوم نہیں ہوسکا، اوران سے بکیر بن اشج، اور سعید بن ابی ہلال اور متعدد لوگوں نے روایت کی ہے اور محمد بن منکدر کی کنیت ابوبکر اور ابوعبداللہ تھی۔

تشریح: جمعہ کی نماز کے وقت خوشبو کا استعمال بھی مستحبات میں سے ہے، اسی کے ساتھ مسواک کو بھی مستحب فرمایا گیا، اور غسل کو اس حدیث الباب میں بھی واجب کہا گیا، جبکہ تینوں کا بیان ساتھ ہی ہوا ہے، خوشبو عطر وغیرہ چونکہ ہر ایک کو میسر نہیں ہوتی، اس لئے ان وجد کی قید لگا دی، مسواک میں کوئی دقت نہیں، اس لئے قید نہ لگی، غسل سے چونکہ خود کو بھی فائدہ اور دوسروں کو بھی راحت ملی ہے اور کوئی خرچ یا دشواری بھی نہیں اس لئے اس کو زیادہ مؤکد کر دیا گیا آگے عمدہ کپڑے پہن کر جمعہ کی شرکت کی ترغیب بھی آ رہی ہے وہ بھی اس بڑے اور مقدس اجتماع کی اہمیت بتلانے کے لئے ہے۔

آگے امام بخاری ایک باب میں جمعہ کے دن پاکیزگی اختیار کر کے بالوں کی صفائی اور تیل لگانے کو بھی مستحب ثابت کریں گے اور مسواک کے لئے الگ باب بھی قائم کریں گے۔ اور ایک باب میں پیدل چل کر جمعہ کی نماز میں شرکت کرنے کی بھی فضیلت بتلائیں گے۔

ایک باب میں حدیثِ نبوی سے یہ ادب ثابت کریں گے کہ جامع مسجد میں پہنچ کر بیٹھے ہوئے آدمیوں کے درمیان میں گھس کر نہ بیٹھے کہ ان کو تکلیف ہوگی، ایک باب میں یہ ادب بتلائیں گے کسی کو اٹھا کر خود اس جگہ پر نہ بیٹھے، ایک ادب یہ سکھائیں گے کہ امام خطبۂ جمعہ شروع کر دے تو اس کو خاموشی سے سنے، اور اس وقت کلام وغیرہ سے احتراز کرے۔ بعض احادیث میں خاص طور سے جمعہ کے دن چونکہ مجمع زیادہ ہوتا ہے اور بعد کو آنے والے آگے پہنچنے کی سعی کیا کرتے ہیں تو یہ ادب سکھایا گیا کہ دوسرے بیٹھے ہوئے آدمیوں کے اوپر سے پھلانگ کر نہ جانا چاہئے۔ ان سب باتوں سے بھی معلوم ہوا کہ جمعہ کی نماز کے احکام و آداب دوسری نمازوں سے الگ اور ممتاز ہیں۔ جس کی طرف ہم نے شروع میں اشارہ بھی کیا تھا۔

بَابُ فَضْلِ الْجُمُعَةِ

(جمعہ کی فضیلت کا بیان)

۸۳۴۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ سُمَيٍّ مَّوْلٰى اَبِيْ بَكْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ اَبِيْ صَالِحِ نِ السَّمَّانِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ غُسْلَ الْجَنَابَةِ ثُمَّ رَاحَ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ بَدَنَةً وَّمَنْ رَّاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّانِيَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ بَقَرَةً وَّمَنْ رَّاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّالِثَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ كَبْشًا اَقْرَنَ وَمَنْ رَّاحَ فِي السَّاعَةِ الرَّابِعَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ دَجَاجَةً وَّمَنْ رَّاحَ فِي السَّاعَةِ الْخَامِسَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ بَيْضَةً فَاِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ حَضَرَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ.

ترجمہ ۸۳۴۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جمعہ کے دن غسلِ جنابت کیا، پھر نماز کے لئے چلا تو گویا اس نے ایک اونٹ کی قربانی کی، اور جو شخص دوسری گھڑی میں چلا تو گویا اس نے ایک گائے کی قربانی کی اور تیسری گھڑی میں چلا تو گویا ایک سینگ والا دنبہ قربانی کیا، اور جو چوتھی گھڑی میں چلا تو گویا ایک مرغی قربانی کی، اور جو پانچویں گھڑی میں چلا تو اس نے گویا ایک انڈا اللہ کی راہ میں دیا، پھر جب امام خطبہ کے لئے نکل جاتا ہے تو فرشتے ذکر سننے کے لئے حاضر ہو جاتے ہیں۔

تشریح: اس باب میں امام بخاریؒ نے جمعہ کی نماز میں شرکت اور اولاول فالاول کی فضیلت بیان کی لیکن اکابرِ امت اس بارے میں

مختلف ہیں کہ یہ فضیلت صبح ہی سے شروع ہوجاتی ہے یا بعد زوال کے جس سے نمازِ جمعہ کا وقت شروع ہوتا ہے جمہور کی رائے اول کے لئے ہے اور امام مالک بعد زوال کے قائل ہیں، کیونکہ راح رواح سے ہے جس کے معنے بعد زوال کے چلنے کے ہیں، جمہور کا استدلال تعاملِ سلف سے ہے کہ لوگ صبح ہی سے مسجدِ جامع میں آنے لگتے تھے اور نماز کے بعد لوٹ کر ہی کھانا بھی کھاتے اور قیلولہ کیا کرتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ الفاظ پر مسائل کو منحصر نہ کرنا چاہئے، بلکہ تعامل کو دیکھنا چاہئے، پھر فرمایا کہ بعض جاہلوں نے (مراد غیر مقلد ہیں) مرغی کی قربانی بھی اس حدیث سے نکال لی ہے، حالانکہ یہاں قربانی کے مسائل نہیں بیان ہوئے، بلکہ فضیلت کے مختلف مراتب سمجھانے کے لئے جانوروں کی قربانی کے اعلیٰ اور ادنیٰ مراتب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے قربانی کے مسائل علماء امت میں سے کسی نے بھی نہیں سمجھے، اور نہ اس کے مطابق امت میں کچھ تعامل ہوا ہے، اور اگر اسی اجتہاد پر اصرار ہے تو بخاری و مسلم شریف میں تو بیضہ کا بھی ذکر ہے، تو اس کی بھی قربانی جائز کر دینی چاہئے۔

یومِ جمعہ کے فضائل

یہ تو نمازِ جمعہ کی شرکت کے لئے الاول فالاول حاضرِ مسجد ہونے کی فضیلت ہے، اس کے علاوہ خود روزِ جمعہ کے فضائل بھی بکثرت وارد ہوئے ہیں۔

ا- ایک بڑی فضیلت تو بخاری کی پہلی حدیث نحن الاخرون السابقون میں ہی آ چکی ہے (۲) مسندِ احمد اور سنن کی حدیث میں ہے کہ دنوں میں افضل ترین دن جمعہ کا ہے اسی میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے، اسی میں ان کی وفات ہوئی اور اسی میں قیامت آئے گی، اس دن میں مجھ پر زیادہ سے زیادہ درود بھیجو، کیونکہ وہ میرے پاس پہنچایا جاتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ آپ پر ہماری صلوٰۃ و سلام کیونکر پیش ہوں گی جبکہ قبر مبارک میں آپ کی ہڈیاں پرانی ہو جائیں گی؟ تو آپ نے فرمایا، ایسا نہیں ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام زمین پر حرام کر دیئے گئے ہیں، اور وہ بدستور محفوظ رہتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے "جذب القلوب الی دیار المحبوب" میں لکھا کہ حیاتِ انبیاء علیہم السلام میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے لکھا کہ سماع اموات میں جو کچھ اختلاف ہے وہ غیر انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہے، انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، اس بارے میں ہمارے حضرت نانوتوی قدس سرہ کی کتابِ مستطاب "آبِ حیات" بھی قابلِ مطالعہ ہے بلکہ حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے، ہم اس کے بارے میں پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور مہمات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۳) حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ میں جمعہ کی ایک بڑی فضیلت یہ بتائی کہ اس دن میں نمازِ جمعہ قائم کر کے نماز کو بین الاقوامی شہرت اور امتیاز عطا کیا گیا ہے۔ (اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جمعہ کا قیام شہروں اور بڑے قصبات ہی کے مناسب ہے، گاؤں گاؤں میں اس کو عام کرنے سے اس کی حیثیت روزانہ کی پنج وقتہ نمازوں جیسی ہو جاتی ہے۔ جس طرح آج کل بخاری کا درس چھوٹے مدارس میں بھی ہونے لگا ہے اور اس سے صحیح بخاری شریف کی عظمت اور امتیازی شان مجروح ہوتی ہے۔)

(۴) ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ جمعہ کا دن سید الایام ہے اور وہ سب دنوں سے زیادہ اعظم و افضل ہے۔ حتیٰ کہ دونوں عید کے دنوں سے بھی زیادہ عظمت والا ہے۔

(۵) جمعہ کے دن ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ جس میں دعا قبول ہوتی ہے بشرطیکہ امرِ حرام کا سوال نہ ہو۔ (بخاری و مسلم) وہ گھڑی شروع خطبۂ جمعہ سے نمازِ جمعہ سے فراغ تک ہے یا عصر مغرب کے درمیان ہے۔ واللہ اعلم۔

(۶) جمعہ کفارۂ سیئات کا دن ہے (۷) جمعہ کی برکت سے اس دن دوزخ کی آگ میں گرمی کم ہوجاتی ہے۔ (۸) بخاری و مسلم کی حدیث قربانی کی مثال سے اشارہ ہوا کہ جیسے عید کی حیثیت سال میں ہے اور سال میں نمازِ عید و قربانی دو عبادت جمع ہوجاتی ہیں، ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے ہفتہ میں یوم جمعہ کو یوم الصلوٰۃ قرار دے کر اس کے لئے سعی کا حکم دیا اور جلدی جلدی چل کر آنے والوں کو قربانی کرنے والوں سے تشبیہ دے کر یہ بتلایا کہ وہ گویا سالانہ عید کی طرح نماز اور قربانی دونوں کو جمع کر رہے ہیں (۹) جمعہ کے دن صدقہ خیرات کرنا ہفتہ کے دوسرے دنوں سے زیادہ افضل ہے۔ جیسا کہ رمضان میں صدقہ کرنا دوسرے مہینوں کے مقابلہ میں زیادہ فضیلت رکھتا ہے، اسی لئے بعض اکابر کا معمول رہا ہے کہ وہ جب جمعہ کے لئے نکلتے تھے تو صدقہ خیرات کرنے میں بھی حرص کرتے تھے۔ اور آیت اذا ناجیتم الرسول سے استدلال کرتے تھے کہ جب حضور علیہ السلام سے مناجات کے قبل صدقہ کا حکم ہوا ہے تو حق تعالیٰ سے مناجات کرنے سے قبل تو صدقہ اور بھی زیادہ افضل ہونا چاہئے۔ ایک حدیث میں اس صدقۂ یوم جمعہ کی فضیلت صراحۃً بھی وارد ہے۔ (۱۰) سورۂ بروج کی آیت میں جو حق تعالیٰ نے شاہد و مشہود کی قسم کھائی ہے مفسرین نے شاہد سے مراد یوم جمعہ اور مشہود سے مراد یوم عرفہ لیا ہے۔ یہ بھی یوم جمعہ کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ **تلک عشرۃ کاملہ**۔ لہٰذا اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔ **اللہ یرزقنا من فضائل یوم الجمعۃ وبرکاتھم**۔

بابٌ

۸۳۵. حَدَّثَنَا اَبُوْ نُعَیْمٍ قَالَ حَدَّثَنَا شَیْبَانُ عَنْ یَحْیٰی هُوَ ابْنُ اَبِیْ کَثِیْرٍ عَنْ اَبِیْ سَلَمَةَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ بَیْنَمَا هُوَ یَخْطُبُ یَوْمَ الْجُمُعَةِ اِذْ دَخَلَ رَجُلٌ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِمَ تَحْتَبِسُوْنَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَقَالَ الرَّجُلُ مَاهُوَ اِلَّا اَنْ سَمِعْتُ النِّدَآءَ تَوَضَّأْتُ فَقَالَ اَلَمْ تَسْمَعُوا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا رَاحَ اَحَدُکُمْ اِلَی الْجُمُعَةِ فَلْیَغْتَسِلْ.

ترجمہ ۸۳۵۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ ایک بار جمعہ کے دن خطبہ پڑھ رہے تھے کہ اسی اثناء میں ایک شخص آیا تو حضرت عمر بن خطابؓ نے کہا کہ تم نماز سے کیوں رک جاتے ہو، اس شخص نے کہا کہ اذان کی آواز سنتے ہی میں نے وضو کیا (اور چلا آیا) حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا تم نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے نہیں سنا کہ جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کی نماز کے لئے روانہ ہو تو غسل کرے۔

تشریح: حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ باب بلا ترجمہ اس لئے ہے کہ اس کا تعلق بظاہر فضل جمعہ والے سابق باب سے نہیں ہے، اور اس لحاظ سے تعلق بھی ہے کہ پہلے باب میں نمازِ جمعہ کیلئے تبکیر (صبح ہی سے جلد تر نمازِ جمعہ کیلئے حاضری) کی فضیلت بیان ہوئی تھی، اور یہاں ان کا رد ہوا جو ترکِ تبکیر پر اہل مدینہ کا اجماع بتلاتے ہیں، چونکہ حضرت عمرؓ نے مدینہ طیبہ کے صحابہ و کبارِ تابعین کے مجمع میں ترک تبکیر پر نکیر کی ہے اور جمعہ کی فضیلت اور اس کی بڑی عظمت و اہمیت حضرت عمرؓ کے نزدیک نہ ہوتی تو وہ دیر سے آنے والے پر اس طرح خطبہ کو روک کر اور سب کی موجودگی میں برملا نکیر نہ فرماتے۔ (فتح الباری ۲ ص ۲۵۳) حسب تصریح محدثین یہ آنے والے ذوالنورین سیدنا حضرت عثمانؓ تھے۔

تبکیر و تہجیر کی بحث

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ممکن ہے امام بخاری اس باب بلا ترجمہ سے مسئلۂ تبکیر و تہجیر ہی کی طرف اشارہ کر گئے ہوں، اس طرح یہ باب گویا بابِ سابق فضلِ جمعہ کا تکملہ ہے، اور حافظ کا اشارہ بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

واضح ہو کہ امام بخاری جو حدیث فضلِ جمعہ میں لائے ہیں اسی کو امام مسلم نے کتاب الجمعہ کے تحت درج کیا ہے، اور امام ترمذی نے مستقل باب ''التبکیر الی الجمعہ'' قائم کر کے اسی حدیث بخاری کو بعینہ اسی سند سے لیا ہے، امام مالکؒ کے موطأ میں یہ حدیث ''باب العمل فی

غسل یوم الجمعہ'' کے تحت آئی ہے کیونکہ اس میں غسل کا ذکر شروع میں ہے۔ اوجز میں قولہ ثم راح کے تحت ہے کہ ابتداءِ ساعات میں اختلاف ہے، جماہیر علماء کے نزدیک ساعاتِ اول النہار سے ہی ابتدا ہو جاتی ہے، اسی کو مالکیہ میں سے ابن حبیب نے اور امام شافعی و ابو حنیفہ و احمد اوزاعی، ابن المنذر وغیرہ نے بھی اختیار کیا ہے، صرف امام مالک کی رائے یہ ہے کہ صبح سے نہیں بلکہ زوال کے بعد سے ابتدا ہوتی ہے اور زوال کے بعد جو ساعت ہے اسی میں دوسری ساعات صغیرہ لطیفہ داخل ہیں۔

امام مالک کے ساتھ قاضی حسین اور امام الحرمین شافعی بھی ہیں، شاہ ولی اللہؒ بھی ''مسوی'' میں ان ہی ساعاتِ لطیفہ بعد زوال کو ترجیح دی اور زمانی و حسابی ساعات کی نفی کی، اور حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اپنے والد مرحوم نور اللہ مرقدہ کو بھی اسی کا مؤید پایا۔ پھر ساری بحث کے بعد درمیانی صورت ارتفاعِ نہار والی مختار ابن رشد کو اپنے نزدیک مرجح قرار دیا اور فرمایا کہ اس صورت میں روایاتِ حدیث کے چاروں الفاظ (رواح) غدوہ، تبکیر و تہجیر، پر تجوز اُعمل ہو جاتا ہے اور کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ **فتدبر فلاتجد هذا العجيب في غير هذا الوجيز** (اوجز ص ۱/۳۲۰) لیکن اس تجوز میں جو تجوز یا اشکال ہے اس کو حضرت دامت برکاتہم نے رفع نہیں کیا ہے۔ **فتدبر خان الاشكال لكل اشكاله موجود، والله تعالىٰ اعلم و علم اتم و احكم۔**

حافظ ابن حجرؒ نے جو لکھا کہ امام بخاری نے ترکِ تبکیر کے قائل کا رد کیا ہے، اس سے مراد امام مالکؒ ہی ہیں اور ان کا متدل حدیث مسلم ونسائی و ابن ماجہ ہیں۔ جس میں **فالمهجر الى الصلوة كالمهدى بدنة** الخ کے الفاظ ہیں، کیونکہ تہجیر زوال کے بعد نکلنے کو کہتے ہیں۔ جمہور کا استدلال حدیثِ ترمذی ونسائی و ابن ماجہ سے ہے، جس کو ابوداؤد، امام احمد، ابن خزیمہ کو ابن حبان نے بھی روایت کیا اور حاکم نے روایت کر کے تصحیح کی ہے، اس میں **من بكر و ابتكر** الخ وارد ہے، تبکیر کے معنی اول دن میں نکلنے کے ہیں۔ کما قال الشاعر۔ **بكرا صاحبى قبل الهجير انذاك النجاح فى التبكير۔**

معارف السنن کی مسامحت

اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے امام مالک وغیرہ کا متدل لفظِ رواح وحدیث المُہجر کو اور جمہور کا متدل حدیثِ تبکیر کو بتلایا تھا، جو العرف الشذی ص ۲۲۸ میں بھی ہے، اور وہی صحیح بھی ہے مگر معارف السنن ص ۳۴۶/۴ میں مسامحت ہوگئی کہ متدلِ جمہور حدیث المُہجر کو لکھا گیا۔

امام مالک کی رائے

آپ نے اس امر کو تسلیم نہیں کیا کہ جمعہ کی نماز کے لئے طلوعِ فجر کے بعد ہی سے جامع مسجد چلے جانا بہتر ہے اور تبکیر کو نہیں مانا، آپ نے فرمایا کہ ہم نے اہلِ مدینہ کا تعامل اس کے موافق نہیں پایا، اس کے برعکس امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اگر جمعہ کے لئے فجر کے بعد طلوعِ شمس سے قبل جائے تو بہت اچھا ہے اور دوسرے حضرات حنفیہ وحنابلہ بھی صبح ہی سے جانے کو افضل سمجھتے ہیں۔

اثرم کا بیان ہے کہ امام احمد سے پوچھا گیا امام مالک کی رائے کیسی ہے کہ جمعہ کے لئے سویرے جانا مناسب نہیں ہے؟ جواب دیا کہ یہ بات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے خلاف ہے، سبحان اللہ انہوں نے یہ مسئلہ اس طرح کیوں بیان کر دیا حالانکہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو اول وقت جائے وہ اونٹ کی قربانی کرنے والے کے مثل ہے۔

امام مالکؒ نے ایک کے سوال پر فرمایا کہ میرے دل کو تو یہی بات لگتی ہے کہ ساعت سے مراد ساعتِ واحدہ ہی ہے۔ جس کے تحت دوسری ساعات خفیفہ فضیلت والی آئی ہیں لیکن ابن حبیب مالکی نے (جو جمہور کے ساتھ ہیں) امام مالک کے قولِ مذکور کو حدیث کی تحریف کہا ہے، اور لکھا کہ ''ایک ساعت کے اندر بہت سی ساعات کا ہونا ناممکن ہے اور چونکہ تبکیر والی بات صاف وواضح ہے، اس لئے تہجیر سے بھی اول

نہار مراد لینا زیادہ اچھا ہے اور اس کیلئے بہت سے آثار اس کی تائید میں موجود ہیں جن کو ہم نے اپنی کتاب ''واضح السنن'' میں بیان کیا ہے۔

علامہ ابن القیم نے زاد المعاد میں اس بحث کو بہت تفصیل سے لکھا ہے اور امام مالک کا مسلک و متدل اور اس پر جو اعتراضات ہوئے ہیں نقل کئے ہیں اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ لغتِ عرب میں رواح کے معنی مطلق جانے کے بھی آتے ہیں لہٰذا وہی یہاں مراد ہے اور بعض اشعارِ عرب میں ہجیر الفجر کا استعمال بھی آیا ہے، جس کے معنی فجر کے وقت سویرے جانے کے ہیں، اور لکھا کہ اہلِ مدینہ ممکن ہے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی دینی و دنیوی ضرورتوں اور مشاغل کی وجہ سے سویرے جمعہ کو نہ آتے ہوں اور بعض اوقات ایسے اہم و ضروری مشاغل میں لگنا جمعہ میں جلد جانے سے افضل بھی ہو سکتا ہے اس لئے تعاملِ اہلِ مدینہ کو یہاں پیش کرنا حجت نہیں ہے اور یوں بھی بہت سے حضرات نے تعاملِ اہلِ مدینہ کو حجت نہیں مانا ہے علامہ نوویؒ نے اس موقعہ پر جمہور کی تائید میں بہت اچھا لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو فتح الملہم ۲ ص ۳۸۹ تا ۳۹۱ ص ۳۹۸)

بَابُ الدُّهْنِ لِلْجُمُعَةِ

(نماز جمعہ کے لئے تیل لگانے کا بیان)

۸۳۶. حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِیْ ذِئْبٍ عَنْ سَعِیْدِنِ الْمَقْبُرِیِّ قَالَ اَخْبَرَنِیْ اَبِیْ عَنِ ابْنِ وَدِیْعَةَ عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِیِّ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَغْتَسِلُ رَجُلٌ یَّوْمَ الْجُمُعَةِ وَیَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ وَّ یَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهٖ اَوْ یَمَسُّ مِنْ طِیْبِ بَیْتِهٖ ثُمَّ یَخْرُجُ فَلَا یُفَرِّقُ بَیْنَ اثْنَیْنِ ثُمَّ یُصَلِّیْ مَا کُتِبَ لَهٗ ثُمَّ یَنْصِتُ اِذَا تَکَلَّمَ اَمَا لِاِمَامُ اِلَّا غُفِرَ لَهٗ مَا بَیْنَهٗ وَمَا بَیْنَ الْجُمُعَةِ الْاُخْرٰی.

۸۳۷. حَدَّثَنَا اَبُو الْیَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَیْبٌ عَنِ الزُّهْرِیِّ قَالَ طَاوٗسٌ قُلْتُ لِاِبْنِ عَبَّاسٍ ذَکَرُوْا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اغْتَسِلُوْا یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَاغْسِلُوْا رُؤُسَکُمْ وَاِنْ لَّمْ تَکُوْنُوْا جُنُبًا وَّاَصِیْبُوْا مِنَ الطِّیْبِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اَمَّا الْغُسْلُ فَنَعَمْ وَاَمَّا الطِّیْبُ فَلَا اَدْرِیْ.

۸۳۸. حَدَّثَنَا اِبْرَاهِیْمُ بْنُ مُوْسٰی قَالَ اَخْبَرَنَا هِشَامٌ اَنَّ ابْنَ جُرَیْجٍ اَخْبَرَهُمْ قَالَ اَخْبَرَنِیْ اِبْرَاهِیْمُ بْنُ مَیْسَرَةَ عَنْ طَاوٗسٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّهٗ ذَکَرَ قَوْلَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی الْغُسْلِ یَوْمَ الْجُمُعَةِ فَقُلْتُ لِاِبْنِ عَبَّاسٍؓ اَیَمَسُّ طِیْبًا اَوْ دُهْنًا اِنْ کَانَ عِنْدَ اَهْلِهٖ فَقَالَ لَا اَعْلَمُهٗ.

ترجمہ ۸۳۶۔ حضرت سلمان فارسیؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن غسل کرتا ہے اور جس قدر ممکن ہو پاکیزگی حاصل کرتا ہے، اور اپنے تیل میں سے تیل لگاتا ہے، یا اپنے گھر کی خوشبو میں سے خوشبو لگاتا ہے، پھر (نماز کے لئے اس طرح) نکلے کہ دو آدمیوں کے درمیان نہیں گھسے، اور جتنا اس کے مقدر میں ہے، نماز پڑھ لے، اور جب امام خطبہ پڑھے تو خاموش رہے تو اس جمعہ سے لے کر دوسرے جمعہ تک کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

ترجمہ ۸۳۷۔ طاؤس روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا: لوگوں کا بیان ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جمعہ کے دن غسل کرو اور اپنے سروں کو دھولو، اگرچہ تمہیں نہانے کی ضرورت نہ ہو، اور خوشبو لگاؤ، تو ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ غسل کا حکم تو صحیح ہے۔ لیکن خوشبو کے متعلق مجھے معلوم نہیں۔

ترجمہ ۸۳۸۔ طاؤس حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا قول جمعہ کے دن غسل کے متعلق بیان فرمایا تو میں نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ کیا وہ خوشبو یا تیل لگائے، اگر اس کے گھر والوں کے پاس ہو تو انہوں نے

جواب دیا کہ میں یہ نہیں جانتا۔

تشریح: ان احادیث میں جمعہ کے دن غسل کے ذریعہ سے طہارت و پاکیزگی اختیار کرنا، بالوں کو دھونا اور صاف کر کے تیل لگانا، خوشبو لگانا، اور دوسرے آداب سکھائے گئے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے جو خوشبو کے بارے میں سوال پر لاعلمی کا جواب دیا، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کی وجہ یہ بتلائی کہ ان کے یہاں مردوں اور عورتوں کی خوشبوئیں الگ الگ قسم کی تھیں، مردوں کی خوشبو میں رنگ ہلکا ہوتا اور مہک زیادہ ہوتی تھی، عورتوں کی اس کے برعکس ہوتی تھیں۔ اس لئے حضرت ابن عباسؓ کو اس کیلئے شرح صدر نہ ہوسکا کہ مرد عورتوں کی رنگین خوشبو لگا کر مسجدوں میں جائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بَابٌ یَلْبِسُ اَحْسَنَ مَا یَجِدُ

(جمعہ کے دن عمدہ سے عمدہ کپڑے پہننے کا بیان، جو مل سکیں)

۸۳۹۔ حَدَّثَنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ یُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِکٌ عَنْ نَّافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَاٰی حُلَّةً سِیَرَآءَ عِنْدَ بَابِ الْمَسْجِدِ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ لَوِ اشْتَرَیْتَ هٰذِهٖ فَلَبِسْتَهَا یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلِلْوَفْدِ اِذَا قَدِمُوْا عَلَیْکَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا یَلْبَسُ هٰذِهٖ مَنْ لَّاخَلَاقَ لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ ثُمَّ جَآءَ تْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْهَا حُلَلٌ فَاَعْطٰی عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ مِنْهَا حُلَّةً فَقَالَ عُمَرُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کَسَوْتَنِیْهَا وَقَدْ قُلْتَ فِیْ حُلَّةِ عُطَارِدٍ مَّا قُلْتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ لَمْ اَکْسُکَهَا لِتَلْبَسَهَا فَکَسَاهَا عُمَرُبْنُ الْخَطَّابِؓ اَخًالَّهٗ بِمَکَّةَ مُشْرِکًا۔

ترجمہ ۸۳۹۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک ریشمی دھاری دار حلہ مسجد نبوی کے پاس (فروخت ہوتے ہوئے) دیکھا تو کہا یا رسول اللہ! کاش آپ اس کو خرید لیتے، تاکہ جمعہ کے دن اور وفد کے آنے کے وقت پہن لیتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے وہی شخص پہنتا ہے، جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، پھر اسی قسم کے چند حلے نبی کریم صلی اللہ علیہ واسلم کے پاس آئے تو آپ نے ان سے ایک عمر بن خطابؓ کو دے دیا تو عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ نے مجھے یہ پہننے کو دیا، حالانکہ آپ نے حلۂ عطارد کے بارے میں فرما چکے ہیں (کہ اس کے پہننے والے کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں) تو رسول اللہ صلے للہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ میں نے تمہیں اس لئے نہیں دیا تھا کہ تم اسے پہنو، تو عمر بن خطابؓ نے اپنے ایک مشرک بھائی کو، جو مکہ میں تھا، پہننے کو دے دیا۔

تشریح: قولہ حلة سیراء، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ سیبویہ کے نزدیک اس کو اضافت اور نعت دونوں طرح سے پڑھ سکتے ہیں، یہ ریشم کا تھا اور سیراء کے معنی دھاریدار کے ہیں، وفد کے لئے حضور علیہ السلام سیاہ عمامہ باندھتے تھے۔

قولہ من لا خلاق لہ فی الآخرہ، حضرتؒ نے فرمایا کہ بعض علماء کے نزدیک دنیا میں ریشمی لباس پہننے والے اور شراب پینے والے جنت میں ان دونوں سے محروم رہیں گے، اور محرومی اس لحاظ سے ہوگی کہ خیال تو انہیں ان دونوں کا آئے گا مگر وہ ان کو نہیں دی جائیں گی، اور وہ ان کی خواہش بھی نہ کریں گے، اور ہر چیز کے جنت میں ملنے کا وعدہ جنتیوں کی خواہش پر موقوف ہوگا۔ قال تعالے ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ماتدعون (جنت میں تمہیں وہ سب چیزیں ملیں گی جن کی تم خواہش کرو گے، اور تمہیں وہ سب ملے گا جس کی تم طلب کرو گے) معلوم ہوا کہ خواہش وطلب شرط ہوگی۔

غرض یہ کہ وہ لوگ ان دونوں چیزوں کی خواہش وطلب بھی نہ کریں گے جس طرح یہ کہ جنتی اپنے درجہ سے اوپر کے درجہ کی طلب و

خواہش نہ کریں گے وغیرہ، لہٰذا ان کو کسی کمی یا تکلیف کا احساس بھی نہ ہوگا۔ اگر خواہش وطلب کرتے اور پھر نہ ملتی تو ضرور اذیت ہوتی، حافظ نے اس پر کچھ نہیں لکھا، البتہ علامہ عینیؒ نے جو ہر حدیثِ بخاری پر متنوع علمی ابحاث وگرانقدر افادات پیش کرنے کے عادی ہیں اور اسی لئے ان کی شرحِ بخاری حافظ کی فتح الباری سے کئی گنا زیادہ ضخیم وعظیم ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ان دونوں قسم کے لوگوں کی آخرت میں محرومی کو بعض حضرات نے تو حقیقت پر محمول کیا ہے، خواہ وہ ان دونوں سے تائب بھی ہو چکا ہو، مگر اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ اگر وہ ان سے توبہ کرنے کے بعد مرے ہیں تو وہ ان دونوں سے جنت میں محروم نہ ہوں گے۔ (عمدہ ۳ص ۳۵۵) علامہ عینی نے دسواں افادہ یہ کیا کہ جمعہ کے دن عمدہ کپڑے پہننے کا استحباب حدیث سے ثابت ہوا اور ابوداؤد اور ابن ابی شیبہ وابن ماجہ سے دوسری حدیث بھی ذکر کیں جن میں عمدہ جوڑہ جمعہ کے لئے تیار رکھنے کی ترغیب ہے، یعنی روزمرہ کے لباس سے زیادہ اچھا اور ممتاز لباس جمعہ کے لئے ہونا چاہئے۔

ایک فائدہ یہ لکھا کہ حدیث الباب بخاری سے اس امر کا جواز نکلا کہ کسی کافر کو ریشمی لباس ہدیۃً دے سکتے ہیں کیونکہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک مکی بھائی کافر کو اسلام لانے سے قبل دیا تھا، اگر کہا جائے کہ اس سے تو ثابت ہوگا کہ کفار فروعی احکام کے مکلف ومخاطب نہیں ہیں، میں کہتا ہوں کہ یہ بات حنفیہ کی تائید وحجت بنے گی، کیونکہ ان کے نزدیک وہ مخاطب بالفروع نہیں ہیں، شافعیہ نے اس کا جواب دیا کہ صرف دینا اس کے پہننے کا اذن نہیں، الخ (لیکن لفظ **فکساھا عمر** الخ پہنایا یا پہننے کو دیا) اور لفظِ **مشرک**ا اور دوسری حدیث بخاری میں **ارسل بھا عمر الٰی اخ لہ من اھل مکۃ قبل ان یسلم** سے رجحان حنفیہ کے مسلک کے لئے زیادہ معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم)

حضرت شاہ صاحبؒ نے کفار کے مخاطب بالفروع ہونے نہ ہونے کے بارے میں حنفیہ کے تین اقوال ذکر فرمائے ہیں اور اس قول کو اپنا مختار بنایا کہ وہ اداء واعتقاداً مخاطب ہیں، اور یہی مسلک شافعیہ، مالکیہ وحنابلہ کا بھی ہے، اور فرمایا کہ صاحبِ بحر نے بھی اسی کو شرح المنار میں اختیار کیا ہے، جو طبع نہیں ہوئی۔ پھر فرمایا کہ صحت وفساد کا حکم احکام دنیا میں سے ہے اور حل وحرمت کا حکم احکامِ آخرت میں ہے۔ اور اقوال ثلاثہ کا تعلق بھی حل وحرمت سے ہے۔ (وراجع فیض الباری ۳ص ۳۲۸) حنفیہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ کفار نہ اداء مخاطب بالفروع ہیں نہ اعتقاداً اور تیسرا یہ ہے کہ اعتقاداً مخاطب ہیں اداءً نہیں (کذا فی المنار)

پھر یہ ساری بحث عذابِ آخرت کے بارے میں ہے کہ پہلے قول پر کفار پر دونوں کے ترک کی وجہ سے عذاب ہوگا اور دوسرے قول پر صرف ترکِ ایمان پر ہوگا، فروع پر ترک اعتقاد واداء کے سبب ہوگا۔ اور تیسرے پر صرف ترک اعتقاد پر ہوگا۔ پھر یہ کسی کا بھی مذہب نہیں ہے کہ اسلام لانے کے بعد کافر کے ذمہ نماز روزوں کی قضا واجب ہوگی۔

طریق تحقیق انوری

یہ بات پہلے بھی عرض کی گئی ہے کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ حنفیہ کے متعدد اقوال میں سے اس قول کو ترجیح دیا کرتے تھے، جو دوسرے مذاہب فقہیہ کے موافق ہوتا تھا، اسی لئے مسئلہ مذکورہ میں بھی پہلا قول اختیار فرمایا تھا اس مسئلہ کی پوری تحقیق اپنے موقع پر آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

بَابُ السِّوَاکِ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَقَالَ اَبُوْسَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیَسْتَنُّ (جمعہ کے دن مسواک کرنے کا بیان، اور ابو سعید نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ مسواک کرے)

۸۴۰۔ **حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ یُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِکٌ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْ لَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِیْ اَوْلَوْ لَا اَنْ اَشُقَّ عَلَی النَّاسِ لَاَمَرْتُھُمْ**

بِالسِّوَاکِ مَعَ کُلِّ صَلٰوۃٍ.

۸۴۱. حَدَّثَنَا اَبُوْ مَعْمَرٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعَیْبُ ابْنُ الْحَبْحَابِ قَالَ حَدَّثَنَا اَنَسٌ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَکْثَرْتُ عَلَیْکُمْ فِی السِّوَاکِ.

۸۴۲. حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ کَثِیْرٍ قَالَ اَخْبَرَنَا سُفْیَانُ عَنْ مَنْصُوْرٍ وَّ حُصَیْنٍ عَنْ اَبِیْ وَآئِلٍ عَنْ حُذَیْفَۃَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ مِنَ اللَّیْلِ یَشُوْصُ فَاہُ بِالسِّوَاکِ.

ترجمہ ۸۴۰۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں اپنی امت کے لئے شاق نہ جانتا تو انہیں ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم دیتا۔

ترجمہ ۸۴۱۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تم لوگوں سے مسواک کے متعلق بہت زیادہ بیان کیا ہے۔

ترجمہ ۸۴۲۔ حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہ) روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم، جب رات کو سو کر اٹھتے تو مسواک سے اپنا منہ صاف کر لیتے۔

تشریح: سواک: بکسر السین، جس چیز سے دانتوں کو مل کر صاف کیا جائے، ساک یسوک سے ہے بمعنی ملنا، اصطلاحی معنی کسی لکڑی وغیرہ کا استعمال دانتوں پر کرنا تا کہ دانتوں کی زردی اور منہ کی بو دور ہو جائے۔ سواک کا اطلاق مسواک پر بھی آتا ہے اور مسواک کرنے پر بھی۔ پیلو کی لکڑی کو حضور علیہ السلام نے پسند فرمایا ہے۔

اطباء کہتے ہیں کہ دانتوں کی مضبوطی کے لئے مسواک جیسی درمیانی سخت چیز ہی زیادہ مفید ہے، اس سے معلوم ہوا کہ برش و منجن کا استعمال اتنا زیادہ مفید نہیں، تاہم عمدہ قسم کے طبی منجن استعمال کرنے سے دانتوں کی سفیدی باقی رہتی ہے۔ اور مسوڑھے مضبوط ہوتے ہیں اور گندہ دہنی بھی دور ہوتی ہے۔ شریعت بھی یہی چاہتی ہے کہ منہ سے مناجاتِ رب ہوتی ہے کلام الٰہی کی تلاوت ہوتی ہے، فرشتے جو نمازی کے منہ سے قرآن مجید کے کلماتِ مبارکہ سنتے ہیں اور فرطِ اشتیاق استماعِ کلام باری کے سبب سے تلاوت کرنے والے کے منہ سے قریب تر ہو کر اپنا منہ تالی کے منہ پر رکھ دیتے ہیں، تا کہ جو کچھ بھی کلامِ الٰہی کی آواز تالی کے منہ سے نکلے، وہ سب فرشتے کے منہ میں چلی جائے (رواہ البزار عن علیؓ، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ منہ کو نہایت صاف ستھرا رکھنے، دانتوں میں خلال کر کے اور مسواک کے ذریعہ ان کو بہتر سفید رکھنے میں جتنی بھی کوشش کی جائے وہ کم ہے، دانتوں، مسوڑھوں اور منہ کی جتنی صفائی اور بہتری ہوگی، اتنا ہی معدہ بھی بہتر رہے گا، کیونکہ ساری غذائیں منہ کے واسطہ واسطہ سے ہی معدہ میں جاتی ہیں۔ اکابر امت میں اختلاف ہوا ہے کہ مسواک وضو کی سنت ہے یا نماز کی یا دین کی۔ ہمارے امام صاحب ابوحنیفہ نے تمام اطراف پر نظر کر کے یہ فیصلہ فرمایا کہ وہ دین کی سنت ہے، لہٰذا ہر دیندار کو تمام ہی احوال میں سنتِ مسواک پر عمل کرنا چاہئے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک بھی وہ نماز کے لئے کھڑے ہونے کی بھی سنت ہے اور وضو کے وقت بھی، اور ہر اس حال میں بھی کہ منہ میں کوئی تغیر بو وغیرہ آجائے، یوں عام طور سے ہمارے فقہاءِ حنفیہ نے صرف وضو کے وقت مسواک کی تاکید و سنیت لکھی ہے (عمدہ ۳ ص ۳۵۶)

علامہ عینیؒ نے لکھا کہ امام صاحب نے جو مسواک کو ''سنن دین'' میں سے شمار کی، یہی قول سب سے زیادہ اقوی معلوم ہوتا ہے یہ سنتِ وضو، یا سنتِ نماز ہونے کے، کیونکہ احادیث سے اس کی تائید ملتی ہے، مثلاً ترمذی و مسند احمد وغیرہ کی حدیثِ ابی ایوبؓ وغیرہ میں ہے کہ چار چیزیں سننِ مرسلین میں سے ہیں، ختنہ، مسواک، عطر لگانا اور نکاح، مسلم شریف کی حدیثِ عائشہؓ ہے کہ دس چیزیں فطرت سے ہیں اور ان میں مسواک کو ذکر کیا، بزار اور طبرانی میں ہے کہ صفائی و پاکیزگی و ستھرائی کی چار چیزیں ہیں۔ لبوں کے بال کترانا۔ حلق عانہ و زیر ناف کے

بال صاف کرنا، ناخن کاٹنا اور مسواک کرنا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت سارے ہی بدن کی صفائی وستھرائی چاہتی ہے اور جو چیزیں سنن مرسلین یا فطرت قرار دی گئی ہیں ان کے ظاہری و باطنی فوائد ہر لحاظ سے بے شمار ہیں۔ و من لم یذق لم یدر۔

''حلق عانہ'' کا فطرت وسنن مرسلین میں سے ہونا نہ صرف صفائی وستھرائی بلکہ باطنی نقطہ نظر سے بھی قیام رجولیت وقوت باہ کے لئے نہایت مفید ہے، اور اس کے برخلاف حلق لحیہ کا عمل نہ صرف خلاف فطرت وسنن مرسلین ہے بلکہ شرعاً ممنوع اور قبیح تر شاید اس لئے بھی ہے کہ طبی نقطۂ نظر سے رجولیت کے لئے ضعف وضرر کا بھی موجب ہے واللہ تعالیٰ اعلم ختنہ کی سنت میں بھی بے شمار ظاہری وجسمانی فوائد ہیں، جن سے واقف ہو کر بہت سے غیر مسلم بھی اس کو اختیار کرنے لگے ہیں۔

علامہ عینیؒ نے حضرت ابو الدرداءؓ سے مسواک کے ۲۴ فوائد کا حوالہ دے کر لکھا کہ ان میں سے سب سے بڑی فضیلت رضاءِ خداوندی ہے، اور دوسرے چند فوائد یہ ہیں۔

مسواک والی نماز کا ۲۷ گنا ثواب، وسعتِ رزق وغنی کا حصول، منہ کی بو کا بہتر ہو جانا (معلوم ہوا کہ اگر صرف مسواک سے یہ مقصد حاصل نہ ہو تو معدہ کی اصلاح اور طبی منجنوں کے ذریعہ دانتوں اور مسوڑھوں کی بیماری کو بھی دور کرنا ضروری ہے کہ بغیر اس کے مسواک کا فائدہ حاصل نہ ہوگا، مسوڑھوں کو مضبوط کرنا، دردِ سر کا ازالہ (معلوم ہوا کہ دانتوں اور منہ کی صفائی ستھرائی نہ ہونے سے دماغ پر بھی برے اثرات پڑتے ہیں) داڑھوں کا درد دور ہونا، فرشتوں کا مصافحہ کرنا کہ مسواک کرنے والے کے چہرے پر ایک خاص قسم کا نور ہوتا ہے اور دانت سفید برق ہو کر چمکتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں فرشتوں کو پسند ہیں۔

حضرت عائشہؓ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتی ہیں کہ مسواک ضرور کیا کرو، کیونکہ وہ منہ کو صاف ستھرا بناتی ہے اور حق تعالیٰ کو راضی کرتی ہے، دوسری حدیث میں ہے کہ مسواک والی نماز کا ثواب ستر گنا ہے۔

امام نسائیؒ نے روزہ دار کے لئے بعد زوال بھی مسواک کرنے کو عموم احادیث کے تحت استدلال کیا ہے، (یہ حنفیہ کی تائید ہے، کیونکہ عند الشافعیہ مکروہ ہے) محقق مہلبؒ نے حدیثِ نبوی **لولا ان اشق علیٰ امتی لا مرتھم بالسواک عند کل صلوۃ** سے ثابت کیا کہ اگر لوگوں پر تنگی ومشقت ہو تو سنن وفضائل کے بارے میں ان کا تساہل قابلِ برداشت ہے۔ مذکورہ حدیث سے ہر نماز کے وقت مسوک کی فضیلت سے مفہوم ہوا کہ مسجد کے اندر مسواک کرنا مباح ہے۔

کیونکہ اس سے ہر نماز کے وقت مسوک کا مستحب ہونا ثابت ہوا، لیکن بعض مالکیہ کے نزدیک یہ مسجد میں مکروہ ہے، کیونکہ اس میں ایک قسم کا استقذار اور نازک طبائع کے لئے بار ہے، اور مسجد کو اس سے بچانا چاہئے، (عمدۃ القاری ص ۲۵۸/۲۵۷ جلد سوم)

بعض احادیث میں **عند کل وضوء** آیا ہے اور اسی کو حنفیہ نے ترجیح دی ہے، کیونکہ ہر نماز کے وقت مسوک کو اگر مستحب قرار دیں تو کسی وقت دانتوں سے خون بھی نکل سکتا ہے جو سب ہی کے نزدیک نجس ہے (یہ دوسری بات ہے کہ حنفیہ کے یہاں خروجِ دم ناقض وضو بھی ہے اور شافعیہ کے نزدیک نہیں) دوسرے یہ کہ حضور علیہ السلام کے عملِ مبارک سے بھی کہیں نماز کے وقت مسواک کرنا ثابت نہیں ہوا، تاہم حنفیہ کی بھی بعض کتب میں **استحبابِ سواک عند کل صلوٰۃ** موجود ہے **کما قالہ ابن الھمام و صاحب التتار خانیہ والشامی** وغیرہم کہ ان سب فقہاء حنفیہ نے اس کے استحباب کا قول کیا ہے۔

اوپر کی تفصیل نقل کر کے حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ اگر نماز کے وقت مسواک کی جائے تو نرمی واحتیاط سے تاکہ دانتوں اور مسوڑھوں سے خون نہ نکلے کما قالہ القاری، اور اس کے بعد کلی بھی کر لے اور مسواک کو بھی دھوئے، اور وہ تھوک لگی ہوئی اپنے ساتھ نہ رکھے۔ کیونکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب مسواک کرتے تھے تو حضرت عائشہؓ کو دیا کرتے تھے کہ وہ اس کو دھو دیں، اور ہمیں صفائی ستھرائی

کی ترغیب بھی دی گئی ہے، پھر یہ تو حضور علیہ السلام سے ثابت ہی نہیں ہوا کہ کبھی آپ نے تحریمہ کے وقت مسواک کی ہو اور تھوک میں لتھڑی ہوئی مسواکوں کا نمازی کے آگے ہونا یا نماز کے اندر اس کی جیب میں یا کان پر ہونا تو اس عام ممانعت کے تحت بھی آتا ہے، جس میں تھوک کا نمازی اور قبلہ کے درمیان ہونا نظرِ شارع میں برا قرار پایا ہے، کیونکہ مسواک کے سرے پر تھوک ضرور لگا رہ جاتا ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فتامل، واللہ ولی التوفیق (اوجز ص ۱/۱۷۰) سلفی بھائی اپنے عمل پر نظرِ ثانی کریں تو اچھا ہے۔

مسواک عورتوں کے لئے

اس بارے میں علماء کی صراحت نہیں دیکھی کہ اتنی گرانقدر فضیلت کی چیز میں صنفِ نسواں کا بھی حصہ ہے یا نہیں، علامہ عینی نے محیط سے یہ نقل کیا کہ عورت کے لئے علک (ایک قسم کا گوندا ہے) قائم مقام مسواک کے ہے، کیونکہ عورتوں کے دانت کمزور ہوتے ہیں، مسواک کی وجہ سے ان کے جھڑ جانے کا ڈر ہے، اور علک سے یہ فائدہ حاصل ہے کہ وہ مسواک کی طرح دانتوں کو صاف رکھتا ہے، اور مسوڑھوں کو مضبوط کرتا ہے۔ (عمدہ ص ۳۵۷)

معلوم نہیں صاحب محیط کی تحقیق مذکور کا پایہ کیا ہے، عاجز کا خیال تو یہ ہے کہ پیلو کی عمدہ مسواک کا ریشہ بھی مروجہ برشوں جیسا ہی ہوتا ہے، لہٰذا اسی کا استعمال برش کی جگہ کیا جائے تو بہتر ہے تا کہ وہی منافع و فضائل عورتوں کو بھی حاصل ہو سکیں جو مردوں کو حاصل ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مجمع البحار ص ۲/ ۴۱۸ میں لکھا کہ عِلک بکسر العین کو مصطگی کی طرح چبایا جاتا ہے، اور امام شافعی نے اس کو مکروہ کہا ہے کیونکہ وہ منہ میں خشکی پیدا کرتا ہے اور پیاس لگاتا ہے۔ (پھر ایسی مضر چیز کو مسواک کے قائم مقام کیسے کر سکتے ہیں؟)

مسواک کرنے کا طریقہ

علامہ عینیؒ نے لکھا: ہمارے اصحاب کا ارشاد ہے کہ مسواک کو عرضاً کرنا چاہئے طولاً نہیں، اور ابونعیم نے حدیثِ عائشہؓ نقل کی کہ حضور علیہ السلام بھی اسی طرح کرتے تھے، اور مراسیلِ ابی داؤد میں حضور علیہ السلام کا قولی ارشاد بھی یہی ہے، امام الحرمین شافعیؒ نے کہا کہ عرضاً و طولاً دونوں طرح کرے، لیکن اگر ایک پر اختصار کرے تو عرض اولیٰ ہے، دوسرے شافعی ہی کہتے ہیں کہ عرضاً کرے طولاً نہ کرے۔

عرضاً کا مطلب یہ ہے کہ دانتوں کی چوڑائی میں کرے، طولاً اوپر سے نیچے کو نہ کرے، شاید یہی شفقت ہو کہ اس سے مسوڑھوں کے چھلنے کا اندیشہ ہوتا ہے، واللہ اعلم۔ اور اتنی بار مسواک کرے جس سے دل مطمئن ہو جائے کہ منہ کی اور دانتوں کی صفائی خوب ہو کر بدبو دفع ہو گئی ہے اور دانتوں کی زردی دور ہو گئی ہے، حضور علیہ السلام علاوہ اوقاتِ وضو کے رات کو بھی سوتے وت، اور تہجد کے لئے اٹھ کر بھی کرتے تھے، اور جب گھر سے کسی نماز کے لئے نکلتے تب بھی مسواک کر کے نکلتے تھے، اور آپ نے فرمایا کہ اگر کسی وقت مسواک نہ ہو تو انگلیوں سے ہی دانتوں کو اچھی طرح صاف کرے۔ (طبرانی)

ترجمۃ الباب سے مطابقت

علامی عینیؒ نے لکھا کہ پہلی حدیث سے مطابقت اس لئے ہوگی کہ مسواک جب ہر نماز کے لئے افضل ہوئی تو جمعہ کے لئے بدرجۂ اولیٰ افضل ہوئی کہ وہ زیادہ اژدہام اور اجتماع کا موقع ہے، اس کے لئے اور بھی زیادہ منہ صفائی ستھرائی چاہئے، تا کہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو، اور دوسری میں ارشاد ہوا کہ میں نے مسواک کے لئے بہت زیادہ تاکیدات کی ہیں، لہٰذا جمعہ ان تاکیدات کا مستحق سب سے زیادہ ہے، تیسری میں ہے کہ حضور علیہ السلام جب رات کو سو کر اٹھتے تھے تو مسواک کرتے تھے، تو ظاہر ہے کہ اس وقت بھی آپ نمازِ تہجد کے لئے ایسا کرتے ہوں گے تو جمعہ کے لئے

تو اور بھی زیادہ اہتمام کی ضرورت ہے کہ اس میں آدمی بھی زیادہ اور فرشتے بھی بکثرت ہوتے ہیں۔ اس طرح اگرچہ امام بخاری کی ذکر کردہ تینوں احادیث میں جمعہ کی صراحت نہیں ہے، مگر یہ بات مفہوم ضرور ہوتی ہے کہ جمعہ کے دن مسواک کا خاص طور سے زیادہ اہتمام ہونا چاہئے۔ اور مطابقت کے لئے امام بخاری کے یہاں ایسے اعتبارات کافی ہوتے ہیں۔ (عمدہ ص ۲۵۹/۳) امام بخاریؒ حدیث نمبر ۸۴۰ یہاں فضیلت مسواک للجمعہ بیان کرنے کو لائے ہیں اور اغلب ہے کہ اس کو کتاب الوضو میں اسی لئے نہ لائے ہوں گے کہ ان کے نزدیک بھی حنفیہ کی طرح مسواک سنت وضو ہے، سنتِ صلوٰۃ نہیں ہے اگرچہ بدرجہ استحباب حنفیہ کے یہاں بھی ہے۔ بخلاف شافعیہ کے کہ ان کے نزدیک وہ سنتِ صلوٰۃ ہے۔

شیخ ابن ہمامؒ نے پانچ اوقات میں مسواک کو مستحب لکھا (۱) وضو کے وقت (۲) نماز کیلئے (۳) جب منہ میں بدبو پیدا ہوئے (۴) جب دانت زرد ہو جائیں (۵) نیند سے بیدار ہونے پر۔

بَابُ مَنْ تَسَوَّكَ بِسِوَاكِ غَيْرِهٖ

(دوسروں کی مسواک استعمال کرنے کا بیان)

۸۴۳. حَدَّثَنَا اِسْمٰعِيْلُ قَالَ حَدَّثَنِيْ سُلَيْمَانُ بْنُ بِلَالٍ قَالَ قَالَ هِشَامُ ابْنُ عُرْوَةَ اَخْبَرَنِيْ اَبِيْ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ دَخَلَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ ابْنَ اَبِيْ بَكْرٍ وَّ مَعَهٗ سِوَاكٌ يَّسْتَنُّ بِهٖ فَنَظَرَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ لَهٗ اَعْطِنِيْ هٰذَا السِّوَاكَ يَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ فَاَعْطَانِيْهِ فَقَصَمْتُهٗ ثُمَّ مَضَغْتُهٗ فَاَعْطَيْتُهٗ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَنَّ بِهٖ وَهُوَ مُسْتَنِدٌ اِلٰى صَدْرِيْ.

ترجمہ ۸۴۳۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر آئے، اور ان کے ساتھ ایک مسواک تھی مسواکتھی جو وہ کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس مسواک کو دیکھا، تو میں نے ان سے کہا کہ اے عبدالرحمٰن مجھے یہ مسواک دے دو۔ انہوں نے وہ مسواک مجھے دے دی، تو میں نے اسے توڑ ڈالا، اور چبا ڈالا، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دی تو آپ نے اسے استعمال کیا، اس حال میں کہ آپ میرے سینہ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔

تشریح: دوسرے کی مسواک اس کی اجازت سے کرسکتا ہے، بشرطیکہ کسی ایک کو اس سے کراہت محسوس نہ ہو، اور اگر مقصود حصولِ تبرک ہو، اور موقع بھی صحیح ہو تب تو کوئی مضائقہ ہی نہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس باب کا ابواب جمعہ سے کوئی خاص تعلق نہیں، اس لئے اگر امام بخاریؒ اس کو ابوابِ وضو میں لاتے تو زیادہ بہتر تھا۔ اور اگر تھوک کا پاک ہونا بتلانا تھا تو اس کے لئے کتاب الطہارۃ موزوں تھی یہ واقعہ مرضِ وفاتِ نبوی کا ہے۔

بَابُ مَا يَقْرَأُ فِيْ صَلٰوةِ الْفَجْرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ

(جمعہ کے دن فجر کی نماز میں کیا چیز پڑھی جائے)

۸۴۴. حَدَّثَنَا اَبُوْ نُعَيْمٍ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيٰنُ عَنْ سَعْدِ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ هُرْمُزَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْفَجْرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ الٓمّٓ تَنْزِيْلُ وَهَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ.

ترجمہ ۸۴۴۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورہ الٓمّٓ تنزیل اور هل اتى على الانسان (یعنی سورہ سجدہ اور سورہ دہر) تلاوت کرتے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: بحر میں ہے کہ جو سورتیں حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص نمازوں میں پڑھی ہیں، ان کا التزام اکثر مستحب ہے اور یہی صحیح ہے۔ لہٰذا کنز وغیرہ کتبِ متون میں جو یہ ہے کہ تعیینِ سورت مکروہ ہے، اس کا تعلق ماثورہ سورتوں سے نہیں ہونا چاہئے۔

بَابُ الْجُمُعَةِ فِی الْقُرٰی وَمُدُنٍ

(دیہاتوں اور شہروں میں جمعہ پڑھنے کا بیان)

۸۴۵۔ حَدَّثَنِیْ مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰی قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ عَامِرِ الْعَقَدِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا اِبْرَاھِیْمُ بْنُ طَھْمَانَ عَنْ اَبِیْ جَمْرَۃَ الضُّبَعِیِّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ اَوَّلَ جُمُعَةٍ جُمِّعَتْ بَعْدَ جُمُعَةٍ فِیْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ مَسْجِدِ عَبْدِ الْقَیْسِ بُجْواثٰی مِنَ الْبَحْرَیْنَ.

۸۴۶۔ حَدَّثَنِیْ بَشْرُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰہِ قَالَ اَخْبَرَنَا یُوْنُسُ عَنِ الزُّھْرِیِّ اَخْبَرَنِیْ سَالِمٌ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّزَادَ اللَّیْثُ قَالَ یُوْنُسُ کَتَبَ رُزَیْقُ بْنُ حَکِیْمٍ اِلَی ابْنِ شِھَابٍ وَّاَنَا مَعَہٗ یَوْمَئِذٍ بِوَادِی الْقُرٰی ھَلْ تَرٰی اَنْ اُجَمِّعَ وَرُزَیْقٌ عَامِلٌ عَلٰی اَرْضٍ یَّعْمَلُھَا وَفِیْھَا جَمَاعَةٌ مِنَ السُّوْدَانِ وَغَیْرِھِمْ وَرُزَیْقٌ یَوْمَئِذٍ عَلٰی اَیْلَةَ فَکَتَبَ ابْنُ شِھَابٍ وَّاَنَا اَسْمَعُ یَاْمُرُہٗ اَنْ یُّجَمِّعَ یُخْبِرُہٗ اَنَّ سَالِمًا حَدَّثَہٗ اَنَّ عَبْدَ اللّٰہِ بْنَ عُمَرَ یَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ اَلْاِمَامُ رَاعٍ وَّ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِیْ اَھْلِہٖ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ وَالْمَرْاَۃُ رَاعِیَةٌ فِیْ بَیْتِ زَوْجِھَا وَمَسْئُوْلَةٌ عَنْ رَّعِیَّتِھَا وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِیْ مَالِ سَیِّدِہٖ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ قَالَ وَحَسِبْتُ اَنْ قَدْ قَالَ وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِیْ مَالِ اَبِیْہِ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ وَکُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ.

ترجمہ ۸۴۵۔ حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے بعد سب سے پہلا جمعہ بحرین کے مقام جواثی میں (قبیلہ) عبدالقیس کی مسجد میں ادا کیا گیا۔

ترجمہ ۸۴۶۔ حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے ہر شخص نگراں ہے، لیث نے زیادتی کے ساتھ بیان کیا کہ یونس کا قول ہے کہ میں ان دنوں وادی القری میں ابن شہاب کے ساتھ تھا، تو رزیق بن حکیم نے ابن شہاب کو لکھ بھیجا کہ کیا آپ کا خیال ہے، میں یہاں جمعہ قائم کروں، اور رزیق ایک زمین میں کاشت کاری کراتے تھے، اور وہاں حبشیوں اور دیگر لوگوں کی ایک جماعت تھی، اور رزیق ان دنوں میں ایلہ میں حاکم تھے تو ابن شہاب نے لکھا کہ جمعہ قائم کریں اور یہ حکم دیتے ہوئے میں سن رہا تھا، اور انہوں نے خبر دی کہ سالم نے ان سے بیان کیا کہ عبداللہ بن عمر فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے ہر شخص نگراں ہے، اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی، مرد اپنے اہل پر نگراں ہے، اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر میں نگراں ہے، اس سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔ خادم اپنے آقا کے مال کا محافظ ہے، اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پرسش ہوگی، ابن شہاب نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ شاید یہ بھی کہا کہ مرد اپنے باپ کے مال کا نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی اور تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے، اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے متعلق پرسش ہوگی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جمعہ فی القریٰ کا عنوان صرف امام بخاری اور ابوداؤد نے قائم کیا ہے اور حدیث بھی دونوں نے ایک ہی پیش کی ہے، ان دونوں نے قریہ کا لفظ لگایا ہوا ہے، حضرتؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کا مستدل "لا جمعة ولا تشریق الا فی مصر جامع"۔

(اس پر جو کچھ کلام ہوا ہے اس کے شافی وکافی محدثانہ جوابات اعلاء السنن ص ۲/۸ الخ میں ہیں) اور قریۂ جامعہ کی قید حضرت عطاء تابعی نے بھی لگائی ہے، (یہ بخاری کی حدیث ص ۸۵۲ میں موجود ہے) حافظ نے اس کے تحت ص ۲/۲۶۳ میں لکھا کہ محدث عبدالرزاق نے اس اثرِ عطاء میں یہ بھی اضافہ کیا کہ میں نے عطاء سے پوچھا کہ قریۂ جامعہ کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ جہاں جماعت ہو، امیر ہو، قاضی ہو، اور بہت سے گھر ایک جگہ ہوں جیسے جدہ ہے، دوسری روایت میں انہوں نے مدینہ کی مثال دی ہے اور ایک دفعہ مدائن کی طرح شہروں میں جمعہ کو بتایا (اوجز ص ۱/۳۵۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ تصریح چونکہ حنفیہ کے لئے پوری طرح موافق تھی، اس لئے اس پر حافظ کچھ نہ بولے اور خاموشی سے آگے گزر گئے۔ نیز فرمایا کہ امام بخاریؒ نے بھی قطع و برید کا معاملہ کیا ہے۔ غیر مقلدوں کو ایسی ہی چیزوں سے غلط فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے، دیہات میں جمعہ کرنے کے لئے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے قول سے بھی فائدہ اٹھایا ہے انہوں نے حجۃ اللہ میں لکھ دیا کہ جہاں پچاس آدمی ہوں، وہاں جمعہ فرض ہو جاتا ہے، کیونکہ پچاس آدمیوں سے قریت متحقق ہو جاتی ہے، اور حضور علیہ السلام نے بھی فرمایا[1] کہ جمعہ پچاس آدمیوں پر ہو جاتا ہے، اسی طرح کشمیر کے غیر مقلدوں سے گزشتہ[2] سال چاشت کے وقت جمعہ کی نماز پڑھی، صرف حنفیوں کی دشمنی میں اور کہا کہ امام احمد کے یہاں تو زوال سے قبل جائز ہی ہے، کیونکہ یہ بھی عید ہی ہے، حالانکہ جمہور امت کا مذہب بعد زوال کا ہی ہے (فتاویٰ دار العلوم دیوبند میں ہے کہ کسی نے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کو اسی قول حضرت شاہ ولی اللہ کے بارے میں لکھا تھا تو آپ نے جواب دیا کہ یہ ان کی تحقیق ہوگی، ہمیں تو امام ابوحنیفہؒ کا مسلک و مذہب اختیار کرنا چاہئے جو کتب فقہ میں مبین ومبرین ہے) حضرت مفتی صاحبؒ کے زمانہ کے سارے فتاویٰ بابۃ اقامۃ جمعہ فتاویٰ دار العلوم میں چھپ گئے ہیں، وہ قابلِ مطالعہ ہیں سوال نمبر ۴۲۰/ ۳۵۱ میں ایک قصبہ کی آبادی بارہ تیرہ سو لکھی اور یہ کہ اکثر دکانیں بھی ہیں اور ضروریات کی چیزیں بھی دستیاب ہوتی ہیں اور ہمیشہ سے یہاں جمعہ وعیدین ہوتے ہیں، تو حضرت مفتی صاحبؒ نے جواب دیا کہ ''قریۂ مذکور بڑا قریہ ہے، اس میں جمعہ واجب واداء ہو جاتا ہے'' الخ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس سے کم تعداد پر فتوےٰ نہیں دیا تھا، اور دوسری شرائط دوکانوں وغیرہ کی سب میں ضروری قرار دی ہیں۔

دیگر افاداتِ خاصہ انوریہ

آپ نے فرمایا کہ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر بستی میں حنفیہ کے نزدیک جمعہ قائم نہیں ہو سکتا، اور اس کے لئے مصر جامع یا قریۂ جامعہ ہونا ضروری ہے، لیکن ''مصر جامع'' کی تفسیر میں کچھ تسامحات ہو گئے ہیں جیسے ابن شجاع کی تعبیر پر نقض واعتراض ہوئے ہیں حالانکہ وہ بات بھی ان کی درست ہی تھی، اس لئے سب سے بہتر تعریف مصر جامع کی وہ ہے جو خود امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے کہ اس میں گلیاں اور کوچے ہوں۔ دوکانیں ضرورت کے سامانوں کی ہوں، اس بستی سے ملحق چھوٹی بستیاں (وانڈھے) ہوں جن کی ضروریات بھی یہاں سے پوری ہوتی ہوں، اس بستی میں حاکم بھی ہو جو مظلوم کو ظالم سے حق دلائے اور عالمِ دین بھی ہو، جو مسائل بتلائے۔ امام ابو یوسفؒ نے کہا کہ جہاں احکام شرعیہ وحدود نافذ کرنے والے امیر وقاضی ہوں، وہاں جمعہ ہو سکتا ہے۔ اس تعریف کو حنفی متون فقیہ میں بھی ذکر کیا گیا ہے کیونکہ درمختار کی کتاب القضاء میں یہ آ گیا ہے کہ ظاہر روایت کی رو سے مصر شرط ہے نفاذ قضاء کے لئے اور اسی لئے ہمارے یہاں قاضیوں کا تقرر بھی صرف شہروں میں ہوتا ہے۔

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس حدیث کی کوئی سند یا حوالہ پیش نہیں کیا، جیسا کہ ان کی عادت ہے کہ بہت ہی کم تخریج وتصحیح کرتے ہیں یہاں حضرت شاہ ولی اللہ نے ایک حدیث الجمعۃ واجبۃ علےٰ کل قریۃ بھی ذکر کی ہے، وہ بھی بلا حوالہ وسند ہے (حجۃ اللہ ص ۲/۳۰) ہمارے علم میں شاہ صاحب کی دونوں حدیثوں کو ائمہ مجتہدین وفقہاء میں سے کسی نے پیش نہیں کیا ہے اور نہ پچاس والا قول کسی کا مذہب ہے واللہ تعالیٰ اعلم ازالۃ الخفاء میں بہ کثرت احادیث ضعیف بلکہ ضعیف تر یا اس سے بھی کم درجہ کی لکھی ہیں، جن کی کوئی سند وحوالہ نہیں ہے، احقر نے بزمانۂ ادارت مجلسِ علمی ڈابھیل ازالۃ الخفاء کا ترجمہ عربی میں کرایا تھا اور تخریج کا بھی التزام کرایا تھا، مگر وہ اب تک شائع نہ ہو سکی۔ ''مؤلف''۔

[2] حضرتؒ نے یہ واقعہ ۲۱ صفر ۱۹۵۰ء کو درس بخاری شریف میں ان ہی احادیثِ جمعہ فی القریٰ پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا، پھر اگلے سال بھی ۵۱ھ کے درس بخاری میں اس واقعہ کا ذکر کیا تھا (مورخہ ۲۷ جون ۳۲ء)۔ ''مؤلف''۔

اگر کہا جائے کہ اس تعریف کی بنا پر تو جمعہ کا وجوب اس زمانہ میں مصر والوں پر بھی نہ ہوگا کیونکہ اب نہ قضاء ہے نہ اقامۃ حدود ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے اصحاب حنفیہ نے یہ بھی تصریح کردی ہے کہ جب کوئی ملک دارالحرب بن جائے تو وہاں کے شہروں میں وہ شخص جمعہ پڑھا سکتا ہے، جس پر قوم کا اتفاق ہوجائے۔ مبسوط و شامی میں ایسا ہی ہے۔

علامہ ابن تیمیہ کا عجیب استدلال

اوپر ہم نے شاہ ولی اللہ کے نقلی استدلال کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے سب سے الگ ایک نیا مسلک پچاس آدمیوں کے گاؤں میں وجوبِ جمعہ کا اپنایا ہے اور اس کے لئے دو حدیثیں پیش کیں جن کی صحت و قوت کا حال اللہ ہی جانتا ہے۔

ان ہی کے ممدوح اور دورِ حاضر کے سلفی حضرات کے متبوعِ اعظم علامہ ابن تیمیہ کا استدلال بھی پڑھتے چلئے، مزید بصیرت ہوگی، آپ کے مجموعۂ فتاویٰ ص ۱/۱۶۱ میں ہے کہ جمہور ائمہ مثل مالک، شافعی و احمد کے نزدیک جمعہ دیہات میں بھی جائز ہے، کیونکہ جواثی میں جمعہ ہوا، اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ وحضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ارشادات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، باقی رہا حضرت علیؓ کا ارشاد کہ جمعہ و تشریق بجز مصرِ جامع کے اور کہیں جائز نہیں، تو بالفرض اگر اس کے مقابل کوئی مخالف دلیل نہیں ہے تو ان کے ارشاد کا مطلب ہم یہ لیں گے کہ ہر قریہ مصر جامع ہے، جیسا کہ مصرِ جامع کو بھی قریہ کا نام دیا گیا ہے، حق تعالیٰ نے مکہ معظمہ کو قریہ فرمایا بلکہ ام القریٰ کہا اور مصر قدیمہ کو بھی قرآن مجید میں قریہ کہا گیا ہے اور ایسا قرآن مجید میں اور بھی بہت جگہ ہے۔

علامہ کا یہ استدلال بھی لاجواب ہے کیونکہ اس کا ایک مقدمہ حق تعالیٰ کی جانب سے پوری طرح استحکام پا چکا ہے لہٰذا یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ہر مصر جامع قریہ بھی ہے۔ جیسے کہیں کہ ہر انسان حیوان بھی ہے، اس کے بعد دوسرے مقدمہ کو صرف علامہ کی جلالتِ قدر کی خاطر مان لیجئے کہ ہر قریہ بھی مصر جامع ہے، یعنی یہ بھی مان لیں کہ ہر حیوان بھی انسان ہے کیونکہ علامہ نے اس دوسرے مقدمہ کی صحت پر کوئی دلیل نہیں دی یا اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس کے بعد ہم دوسروں کے دلائل وجوبِ جمعہ فی القریٰ بھی پیش کرکے ان کے جوابات پیش کریں گے تاکہ بحث مکمل ہوجائے، مگر اس سے پہلے علامہ ابن رشد مالکی کی ایک مختصر عبارت بھی نقل کردینا مفید سمجھتے ہیں، جس سے مسلک حنفیہ کی قوت و برتری دوسروں کی زبان سے ملتی ہے اور جوع گفتہ آید در حدیثِ دیگراں کے مصداق ہے۔

علامہ ابن رشد مالکی کا تاثر

امام ابوحنیفہؒ نے جمعہ کے لئے مصر اور سلطان کی بھی شرط لگائی ہے اور اس کے ساتھ عدد کی شرط ان کے نزدیک نہیں ہے (۴۰ نفر وغیرہ کی) درحقیقت اس بارے میں اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ حضور علیہ السلام نے جن احوال وظروف میں نماز جمعہ ادا فرمائی ہے، ان احوال کو ہی شرائطِ صحت ووجوب ماننے نہ ماننے میں فرق پڑ گیا، کیونکہ حضور علیہ السلام نے جمعہ کو کبھی کسی وقت بھی بغیر جماعت کے نہیں پڑھا، بغیر شہر کے نہیں پڑھا، اور بغیر کسی جامع مسجد کے نہیں پڑھا، ان سب امور میں سے کسی نے ان سب کو شرط صحت ووجوب سمجھا، (جیسے امام صاحب نے اور آپ نے عدد کی شرط بھی اسی لئے نہیں لگائی کہ وہ حضور علیہ السلام کے قول وعمل سے ثابت نہیں ہے البتہ سب ہی آئمہ نے بالاتفاق جمعہ کے لئے جماعت کو ضروری مانا ہے، لیکن امام ابوحنیفہ نے علاوہ امام کے تین آدمی ضروری قرار دیئے امام احمد وشافعی نے چالیس مع امام کے بتائے) اور کسی نے بعض کو بطور شرط مانا اور بعض کو نہیں جیسے امام مالکؒ نے مسجد کی شرط تو مانی اور مصر وسلطان کی نہیں مانی، اور اسی طرح دوسرے مسائل میں بھی اختلاف کی صورت بن گئی ہے (بدایہ ص ۱/۱۳۶) علامہ ابن رشد کے فیصلے بڑے دقیق اور دوررس ہوتے ہیں اور یہ بھی ان میں سے ایک ہے رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ناظرین غور کرتے جائیں کہ جس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ ایک طرف ہیں کہ وہ حضور علیہ السلام کے عملِ مبارک کو پوری طرح سے اپنا معمول بنانا چاہتے ہیں، اور دوسری طرف تینوں امام ہیں جو نیچے کے اقوالِ محتملہ کا سہارا لے کر کسی امر کو شرطِ صحت مانتے ہیں اور کسی کو نہیں، ان میں سے کھلی حق کی راہ کس کی ہے؟ ہم نے اوپر حنفیہ کے کچھ دلائل لکھ دیئے ہیں اور اب دوسروں کے دلائل مع جوابات لکھتے ہیں۔ واللہ الموفق۔

(۱) امام بخاریؒ وحافظ ابن حجرؒ

امام نے جو ترجمۃ الباب یہاں قائم کیا ہے، اور اس کے تحت دو حدیث درج کی ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ یہ ترجمہ اشارہ ہے ان کے خلاف اور رد کے لئے جو جمعہ کو شہروں کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور دیہات میں ان کا قیام جائز نہیں کہتے، جو حنفیہ سے نقل کیا گیا ہے اور انہوں نے حضرت حذیفہ وحضرت علیؓ وغیرہما کے آثار سے استدلال کیا ہے مگر حضرت عمرؓ سے یہ نقل ہوا کہ آپ نے اہلِ بحرین کو لکھا جہاں تم ہو جمعہ کر لو یہ شہروں اور دیہات سب کو شامل ہے اور لیث بن سعد نے فرمایا کہ ہر شہر یا گاؤں جہاں جماعت ہو وہاں جمعہ کا حکم ہے کیونکہ اہل مصر اور سواحل والے حضرت عمر وعثمان کے زمانہ میں ان کے امر سے جمعہ کیا کرتے تھے، جن میں صحابہ بھی تھے، اور ابن عمر بھی مکہ ومدینہ کے درمیان اہل میاہ کو جمعہ پڑھتے دیکھتے تھے اور ان پر کوئی نکیر نہ کرتے تھے، لہٰذا جب صحابہ کے آثار مختلف ہو گئے کہ کچھ نے دیہات میں جمع کو منع کیا اور کچھ نے اجازت دی تو ایسی صورت میں لازم ہوا کہ حدیثِ مرفوع کی طرف رجوع کر کے فیصلہ حاصل کیا جائے (۲/۲۵۹) گویا امام بخاری جو ایک حدیث جواثی میں جمعہ ہونے کی اور دوسری کلکم راع والی لائے ہیں۔ وہ اسی لئے لائے ہیں کہ اختلافِ صحابہ کی وجہ سے حنفیہ کے خلاف حدیث سے فیصلہ کرائیں۔ پھر حافظ نے دوسری حدیث پر لکھا کہ اس سے دیہات میں جمعہ قائم کرنے کا ثبوت ہوا اور یہ ان کے خلاف ہے جو جمعہ کے واسطے شہروں کی قید لگاتے ہیں۔ (فتح ص ۲/۲۶۰)

علامہ عینی کا اعتراض

آپ نے لکھا کہ میرے نزدیک یہاں سے کوئی دلیل نہیں نکلتی، کیونکہ اگر حدیث کلکم راع سے استدلال ہے تو وہ حجت تامہ نہیں ہے، اور اگر کتاب ابن شہاب سے استدلال ہے تو اس سے بھی حجت پوری نہیں ہوسکتی، کیونکہ انہوں نے کوئی تصریح اس امر کی نہیں کی کہ جمعہ ہر جگہ کر لو، شہر میں بھی، اور دیہات میں بھی، اگر کہا جائے کہ رزیق اپنی کھیتی کے فارم پر تھے اور وہاں سوڈانی وغیرہ بھی تھے اور وہ شہر نہیں بلکہ

گاؤں تھا تب بھی استدلال مکمل نہیں ہوتا کیونکہ ان کے موضعِ مذکور کو بھی شہر کا درجہ حاصل ہوگیا، اس لئے کہ امام وقت کی طرف سے وہاں رزیق بطور ان کے نائب ومتولی کے تھے اور ہم بتلا چکے ہیں کہ جب امام کسی گاؤں میں اپنا نائب اقامتِ احکام کے لئے مقرر کر کے بھیج دے تو وہ بھی شہر کے حکم میں ہو جاتا ہے (عمدہ ص۳/۲۶۶)

پھر ابن حجر کے استدلال مذکور میں یہ بھی نقص ہے کہ ان کے امامِ متبوع امام شافعیؒ کے نزدیک تو صحابی کا قول حجت بھی نہیں ہے اور یہاں قولِ تابعی ہے لہٰذا وہ بدرجۂ اولیٰ قابلِ احتجاج نہ ہوگا۔ (عمدہ ص۳/۲۶۹)

علامہ عینی کی رائے بابۃ ترجمۃ الباب

آپ کی رائے ہے کہ امام بخاری خود متردد ہیں اسی لئے انہوں نے دیہات میں جمعہ کی اقامت پر استدلال پورا نہیں کیا کیونکہ پہلی حدیث الباب کی مطابقت ترجمہ کے صرف جزو ثانی کے ساتھ ہوسکتی ہے، کیونکہ جواثی کا شہر ہونا اظہر من الشمس ہے، اس کو گاؤں کوئی بھی کسی طرح نہیں مان سکتا۔ (عمدہ ص۳/۲۶۳) پھر علامہ نے اس دعوے کو پوری طرح دلائل سے ثابت بھی کیا ہے اور ہم بھی کچھ لکھ آئے ہیں، علامہ نے دوسری حدیث پر جو کچھ لکھا وہ اوپر آچکا ہے، اس کے بعد علامہ نے لکھا کہ امام بخاری کے ترجمہ کی مطابقت جزو ثانی سے مان لینے کے بعد ان کی طرف سے کوئی اختلاف نہیں رہتا اور گویا امام بخاری کا مقصد بھی صرف اس مسئلہ کے اختلافی ہونے کی طرف اشارہ کرنا ہے اور اسی لئے انہوں نے حجت تمام نہیں کی ہے۔ فافہم۔ (رر)

راقم الحروف کا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ امام بخاری نے کسی ایک امر پر حجت قائم نہیں کرنی چاہی اور اسی لئے وہ حضرت انس کے اثر کو بھی اس باب میں نہیں لائے اور آگے دوسرے موقع پر لائے ہیں، جبکہ اس کو بھی جمعہ فی القریٰ والوں نے بطور دلیل کے پیش کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

الابواب والتراجم للشاہ ولی اللہ ص۲۶ میں **باب الجمعۃ فی القریٰ او المدن** ہے، او کے ساتھ، اس سے بھی شبہ ہوتا ہے مگر اس کے لئے بخاری کے موجودہ نسخوں سے قوت نہیں ملی دوسرے یہ کہ شاہ ولی اللہؒ نے بھی اس ترجمہ کو امام شافعیؒ کی تائید سمجھا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت علامہ کشمیری کی رائے

آپ نے فرمایا کہ رزیق ایلہ کے گورنر تھے، اور جس وقت ابن شہاب کے پاس استفسار کے لئے لکھا ہے اس وقت آپ ایلہ[1] شہر کے اطراف میں تھے، جہاں آپ نے کچھ اراضی کو قابلِ کاشت بنا کر قیام کیا ہوا تھا، آپ نے نواحی ایلہ سے ابن شہاب کو لکھا جو اس وقت وادی القریٰ کے ساکن تھے اور یہ وادی القریٰ متعلقات مدینہ طیبہ سے ہے شام کے راستہ پر، اس وادی میں بہت سے دیہات یکجا ہیں، اور ان کو حضور علیہ السلام نے ص ۷ھ میں فتح کیا تھا۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے رزیق کا یہ غارم فناءِ مصر میں ہو اور اس کے لئے کوئی تحدید حنفیہ کے یہاں نہیں ہے وہ شہر کے باہر میلوں تک بھی ہوسکتی ہے دوسرے میرا خیال یہ ہے کہ ان کا استفسار قریہ یا مصر کے اندر جمعہ قائم کرنے کے بارے میں تھا ہی نہیں، بلکہ دوسرے مسئلہ میں تھا کہ آیا گورنر ایلہ بن جانے کے بعد بھی ان کو حوالیِ ایلہ میں مزید اذن کی ضرورت اقامتِ جمعہ کے لئے ہے یا نہیں، اس کے جواب میں ابن شہاب نے لکھا کہ تمہاری ولایت جس طرح ایلہ پر ہے اسی طرح اس کے اطراف وحوالی میں بھی ہے۔ لہٰذا تمہیں ان

---

[1] سبقتِ قلم: لامع ص۲/۱۰ میں حضرت گنگوہیؒ کی جانب سے یہ بات لکھی گئی ہے کہ رزیق ایلہ کے امیر تھے اور وہ وادی القریٰ میں سکونت وزراعت کرتے تھے اور انہوں نے وادی القریٰ میں جمعہ قائم کرنے کے بارے میں ابن شہاب سے استفسار کیا تھا الخ۔ حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے مندرجہ بالا کو سبقتِ قلم قرار دے کر صحیح بات درج کر دی ہے۔ جو ہم نے بھی لکھ دی ہے۔ فتنبہ لہ (مؤلف)

لوگوں کے فرائض کی بھی نگرانی کرنی چاہئے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے ہر راعی و حاکم پر اپنی رعیت و ماتحت کی خبر گیری لازم کر دی ہے۔
حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اس عام حدیث کو یہاں لانے اور اس سے استدلال کرنے کا کوئی موقع نہ تھا، کیونکہ وہ ولایت و رعایت کے مسائل سے متعلق ہے یا باب الاستئذان سے شہر و قریہ کے فرق و مسائل بیان کرنے کے لئے نہیں ہے لہٰذا اس سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ رزیق نے جمعہ کے لئے اذان طلب کیا ہوگا، نہ کہ جمعہ فی القریٰ کے لئے اور یہ بات اس لئے ممکن نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت علیؓ سے مصنفِ عبدالرزاق میں بہ اسنادِ صحیح علیٰ شرط الشیخین ثابت ہو چکا ہے کہ جمعہ و تشریق کے لئے مصرِ جامع شرط ہے۔
علامہ نووی نے یہ کمال دکھایا کہ اس اثر کی تخریج بہ اسنادِ ضعیف کر کے اس پر ضعف کا حکم لگا دیا، حالانکہ اس کی اسناد دن چڑھے سورج کی طرح روشن و تابندہ ہے اور اسی کے قائل دوسرے صحابیِ رسول حضرت حذیفہ یمانیؓ بھی ہیں۔ (وراجع فیض الباری ص ۲/۳۲۱)
(۲) قائلینِ جمعہ فی القریٰ بخاری کے اثرِ حضرت انسؓ سے بھی استدلال کرتے ہیں، جو بخاری ص ۱۲۳" باب من این توتی الجمعة میں آنے والا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں" وکان انس فی قصره احیانا یجمع واحیانا لایجمع وھو بالزاویة علے فرسخین" یعنی کبھی وہ جامع بصرہ جا کر) جمعہ پڑھتے تھے اور کبھی جمعہ نہ پڑھتے تھے (اور زاویہ میں ہی ظہر پڑھ لیتے تھے) کذا فی الخیر الجاری شرح البخاری، اور اسی کی تائید روایتِ ابی البختری سے بھی ہوتی ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت انس کو دیکھا کہ زاویہ سے آ کر جمعہ میں شریک ہوتے تھے۔ (حاشیہ بخاری ص ۱۲۳)
پھر اسی کی تائید حضرت امام بخاری کے ترجمۃ الباب سے بھی ہوتی ہے کہ کتنی دور سے جمعہ کیلئے شہر میں جانا چاہئے اور اسی ترجمہ میں امام بخاری نے حضرت عطاء کا قول بھی پیش کیا ہے کہ جب تم کسی "قریۂ جامعہ" میں ہو اور نمازِ جمعہ کی اذان ہو جائے تو تم پر لازم ہے کہ جمعہ کی نماز پڑھو خواہ اذان کو تم خود سنو یا نہ سنو۔ حافظ نے لکھا کہ اس اثرِ مذکور میں محدث عبدالرزاق نے ابن جریج سے یہ اضافہ بھی روایت کیا ہے کہ میں نے عطا سے پوچھا کہ قریہ جامعہ کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جہاں جماعت ہو، امیر ہو قاضی ہو اور بہت سے گھر ایک جگہ مجتمع ہوں، جیسے جدہ ہے (فتح الباری ص ۲/۲۶۳)
دوسرے لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ حضرت انس کبھی تو جمعہ اپنے قصر میں پڑھتے تھے اور کبھی نہ پڑھتے تھے حالانکہ یہ مطلب غلط ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر ان کے قصر یا زاویہ میں جمعہ واجب ہو جاتا تھا اور وہ قریہ تھا تو پھر کبھی پڑھنے اور کبھی نہ پڑھنے کا موقع کیا تھا؟ جبکہ جمعہ پڑھنے کی سخت تاکیدات ہیں۔ اور حضرت انسؓ کی طرح بہ اسنادِ امام شافعیؒ امام بیہقی نے المعرفہ میں نقل کیا کہ سعید بن زید اور حضرت ابو ہریرہؓ دونوں شجرہ میں ہوتے تھے جو مدینہ طیبہ سے ۶ میل سے کم پر تھا، اور وہ دونوں کبھی جمعہ پڑھتے تھے (مدینہ جا کر) اور کبھی جمعہ نہ پڑھتے تھے۔ اور کبھی کوئی ان میں سے عقیق میں ہوتا تو جمعہ ترک بھی کر دیتے تھے، اور جمعہ میں جا کر شرکت بھی کر لیتے تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص طائف سے دو میل پر رہتے تھے اور جمعہ پڑھتے بھی تھے اور ترک بھی کر دیتے تھے، ان تمام آثار اور تفصیل سے یہ بات ثابت ہے کہ جمعہ دیہات میں نہ تھا اور نہ دیہات میں رہنے والے ہمیشہ قریبی شہروں میں پڑھنے کا التزام ہی کرتے تھے۔ (اعلاء السنن ص ۸/۲۴ و فیض الباری ص ۲/۳۳۲)
(۳) امام شافعیؒ کا قول بیہقی نے المعرفہ میں نقل کیا کہ لوگ عہدِ سلف میں مکہ و مدینہ کے درمیانی دیہات میں جمعہ پڑھا کرتے تھے، اور ربذہ میں بھی حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں پڑھا کرتے تھے، علامہ نیمویؒ نے اس کے جواب میں لکھا کہ یہ قول بلا سند و دلیل ہے اس لئے قابلِ جواب نہیں۔ (آثار السنن ص ۲/۸۴)
(۴) حضرت عمرؓ کا قول بھی حافظ ابن حجر وغیرہ نے پیش کیا ہے کہ آپ نے حضرت ابو ہریرہؓ کے سوال پر جواب دیا کہ جہاں بھی تم ہو وہیں جمعہ کر لیا کرو۔ علامہ عینی نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شہروں کے اندر جہاں تم ہو وہیں پڑھ لو، عام حکم اس لئے نہیں ہو سکتا کہ صحراؤں اور جنگلات میں کسی کے نزدیک بھی جمعہ نہیں ہے، علامہ نیموی نے مزید لکھا کہ ساری امت نے بالاتفاق فیصلہ کیا ہے کہ حج کے موقع پر عرفات

میں جمعہ نہیں ہے۔ اور ایسے ہی کچھ اہل الظاہر کو چھوڑ کر ساری امت کا اتفاق ہے کہ صحراؤں میں بھی جمعہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس عام میں تخصیص تو امام شافعی وغیرہ نے بھی کردی ہے۔ اور امام شافعی واحمد نے تو چالیس کی قید بھی لگا دی ہے، یعنی جمعہ کی نمازِ جماعت جب صحیح ہوگی کہ اس میں چالیس آدمی ہوں (گویا شہر میں بھی کم لوگ جمع ہوں تو نمازِ جمعہ صحیح نہ ہوگی اور چالیس آدمی کسی گاؤں میں ہوں اور وہ سب جماعت میں آجائیں تو جمعہ صحیح ہو جائے گا) اور دلیل کتنی قوی ہے کہ اسعد بن زرارہ نے جو نقیع میں پہلی نمازِ جمعہ پڑھائی تھی اس میں چالیس آدمی شریک تھے (ابوداؤد) خود حافظ نے التلخیص میں لکھا کہ اس حدیث کی اسناد حسن ہے مگر اس سے تعیین چالیس کے لئے استدلال نہیں ہوسکتا (ص ۱/۱۳۳) کیونکہ وہ ایک اتفاقی بات تھی، اس سے شریعت نہیں بنتی، نیز اس قید اور تعیین کیلئے اور بھی چند احادیث پیش کی گئی ہیں مگر وہ سب ضعیف و موضوع ہیں اور حضرت مصعب بن عمیرؓ نے جو جمعہ ہجرت نبوی سے قبل مدینہ طیبہ میں پڑھایا تھا، اس میں صرف بارہ آدمی تھے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی جماعت جمعہ کیلئے ضرور شرط ہے، جن کیلئے کم سے کم تین آدمی علاوہ امام کے ہوں تو کافی ہیں الخ (اعلاء ص ۸/۳۲)۔

واضح ہو کہ حضرت ابوہریرہ عہد فاروقی میں بحرین کے گورنر تھے، (کمافی معجم البلدان وغیرہ) اور وہی حضرت عمرؓ سے سوال کر رہے ہیں لہٰذا ان کے سوال ہی سے یہ بات مل رہی ہے کہ ان کے نزدیک بھی ہر موضع وقریہ میں جمعہ نہ تھا بلکہ وہ جانتے تھے کہ ہر چھوٹے قصبہ وشہر میں بھی نہ تھا بلکہ مصر جامع میں ہوسکتا ہے۔ اسی لئے پوچھا اور حضرت عمرؓ نے اشارہ دیا کہ والی گورنر چھوٹی جگہ پر بھی ہوگا تو وہاں بھی جمعہ پڑھائے گا، کیونکہ وہ جگہ بھی اس کی وجہ سے مصرِ جامع کے حکم میں ہو جاتی ہے اور یہی مذہب حنفیہ کا ہے۔ (آثار السنن ص ۲/۸۳ واعلاء ص ۸/۸)۔

افادۂ انور: حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی فرمایا کہ حضرت عمرؓ کا خطاب امراء اور والیوں سے تھا جو بجائے دیہات کے شہروں میں اقامت کرتے تھے اور اسی سے صحابہ کے دور میں اختلاف کی خاص وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے، ورنہ بظاہر ہر ہفتہ پیش آنے والی بات میں اور ایسے امر میں جو متواترات دین میں سے ہے، اختلاف نہ ہونا چاہئے تھا۔ وہ یہ ہے کہ امراء شہروں میں ہوتے تھے، اور عام لوگوں میں دین پر عمل کرنے کا صحیح وقوی جذبہ تھا اس لئے وہ قرب وجوار سے آکر امراء کے ساتھ شہروں میں نماز جمعہ ادا کرتے تھے، اور اس سے تخلف نہ کرتے تھے، اس کے بعد اور ادائگی احکام میں سستی آگئی تو لوگوں نے نواحی ودیہات سے جمعہ کے لئے شہروں میں جانا ترک کردیا اور اسی وقت سے اختلاف ظاہر ہوگیا، کچھ لوگوں نے کہا کہ سلف میں دیہات کا جمعہ اس لئے نہ تھا کہ وہاں واجب وصحیح نہ تھا، دوسروں نے کہا کہ وہ لوگ پہلے زمانہ میں دوسری ضرورتوں کے لئے شہروں میں جاتے تھے تو جمعہ بھی وہاں پڑھ لیا کرتے تھے، اگرچہ دیہات میں جمعہ جائز اس وقت بھی تھا۔

یہی دو مختلف نظریے ائمہ مجتہدین کے بھی ہوگئے اس کے لئے حضرتؒ نے حضرت علی وحضرت حذیفہ کے اقوال پیش کئے کہ مصر جامع اور قریہ جامعہ کی اصطلاح سلف میں ہی مشہور ہوگئی تھی۔ اور وہ جمعہ کے لئے جدہ، مداین وغیرہ کی مثالیں دے کر بھی سمجھایا کرتے تھے کہ جمعہ ایسی جگہوں میں ہونا چاہئے، اور اسی لئے حنفیہ نے مصرِ جامع کی تعریف وتعیین کی سعی فرمائی ہے۔

تحقیق شیخ ابن الہمامؒ

آپ نے فرمایا کہ مختصر بات جو نزاع وجدال کو ختم کرسکتی ہے وہ یہ کہ آیتِ مبارکہ **فاسعوا الی ذکر اللہ** میں سب نے مان لیا کہ حکم علی الاطلاق نہیں ہے، کیونکہ صحراؤں میں کوئی بھی جمعہ کو واجب یا صحیح نہیں کہتا بلکہ دیہات میں بھی وہ لوگ قید لگاتے ہیں کہ ایسے ہوں جن سے کسی زمانہ میں سردی یا گرمی میں لوگ باہر نہ جاتے ہوں، تو انہوں نے بھی صحراؤں کو ترک کیا اور دیہات میں بھی قیدیں لگائیں، اس لئے ہم نے جو مسلک اختیار کیا، شہروں میں جمعہ کا وہی زیادہ اولیٰ وانسب ہے۔ حدیث حضرت علی وحذیفہ کی وجہ سے بھی اور اس لئے بھی کہ صحابۂ کرام نے جب فتوحات کیں تو ان ممالک مفتوحہ میں جاکر بھی صرف شہروں کی مساجد میں منبر بنانے اور جمعے قائم کرنے کا اہتمام کیا اور دیہات میں

کہیں ایسا نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی نقل تو ہم تک آتی۔ (فیض الباری ص ۲/۲۳۲)۔

(۵) علامہ بیہقی وحافظ ابن حجرؒ نے لیث بن سعد کا قول پیش کیا ہے کہ اہلِ سکندریہ و مدائنِ مصر و مدائن سواحل مصر جمعہ ادا کرتے تھے، زمانۂ حضرت عمر وعثمان میں، ان ہی کے حکم سے، اور وہاں صحابہ بھی تھے۔ لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے زمانہ میں دیہات میں بھی جمعہ ہوتا تھا، بلکہ اس میں تو صرف شہروں کا ذکر ہے، اور اس کے بعد جو لیث، بن سعد کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ ہر شہر و قریہ میں جس میں جماعت تھی جمعہ قائم کرنے کا حکم امراء کو دیا گیا تھا، تو اول تو اس اثر میں انقطاع ہے کیونکہ لیث اتباعِ تابعین میں سے ہیں انہوں نے حضرت عمر وعثمان کا زمانہ نہیں پایا، لہٰذا ان کا اثر نا قابلِ احتجاج ہے۔ دوسرے یہ کہ جب امراء باذن الامام کہیں جمعہ قائم کریں تو وہ جگہ تو حنفیہ کے نزدیک بھی جمعہ کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

(۶) حافظ وغیرہ نے حضرت ابن عمرؓ کا قول بھی پیش کیا ہے کہ انہوں نے مکہ و مدینہ کے درمیانی دیہات کے بارے میں فرمایا کہ ان میں امیر ہو تو وہ جمعہ کرا دے اول تو اس کی سند بھی مجہول ہے (آثار السنن ص ۲/۸۴) دوسرے اس میں بھی قید امیر کی موجود ہے اور لوگوں کے سوال سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ جانتے تھے کہ ہر جگہ یا ہر قریہ میں جمعہ نہیں ہے، ورنہ سوال ہی کی ضرورت نہ تھی۔ حضرت ابن عمرؓ کے دوسرے آثار سے بھی یہی ثابت ہوا کہ وہ امیر کی موجودگی میں جمعہ کے قائل تھے (اعلاء ص ۸/۹)

(۷) علامہ ابن تیمیہ کا استدلال

آپ نے بھی جمعہ فی القریٰ کا جواز مانا ہے اور جواثی کا جمعہ اور حضرت ابن عمرؓ کا قول پیش کیا ہے، ان دونوں کے جواب ہو چکے، اور حضرت عمر بن العزیزؒ کا قول بھی پیش کیا کہ آپ نے عدی کو لکھا جن دیہاتوں میں خیموں کے گھر قابلِ انتقال نہ ہوں وہاں امیر قائم کر کے جمعہ کا اہتمام کریں۔ علامہ نیموی نے لکھا کہ اول تو اس کی سند ضعیف ہے اور منقطع بھی، پھر حضرت عمر بن العزیز کی رائے حجتِ شرعیہ بھی نہیں ہے۔

آپ نے یہ بھی لکھا کہ صاحب التعلیق المغنی علی الدار قطنی نے اور بھی اس قسم کے ضعیف آثار پیش کئے ہیں اور نہایت نازیبا اور غیر مہذب الفاظ بھی بعض اکابرِ سہارنپور کی شان میں لکھے ہیں، اور یہ نہ خیال کیا کہ وہ تمام آثار باعتبار سند و متن کے اہلِ علم کے نزدیک لاشئ ہیں خصوصاً حضرت علیؓ کے اثرِ قوی کے مقابلہ میں جس کی سندِ غایتِ صحت میں ہے (آثار السنن ص ۲/۸۴)

اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ علامہ ابن تیمیہ نے اثرِ حضرت علیؓ میں مصرِ جامع کو قریہ پر محمول کیا تھا، اور اس کا رد کیا تھا، اس دور کے ایک اہلِ حدیث نے بھی غالباً اُن ہی کے اتباع میں وہی بات دہرائی ہے۔ جس پر صاحب اعلاء السنن نے لکھا کہ یہ بات جس طرح طبع سلیم کے خلاف ہے، اثرِ حذیفہؓ کے بھی معارض ہے، کیونکہ حضرت حذیفہ نے قریٰ کا مقابلہ امصار کے ساتھ کیا ہے اور امصار کو مدائن کے ساتھ تشبیہ بھی دی ہے، جس سے یہ صراحتِ صحابی جلیل القدر ثابت ہو گیا کہ مصر اور قریہ عرفیہ الگ الگ ہیں، واضح ہو کہ ''مدائن'' بغداد کے قریب ایک شہر کا نام ہے، جس میں کسریٰ کا محل تھا، بڑا شہر ہونے کی وجہ سے اس پر جمع کا لفظ بولا گیا ہے۔

(۸) حضرت شاہ ولی اللہ کا استدلال ضعیف

آپ نے کہا کہ جہاں پچاس آدمی رہتے ہوں، اس گاؤں میں جمعہ ہو سکتا ہے۔ آپ نے لکھا: چونکہ حقیقتِ جمعہ اشاعتِ دین بلد میں ہے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ تمدن اور جماعت دونوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ اور میرے نزدیک صحیح تر یہ ہے کہ جمعہ ہر اس جگہ ہو سکتا ہے جس پر کم سے کم قریہ کا اطلاق ہو سکے اور پانچ پر جمعہ نہیں ہے، ان کو اہلِ بادیہ میں شمار کیا گیا ہے، اور حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جمعہ پچاس آدمیوں پر ہے۔ یہ میرے نزدیک اس لئے کہ اتنے آدمیوں سے قریہ بن جاتا ہے، اور حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ جمعہ ہر قریہ پر واجب ہے۔ اور

۴۰نفر کی شرط صحیح نہیں ہے، جتنے پر بھی کم سے کم اطلاق جماعت کا ہو سکے اتنے لوگ جمعہ میں ہوں تو نمازِ جمعہ ہو جائے گی۔ (حجۃ اللہ ص ۲/۳۰)

اگر چہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے دونوں مذکورہ متدلہ احادیث کی سند نہیں پیش کی اور نہ حوالہ دیا مگر تلاش سے معلوم ہوا کہ پہلی حدیث تو بیہقی وطبرانی کی ہے، اس میں یہ زیادتی بھی ہے کہ اس سے کم پر جمعہ نہ ہوگا، چونکہ یہ حدیث شافعیہ وغیرہم کے بھی خلاف ہے، غالباً اسی لئے وہ اس کو ذکر نہیں کرتے ہوں گے، پھر یہ کہ اس کے راوی جعفر بن الزبیر اور ہیاج بن بطام دونوں متروک ہیں اور حافظ ابن حجر نے التلخیص میں لکھا کہ بیہقی کا راوی نقاش بھی ضعیف ہے۔ پھر اس کے معارض حضرت مصعب ابن عمیر والی حدیث بھی ہے کہ انہوں نے قبل ہجرت مدینہ طیبہ میں جمعہ پڑھایا جس میں صرف بارہ نفر تھے۔ رہی دوسری حدیث "الجمعة واجبة علی کل قریة" یہ دارقطنی کی ہے اور اس میں یہ جملہ بھی ساتھ ہے وان لم یکن فیھا الا اربعة اور دارقطنی نے اس پر "لا یصح ھذا عن الزھری" کا ریمارک بھی کر دیا ہے۔ دوسری حدیث دارقطنیؒ نے روایت کی "الجمعة واجبة علی کل قریة فیھا امام وان لم یکونوا الا اربعة" اور کہا کہ اس میں موقری متروک ہے۔ الخ (اعلاء ص ۸/۳۰)

غرض ان روایات میں امام وغیرہ کی قید بھی لگی ہوئی ہے۔ اور متروک وضعیف راویوں سے مروی ہیں، پھر معلوم نہیں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے سب سے الگ ہو کر کیا فائدہ حاصل کیا۔ ایسی ضعیف احادیث سے تو سنت بھی ثابت نہیں ہوتی چہ جائیکہ وجوب اور وہ بھی وجوبِ جمعہ جیسا اہم فرض؟!

شاہ ولی اللہ نے اپنی رائے یا تحقیق مذکور سے قبل خود ہی یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ امتِ محمدیہ نے بطور تلقیِ لفظی تو نہیں لیکن تلقی معنوی کے ذریعہ یہ امر حاصل کیا ہے کہ جمعہ کے لئے جماعت اور ایک قسم کے تمدن کی شرط ضرور ہونی چاہئے اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم، آپ کے خلفاءؓ اور ائمۂ مجتہدینؒ سب ہی شہروں کے اندر جمعہ قائم کیا کرتے تھے اور اہلِ بدو دیہاتیوں سے جمعہ کا مطالبہ نہیں کرتے تھے، بلکہ ان سب کے زمانوں میں بدو کے اندر جمعہ قائم بھی نہ ہوتا تھا تو اس امر سے سب لوگوں نے قرناً بعد قرن اور عصراً بعد عصر یہی سمجھا کہ جمعہ کیلئے جماعت وتمدن شرط ہیں (حجۃ اللہ ص ۲/۳۰)۔

اس اعتراف کے باوجود شاہ صاحبؒ نے پچاس نفر کے گاؤں میں جمعہ کو صحیح اور واجب گردان دیا اور قرونِ اولیٰ کے تعامل وآثارِ صحابہ سے انحراف کرلیا اور اس قسم کے تفردات وشطحیات اصول وفروع دونوں میں شاہ صاحبؒ کے یہاں ملتے ہیں۔

(۹) علامہ ابن حزم کا عجیب استدلال

آپ نے حضرت علیؓ کے اثرِ مشہور کی تصحیح کی ہے، تاہم آپ نے اپنے مسلک کے لئے استدلال میں سب سے الگ اور عجیب استدلال اس طرح کیا کہ سب سے بڑا برہان یہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ پہنچے، تو وہ چھوٹے چھوٹے متفرق دیہات کا مجموعہ تھا، آپ نے وہاں پہنچ کر قبیلۂ بنی مالک بن النجار میں مسجد تعمیر کرائی اور اسی میں جو ایک چھوٹے گاؤں کی حیثیت میں تھا، بڑا گاؤں بھی نہ تھا، اور نہ وہ شہر تھا، جمعہ قائم فرمایا (کمافی العمدہ ص ۳/۲۶۵) صاحبِ اعلاء نے لکھا کہ بڑا تعجب ہے ابنِ حزم پر کہ انہوں نے ایسی بات کیوں کر کہہ دی۔ جب کہ سب ہی علماء آثار جانتے ہیں کہ مدینۃ الرسول صلے اللہ علیہ وسلم بہت سے گھروں اور محلوں پر مشتمل تھا، جن میں بہت سے قبائل رہتے تھے اور حضور علیہ السلام جب قبا سے مدینہ پہنچے ہیں تو وہاں کے محلوں سے گزرتے ہوئے سب ہی قبیلوں کے سرداروں اور عوام نے آپ کا استقبال کیا اور خواہش کی کہ آپ ان کے پاس قیام فرمائیں اور آپ نے جمعہ تو ضرور قبیلہ بنی سالم کی مسجد میں سب کے ساتھ ادا فرمایا مگر کسی قبیلہ یا محلّہ میں قیام نہیں فرمایا اور سب سے یہی فرماتے رہے کہ اونٹنی خدا کی طرف سے مامور ہے یہ خود ہی جس جگہ جا کر بیٹھ جائے گی، وہیں میرا قیام ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ نے راہ کے سب قبیلوں اور محلوں سے گزر کر بنو مالک بن النجار کے گھروں کے پاس اونٹنی کے وہاں بیٹھنے پر قیام فرمالیا جہاں اس وقت مسجدِ

نبوی ہے غرض یہ سب ایک بستی مدینہ طیبہ کے ہی گھر اور محلات تھے یہ نہیں کہ یہ قبیلے مدینہ کے قریب میں اس سے باہر آباد تھے۔ یا مدینہ کوئی الگ الگ چھوٹی بستیوں کا مجموعہ تھا۔ اسی لئے حضور علیہ السلام کو جب قبا والوں نے روکنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے ایسی بستی میں جانے کا حکم ہوا ہے جس کی شان دوسری بستیوں سے اعلیٰ وارفع ہے، گویا وہ ان کی سردار ہے، اور جب مدینہ کے قبیلوں سے گزرے تو آپ نے ان کو یہ جواب نہیں دیا جو قبا والوں کو دیا تھا کیونکہ آپ مدینہ طیبہ میں وارد ہو چکے تھے، اور دوسرا جواب دیا جو ہم نے اوپر لکھا ہے۔

(۱۰) علامہ شوکانی کا اجتہاد

آپ نے حضرت حذیفہ وحضرت علیؓ کے اثر موقوف کے خلاف یہ اجتہادی نکتہ پیش کیا کہ ان دونوں صحابی کے اقوال میں رائے و اجتہاد کی گنجائش ہے، اس پر علامہ نیموی اور صاحب اعلاء نے تعقب کیا کہ علماءِ اصول کا یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ صحابی کا ارشاد غیر مدرک بالقیاس امور میں بحکم مرفوع ہوتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کا کسی نماز کو خاص محل ومکان کے ساتھ مخصوص کرنا اور دوسرے میں اس کو ناجائز قرار دینا بغیر منشا شارع علیہ السلام جانے ہوئے نہیں ہوسکتا، کیونکہ جمعہ کے علاوہ اور سب نمازوں کا سب ہی مواضع میں یکساں طور سے صحیح و درست ہونا سب کو معلوم ہے۔ الخ (آثار السنن ص ۲/ ۸۸ و اعلاء السنن ص ۸/ ۱۷) و تلک عشرة کاملہ . و اللہ الموفق۔

آخر میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جمعہ فی القری کے مسئلہ میں اگرچہ ائمہ ثلاثہ دوسری طرف ہیں تاہم عبیداللہ بن الحسن اور امیر المومنین فی الحدیث سفیان ثوری بھی حنفیہ کے ساتھ ہیں جن کے لئے امام لقدرجال یحییٰ بن سعید القطان نے فرمایا کہ سفیان امام مالک سے ہر بات میں فائق ہیں دوسرے مناقب کے لئے ملاحظہ ہو انوار الباری ص ۱/ ۲۱۷ مقدمہ۔

بَابُ هَلْ عَلٰى مَنْ لَّا يَشْهَدُ الْجُمُعَةَ غُسْلٌ مِّنَ النِّسَآءِ وَالصِّبْيَانِ وَغَيْرِهِمْ وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ اِنَّمَا الْغُسْلُ عَلٰى مَنْ تَجِبُ عَلَيْهِ الْجُمُعَةُ

(جو جمعہ میں شریک نہ ہوں یعنی بچے اور عورتیں وغیرہ تو کیا ان لوگوں پر بھی غسل واجب ہے ابن عمر نے کہا ہے کہ غسل ان ہی پر واجب ہے جن پر جمعہ واجب ہے۔)

۸۴۷. حَدَّثَنَا اَبُو الْيَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ حَدَّثَنِيْ سَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللهِ اَنَّهٗ سَمِعَ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ جَآءَ مِنْكُمُ الْجُمُعَةَ فَلْيَغْتَسِلْ.

۸۴۸. حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَّالِكٍ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ غُسْلُ يَوْمِ الْجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُحْتَلِمٍ.

۸۴۹. حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ طَاؤُسٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بَيْدَ اَنَّهُمْ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِنَا وَاُوْتِيْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ فَهٰذَا الْيَوْمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ فَهَدَانَا اللهُ لَهٗ فَغَدًا لِلْيَهُوْدِ وَبَعْدَ غَدٍ لِلنَّصَارٰى فَسَكَتَ ثُمَّ قَالَ حَقٌّ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ اَنْ يَغْتَسِلَ فِيْ كُلِّ سَبْعَةِ اَيَّامٍ يَوْمًا يَغْسِلُ فِيْهِ رَاْسَهٗ وَجَسَدَهٗ رَوَاهُ اَبَانُ بْنُ صَالِحٍ عَنْ مُجَاهِدٍ عَنْ طَاؤُسٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلّٰهِ تَعَالٰى عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ حَقٌّ اَنْ يَّغْتَسِلَ فِيْ كُلِّ سَبْعَةِ اَيَّامٍ يَّوْمًا.

ترجمہ ۸۴۷۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے جو شخص جمعہ کی نماز کے لئے آئے تو وہ غسل کرے۔

ترجمہ ۸۴۸۔ حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے دن غسل کرنا، ہر بالغ مرد پر واجب ہے۔

ترجمہ ۸۴۹۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم آنے میں آخری ہیں لیکن قیامت میں سب سے آگے ہوں گے، بجز اس کے کہ انہیں ہم سے پہلے کتاب دی گئی، اور ہمیں بعد میں کتاب ملی، چنانچہ یہی وہ دن ہے جس کے متعلق انہوں نے اختلاف کیا، لیکن ہمیں اللہ نے ہدایت دی، تو کل (یعنی سنیچر، کا دن یہود کے لئے ہے، اور کل کے بعد (یعنی اتوار) کا دن نصاریٰ کے لئے ہے۔ پھر تھوڑی دیر خاموش رہے اور فرمایا کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ ہر سات دن میں ایک دن غسل کرے، اس طرح کہ اپنا سر اور اپنا جسم دھوئے اور اس حدیث کو ابان بن صالح نے بھی بہ سندِ مجاہد و طاؤس حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ہر مسلم پر یہ حق ہے کہ ہر سات دن میں ایک دن غسل کرے۔

۸۵۰. حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنَا شَبَابَةُ قَالَ حَدَّثَنَا وَرْقَآءُ عَنْ عَمْرِو بْنِ دِیْنَارٍ عَنْ مُّجَاهِدٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهُمَا عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ائذَنُوْ اللِنِّسَآءِ بِاللَّیْلِ اِلَی الْمَسَاجِدِ.

۸۵۱. حَدَّثَنَا یُوْسُفُ بْنُ مُوْسٰی قَالَ ثَنَا اَبُوْ اُسَامَةَ قَالَ حَدَّثَنَا عُبَیْدُ اللّٰہِ ابْنُ عُمَرَ عَنْ نَّافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ کَانَتْ امْرَاَۃٌ لِّعُمَرَ تَشْهَدُ صَلٰوۃَ الصُّبْحِ وَالْعِشَآءِ فِی الْجَمَاعَةِ فِی الْمَسْجِدِ فَقِیْلَ لَهَا لِمَ تَخْرُجِیْنَ وَقَدْ تَعْلَمِیْنَ اَنَّ عُمَرَ یَکْرَهُ ذٰلِکَ وَیَغَارُ قَالَتْ فَمَا یَمْنَعُهٗ اَنْ یَّنْهَانِیْ قَالَ یَمْنَعُهٗ قَوْلُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَمْنَعُوْا اِمَآءَ اللّٰہِ مَسَاجِدَ اللّٰہِ.

ترجمہ ۸۵۰۔ حضرت ابن عمرؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: عورتوں کو مسجد میں رات کے وقت جانے کی اجازت دے دو۔

ترجمہ ۸۵۱۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کی زوجۂ محترمہ فجر اور عشاء کی نماز کے لئے مسجد کی جماعت میں شریک ہوتی تھیں تو ان سے کہا گیا، کہ تم کیوں باہر نکلتی ہو، جب کہ تمہیں معلوم ہے کہ عمرؓ اس کو برا سمجھتے ہیں اور انہیں اس پر غیرت آتی ہے تو انہوں نے کہا کہ پھر انہیں کون سی چیز اس بات سے روکتی ہے کہ وہ مجھے اس سے منع کریں، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان انہیں اس سے مانع ہے کہ اللہ کی لونڈیوں کو اللہ کی مسجدوں سے نہ روکو۔

تشریح: حافظؒ نے لکھا کہ ترجمہ میں قولہ وغیرہم سے عبد اور مسافر و معذور بھی نکل گئے، کہ جس طرح بچوں اور عورتوں پر غسل جمعہ نہیں ہے، اسی طرح ان سب پر جمعہ بھی فرض نہیں ہے، یوں وہ ادا کرلیں تو ادا ہو جائے گا اور ظہر ان سے ساقط ہو جائے گی۔ اور پہلی حدیث الباب میں محتلم کے لفظ سے بچے نکل گئے، اور عورتوں کو رات میں نماز کے لئے نکلنے سے روکنے کے حکم سے جمعہ کے لئے نکلنے کا جواز معلوم ہوا، اور یہی وجہ ہے کہ آخری دو حدیث الباب لائی گئی ہیں جبکہ ان کا کوئی تعلق ترجمۃ الباب سے نہیں ہے۔ (فتح الباری ص ۲/۲۶۰) نیز حافظ اور عینی دونوں نے لکھا کہ امام بخاری تھوڑی مناسبت سے بھی احادیث لے آیا کرتے ہیں۔

افادۂ انور: حضرتؒ نے فرمایا کہ ترجمہ اور حدیث الباب میں من جاء منکم الجمعة الخ سے تفصیل معلوم ہوگئی کہ جمعہ کے لئے غسل کس پر ہے اور کس پر نہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر آنے والے اور جمعہ میں شریک ہونے والے پر غسل ضروری یا مستحب بھی نہیں، بلکہ یہ حکم صرف بالغ مردوں کے لئے ہے، جن پر جمعہ فرض ہے۔

لہٰذا میں کہتا ہوں کہ جب یہاں حدیث میں امام بخاری کے نزدیک من تعمیم کے لئے نہیں ہے کہ سب پر حکم یکساں ہوتا تو **لاصلوٰۃ لمن لم یقراء بفاتحۃ الکتاب** کے مَن کو عموم احوال کے لئے کیسے لیا گیا، کہ اس میں حالت انفراد واقتداسب کے لئے حکم عام کر دیا گیا، اور جس طرح یہاں تخصیص امام بخاری نے کر دی ہے ہم بھی فاتحہ کے حکم کو خاص اشخاص کے لئے مانتے ہیں یعنی منفردین اور اماموں کے لئے، اور مقتدیٰ کو اس حکم سے نکال لیتے ہیں، جیسے یہاں حکمِ عام سے امام بخاری نے بھی بچوں، عورتوں، مسافروں، معذوروں اور غلاموں کو نکال لیا ہے۔ پھر اس میں کوئی عجب اوپری بات بھی نہیں ہے، ایسا کتاب وسنت میں ثابت ہے کہ خطاب عام ہوا اور مراد خاص ہوا ہے، جیسے قولہ تعالیٰ **واذا طلقتم النساء فبلغن اجلھن فلا تعضلو ھن** میں خطاب بظاہر عام ہے اور مراد اولیاء ہیں کہ مخاطب وہی ہیں اور ایسے ہی حدیث "**ائذنوا للنساء الی المساجد**" میں خطاب عام ہے، مگر مراد صرف ازواج ہیں۔

بعینہ اسی طرح حدیث "لاصلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب" میں اگرچہ بظاہر حکم عام ہے، مگر ہم اس سے مراد صرف ان لوگوں کو لے سکتے ہیں جن کے حق میں قراءت جائز ہے۔

عورتوں کا جمعہ کیلئے گھروں سے نکلنا

حافظ نے یہاں علامہ کرمانی شافعی سے نقل کیا کہ عورتوں کے لئے رات کے وقت نماز کو نکلنے کی اجازت دینے کی حدیث امام بخاری ادنیٰ تعلق اور مناسبت کی وجہ سے لائے ہیں اور یہاں مفہومِ موافقت کے طور سے یہ بات بھی نکل رہی ہے کہ اگر عورتیں جمعہ کے لئے نکلیں تو وہ بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا کیونکہ بہ نسبت رات کے دن کا وقت فتنوں سے امن کا ہے، اور حنفیہ نے جو مفہومِ مخالف کے طور پر اس سے یہ سمجھا کہ رات کی قید سے جمعہ کی شرکت نکل گئی، کیونکہ رات کے وقت تو فسق وفجور والے اپنی بداطواریوں میں مشغول ہوتے ہیں اور دن میں ان کو کوئی شغل نہیں ہوتا، اس لئے آزادی سے پھرتے ہیں اور باہر نکلنے والی عورتوں کے لئے فتنوں کا سبب بنیں گے۔ علامہ کرمانی نے حنفیہ کی اس بات کو غلط قرار دیا اور کہا کہ یہ تو حنفیہ نے الٹی بات کہی ہے۔ اس لئے کہ فساق کا فتنہ دن میں کم ہوتا ہے، دوسرے عام لوگوں کی وجہ سے وہ تعرض نہ کریں گے، شرمائیں گے اور ان کے اعتراض سے ڈریں گے (فتح الباری ص ۲/۲۶۱)

علامہ کرمانی کا جواب

حافظ نے علامہ کرمانی کا اعتراض حنفیہ کے خلاف پا کر نقل کر دیا۔ اور یہ خیال نہ کیا کہ ابھی چند باب قبل ہی امام بخاری نے "**باب خروج النساء الی المساجد باللیل والغلس**" قائم کیا تھا جس میں چھ احادیث لائے تھے، ان میں بھی یہ قید آچکی ہے کہ رات کے وقت مسجد میں جانے کی عورتیں اجازت طلب کریں تو ان کو اجازت دے دینا۔ اور صبح کی نماز میں عورتیں حضور علیہ السلام کے زمانۂ مبارکہ میں شرکت کرتی تھیں تو نماز کے بعد جلدی سے نکل جاتی تھیں تاکہ واپسی میں پہچانی نہ جائیں، اور حضرت عائشہؓ نے تو یہ بھی فرما دیا تھا کہ سرے سے کسی بھی نماز میں عورتوں کا مسجد جانا اب ٹھیک نہیں رہا، اور حضور علیہ السلام اب کے نئے حالات دیکھ لیتے تو ان کو ہرگز اجازت نہ دیتے۔ اور وہاں خود حافظ ابن حجر کئی صفحات میں ضروری تشریحات لکھ آئے ہیں۔ وہاں آپ نے ص ۲/۲۳۶ میں سلف سے نقل کیا تھا کہ رات کی قید وخصوصیت اس لئے لگائی گئی کہ وہ استر ہے یعنی چھپانے والی ہے اور یہ بھی اس وقت ہے کہ ان کے رات میں مسجد جانے سے کوئی فتنہ نہ ان کی وجہ سے مردوں کے لئے ہوا اور نہ مردوں کی وجہ سے ان کے لئے ہو ورنہ رات کی بھی اجازت نہیں۔ یہ بھی تشریح کی گئی تھی کہ حضرت عائشہؓ نے نئے حالات سے اشارہ تبرج اور زینت کی طرف کیا تھا کہ عورتیں اپنے حسن وزینت کی نمائش کرنے کی طرف مائل ہو چکی تھیں اور یہ بھی تھا کہ

ممانعت کا سبب تحریکِ داعیہ شہوت کو روکنا تھا، جیسے اچھے لباس اور زیور وزینت کا اظہار اور اختلاطِ رجال وغیرہ پھر آخر میں بھی حافظ نے لکھا کہ بہتر یہی ہے کہ فساد وفتنہ کا دروازہ نہ کھلے اور اس سے کامل اجتناب کیا جائے کیونکہ حضور علیہ السلام نے بھی اس کی طرف اشارہ باہر نکلنے کی وقت خوشبو لگانے اور زینت کی ممانعت سے اور رات کی قید لگا کر کیا ہے ان حالات میں رات کی قید سے دن کی اجازت نکالنا زیادہ صحیح ہے جو کرمانی نے سمجھایا، دن کے وقت خروج الی المساجد کو ممنوع سمجھنا زیادہ صحیح ہے جو حنفیہ نے فرمایا ہے؟۔

پھر یہ بھی سب ہی جانتے ہیں کہ فاسق وفاجر لوگ سارے پلان راتوں کی تاریکی کے لئے بھی دن کی روشنی میں ہی تیار کرتے ہیں اور وہ پوری طرح ایسی عورتوں سے باخبر رہتے ہیں جو دن کے وقت بازاروں میں گھومتی اور خرید وفروخت کے بہانے سے گھروں سے باہر جاتی ہیں بلکہ وہ ان کی چال ڈھال سے بھی باکردار اور بے کردار والی عورتوں کا اندازہ کر لیتے ہیں، اسی لئے شارع علیہ السلام نے بغیر کسی شدید ضرورت کے عورتوں کے باہر جانے کو ہی سخت ناپسند کیا ہے اور فقہاء نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ جو عورتیں اپنے شوہروں کی اجازت کے بغیر باہر جاتی ہیں، ان کا نان ونفقہ شوہروں پر واجب نہیں ہے، کہ یہ رکاوٹ اور اجازت طلب کرنی ہی زوجیت کے معیارِ صحیح کا پتہ دیتی ہے۔

افسوس ہے کہ علامہ کرمانی اور حافظ ابن حجر ایسے پختہ شافعی المسلک اکابر نے یہ بھی نہ دیکھا کہ خود امام شافعی نے جوان عورتوں کو عیدگاہ جانے سے روک دیا ہے اور آپ نے کتاب الام میں لکھا کہ میں صرف بوڑھی عورتوں اور ان کے لئے نمازِ عید وغیرہ کے لئے جانا پسند کرتا ہوں جن کی صورت وہیئت میلان کے قابل نہ ہو، اور امام احمد نے بھی عورتوں کا عیدگاہ جانا جائز غیر مستحب بتلایا، اور علامہ نخعی، یحیٰ انصاری، سفیان ثوری اور ابن المبارک نے مکروہ قرار دیا حنفیہ نے جوان عورتوں کے لئے مکروہ کہا، اور معتمد قول سب کے نزدیک یہ ہے کہ سب ہی عورتوں کا عید وغیرہ کے لئے نکلنا ممنوع ہے، بجز بہت ہی بوڑھی کھوسٹ عورتوں کے، یعنی جو بوڑھی عورت زیب وزینت کرتی ہے، اس کا نکلنا بھی فتنہ سے خالی نہیں۔

علامہ رافعی سے شرح المہذب ص ۵/۹ میں نقل ہوا کہ جو کچھ اجازت ہے وہ بھی ان بوڑھیوں کے لئے ہے جو لائق رغبت نہیں، لیکن جوان اور حسن وجمال والی عورتوں کے لئے "کراہت وممانعت ہی ہے، کیونکہ ان سے فتنہ ہے اور ان کے لئے بھی فتنہ ہے۔ (معارف السنن ص ۴/۴۴۶)

غرض حنفیہ نے جو کچھ سمجھا درست ہی سمجھا ہے کہ عورتوں کے لئے دن کے اوقات تو کسی طرح بھی باہر نکلنے کے نہیں ہیں نہ نمازوں اور جمعہ وغیرہ کے لئے اور نہ دوسرے کاموں کے لئے، الا یہ کہ ضرورتِ شدیدہ کے وقت اور محارم کی معیت میں ان کے لئے اجازت ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جب عید کی نماز کے لئے جو سال میں صرف دو بار آتی ہے اوپر والی احتیاط سب نے تسلیم کر لی ہے تو جمعہ کی نماز کے لئے ہفتہ وار عورتوں کی نمازوں میں حاضری شارع علیہ السلام کو کیسے پسند ہو سکتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بَابُ الرُّخْصَةِ اِنْ لَّمْ يَحْضُرِ الْجُمُعَةَ فِي الْمَطَرِ

(بارش ہو رہی ہو تو جمعہ میں حاضر نہ ہونے کی اجازت کا بیان)

حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا اِسْمٰعِيْلُ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ الْحَمِيْدِ صَاحِبُ الزِّيَادِيِّ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ الْحَارِثِ بْنِ عَمِّ مُحَمَّدِ بْنِ سِيْرِيْنَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لِمُؤَذِّنِهٖ فِيْ يَوْمٍ مَّطِيْرٍ اِذَا قُلْتَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ فَلَا تَقُلْ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ قُلْ صَلُّوْا فِيْ بُيُوْتِكُمْ فَكَاَنَّ النَّاسَ اسْتَنْكَرُوْا فَقَالَ فَعَلَهٗ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنِّيْ اِنَّ الْجُمُعَةَ عَزْمَةٌ وَّ اِنِّيْ كَرِهْتُ اَنْ اُحْرِجَكُمْ فَتَمْشُوْنَ فِي الطِّيْنِ وَالدَّحْضِ.

بَابٌ مِنْ اَيْنَ تُؤْتَى الْجُمُعَةُ وَعَلٰى مَنْ تَجِبُ لِقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ وَقَالَ عَطَآءٌ اِذَا كُنْتُ فِيْ قَرْيَةٍ جَامِعَةٍ فَنُوْدِيَ بِالصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَحَقٌّ عَلَيْكَ اَنْ تَشْهَدَهَا سَمِعْتَ النِّدَآءَ اَوْلَمْ تَسْمَعْهُ وَكَانَ اَنَسٌ فِيْ قَصْرِهٖ اَحْيَانًا يُّجَمِّعُ وَاَحْيَانًا لَّا يَجَمِّعُ وَهُوَ بِالزَّاوِيَةِ عَلٰى فَرْسَخَيْنِ.

(نمازِ جمعہ کے لئے کتنی دور تک سے آنا چاہئے اور کن پر جمعہ واجب ہے؟ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی بنا پر کہ جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان کہی جائے الخ اور عطاء نے کہا کہ جب تم کسی ایسے شہر میں ہو جہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہے، اور جمعہ کی نماز کے لئے اذان کہی جائے، تو تم پر جمعہ کی نماز کے لئے حاضر ہونا واجب ہے، خواہ تم اذان کی آواز سنو یا نہ سنو اور حضرت انسؓ اپنے قصر میں رہتے تھے پھر کبھی جمعہ کی نماز پڑھتے اور کبھی نہ پڑھتے تھے، اور ان کا قصر شہر (بصرہ) سے دو میل کے فاصلہ پر زاویہ میں تھا)

ترجمہ ۸۵۲۔ حضرت عبداللہ بن حارث (محمد بن سیرین کے چچازاد بھائی) روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے بارش کے دن میں اپنے مؤذن سے کہا کہ جب تم اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰه کہہ لو، تو (اس کے بعد) حی علی الصلوۃ نہ کہو، بلکہ کہو، صلوا فی بیوتکم (اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو) لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوا تو انہوں نے کہا کہ یہ اس شخص نے کیا ہے جو مجھ سے بہتر تھے، اور نماز جمعہ اگرچہ فرض ہے، لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ تمہیں نکالوں، تاکہ تم کیچڑ اور پھسلن میں چلو۔

تشریح:۔ حدیث الباب سے ثابت ہوا کہ بارش بہت زیادہ ہو تو وہ بھی حضور نمازِ جمعہ کیلئے عذر بن سکتی ہے اسی طرح علماء نے بیماری کو بھی عذر قرار دیا ہے اور اگر کسی مریض کی تیمارداری میں زیادہ مصروفیت ضروری طور سے ہو یا اس کا مرض شدید ہو جس کے سبب سے اس کے پاس سے دور ہونا مضر ہو تب بھی اس کے پاس رہنا چاہئے اور نمازِ جمعہ ترک کر کے نمازِ ظہر پڑھ سکتا ہے۔ علامہ عینی نے تفصیل کی ہے۔

۸۵۳۔ حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ صَالِحٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ وَهْبٍ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عَمْرُو بْنُ الْحَارِثِ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ جَعْفَرٍ اَنَّ مُحَمَّدَ بْنَ جَعْفَرِ بْنِ الزُّبَيْرِ حدثهٗ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَآئِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ كَانَ النَّاسُ يَنْتَابُوْنَ الْجُمُعَةَ مِنْ مَّنَازِلِهِمْ وَالْعَوَالِيْ فَيَاْتُوْنَ فِي الْغُبَارِ يُصِيْبُهُمُ الْغُبَارُ وَالْعَرَقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُمُ الْعَرَقُ فَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْسَانٌ مِّنْهُمْ وَهُوَ عِنْدِيْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّكُمْ تَطَهَّرْتُمْ لِيَوْمِكُمْ هٰذَا.

ترجمہ ۸۵۳۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ام المؤمنین روایت کرتی ہیں کہ لوگ جمعہ کے دن اپنے گھروں اور عوالی سے باری باری آتے تھے وہ گرد میں چلتے تو انہیں گرد لگ جاتی اور پسینہ بہنے لگتا، ان میں سے ایک شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ اس وقت میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کاش تم آج کے دن صفائی حاصل کرتے (یعنی غسل کر لیتے تو اچھا ہوتا)۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں جمعہ فی القری والامصار کے علاوہ دوسرا مسئلہ زیر بحث آیا ہے، وہ یہ کہ جہاں جمعہ واجب ہے، اس کے اردگرد رہنے والوں پر بھی جمعہ کا وجوب ہے یا نہیں؟ اور بقول حافظؒ کے ترجمۃ الباب میں پیش کردہ آیتِ قرآنی چونکہ وجوب کے لئے صریح نہ تھی، اس لئے امام بخاری نے وجوب کو بطریق استفہام پیش کیا اور کوئی قطعی فیصلہ نہیں دیا ہے، اور جمہور کا مسلک حافظ

نے یہ ظاہر کیا کہ جو لوگ اذان سن سکتے ہیں، ان سب پر جمعہ واجب ہو جاتا ہے اور لکھا کہ ابوداؤد کی حدیث سے بھی یہی بات مفہوم ہوتی ہے، باقی دوسری حدیث ترمذی والی کو جو جمعہ پڑھ کر رات تک گھر واپس ہو سکے، اس پر بھی جمعہ ہے، اس کو امام احمد نے بہت ضعیف قرار دیا ہے، دوسرے وہ اس لئے بھی مرجوح ہے کہ اس سے سعی الی الجمعه اول النهار سے لازم آتی ہے، جو آیت کریمہ کے خلاف ہے کیونکہ جب اتنی مسافت پر جمعہ ہوا کہ رات تک گھر پہنچے، تو گھر سے جمعہ تک بھی اتنی ہی مسافت طے کرے گا، للہذا صبح سے ہی چلے گا تب جمعہ پائے گا، جبکہ آیت میں حکم نداء واذانِ جمعہ کے بعد گھر سے چلنے کا ہے (فتح الباری ص ۲/۲۶۳)۔

قوله وهو بالزاويه علی فرسخين۔ یہ حافظ نے لکھا کہ امام بخاری کی یہ تعلیق دو مختلف اثروں سے ملفق ہوئی ہے، ابن ابی شیبہ میں تو یہ ہے کہ حضرت انسؓ زاویہ سے جمعہ پڑھنے کے لئے بصرہ جایا کرتے تھے، جو اس سے ۲ فرسخ (۶ میل) تھا اور عبدالرزاق نے یہ روایت کیا کہ حضرت انسؓ اپنی زمین میں ہوتے تھے جو بصرہ سے تین میل پر تھی، اور آپ وہاں سے جمعہ پڑھنے کے لئے بصرہ کو آیا کرتے تھے، دونوں ماثروں میں تطبیق اس طرح ہے کہ قصر ۶ میل پر تھا اور فارم کی اراضی صرف تین میل پر تھی بصرہ سے (رر ص ۳/۲۶۲)۔

(نوٹ) بعض امالی میں ضبط کی غلطی سے دونوں اثروں کو ایک کہا گیا ہے، جیسا کہ حافظ نے تحقیق کی اثر دونوں مختلف ہیں، تاہم ان میں تطبیق مذکور کی گنجائش ضرور ہے۔

قوله قال عطاء پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس قولِ عطا (تابعی) سے حنفیہ کی تائید ہوتی ہے اور حافظ نے اس موقع پر لکھا کہ عبدالرزاق نے ابن جریج سے اس اثر کو موصول کیا ہے اور اس میں قریۂ جامعہ کی تشریح بھی حضرت عطا ہی سے مروی ہے (فتح ص ۳/۲۶۴) حضرتؒ نے فرمایا کہ امام بخاری سے تعجب ہے کہ اس ٹکڑے کو حذف کر دیا، جو حنفیہ کی تائید میں تھا۔

قوله و كان الناس ينتا پر حضرتؒ نے فرمایا کہ انتیاب کا ترجمہ صاحبِ صراح نے پے در پے آنا غلط کیا ہے کہ اس کا صحیح ترجمہ نوبت بہ نوبت آنا ہی ہے، کہ کبھی کچھ لوگ آتے تھے، اور کبھی دوسرے، اور جو نہ آتے تھے، وہ اپنے مواضع میں ظہر کی نماز پڑھتے تھے۔ اگر جمعہ دیہات والوں پر بھی فرض ہوتا تو سب ہی کو آنا چاہئے تھا۔

بعض امالی کی غلطی

اس موقع پر بعض امالی میں حضرتؒ کی طرف سے بات منسوب کی گئی ہے کہ علامہ قرطبی شارحِ مسلم نے اقرار کر لیا ہے کہ یہ حدیث حنفیہ کے لئے حجت ہے لیکن یہ غلطی اور مسامحت ہے، کیونکہ علامہ قرطبی، قسطلانی اور صاحب التوضیح تینوں نے حنفیہ کا رد کیا ہے جو کہتے ہیں کہ شہر سے باہر کے اہلِ عوالی واطراف پر جمعہ فرض نہیں ہے۔ حالانکہ حدیث میں ہے کہ وہ مدینہ میں آ کر جمعہ پڑھتے تھے، اگر جمعہ ان پر فرض نہ تھا تو کیوں پڑھتے تھے؟

رد الحافظ علی القرطبی

مگر حافظ نے علامہ قرطبی کا قول مذکورہ نقل کر کے خود ہی اعتراض کر دیا ہے کہ یہ استدلال حنفیہ کے خلاف محلِ نظر ہے، کیونکہ اگر ان پر جمعہ فرض ہوتا تو وہ نوبت بہ نوبت کیوں آتے، ان کو تو ہر جمعہ میں سب ہی کو حاضر ہونا چاہئے تھا۔ انتیاب افتعال ہے نوبۃ سے اور دوسری روایت میں یتناوبون بھی ہے۔ (فتح ص ۲/۲۶۳)۔

رد العینی علی صاحب التوضیح

حدیث الباب سے صاحبِ توضیح نے استدلال کر کے حنفیہ پر رد کیا تو علامہ عینی نے لکھا کہ انہوں نے بھی قرطبی کی طرح کوفیین پر

اعتراض کیا حالانکہ اہلِ عوالی پر جمعہ فرض ہوتا تو تناوبا کیوں آتے، انہیں تو سب ہی کو آنا ضروری ہوتا۔ (عمدہ ص ۳/ ۲۷۶)

علامہ قسطلانی کا رد

قسطلانی نے بھی اسی حدیث سے حنفیہ پر رد کیا ہے۔ اور حنفیہ کے استدلال پر اعتراض کیا ہے، ان کے لئے بھی ہمارا وہی جواب ہے جو قرطبی وغیرہ کے واسطے ہے۔ (بذل المجہود ص ۲/ ۱۶۴)

صاحب عون الباری کا اعترافِ حق

آپ نے ص ۳/ ۱۱۳ میں لکھا: یتنا بون، نوبۃ سے ہے یعنی وہ لوگ نوبت بہ نوبت آیا کرتے تھے (اعلاء السنن ص ۸/ ۱۰)

غیر مقلدین کی تلبیس

ان لوگوں نے دعویٰ کیا کہ انتیاب اور تناوب میں منافات ہے اول پے در پے آنے کے لئے ہے اور دوسرا کبھی کبھی آنے کے لئے ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے حافظ ابن حجر صاحبِ عون الباری نواب صدیق حسین خاں، علامہ کرمانی اور جمہور شارحینِ حدیث کی تغلیط کی جرأت کی ہے۔ صاحبِ مجمع البحار نے بھی انتیاب کے معنی نوبت بہ نوبت آنے کے ذکر کئے اور اس کو کرمانی سے بھی نقل کیا۔ (ص ۲/ ۴۰۰)

ان لوگوں کو صراح اور قاموس و مرقاۃ سے استدلال کرنے کا موقع مل گیا، جن میں انتیاب کے معنی پے در پے آنے کے یا ایک کے بعد دوسرے کے آنے کے لکھ دیئے ہیں، لیکن یہ دونوں معنی نوبت بہ نوبت آنے پر بھی منطبق ہو سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ حافظ ابن حجر، علامہ عینی، کرمانی اور صاحبِ مجمع البحار وغیرہم شارحینِ حدیث اہلِ لغت کے کلام سے بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ واقف تھے۔ پھر جبکہ یہ بھی ثابت ہوا کہ خود بخاری کی ہی دوسری روایت میں یتنا بون کی جگہ یتناوبون بھی آیا ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر اور عینی دونوں نے اس دوسری روایت کا علی الاطلاق اعتراف کیا ہے، لہٰذا ان غیر مقلدین کا یہ کہنا بھی کھلی ہوئی جہالت ہے کہ روایتِ یتناوبون صحیح نہیں ہے۔ اور صراح و قاموس کے مقابلہ میں السان العرب بھی ہے، جس میں انتیاب کے معنی نوبت بہ نوبت آنے کے ہی لکھے ہیں۔ اس میں اسی حدیث الباب کو پیش کیا اور دوسرے کلامِ عرب سے بھی شواہد ذکر ہوئے ہیں۔ (اعلاء السنن ص ۸/ ۱۰ میں پوری تفصیل قابلِ مطالعہ ہے)

یہ بھی اپنے حافظ میں تازہ کر لیجئے کہ صاحبِ قاموس وہی علامہ مجد الدین فیروز آبادی ہیں جو ظاہری المسلک تھے، اور انہوں نے سفر السعادۃ بھی لکھی تھی، جس میں اپنی ظاہریت کا کافی مظاہرہ کیا ہے، اسی لئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان کی شطحیات کا رد شرح سفر السعادہ میں بہترین دلائل کے ساتھ کیا ہے۔ یہ کتاب افضل المطابع کلکتہ سے ۱۲۵۲ھ میں ٹائپ سے بڑی تقطیع کے سات سو بیس صفحات میں شائع ہوئی تھی۔ اب نایاب ہے۔

تجربہ یہ بھی ہوا کہ ظاہری المسلک، غیر مقلدین اور سلفی حضرات کا مقصد بجائے خدمتِ حدیث و سنت کے اپنے مسلک کی حمایت اور مذاہب اربعہ ائمہ مجتہدین کی مخالفت ہوتی ہے: واللہ المستعان۔

شہر سے باہر کے ساکنین پر جمعہ ہے یا نہیں؟

جمعہ شہر والوں پر ہے دیہات والوں پر نہیں، یہ بحث پہلے ہو چکی ہے، پھر یہ کہ شہر سے باہر قریب کے رہنے والوں پر بھی جمعہ واجب ہے یا نہیں؟ علامہ عینیؒ نے لکھا کہ اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے، ایک گروہ کا خیال ہے کہ شہر میں جمعہ پڑھ کر جو شخص اپنے گھر رات سے پہلے پہنچ سکے اس پر بھی جمعہ فرض ہے۔ یہ بعض صحابہ اور اوزاعی وغیرہ کا مذہب ہے وہ حدیثِ ترمذی سے استدلال کرتے ہیں جو ضعیف ہے بعض

کہتے ہیں کہ جو لوگ شہر سے اتنے قریب ہوں کہ وہ اذانِ جمعہ سن سکیں، ان پر جمعہ فرض ہے یہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے، ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ صرف شہر والوں پر جمعہ فرض ہے اور شہر سے باہر کے ساکنین پر نہیں ہے خواہ وہ شہر کی اذان سنیں یا نہ سنیں، یہ قول امام ابوحنیفہؒ کا ہے کیونکہ جمعہ صرف شہر والوں پر واجب ہے دیہات وصحراؤں کے ساکنوں پر نہیں ہے، بجز اس کے کہ وہ جمعہ کے وقت شہر میں موجود ہوں، اسی مسلک کو قاضی ابوبکر بن العربی نے راجح قرار دیا ہے، اور کہا کہ ظاہرِ شریعت امام صاحب ہی کے ساتھ ہے۔

پھر علامہ عینی نے لکھا کہ امام صاحب کے مذہب میں مصرِ جامع یا مصلے مصر، یا شہر سے متعلق وملحق اردگرد کے رہنے والوں پر جمعہ فرض ہے، باہر کے دیہات پر نہیں ہے خواہ وہ قریب ہوں یا دور ہوں اور یہ ربیع میں ہے کہ جس کا گھر شہر سے باہر ہو اس پر جمعہ نہیں ہے اور لکھا کہ یہ صحیح ترین قول ہے۔

بدائع میں ہے کہ ہمارے اصحاب کے نزدیک مصرِ جامع شرطِ وجوب جمعہ و شرطِ صحتِ ادارہ ہے۔ لہٰذا وہ صرف شہر اور اس کے ماتحت حصوں میں ہی فرض ہے اور وہیں ادا ہو سکتا ہے اور دیہات والوں پر واجب نہ ہوگا، نہ وہاں ادا ہوگا۔ پھر توابعِ مصر میں اختلاف ہوا کہ امام ابو یوسف نے کہا وہ تین فرسخ تک ہو سکتے ہیں اور بعض نے کہا کہ جو شخص جمعہ پڑھ کر رات سے پہلے اپنے گھر پہنچ سکے اس پر بھی جمعہ ہے (عمدہ ص ۳/۳۷۶)

شرح المنیہ میں ہے کہ جو لوگ اطرافِ مصر میں ہوں اس طرح کہ ان کے اور شہر کے درمیان خالی میدان نہ ہو بلکہ دونوں کی عمارتیں متصل ہوں، ان پر جمعہ ہے، اگرچہ وہ اذان نہ بھی سنیں، اور اگر ان کے درمیان خالی میدان، کھیت یا چراگاہیں ہوں تو ان پر جمعہ نہیں، اگرچہ وہ شہر کی اذان بھی سنتے ہوں۔ البتہ امام محمد کہتے ہیں کہ اذان سنیں تو ان پر بھی جمعہ ہے۔ (بذل ص ۲/۱۶۵)۔

حدیثِ ترمذی در تائیدِ حنفیہ

امام ترمذی ایک حدیث لائے ہیں کہ ایک صحابی ساکنِ قباء نے کہا کہ ہمیں حضور علیہ السلام نے حکم دیا تھا کہ ہم قباء سے چل کر (مدینہ طیبہ کے) جمعہ میں حاضر ہوا کریں، یہ جگہ مدینہ طیبہ سے تین میل پر ہے۔ یہ بھی حنفیہ کی دلیل ہے کہ دیہات میں جمعہ نہیں ہے، ورنہ وہیں جمعہ ہوتا، مدینہ طیبہ جاکر جمعہ میں شرکت کرنی نہ پڑتی اور اس سے زیادہ صریح حدیثِ بخاری ہے جو اس وقت ہماری حدیث الباب بھی ہے کہ مدینہ طیبہ کے آس پاس کے لوگ اپنے گھروں اور عوالی سے آکر جمعہ مدینہ طیبہ میں پڑھا کرتے تھے، اور نوبت بہ نوبت آیا کرتے تھے۔ کبھی کچھ لوگ آئے کبھی دوسرے، اسی طرح آتے رہتے تھے۔

ان دونوں حدیثوں سے واضح ہوا کہ دیہات میں جمعہ نہ تھا اور نہ ان پر واجب تھا کہ ضروری شہر میں جاکر نمازِ جمعہ پڑھیں۔ اسی لئے سب نہ آتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ نے لکھا کہ جمعہ کی عظیم فضیلت کے باوجود جو باقی لوگ اپنی بستیوں میں رہ جاتے تھے اور شہر مدینہ میں حاضر نہ ہو سکتے تھے، وہ اپنے یہاں جمعہ قائم نہ کرتے تھے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ دیہات میں جمعہ جائز نہ تھا۔ (معارف ص ۴/۳۴۶)۔

معارف السنن ص ۴/۳۴۷ میں ہے کہ عہدِ نبوت میں صرف تین جگہ میں جمعہ قائم ہوا تھا، پھر عہدِ خلافت میں وسعت ہوئی تو دوسرے شہروں اور ان منازل میں بھی قائم ہوا جن کی حیثیت شہر کی بن گئی تھی اور وہی محمل ہے حضرت ابن عمرؓ کے اہلِ میاہ کے لئے جمعہ قائم کرنے کا دیا جو لیث بن سعد سے مروی ہوا، اس کا تعلق بھی ایسے ہی مواضع سے ہے۔

''بحر'' میں تجنیس سے نقل کیا کہ اگر طریق مکہ معظمہ کی منازل تغلبیہ وغیرہ میں خلیفہ یا والیٔ عراق قیام کرے تو وہاں وہ جمعہ قائم کرے گا، کیونکہ وہ مواضع اس وقت شہر بن جائیں گے، جیسے حج کے موقع پر منیٰ ہو جاتا ہے، غرض جمعہ امام وقت پر منحصر ہے، جہاں وہ قائم کرے گا، وہیں قائم ہوگا، یعنی شہروں میں یا اُن قری میں جو شہر بن جائیں گے، عام دیہات میں نہ ہوگا، اور جو شہروں میں نہ آئے گا، وہ ظہر کی نماز پڑھے

گا۔تاریخ اسلام سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

علامہ مودودی کا مسلک اور فقہ حنفی میں ترمیم

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اپنی تالیف "الاستاذ المودودی ونتائج بحوذ وافکارہ" میں لکھا: مودودی صاحب نے جمعہ فی القریٰ کے مسئلہ میں بھی اجتہاد فرمایا ہے اور لکھا کہ اس مسئلہ میں لوگوں کو مغالطہ لگ گیا ہے، اس کو میں زائل کرتا ہوں۔ جمعہ کے دیہات میں نہ ہونے سے یہ سمجھ لیا گیا کہ دیہات والوں پر جمعہ فرض نہیں ہے، حق یہ ہے کہ نماز جمعہ کی غرض مسلمانوں کا بڑا اجتماع ہے، اور اسی لئے چھوٹے قریوں میں اس کو قائم کرنے سے شریعت نے روک دیا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب سمجھنا صحیح نہیں کہ گاؤں والوں پر جمعہ فرض ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ان کو کسی ایک مرکز پر جمع ہو کر جمعہ پڑھنا چاہئے، میں نے فقہ حنفی کا مطالعہ کر کے یہی سمجھا ہے کہ چھوٹے دیہات کے لوگوں کو بھی کسی قریہ میں جمع ہو کر جمعہ قائم کرنا فرض ہے خواہ اس گاؤں میں بازار وغیرہ بھی نہ ہوں، کیونکہ الفاظ کی قیود سے نکل کر مقصد اور روح شریعت سمجھ لینے کے بعد یہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے، ۸ کروڑ مسلمانوں کا بیک وقت نماز جمعہ کے لئے جمع ہونا عظیم رابطہ عوام کو ظاہر کرتا ہے جس کا جواہر لال اور گاندھی ایسے لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے، اور اس اجتماع عظیم کی اہمیت کو سمجھ کر مسلمانان ہند دوسرے تمام تمدنی واجتماعی مقاصد ومنافع بھی تدریجاً حاصل کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ جمعہ کی قوت کا پوری طرح احساس کرلیں الخ حضرت شیخ نے علامہ کی پوری عبارتیں "ترجمان القرآن" بابۃ ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ سے نقل فرما کر ان خیالات کی تردید فرمائی ہے اور جمعہ فی القریٰ کے مذکورہ نظریہ کو نہ صرف فقہ حنفی بلکہ دوسرے اکابر امت کے بھی خلاف ثابت کیا ہے۔

دور حاضر کے اہل علم ونظر حنفیہ کو فیصلہ کرنا ہے کہ ترمیم مذکور کا حق مودودی صاحب کو پہنچتا ہے یا نہیں؟ پہلے زمانہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جو اصول وعقائد میں تو امام ابوحنیفہ کے خلاف تھے مگر بیشتر فروع فقہیہ میں فقہ حنفی کے متبع تھے، کچھ ایسا ہی حال مودودی صاحب کا بھی معلوم ہوتا ہے اور شاید اسی لئے بہت سے سادہ لوح حنفی بھی ان کے ہمنوا ہو گئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اذان کون سی معتبر ہے

شہر کی اذان اطراف شہر میں جہاں تک سنی جائے، وہاں کے لوگوں پر جمعہ فرض ہو جانے کے قول پر کہا گیا کہ اعتبار دوسری اذان وقت خطبہ کا ہے کہ وہی حضور علیہ السلام کے زمانہ میں اذان اول تھی، دوسرے حضرات نے کہا کہ اب اعتبار پہلی اذان کا ہی ہوگا، پھر آج کل لاؤڈ سپیکر پر اذان کی آواز مافوق العادۃ طور پر زیادہ دور کے فاصلوں تک پہنچ جاتی ہے اور...... ہوا کے موافق ومخالف ہونے کا بھی اثر پڑتا ہے، اس لئے وہی قول زیادہ راجح اور قابل عمل بھی ہے کہ شہر کے ملحقہ حصوں پر نماز جمعہ ہے اور الگ حصوں پر نہیں ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

بَابُ وَقْتِ الْجُمُعَةِ اِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ وَكَذَالِكَ يُذْكَرُ عَنْ عُمَرَ وَعَلِيٍّ وَّالنُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ وَّعُمَرِو بْنِ حُرَيْثٍ.

(جمعہ کا وقت آفتاب ڈھل جانے پر ہونا چاہئے حضرت عمرؓ علیؓ نعمان بن بشیرؓ اور عمرو بن حریثؓ سے اسی طرح منقول ہے)

۸۵۴۔ حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ اَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ اَنَّهُ سَأَلَ عُمْرَةَ عَنِ الْغُسْلِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَقَالَتْ قَالَتْ عَائِشَةُ كَانَ النَّاسُ مَهَنَةَ اَنْفُسِهِمْ وَكَانُوْا اِذَا رَاحُوْا اِلَى الْجُمُعَةِ رَاحُوْا فِيْ هَيْئَتِهِمْ فَقِيْلَ لَهُمْ لَوِاغْتَسَلْتُمْ.

۸۵۵. حَدَّثَنَا شُرَيْحُ بْنُ النُّعْمَانِ قَالَ حَدَّثَنَا فُلَيْحُ ابْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عُثْمَانَ التيمى عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي الْجُمُعَةَ حِيْنَ تَمِيْلُ الشَّمْسُ.

۸۵۶. حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ قَالَ اَخْبَرَنَا حُمَيْدٌ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَّضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ كُنَّا نُبَكِّرُ بِالْجُمُعَةِ وَنَقِيْلُ بَعْدَ الْجُمُعَةِ.

ترجمہ۸۵۴۔ یحییٰ بن سعید روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عمرہؓ سے جمعہ کے دن غسل کے متعلق دریافت کیا، توانہوں نے جواب دیا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں کہ لوگ اپنا کام کاج خود کیا کرتے تھے، جب جمعہ کی نماز کی طرف جاتے تو اسی ہیئت میں چلے جاتے تھے تو ان سے کہا گیا کہ کاش تم غسل کر لیتے۔

ترجمہ۸۵۵۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس وقت جمعہ کی نماز پڑھتے جب آفتاب ڈھل جاتا تھا۔

ترجمہ۸۵۶۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ جمعہ کے دن سویرے نکلتے اور جمعہ کی نماز کے بعد لیٹتے تھے۔

تشریح:۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ جمعہ کا وقت جمہور کے نزدیک وقتِ ظہر ہی ہے (اور امام بخاری بھی جمہور کے ساتھ ہیں)، صرف امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جمعہ عیدین کے وقت بھی جائز ہے گویا چاشت کے وقت بھی ان کے نزدیک درست ہوگا اور یہ قول حضرت ابن مسعود اور ابن زبیر کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے میرے نزدیک ان دونوں کی طرف یہ نسبت صحیح نہیں ہے دوسرے یہ کہ ابن زبیرؓ کے بارے میں علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی یہ اعتراف کیا کہ وہ کثیر التفردات تھے (جہرِ آمین و بسم اللہ قنوت فجر وغیرہ بھی ان سے ثابت ہے)

باقی یہ کہ صحابۂ کرام جمعہ کے دن دوپہر کا کھانا اور قیلولہ نماز کے بعد کرتے تھے، اس کی صورت یہ نہیں ہے کہ زوال سے قبل ہی نماز پڑھ لیتے تھے اور اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق کھانا اور قیلولہ بھی اپنے وقت پر زوال سے قبل ہی کرتے تھے بلکہ جمہور کے نزدیک اصل صورت یہ تھی کہ وہ صبح ہی سے نمازِ جمعہ کی تیاری میں لگ جاتے تھے، جامع مسجد جا کر نمازِ جمعہ کا انتظار کرتے تھے، اور اس سے فارغ ہو کر گھروں پر پہنچ کر کھانا کھاتے اور قیلولہ کرتے تھے، جو روزانہ کے معمول سے مؤخر ہوتا تھا۔

حافظ ابن حجر وابن المنیر کا ارشاد

اس امر سے جو استدلال کیا گیا ہے کہ دن کے کھانے اور قیلولہ کا وقت چونکہ قبل الزوال ہوتا ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ وہ لوگ نمازِ جمعہ بھی قبل الزوال ادا کر کے اپنے معمول کے مطابق غذا و قیلولہ کرتے تھے اس کے جواب میں حافظ نے لکھا کہ اس میں نماز قبل الزوال کے لئے استدلال کا کوئی موقع نہیں ہے، کیونکہ وہ تو یہ بتلا رہے ہیں کہ نماز سے قبل جمعہ کی تیاری اور جلوس فی المسجد وانتظارِ نماز اور پھر ادائِ نماز کے سبب سے ان کا روزانہ کا معمول قبل الزوال طعام و قیلولہ کا بدل جاتا تھا اور اسی کو وہ بتلاتے تھے، بلکہ علامہ زین بن المنیرؒ نے تو یہ بھی دعویٰ کیا کہ ان کی اس بات سے نمازِ جمعہ کا ثبوت بعد الزوال کا ہوتا ہے، کیونکہ عادۃً وہ روزانہ قبل الزوال کھانے کے بعد قیلولہ کیا کرتے تھے اور خاص جمعہ کے دن سے متعلق صحابی نے یہ خبر دی کہ ہم لوگ جمعہ کیلئے تیاری و مشغولی کی وجہ سے طعام و قیلولہ کو مؤخر کیا کرتے تھے (آثار السنن ص ۹۱/۳)

حافظ نے لکھا کہ بعض حنابلہ نے اس سے بھی استدلال کیا کہ حضور علیہ السلام نے جمعہ کے دن کو عید المسلمین فرمایا ہے، لہٰذا عیدین کے وقت میں ہی نمازِ جمعہ بھی پڑھ سکتے ہیں، لیکن یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ عیدین کے احکام تو اور بھی ہیں مثلاً ان میں روزہ رکھنا حرام ہے۔ بخلاف یومِ جمعہ کے کہ اس میں سب کے نزدیک روزہ رکھ سکتے ہیں بلکہ افضل ہے، نیز خطبۂ جمعہ قبل الصلوٰۃ ہے اور عیدین میں بعد الصلوٰۃ ہے اور عیدین کے دن نمازِ عید سے قبل نفل نماز مطلقاً مکروہ ہے اور بعد عید کے عید گاہ میں مکروہ ہے۔ بخلاف جمعہ کہ اس سے قبل و بعد نفل نماز ہے

اور نمازِ عید کے لئے اذان واقامت نہیں ہے، بخلاف جمعہ کے کہ اس کے لئے دونوں ہیں۔ (اعلاء ص ۳۴/۸)

قولہ و کانوا اذا راحوا الخ حافظ نے لکھا کہ اس سے امام بخاری نے ثابت کیا کہ جمعہ زوال کے بعد ہوتا تھا، کیونکہ رواح کی حقیقت اکثر اہلِ لغت کے نزدیک بعد الزوال چلنے کی ہے، باقی جہاں قرینہ صارفہ ہو تو معنی قبل الزوال کے لے سکتے ہیں جیسا کہ **من اغتسل یوم الجمعة ثم راح** میں رواح کو مطلق جانے کے معنی میں لیا گیا۔ اور یہاں تو بعد الزوال کے لئے تائید بھی حدیثِ حضرت عائشہؓ سے ملتی ہے، جس میں فرمایا کہ لوگ جمعہ کے لئے عوالی واطراف سے آتے تھے، تو گرمی گرد وغبار اور پسینہ کی وجہ سے ان کے کپڑوں میں سے بو آنے لگتی تھی، کیونکہ یہ بات گرمی کے وقت اور زوال کے قریب آنے میں ہی ممکن ہے۔ اور غالباً اسی لئے یہاں بھی حضرت عائشہؓ کی دوسری حدیث امام بخاری لائے ہیں۔

قولہ کان یصلی حین تمیل الشمس ۔ حافظ نے لکھا کہ اس سے ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام ہمیشہ نمازِ جمعہ زوال کے بعد ہی پڑھا کرتے تھے (فتح الملہم ص ۴۶۴/۲) صاحب اعلاء السنن نے اس باب میں سب سے پہلے وہ مکتوبِ گرامی نبوی پیش کیا جس میں قبلِ ہجرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ سے مصعب بن عمیرؓ کو جمعہ بعد الزوال پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ اور حاشیہ میں لکھا کہ حضور علیہ السلام سے سب نمازوں کے اول وآخر اوقات جو مروی ہیں ان میں بھی کہیں جمعہ کا وقت الگ سے بیان نہیں ہوا۔ اگر وہ قبل الزوال ہوتا تو اس کو حضور علیہ السلام اپنے فعل یا قول سے ضرور واضح فرماتے، اور کہیں سے یہ بھی ثابت نہیں ہوا کہ حضور علیہ السلام نے کوئی جمعہ زوال سے قبل پڑھا ہو یا کسی کو اس کی اجازت دی ہو، بلکہ نصاً ثابت ہوا کہ جمعہ کا وقت ظہر ہی کا وقت ہے، لہٰذا وہ غیر وقت (قبل الزوال) میں کیسے ادا ہوگا؟ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نمازِ جمعہ کھلے طور سے عام اجازت کے ساتھ ہونی چاہئے، کیونکہ حضور علیہ السلام باوجود فرضیتِ جمعہ کے مکہ معظمہ میں اس کو جاری نہ کر سکے تھے اور حضرت مصعبؓ کو مدینہ میں جاری کرنے کا حکم فرمایا تھا کہ وہاں کوئی رکاوٹ نہ ہوسکتی تھی اس سے معلوم ہوا کہ مدارک اجتہادیہ حنفیہؒ کے نہایت دقیق وعالی ہیں کہ انہوں نے اذنِ عام کی شرط بھی جمعہ کے لئے رکھی ہے۔

علامہ عینی وابن بطال کا ارشاد

حنابلہ نے حدیث لا نتغذی الخ سے استدلال کیا ہے، ان کے رد میں ابن بطال نے کہا کہ اس سے استدلال اس لئے بھی درست نہیں کہ غدا کا اطلاق بعد جمعہ والے کھانے پر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ غداء تو اول النہار کے کھانے کو کہتے ہیں، اور ان کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ ہم جمعہ کے لئے اول وقت ہی سے تیاری ومشغولی۔

پھر اداءِ نمازِ جمعہ کے سبب سے مسجد سے لوٹ کر ہی کھانا وقیلولہ کر سکتے تھے، اور اسی معنی ومراد کو جمہور ائمہ اور اکثر علماء نے اختیار کیا ہے۔ (〃 〃) علامہ نیموی نے مفصل بحث کی ہے اور اس پر حضرت شاہ صاحبؒ کے محدثانہ محققانہ حواشی بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔

علامہ نووی کا ارشاد

آپ نے لکھا کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی جماہیر علماءِ صحابہ وتابعین اور بعد کے حضرات نے فیصلہ کیا کہ جمعہ کی نماز اوال سے قبل جائز نہیں ہے، اور اس کے خلاف صرف امام احمد واسحٰق کی رائے جوازِ قبل الزوال کی ہے۔ قاضی نے لکھا کہ ان کی موافقت میں جو آثارِ صحابہ نقل ہوئے ہیں وہ استدلال کے لائق نہیں ہیں اور جمہور نے ان کو مبالغہ فی التعجیل پر محمول کیا ہے۔ اور جمہور کے دلائل قوی ہیں الخ (اعلاء ص ۳۵/۸)

صاحبِ تحفۃ الاحوذی کا اعلانِ حق

آپ نے باب ماجاء فی وقت الجمعة میں علامہ نووی کا اوپر والا ارشاد بھی نقل کیا، اور امام احمد وحنابلہ کے دلائل نقل کر کے ان

کے جوابات بھی ذکر کئے، اور آخر میں کھل کر اپنی رائے لکھی کہ ظاہر وہ معتمد علیہ مسلک وہی ہے جس کو جمہور نے اختیار کیا ہے کہ جمعہ کی نماز زوال کے بعد ہی جائز ہوسکتی ہے اس سے پہلے نہیں۔ اور جن حضرات نے زوال سے قبل کی اجازت دی، ان کے پاس کوئی صحیح وصریح حدیث نہیں ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ (تحفۃ الاحوذی ص ا......۳۶۱)

صاحبِ مرعاۃ کی تائیدِ جمہور اور تردید حنابلہ

اس موقع پر مولانا عبیداللہ صاحب نے بھی امام احمد وحنابلہ کے دلائل ذکر کر کے ان کا رد نقل کیا ہے اور آخر میں اپنے استاذِ محترم صاحبِ تحفہ کی مذکورہ بالا عبارت بھی نقل کر دی ہے (مرعاۃ شرح مشکوٰۃ ص ۲/۴۰۱) ہندوستان و پاکستان کے یہ سلفی حضرات (غیر مقلدین) اس وقت حکومت سعودیہ حنبلیہ کے نہایت مقرب بنے ہوئے ہیں اور اربوں کی دولت ان سے حاصل کر رہے ہیں، جبکہ یہ لوگ امام احمد وحنابلہ کے مسائل کی تردید بھی کرتے ہیں، مگر ہم میں سے اگر کوئی ذرا سی تنقید امام احمد پر نہیں، بلکہ ان کے متبعین علامہ ابن تیمیہ ابن القیم وغیرہ کے بعض تفردات پر کر دیں تو یہی سلفی حضرات رائی کا پہاڑ بنا کر دکھلاتے ہیں تاکہ صرف دوسرے ہی مطعون ہوں اور خود بدستور مقرب ومحبوب بنے رہیں۔

لمحۂ فکریہ اور تفردات کا ذکرِ خیر

اوپر آپ نے پڑھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے وحافظ ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے حضرت ابن الزبیرؓ کے حق میں "کثیر التفر دات" ہونے کا ذکر کیا ہے، یہاں ذرا توقف کر کے آگے پڑھئے! یہ حضرت عبداللہ بن الزبیر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے، جلیل القدر صحابی ہیں، حضرت ابن عباسؓ نے ان کو متبع کتاب وسنت فرمایا، ان کے مناقبِ کثیرہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں بہ تفصیلی ذکر کئے ہیں، آپ نے کعبۂ معظمہ کی تعمیر بھی بناءِ ابراہیمی پر کی تھی، جو بعد کو حجاج نے بدل دی تھی۔

غرض اتنی عظیم شخصیت کے بارے میں کثیر التفر دات ہونے کا ریمارک حافظ ابن تیمیہؒ کی زبان سے آپ سن چکے تو کیا تفرد کوئی قابل اعتراض بات پہلے ہی سے تھی؟! اسی کو ہمیں یہاں لکھنا ہے کہ جمہور سلف وخلف کے خلاف کوئی نظریہ قائم کرنا تفرد کہا جاتا تھا! اور یہ امر شروع ہی سے انگشت نمائی کے قابل سمجھا جاتا تھا، چنانچہ امام اعظم رحمہ اللہ علیہ کے خلاف بھی یہ بات محدث ابن ابی شیبہ، عبدالرحمان بن مہدی اور امام بخاری وغیرہ نے چلانی چاہی تھی کہ وہ کتاب وسنت اور سلف سے ہٹ کر اپنے فقہی واجتہادی رائے کے مطابق مسائل امت پر مسلط کرنا چاہتے تھے، وہ تو خدا بھلا کرے امام بخاری کے ممدوح اعظم حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا کہ وہ ایسے ریمارکس سنکر مخالفینِ امام اسے فرمایا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہ کی رائے مت کہو، کیونکہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے، وہی کتاب وسنت کی مراد ومطلوب ہے، اور اسی لئے سارے اکابر علمائے حنفیہ نے یہی کہا ہے کہ امام صاحب کی کوئی رائے اگر کتاب وسنت کے خلاف ثابت ہوجائے تو ہم فوراً اس کو ترک کر کے کتبِ وسنت کو ترجیح دیں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ تفرد کو ہمیشہ ہی ٹیڑھی ترچھی نظروں سے دیکھا گیا ہے، اور اسی لئے ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر چونکہ تمام علوم امت پر حاوی تھی۔ وہ خاص طور سے تفرداتِ امت پر کڑی نظر رکھا کرتے تھے، اور کسی بڑے سے بڑے شخص کے بھی تفرد پر نکیر کئے بغیر نہ رہتے تھے، آخر زمانہ میں حضرت نے دیکھا کہ ابن تیمیہ وابن القیم کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھ رہا ہے تو باوجود ان دونوں کی جلالت قدر اور علمی عظمت کے اعتراف کے ان کے تفردات پر بھی نکیر فرمایا کرتے تھے، اور پھر یہی طریقہ ہمارے دوسرے استاذِ معظم حضرت مدنیؒ کا بھی تھا۔ ان کے بعد ہم نے دیکھا کہ نہ وہ تبحر اور وسعتِ معلومات رہی اور نہ ہی جرأت وہمت اس لئے بقول شخصے شیروں کو جگائے بغیر ہی ساری گلستاں ختم کرادی جاتی ہے۔ فیا للاسف و لضیعة علم السلف۔

علامہ ابن تیمیہ بھی کثیر التفر دات تھے

جب بات یہاں تک آ گئی تو آخر میں یہ بھی علی وجہ البصیرت عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے علامہ ابن تیمیہ بھی "کثیر التفر دات' تھے فلیتنبہ لہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

علامہ ابن تیمیہ کے استدلال پر نظر

امام بخاری جو آخری حدیث الباب حضرت انسؓ کی لائے ہیں اس میں لفظِ ''بنکر'' سے علامہ نے استدلال کیا ہے، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درسِ بخاری میں فرمایا تھا کہ حافظ ابن تیمیہ نے زور لگایا کہ تبکیر کے معنی حقیقی اول النہار کے ہی ہیں لہٰذا دوسرے معنی مجازی نا قابلِ قبول ہیں۔

حافظ کا جواب: حافظ نے لکھا کہ اس سے قبل والی حدیثِ بخاری میں کان یصلی حین تمیل الشمس ہے جس سے حضور علیہ السلام کی مواظبت وہمیشگی نمازِ جمعہ بعد الزوال کی ثابت ہوئی، لہٰذا بعد کی روایت حضرت انسؓ میں جو تبکیر ہے، اس کو بھی ایسے معنی پر محمول کریں گے، جس سے دونوں روایتوں کو جمع کیا جا سکے، کیونکہ جمع کی صورت تعارض سے بہتر ہے اور یہ بھی ثابت شدہ امر ہے کہ تبکیر کے معنی کسی کام کو اس کے اول وقت میں کرنے کے اور کسی چیز کو دوسری پر مقدم کرنے کے بھی آتے ہیں، اور وہی یہاں مراد ہیں۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ نمازِ جمعہ کو اور دنوں کے خلاف قیلولہ پر مقدم کرتے تھے، کیونکہ اور دنوں میں مشروعیتِ ابراد کی وجہ سے نمازِ ظہر کے پہلے قیلولہ کیا کرتے تھے، اور اسی نکتہ کی وجہ سے امام بخاری اس روایت انس کو سابق روایتِ انس کے بعد لائے ہیں، جس میں حضور علیہ السلام کی مستقل عادت بعد زوال نماز جمعہ پڑھنے کے بتلائی تھی تاکہ تبکیر کے معنی متعین کی طرف اشارہ ہو، اور اس کے بعد بھی باب اذا اشتد الحر میں تیسری حدیثِ انسؓ اور بھی لائیں گے، اس میں بھی تبکیر ہی ہے، مگر ظاہر ہے وہاں مراد اول النہار نہیں ہوسکتی، بلکہ یہ نسبت تاخیر ابرادی کے تقدیم ہے۔

علامہ زین بن المنیرؒ نے بھی لکھا کہ امام بخاری نے دوسری حدیثِ انس کو پہلی حدیثِ انس کے لئے بطور تفسیر درج کیا ہے یہ بتلانے کے لئے کہ دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے (فتح ص ۲۶۴/۳) یہاں سے حافظ ابن تیمیہ کے استدلال کا پورا جواب ہو گیا ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ حافظ ابن حجر شافعی بھی ابرادِ ظہر کی مشروعیت کے قائل ہیں۔

علامہ عینی کا جواب

آپ نے بھی دونوں روایات کا تعارض حافظ کی طرح اٹھایا ہے اور علامہ کرمانی سے بھی نقل کیا کہ یہ اتفاقِ ائمہ تبکیر کے معنی ہر جگہ اول النہار نہیں ہوتے، جوہری نے کہا کہ ہر چیز کی طرف جلدی کرنا تبکیر ہی ہے خواہ وہ کسی وقت بھی ہو، مثلاً نمازِ مغرب میں جلدی کرنے کے لئے بھی تبکیر بولا جاتا ہے، لہٰذا دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے اور جس نے تبکیر کے ظاہری لفظ سے نماز جمعہ قبل الزوال کے لئے استدلال کیا، وہ اسی سے رد ہو گیا۔ (عمدہ ص ۳۷۹/۳)

عید کے دن ترکِ نمازِ جمعہ اور ابن تیمیہؒ

علامہ نے اپنے فتاویٰ ص ۱۵۰/۱ وص ۱۷۳/۱ میں لکھا کہ جو شخص عید کے دن نمازِ عید پڑھ لے اس سے اس دن کی نمازِ جمعہ ساقط ہو جاتی ہے، کیونکہ حدیث سنن ہے، حضور علیہ السلام نے جمعہ کے دن نمازِ عید پڑھا کر اختیار دیا کہ تم میں سے جس کا جی چاہے وہ جمعہ پڑھے، ہم تو جمعہ پڑھیں گے اور سنن میں دوسری حدیث ہے کہ ابن الزبیرؓ کے زمانہ میں دو عید جمع ہو گئیں تو آپ نے عید و جمعہ کی دونوں نمازوں کو جمع کر لیا، پھر اس کے بعد صرف عصر کی نماز پڑھی، اور حضرت عمرؓ سے بھی ایسی روایت ذکر کی گئی ہے، حضرت ابن عباس سے اس کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ سنت کے موافق کیا اور یہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، آپ کے خلفاء واصحاب سے بھی ثابت ہے اور امام احمد وغیرہ کا بھی یہی قول ہے، جن لوگوں نے اس کے خلاف کیا، ان کو سنن وآثار نہیں پہنچے ہیں۔ علامہ نے سنن کا ذکر کیا اور صحیح بخاری ص ۸۳۵ کی حدیث کو نظر انداز کر دیا جس میں اہلِ عوالی کی قید مذکور ہے۔ دوسروں کے لئے تو علامہ کا یہ ریمارک ہے کہ ان کو سنن وآثار نہیں پہنچے، مگر خود کو حدیثِ صحیح

بخاری سے بھی واقفیت نہیں، یہ عجیب بات ہے، جیسے درود شریف میں ابراہیم و آلِ ابراہیم کے جمع سے انکار کر دیا تھا اور وہ خود بخاری میں بھی موجود ہے۔اس کو ہم انوار الباری قسط ۱۳ میں لکھ آئے ہیں۔

علامہ ابن رشد نے نقل کیا کہ ایک دن میں عید و جمعہ واقع ہوں تو بعضوں کا خیال ہے کہ صرف عید کی نماز کافی ہے، اور اس دن صرف عصر کی نماز پڑھے گا۔ یہ قول عطاء کا ہے اور ابن الزبیر و علی سے بھی نقل کیا گیا ہے، دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ یہ اختیار یا رخصت صرف دیہات والوں کے لئے ہے جو عید کی نماز پڑھنے شہر میں آ جاتے تھے، چنانچہ حضرت عثمانؓ نے خطبہ عید میں فرمایا تھا کہ اہلِ عالیہ و اطرافِ مدینہ والے چاہیں تو نمازِ جمعہ کا انتظار کریں اور چاہے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ اور یہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے بھی مروی ہے، یہی مذہب امام ابوحنیفہ، مالک و شافعیؒ کا ہے کہ عید جمعہ کے دن ہو تو دونوں نمازیں پڑھنی ہیں، عید کی بطور سنت کے اور جمعہ کی بطور فرض کے، اور ایک دوسرے کے قائم مقام نہ ہوگی، یہی اصلِ شرعی ہے اور جب تک اس کے مقابلہ میں دوسری اصلِ شرعی موجود نہ ہو، اسی پر عمل کریں گے جس نے حضرت عثمان کے قول سے استدلال کیا، وہ بھی اسی لئے کہ ایسا امر شریعت کی بنیاد پر ہی ہو سکتا ہے۔ رائے سے نہیں کہا جا سکتا، لہٰذا وہ اصولِ شرعی ہی کے تحت ہے اور نمازِ عید کی وجہ سے فرضِ ظہر و جمعہ کو ساقط کرنا، اصولِ شرعی کے بالکل خلاف ہے (ہدایۃ المجتہد ص ۱/۱۸۶) امام بخاری، ترمذی و مسلم نے اس کے لئے باب قائم نہیں کیا، البتہ امام نسائی نے کتاب العیدین میں ایک باب قائم کیا کہ نمازِ عید و جمعہ دونوں میں شرکت کی جائے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے جمعہ کے دن عید کی نماز میں **سبح اسم ربک الاعلی** اور **هل اتاک** پڑھی، اور اسی دن جمعہ کی نماز میں بھی ان ہی کو پڑھا ہے، اس کے بعد دوسرا باب عید پڑھنے والے کے لئے رخصتِ ترکِ جمعہ کا قائم کیا، جس میں زید بن ارقم سے ترکِ جمعہ کی رخصت مرفوعاً نقل کی، اور ابن الزبیر کا اثر بھی پیش کیا۔ (ص ۱/۲۳۵)۔

ابو دائود **باب اذا وافق یوم الجمعة یوم عید** میں حدیثِ ابی ہریرہؓ نقل کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا "آج کے دن دو عید جمع ہو گئی ہیں، جس کا جی چاہے، یہ نمازِ عید اس کے جمعہ سے کافی ہوگی، اور ہم تو جمعہ کی نماز بھی پڑھیں گے۔ (بذل ص ۲/۱۷۲)۔

ارشادِ امام شافعی رحمہ اللہ

آپ نے اپنی کتاب الام (اجتماع العیدین) میں لکھا کہ حضور علیہ السلام کی مراد اہلِ عالیہ ہیں کہ وہ چاہیں تو جمعہ کا انتظار کریں، چاہیں واپس چلے جائیں، شہر والے مراد نہیں ہیں، لہٰذا شہر والوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ جمعہ کی نماز ترک کر دیں۔ بجز معذورین کے جن پر جمعہ فرض نہیں ہے (بذل 〃)۔

ارشادِ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ

آپ نے فرمایا کہ عید کی نماز کے لئے اطراف و دیہات کے لوگ بھی مدینہ منورہ آ جایا کرتے تھے، اور ان ہی کو یہ رخصت دی گئی ہے، اہلِ مدینہ کو نہیں دی گئی اس کے لئے بڑا قرینہ **وانا مجمعون** ہے کہ ہم سب اہلِ مدینہ تو جمعہ کی نماز بھی پڑھیں گے۔ حضرت ابن عباس و ابن الزبیرؓ اس وقت کم عمر تھے، وہ پوری بات نہ سمجھے ہوں گے اور ابن الزبیر نے جو دونوں نمازوں کو قبل الزوال جمع کیا، وہ اس لئے کہ وہ قبل الزوال جمعہ کو جائز سمجھتے ہوں گے۔

المعجم المفہرس کی فروگذاشتیں

اس میں ابوداؤد کی حدیث مذکور کے لفظ **وانا مجمعون** کا کوئی ذکر و حوالہ نہیں ہے اور ایسی فروگزاشتیں بہ کثرت ہیں، راقم الحروف نے انہیں لکھ کر مکتبہ بریل لیدن (ہالینڈ) کو توجہ دلائی تھی تا کہ اگلے ایڈیشن میں تلافی کر دیں، مگر وہ خط واپس آ گیا، یورپ کے مستشرقین نے ۳۶ سال کے عرصہ میں اس ناقص معجم کو شائع کیا، اور بڑا احسان دنیائے علم پر رکھا، لاکھوں ڈالر اس کی تالیف و اشاعت پر خرچ بھی کئے اور اس کے سات مجلد

حصوں کی بڑی قیمت بھی وصول کرتے ہیں، مگر تحقیق وریسرچ کا حق ادا نہ کر سکے۔ درحقیقت یہ کام علماءِ اسلام کا تھا، لیکن بقول اکبر مرحوم کے ؎

نئی میں اور پرانی روشنی میں فرق اتنا ہے ۔۔۔ انہیں ساحل نہیں ملتا، انہیں کشتی نہیں ملتی

پھر جن اسلامی ملکوں کے پاس اس وقت دولت کی غیر معمولی فراوانی بھی ہے، وہ نسبۃً غیر اہم امور میں صرف ہو رہی ہے **ولعل الله یحدث بعد ذلک امرا۔**

حدیث بخاری سے تائید

امام بخاری نے یہاں تو کوئی حدیث ذکر نہیں کی مگر کتاب الاضاحی، **باب مایو کل من لحوم الاضاحی** ص۸۳۵ میں حضرت عثمانؓ کا اثر لائے ہیں، جس میں اہل العوالی کی قید بھی موجود ہے کہ آپ کے خطبہ عید میں ہے کہ اہلِ عوالی واطرافِ مدینہ میں سے جو چاہے جمعہ کا انتظار کرے اور جو جانا چاہے اس کو میں اجازت دیتا ہوں۔

مزید تفصیل و بحث بذل، اوجز، اعلاء السنن[1] اور معارف السنن (باب القراءۃ فی العیدین ص۴/۴۳۱) میں دیکھی جائے۔ ان شاء اللہ اس بارے میں شرحِ صدر ہو جائے گا کہ علامہ ابن تیمیہ وشوکانی وغیرہ کا مسلک ترکِ جمعہ یوم العید کا ضعیف بلکہ اضعف وقابلِ رد ہے۔ اور جن آثار سے انہوں نے استدلال کیا ہے ان میں کلام ہے، جبکہ ان کے مقابلہ میں جمہور کے پاس آیتِ قرآنی **اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ** فرضیتِ جمعہ کے لئے نصِ صریح عام ہے، جس سے یوم العید بھی مخصوص ومستثنیٰ نہیں ہے، دوسرے بخاری وموطا مالک وغیرہ میں **من احب** الخ ہے کہ اہلِ عوالی میں سے جس کا جی چاہے جمعہ تک رک جائے اور جس کا جی چاہے گھر جائے، یہاں عوالی کی قید موجود ہے، اس سے شہر والوں کے لئے ترکِ جمعہ کی اجازت نہیں نکل سکتی، تیسرے **وانا مجمعون** کا لفظ ابوداؤد میں ہے اور مشکل الآثار طحاوی میں بھی اسی طرح ہے کہ ہم تو جمعہ پڑھیں گے، جو جمعہ پڑھنا چاہے وہ جمعہ پڑھے اور جو لوٹنا چاہے وہ لوٹ جائے۔

اس میں کامل صراحت ہے کہ حکم شہر مدینہ سے باہر کے لوگوں کے لئے ہے۔ جمہور نے یہ بھی کہا کہ نمازِ جمعہ کی فرضیت سب کو مسلم ہے اور نمازِ عید بھی سنت یا واجب ہے تو ایک کی وجہ سے دوسری ساقط نہ ہوگی۔ جس طرح جمعہ کے علاوہ دوسرے دنوں میں عید کی وجہ سے ظہر کی نماز ساقط نہیں ہوتی۔ اس پر بھی علامہ ابن تیمیہؒ کا یہ دعویٰ کرنا کہ جو بھی عید کی نماز پڑھ لے گا اس پر سے جمعہ ساقط ہو جائے گا۔ اور یہ بھی دعویٰ کرنا کہ یہی حضور علیہ السلام اور آپ کے اصحاب سے ماثور ہے اور صحابہ سے اس کے خلاف ثابت نہیں ہے۔ پھر دلیل میں یہ قول نبوی پیش کیا۔ **ایھا الناس انکم قد اصبتم خیرا فمن شاء ان یشھد الجمعۃ فلیشھد فانا مجمعون** (فتاویٰ ابن تیمیہ ص۱/۱۵۰) اور ص۱۷۳ میں **فمن شاء منکم** الخ ہے یعنی اثرِ مذکور کو **منکم** کے اضافہ کے ساتھ ذکر کیا ہے یعنی تم میں سے جس کا جی چاہے جمعہ پڑھے، حالانکہ ارشاد اہلِ عوالی کے لئے ہے کہ وہ چاہیں تو پڑھیں اور چاہیں تو لوٹ جائیں۔ ایک **منکم** کے اضافہ اور اگلی عبارت حذف کرنے سے بات الٹ دی گئی پھر یہ **منکم** بلا سند وحوالہ ذکر ہوا ہے اول تو علامہ پورا حوالہ دیا ہی نہیں کرتے، صرف یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ سنن میں ایسا ہے یا صحیح میں

---

[1] اعلاء ص۸/۵۲ میں عمدہ بحث ہے، جس کی تحسین علامہ بنوری، اور علامہ کوثریؒ نے بھی کی ہے، اور مقالات الکوثری ص۱۶۰ میں بھی اس مسئلہ پر کافی وشافی مدلل مقالہ ہے، جس کی یہ تحقیق خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ امام احمدؒ کی طرف اس مسئلہ کی نسبت بھی مشکوک ہے، کیونکہ دوسرے تینوں آئمہ مجتہدین کے برخلاف امام احمد کے مسائلِ فقہیہ کی تدوین ان کی زندگی میں نہ ہو سکی تھی، اور اسی لئے ان کے اقوال بھی ہر مسئلہ میں بہ کثرت ہیں، کہ بعض مسائل میں تو دس دس قول مروی ہیں۔ اور ایک شافعی عالم نے تقریباً ایک سو مسئلے ان کے بطور تفردات کے جمع کئے تھے، جس پر حنابلہ سخت مشتعل ہوئے اور اس کے ردود لکھے تھے، علامہ کوثری نے ابن تیمیہ وابن قیم شوکانی کے پیش کردہ آثار پر محدثانہ نقد وکلام کیا ہے اور آپ نے لکھا کہ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ مع اصحاب کے امام مالک مع اصحاب کے، امام شافعی مع اصحاب کے اور حتیٰ کہ ظاہریہ بھی اس امر پر متفق ہیں کہ...... نمازِ عید کی وجہ سے نمازِ جمعہ ہرگز ساقط نہ ہوگی، لہٰذا ہمیں بہت سے مسائل کی جن میں امام احمد کو متفرد قرار دیا گیا ہے، مزید تحقیق کرنی ہوگی، کیونکہ تفردات کی کثرت کسی بھی امام کے شایانِ شان نہیں ہے، چونکہ ہمارے نزدیک حق دائر ہے، چاروں ائمہ کے مذاہب میں اور خیر کثیر صرف ان ہی کے اتباع میں ہے، اسی لئے ہم تیمیت وغیرہ کے قائل نہیں ہیں۔

ایسا ہے، جبکہ یہاں منکم سے مطلب ہی دوسرا بن جاتا ہے جو موطا امام مالک کی روایت فمن احب من اهل العالية ان ينتظر الجمعة فلينتظر ها ومن احب ان يرجع فقد اذلت له کے مخالف ہے۔ دوسرے علامہ نے آگے کی عبارت بھی ذکر نہیں کی۔ اور طحاوی کی روایت بھی اسی طرح ان سے الگ اور مخالف ہے بلکہ صحیح بخاری ص ۸۳۵ میں بھی فمن احب ان ينتظر الجمعة من اهل العوالي فلينتظر و من احب ان يرجع فقد اذنت له هے، یہاں بھی اہل العوالی کی صراحت ہے جو منکم سے مطابق نہیں ہوتی، اور آگے اپنے گھروں یا دیہات کو واپسی کا بھی ذکر ہے جو اہلِ شہر کے لئے نہیں ہوسکتا۔ امام شافعیؒ نے بھی الام میں ایک روایت بالفاظ من احب ان يجلس من اهل العالية فليجلس من غير حرج، اور دوسری فمن احب من اهل العالية ان ينتظر الجمعة فلينتظر ها ومن احب ان يرجع فقد اذنت له ذکر کی ہے۔ (بذل ص ۲/۱۷۳)

یہاں آپ نے علامہ ابن تیمیہ کا کمال بھی ملاحظہ کرلیا کہ جس طرح زیارت وتوسل وغیرہ مسائل میں انہوں نے قطع وبرید وغیرہ کی ہے، یہاں بھی کی ہے۔ جب منطوقِ صریح آیتِ قرآنی اور احادیث صحیحہ قویہ سے اہلِ شہر کے لئے عید کے دن بھی جمعہ کی فرضیت ثابت ومتحقق ہے، تو پھر یہ بات کیونکر ثابت ہوسکتی ہے کہ حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ نمازِ جمعہ بروز عید کے قائل نہ تھے۔ کلاثم کلا والحق احق ان يتبع.

علامہ ابن تیمیہ کے طرزِ تحقیق پر ایک نظر اور طلاق ثلاث کا مسئلہ

اس وقت علامہ کی تحقیق دوبارۂ مسئلہ طلاق یاد آ گئی، اس کا ذکر بھی علمی وحدیثی فائدہ سے خالی نہیں، اس لئے ذکر کرتا ہوں، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ علامہ ابن تیمیہ کا طریقہ ہے کہ جب کوئی لفظ حدیث کا وہ ایسا دیکھتے ہیں کہ اس میں ان کے مسلک کے موافق تاویل کی گنجائش نہیں ہوتی، تو وہ اس سے صرف نظر کر لیتے ہیں، چنانچہ طلاق حالتِ حیض کے معتبر شرعاً ہونے کے وہ منکر ہیں تو جمہور کے خلاف مسئہ کا ترجمہ تو کف (ہٹ) کر دیا، اور ان عجز و استحمق سے مراد یہ لی کہ شریعت اس کے بدلنے سے نہ بدلے گی جبکہ جمہور کے نزدیک مسئہ بمعنی ما استفہامیہ ہے، یعنی کیا مانع ہے اس کو محسوب کرنے سے؟ اور کیا احکام شرع اس کی لاچاری یا حماقت کے سبب سے بے اثر ہوجائیں گے؟! یعنی نہیں، بلکہ وہ قطعاً ویقیناً معتبر ہی رہیں گے۔ علامہ نے اس مراد کو الٹ دیا۔ پھر جب حضرت ابن عمرؓ کا قول بخاری ص ۷۹۰ والا حسبت علی بتطليقة (وہ ایک طلاقِ حیض کے لئے محسوب ہوگئی) ان کے سامنے کیا گیا تو اس کی جواب دہی نہ کرسکے، کہ وہ صریح ہے اس طلاق کے معتبرِ شرعی ہونے پر۔ امام بخاری نے باب کا عنوان بھی یہ قائم کیا ہے کہ "حالتِ حیض میں طلاق دی جائے تو وہ معتبر ہوتی ہے"، گویا امام بخاری نے بھی جو مطلب حدیثِ ابنِ عمر کا سمجھا وہ غلط تھا اور جو علامہ ابن تیمیہ نے سمجھا وہ صحیح ہے۔ صحیح مسلم میں بھی طلاقِ حائض کے وقوع کا باب قائم ہوکر بہت سی روایات درج کی گئیں، جن میں طلاقِ حائض کا واقع ومحسوب ہونا کامل صراحتوں کے ساتھ ثابت ہوچکا ہے۔ علامہ نووی نے لکھا کہ اس امر پر اجماع امت ہوچکا کہ حالتِ حیض میں طلاق دینا حرام ہے، لیکن اگر کوئی دے گا تو وہ واقع ہوجائیگی، بوجہ حدیثِ ابن عمرؓ کیونکہ حضور علیہ السلام نے ان کو رجوع کا حکم دیا، اگر طلاق واقع نہ ہوتی تو رجوع کا حکم نہ ہوتا الخ (نووی شرح مسلم ص ۱/۴۷۵)

محدث علامہ خطابیؒ نے فرمایا کہ عدمِ وقوع طلاقِ بدعی کا قول خوارج وروافض کا مسلک ہے، علامہ ابن عبدالبرؒ نے فرمایا کہ اس بارے میں بجز اہلِ بدعت وضلال کے کوئی مخالفت نہ کرے گا۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا کہ طلاقِ ثلاث مجموعی کے وقوع پر اجماع ہے، لہٰذا اس کی مخالفت اجماع کی مخالفت ہے اور جمہور کا فیصلہ ہے کہ جو اجماع واتفاق کے بعد اختلاف کرے اس کا قول معتبر نہ ہوگا، نیز حافظ نے اس مسئلہ کو حرمتِ متعہ کی طرح اجماعی قرار دیا۔

مجھے یہاں بحث کے وقت حضرتؒ کی وہی بات یاد آ گئی، جو تفصیل کے ساتھ کتاب الطلاق میں آئے گی، ان شاءاللہ کیونکہ یہاں بھی علامہ کو منکم کا لفظ بڑھانا پڑا، اور اہل العوالی اور بعد کے دوسرے کلمات بھی حذف کرنے پڑے جس کو حضرتؒ نے صرف نظر یا اغماض سے ادا کیا ہے۔ اور یہ تو خاص بات ہے کہ دوسروں کے دلائل کو (جو ہم نے بھی اوپر لکھے ہیں وہ ذکر ہی نہیں کرتے، یعنی ان سے بھی صرف نظر۔ چنانچہ انوارالباری جلد ۱۱ میں زیارۃِ نبویہ اور توسل نبوی کی مفصل بحث میں ہم نے ان کی اس خاص عادت کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔

جمہورِامت وابن حزم وغیرہ

واضح ہو کہ طلاقِ ثلاث مجموعی کے نفاذ و وقوع کے دلائل جمع کرنے میں ابن حزم ظاہری نے سب سے زیادہ توسع کیا ہے اور وہ بھی اس مسئلہ میں ائمہ اربعہ اور جمہور کے ساتھ ہیں۔ امام احمدؒ نے تو یہاں تک فرمایا کہ اس کی مخالفت کرنا اہلِ سنت والجماعت سے خروج ہے۔ (کیونکہ یہ مسئلہ روافض وخوارج کا اختیار کردہ ہے) ان سب امور کے باوجود علامہ ابن تیمیہ وابن القیم نے سب کے خلاف طلاقِ ثلاثِ مجموعی کے عدم وقوع ونفاذ کو حق ثابت کرنے میں پورا زور صرف کر دیا ہے۔ اور آج کے سلفی وغیر مقلدین بھی ان دونوں ہی کے مسلک کو رائج کرنے میں پوری قوت وطاقت صرف کر رہے ہیں۔ والی اللہ المشتکی۔

تجلی دیوبند کے طلاق نمبر اردو میں اس مسئلہ پر تجلی دیوبند کے تین نمبر حق وباطل واضح کرنے کے لئے بے نظیر و بے مثال ہیں اب کے علماء سعودیہ نے بھی اس مسئلہ میں رائے جمہور کی ترجیح وصواب کو قبول کر لیا ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک وانا لنرجوفوق ذلک مظہرا وبیدہ التوفیق۔

بَابٌ اِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ

(جمعہ کے دن سخت گرمی پڑنے کا بیان)

۸۵۷۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اَبِیْ بَكْرِنِ الْمُقَدَّمِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا حَرَمِیُّ بْنُ عُمَارَةَ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ خُلْدَةَ هُوَ خَالِدُ بْنُ دِيْنَارٍ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَّقُوْلُ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اشْتَدَّ الْبَرْدُ بَكَّرَ بِالصَّلٰوةِ وَاِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ اَبْرَدَ بِالصَّلٰوةِ يَعْنِی الْجُمُعَةَ وَقَالَ يُوْنُسُ بْنُ بُكَيْرٍ اَخْبَرَنَا اَبُوْ خَلْدَةَ وَقَالَ بِالصَّلٰوةِ وَلَمْ يَذْكُرِ الْجُمُعَةَ وَقَالَ بِشْرُ بْنُ ثَابِتٍ حَدَّثَنَا اَبُوْ خَلْدَةَ صَلّٰى بِنَا اَمِيْرُ الْجُمُعَةِ ثُمَّ قَالَ لِاَنَسٍؓ كَيْفَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّی الظُّهْرَ.

ترجمہ:۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ جب سردی بہت ہوتی تو رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نماز سویرے پڑھتے اور جب گرمی بہت زیادہ ہوتی تو نماز یعنی جمعہ کی نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھتے تھے، اور یونس بن بکیر کا بیان ہے کہ ابوخلدہ نے ہم سے بالصلوٰۃ کا لفظ بیان کیا، اور جمعہ کا لفظ نہیں بیان کیا، اور بشر بن ثابت نے کہا، کہ ہم سے ابوخلدہ نے بیان کیا، کہ ہمیں امیر نے جمعہ کی نماز پڑھائی، پھر انسؓ سے پوچھا کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز کس طرح پڑھتے تھے۔

تشریح:۔ حافظ نے لکھا: بعض روایات حضرت انسؓ سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی نماز اول وقت میں پڑھی جاتی تھی، اور دوسری یہاں کہ روایت سے معلوم ہوا کہ دوپہر کی نماز سردی کے موسم میں جلد اور گرمی میں دیر سے ٹھنڈے وقت میں ادا کی جاتی تھی، اس لئے دونوں قسم کی روایتوں میں جمع اس طرح کر لیا گیا کہ جمعہ وظہر کا مسئلہ الگ الگ ہو جائے۔

تاہم راوی کا حدیث الباب میں بھی یعنی الجمعہ لانا بتلا رہا ہے کہ جمعہ وظہر کا حکم یکساں ہے، کیونکہ سوال جمعہ سے تھا اور جواب میں حضرت

انس نے ظہر کا وقت بتلایا اور دوسری روایت اسی سند سے یہ بھی ہے کہ جس طرح حجاج جمعہ کے خطبہ میں طوالت کر کے نماز کو مؤخر کرتا تھا، اس کا نائب حکم بھی کرتا تھا، اس پر یزید ضبی نے جمعہ کے دن حضرت انس سے بلند آواز میں پکار کر پوچھا کہ آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں آپ جمعہ کی نماز کس طرح پڑھا کرتے تھے۔ حضرت انس نے جواب میں یہی بتایا کہ موسم سرما میں نماز جلدی اور گرما میں دیر سے پڑھتے تھے، گویا اس وقت حضرت انس نے جمعہ کو ظہر پر قیاس کر کے یہ جواب دے دیا، اور جمعہ کے لئے تاخیر کی وجہ پیدا کر دی، جس پر حاکم وقت پر سے اعتراض اٹھ گیا، اس کے بعد حافظ نے علامہ زین بن المنیر کا قول نقل کیا کہ اس باب وحدیث سے امام بخاری کا رجحان نمازِ جمعہ کے لئے بھی ظہر پر قیاس کر کے ابراد ٹھنڈے وقت میں نماز پڑھنے کا، معلوم ہوا، پھر علامہ موصوف نے یہ بھی لکھا کہ جب یہاں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ابراد جمعہ کے لئے بھی مشروع ہے تو اس سے یہ بھی مستنبط ہوا کہ جمعہ زوال سے پہلے مشروع نہیں ہے اس لئے کہ اگر وہ مشروع ہوتا تو زیادہ گرمی کی وجہ سے تاخیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ زوال سے پہلے ہی جلدی کر کے ٹھنڈے وقت میں پڑھ لیا جاسکتا تھا۔

حافظ نے مزید لکھا کہ اسی سے ابن بطال نے بھی استدلال کیا کہ جب وقتِ جمعہ اور وقتِ ظہر ایک ہے تو جمعہ قبل الزوال کا جواز یہاں نہیں ہے، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت کا منشا ہر طرح سے نمازی کو تشویش و پریشانی سے بچانا ہے تاکہ پورے اطمینان اور خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کی جائے۔ کیونکہ گرمی کے وقت ابراد کی رعایت اسی لئے کی گئی ہے (فتح ص ۲/۳۶۴)

حضرت گنگوہیؒ کا ارشاد

آپ نے فرمایا کہ امام بخاری نے یہ باب قائم کر کے واضح کیا کہ جمعہ وظہر میں باہم کوئی فرق استحباب ابراد کے بارے میں نہیں ہے اور یہی امام اعظم کا بھی مختار ہے، اس پر حاشیۂ لامع میں درمختار کی عبارت نقل ہوئی کہ جمعہ اصلاً واستحباباً دونوں زمانوں میں ظہر کی طرح ہی ہے کیونکہ وہ ظہر کا قائم مقام ہے۔ جامع الفتاویٰ میں بھی یہی ہے، لیکن الاشباہ میں یہ ہے کہ جمعہ کے لئے ابراد نہیں ہے اور جمہور کی رائے بھی یہی ہے کیونکہ جمعہ میں بڑا عظیم اجتماع ہوتا ہے اور تاخیر سے حرج وتکلیف ہوگی، بخلاف ظہر کے۔

علامہ موفق حنبلیؒ نے کہا کہ جمعہ موسم گرما اور سرما دونوں میں اول وقت پڑھا جائے، کیونکہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اس کو جلدی پڑھتے تھے اور اس لئے بھی کہ لوگ جمعہ کے لئے وقت سے پہلے ہی صبح ہی سے جمع ہو جاتے تھے، اور اگر ان کو وقت ابراد کا انتظار کرایا جاتا تو جمع ہو جانے والوں پر شاق ہوتا اور اس لئے بھی کہ سخت گرمی کے زمانہ میں ظہر کی نماز کو اسی لئے مؤخر کیا جاتا ہے کہ ان سے تکلیف ومشقت کو دور کیا جائے، اگر جمعہ کے لئے صبح ہی سے جامع مسجد میں جمع ہونے والوں کو ابراد کے لئے روکا جائے تو اس میں تو تکلیف اور مشقت اور بھی زیادہ ہو جائے گی، ''شرح کبیر'' میں اس طرح ہے کہ ابراد ظہر میں دفعِ مشقت کے لئے ہے، اور ابرادِ جمعہ میں مشقت اور بھی زیادہ ہوگی، اور اسی کی طرف شافعیہ کا بھی میلان ہے، علامہ قسطلانی شافعی نے لکھا کہ ظہر میں ابراد سخت گرمی اور گرم ملک کے لئے ہے، جمعہ کے لئے بھی اس کو جاری کریں تو تاخیر کی وجہ سے اس کے فوت ہونے کا خطرہ بڑھ جائے گا، کیونکہ لوگ حاضری میں تکاسل سے کام لیں گے۔ دوسرے اس لئے بھی کہ لوگوں کو جمعہ کے لئے اول دن سے آنے کی ترغیب دی گئی ہے، اس لئے ان کو گرمی سے کوئی تکلیف نہ ہوگی (کہ وہ ٹھنڈے وقت میں ہی مسجد پہنچ جائیں گے) اور یہ جو صحیحین میں وارد ہوا کہ حضور علیہ السلام اس میں ابراد کرتے تھے، وہ بیان جواز کے لئے ہے (لامع ص ۲/۱۸)

ارشادِ انور: آپ نے فرمایا کہ بحر میں ابراد جمعہ کے لئے بھی لکھا ہے، اور علامہ عینی نے اس کو جمعہ کے لئے نہیں مانا ہے میں کہتا ہوں کہ حضور علیہ السلام کی عادتِ مبارکہ تو ابراد ہی کی تھی۔ اور میرے نزدیک حدیث ظہر ہی کے لئے تھی، جس کو راوی نے اپنے قیاس سے جمعہ میں بھی جاری کر دیا ہے۔ اس لئے عینی کی رائے کو ترجیح ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ضرور حضور علیہ السلام کی عادتِ مبارکہ اول وقت ظہر میں ہی جمعہ پڑھنے کی تھی، اس لئے اس کو ترجیح ہونی چاہئے، مگر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس زمانہ میں صبح ہی سے لوگ جمع ہو جاتے تھے، اور ان کا بڑا کام جمعہ کی نماز تک اسی کے لئے اہتمام و اجتماع تھا، اور اس زمانہ میں نہ صرف شہر کے بلکہ قرب و جوار کے لوگ بھی شہر میں جمعہ ادا کرنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں بجز رمضان یا جمعۃ الوداع کے باہر کے لوگ شہر میں نہیں آتے، اور نہ ان پر آنا فرض ہے۔ اس لئے مشروعیتِ ابراد کی قولی احادیث پر عمل ہوسکتا ہے یا ہونا چاہئے، جو صاحبِ بحر وغیرہ کا مختار ہے دوسرے نرم و گرم خطوں کا بھی فرق کرنا پڑے گا۔ مثلاً مدینہ طیبہ کا موسم بہ نسبت مکہ معظمہ کے سرد و نرم ہے اور مکہ معظمہ میں مثلاً حج کے موقع پر کہ سخت ترین گرم موسم میں بھی جبکہ سب لوگ حرم کے آس پاس یا شہر ہی کے اندر ہوتے ہیں، ان کے لئے ابراد کی احادیث پر عمل نہایت مناسب بلکہ ضروری ہے، اور ہم نے تو یہ بھی دیکھا کہ شدتِ حر کی وجہ سے ظہر اول وقت میں تقریباً سارا مطاف اور صحنِ حرم نمازیوں سے خالی ہوتا ہے۔ اور صرف تھوڑے سے آدمی امام کے ساتھ ہوتے ہیں، جمعہ میں بھی کم و بیش ایسی ہی صورت ہوتی ہے، تو کیا نماز کے اس طریقہ کو بھی تعاملِ نبوی کے ساتھ مطابق کیا جائے گا؟

لہٰذا حالات کے بدلنے کے ساتھ کیا، اس زمانہ میں اور خاص طور سے سخت گرم موسم میں اور مکہ معظمہ جیسے بلاد میں جمعہ وظہر کے لئے ابراد کی قولی احادیث پر عمل کرنا بہتر نہ ہوگا؟ جس کی تائید صاحبِ بحر و جامع الفتاویٰ سے بھی ہوتی ہے نیز حضرت گنگوہیؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور امام بخاری کا رجحان بھی اسی طرف ہے، اور جن حضرات نے ان وجوہ سے کہ اس زمانۂ نبوی میں لوگ صبح ہی سے اور ٹھنڈے وقت میں مسجد جامع پہنچ جایا کرتے تھے، اور دیہات کے لوگ بھی صبح ہی سے شہر میں جمعہ کے لئے آجایا کرتے تھے، اور ان کو واپسی اور دوسری ضروریات کے لئے جمعہ کی نماز سے جلد فارغ کرنا ہی مناسب بھی تھا، آج کل کے حالات میں وہ سب حضرات بھی اپنی رائے پر قائم نہ رہ سکتے تھے، اس لئے آج کل ابرادِ ظہر کی طرح ابرادِ جمعہ بھی افضل ہونا چاہئے، البتہ جہاں حالات اب بھی عہدِ نبوی کے مطابق ہوں وہاں تعاملِ نبوی ہی کو ترجیح رہے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

بَابُ الْمَشْيِ اِلَى الْجُمُعَةِ وَقَوْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللهِ وَمَنْ قَالَ السَّعْيُ الْعَمَلُ وَالذَّهَابُ لِقَوْلِهِ تَعَالٰى وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَحْرُمُ الْبَيْعُ حِيْنَئِذٍ وَقَالَ عَطَآءٌ تَحْرُمُ الصَّنَاعَاتُ كُلُّهَا وَقَالَ اِبْرَاهِيْمُ ابْنُ سَعْدٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ اِذَآ اَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَهُوَ مُسَافِرٌ فَعَلَيْهِ اَنْ يَّشْهَدَ

(جمعہ کی نماز کے لئے جانے کا بیان، اور اللہ بزرگ و برتر کا قول کہ ذکرِ الٰہی کی طرف دوڑو، اور بعض کا قول ہے کہ سعی سے مراد عمل کرنا اور چلنا ہے، اس کی دلیل ارشادِ باری "وَسَعٰی لَہَا سَعْیَہَا" ہے اور ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس وقت خرید و فروخت حرام ہے، عطاء کا قول ہے، کہ تمام کام حرام ہیں، اور ابراہیم بن سعد نے زہری سے نقل کیا کہ جب مؤذن، جمعہ کے دن اذان دے، اور کوئی مسافر ہو تو اس پر جمعہ کی نماز کے لئے حاضر ہونا واجب ہے)

۸۵۸۔ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ حَدَّثَنَا الْوَلِيْدُ بْنُ مُسْلِمٍ قَالَ حَدَّثَنَا يَزِيْدُ بْنُ اَبِيْ مَرْيَمَ قَالَ حَدَّثَنَا عَبَايَةُ بْنُ رِفَاعَةَ قَالَ اَدْرَكَنِيْ اَبُوْ عَبْسٍ وَّاَنَا اَذْهَبُ اِلَى الْجُمُعَةِ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنِ اغْبَرَّتْ قَدَمَاهُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ حَرَّمَهُ اللهُ عَلَى النَّارِ.

۸۵۹. حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِیْ ذِئْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا الزُّھْرِیُّ عَنْ سَعِیْدٍ وَّاَبِیْ سَلَمَةَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ح وَحَدَّثَنَا اَبُو الْیَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَیْبٌ عَنِ الزُّھْرِیِّ قَالَ اَخْبَرَنِیْ اَبُوْ سَلَمَةَ ابْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَنَّ اَبَا ھُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلٰوۃُ فَلَا تَاْتُوْھَا تَسْعَوْنَ وَاْتُوْھَا تَمْشُوْنَ وَعَلَیْکُمُ السَّکِیْنَةُ فَمَا اَدْرَکْتُمْ فَصَلُّوْا وَمَا فَاتَکُمْ فَاَتِمُّوْا۔

۸۶۰. حَدَّثَنِیْ عَمْرُوْ بْنُ عَلِیٍّ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ قُتَیْبَةَ قَالَ حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ الْمُبَارَکِ عَنْ یَحْیَی بْنِ اَبِیْ کَثِیْرٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ اَبِیْ قَتَادَةَ لَآ اَعْلَمُہٗ اِلَّا عَنْ اَبِیْہِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَقُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْنِیْ وَعَلَیْکُمُ السَّکِیْنَةُ۔

ترجمہ۸۵۸۔ عبایہ ابن رافع روایت کرتے ہیں کہ میں جمعہ کی نماز کے لئے جارہا تھا تو مجھ سے ابوعبس ملے، اور کہا کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس کے دونوں پاؤں راہِ خدا میں غبار آلود ہوں، اس کو اللہ تعالیٰ دوزخ پر حرام کر دیتا ہے۔

ترجمہ۸۵۹۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب نماز کی تکبیر کہی جائے تو نماز کے لئے دوڑتے ہوئے نہ آؤ بلکہ آہستگی سے چلتے ہوئے آؤ۔ اور اطمینان تم پر لازم ہے جتنی نماز پاؤ، پڑھ لو، اور جو نہ ملے اس کو پورا کر لو۔

ترجمہ۸۶۰۔ حضرت ابوقتادہؓ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جب تک تم لوگ مجھے دیکھ نہ لو، اس وقت تک کھڑے نہ ہو، اور تم اطمینان کو اپنے اوپر لازم کر لو۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ نے یہ ثابت کیا کہ فاسعوا الی ذکر اللہ میں سعی کے معنی دوڑنے کے نہیں ہیں بلکہ صرف چل کر جانے کے ہیں جو رکوب کے مقابلہ میں ہوتا ہے، اگرچہ لغت میں سعی کے معنی دوڑنے کے ہیں اور خاص طور سے جبکہ اس کا صلہ الی ہو۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک صلوٰۃ کا قاعدہ بھی مطرد نہیں ہے، لہٰذا ان پر مسائل کی بنا نہیں ہوسکتی اور یہاں سعی کا لفظ اس لئے بولا گیا ہے کہ جس طرح دوڑنے کے وقت آدمی ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، ایسے ہی یہاں سارے دوسرے مشاغل ترک کر کے صرف جمعہ کی ضروریات میں مشغول ہونا مطلوب ہے۔

قولہ وقال ابن عباسؓ یحرم البیع، فرمایا امام بخاری نے حرمت کو ہی اختیار کیا ہے، ہمارے فقہاء نے بیع کو مکروہ تحریمی لکھا ہے، البتہ امام محمدؒ سے یہ نقل ہوا ہے کہ ہر مکروہ تحریمی بھی حرام ہے، شیخ ابن الہمام نے یہ تحقیق کی کہ نہی لغیرہ سے کراہت تحریمی ثابت ہوتی ہے خواہ وہ قطعی ہو، یہ قاعدہ بنے گا تو اسے خلع کو مستثنیٰ کرنا پڑے گا۔ پھر علاوہ بیع کے دوسری صناعات و معاملات کو بھی ہدایہ میں اذانِ جمعہ کے بعد ممنوع ہی لکھا ہے، حاشیۂ لامع ص۲/ ۱۸ میں لکھا کہ ایسے وقت اگر بیع کا معاملہ کر لیا گیا تو وہ جمہور کے نزدیک باوجود کراہت کے صحیح ہو جائے گا، مالکیہ کے نزدیک نکاح، ہبہ و صدقہ کے علاوہ دوسرے عقود فسخ ہو جائیں گے۔

اس ممانعتِ مذکورہ کی ابتدا جمہور کے نزدیک اذانِ خطبہ سے ہوگی کیونکہ وہی حضور علیہ السلام کے وقت میں تھی لہٰذا پہلی اذان کے وقت سے ابتداء نہ ہوگی۔ اگرچہ ایک قسم کی کراہت اس کے بعد بھی ہوگی، کیونکہ وجوبِ جمعہ کا وقت ہو جاتا ہے۔ علامہ عینی نے اس کو تفصیل سے لکھا ہے اور درمختار میں اذان اول سے ممانعت کی ابتداء کو اصح قرار دیا ہے۔

قولہ من اغبرت قدماہ فی سبیل اللہ:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ "ائمہ حدیث کے نزدیک جہاں کہیں احادیث و آثار میں لفظ فی سبیل اللہ وارد ہوا ہے۔ اس سے مراد جہاد کے اندر اس فعل کا صدور ہوتا ہے۔ اور اسی لئے امام ترمذیؒ نے کتاب الجہاد میں دس گیارہ ابواب فی سبیل اللہ

کے ہی عنوان سے ذکر کئے ہیں، اور صوم فی سبیل اللہ کو بھی جہاد کے موقع پر ہی محمول کیا ہے۔ امام بخاری کچھ تعمیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔"

ابن الجوزی نے بھی لکھا کہ جب مطلقاً فی سبیل اللہ بولا جائے تو جہاد ہی مراد ہوتا ہے، علامہ ابن دقیق العید نے کہا کہ اکثر اس کا استعمال جہاد ہی میں ہوتا ہے۔ علامہ قرطبی نے کہا کہ سبیل اللہ سے طاعۃ اللہ مراد ہے تحفۃ الاحوذی ص ۲/۳) تاہم ظاہر ہے کہ جہاد کے خاص فضائلِ عالیہ ہر طاعت پر حاصل نہ ہوں گے، للہذا آج کل جو لوگ ہر طاعت وسفر کو جہاد کے برابر قرار دیتے ہیں وہ بظاہر صحیح نہیں ہے، نمرود کی طاعات کو مجاہدہ تو کہہ سکتے ہیں جہاد نہیں، کیونکہ یہ نفس ونفیس کو قربان کردینے کا نام ہے، ذیلی طاعات اس کے برابر کیسے ہوسکتی ہیں؟ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کے یہاں من اغبرت قد ماہ فی سبیل اللہ سے مراد بعض نے منقطع الغزاہ کو لیا ہے اور بعض نے منقطع الحاج کو، میرے نزدیک دونوں سے عام لیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ لغۃً اس کی گنجائش ہے اگر چہ اکثری استعمال ان دونوں میں ہی ہوا ہے، للہذا حدیث میں بھی عام ہی مراد لیا جائے جیسا کہ امام بخاری بھی چاہتے ہیں، البتہ اگر امام ترمذی وغیرہ کی رائے کو لیں تو کہا جائے گا کہ امام بخاری نے جمعہ کو بھی جہاد کے ساتھ ملحق کردیا ہے، اور اسی لئے اس حدیث سے استدلال کیا جو جہاد کے بارے میں آئی ہے واضح ہو کہ امام ترمذی اس حدیث الباب بخاری کو کتاب الجہاد ہی میں لائے ہیں۔

مسافر کی نمازِ جمعہ

امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں امام زہری کے مسافر کے لئے بھی حضورِ جمعہ کو لکھا ہے۔ اس پر علامہ عینیؒ نے امام زہری سے دوسرا قول بھی نقل کیا کہ مسافر پر جمعہ واجب نہیں ہے، اور ابن المنذر نے اس پر علماء کا اجماع بھی نقل کیا ہے۔ للہذا امام زہری کے اول الذکر قول سے مراد حضورِ جمعہ بطور استحباب ہے، اور دوسرے کا مقصد نفی وجوب ہے۔ ابن بطال نے بھی کہا کہ اکثر علماء کے نزدیک مسافر پر جمعہ نہیں ہے۔ للہذا وہ جس وقت چاہے سفر پر جاسکتا ہے۔

جمعہ کے دن سفر

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جمعہ سے قبل مقیم کے لئے سفر شروع کرنا کیسا ہے؟ تو زوال سے پہلے امام مالک وابن المنذر کے نزدیک جائز ہے، اور شرح المہذب میں تحریم کو اصح کہا ہے دونوں طرف آثارِ صحابہ ہیں۔ اور زوال کے بعد جبکہ رفقاءِ سفر کا ساتھ چھوٹنے کا خوف نہ ہو اور راستہ میں بھی کہیں جمعہ ملنے کی توقع نہ ہو تو یہ سفر امام مالک واحمد کے نزدیک جائز نہ ہوگا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس کو جائز کہا ہے عمدہ ص ۳/۲۸۳) بہ جواز کراہتِ تحریمہ کے ساتھ ہے۔ علامہ عینی سے فروگذاشت ہوگئی کہ مطلقاً جواز لکھ دیا۔ فلیتنبہ لہ۔

درمختار میں شرح المنیہ سے نقل کیا کہ صحیح یہ ہے کہ زوال سے قبل سفر میں کراہت نہیں ہے اور زوال کے بعد سفر بغیر نمازِ جمعہ پڑھے مکروہ ہے، ردالمختار میں لکھا کہ اس سے وہ صورت مستثنیٰ ہونی چاہئے کہ رفقاءِ سفر چھوٹ جائیں اور نماز جمعہ پڑھنے کے بعد تنہا سفر ممکن نہ ہو، کہ اس صورت میں بھی کراہت نہ رہے گی۔ (معارف ص ۴/۴۲۲)

علامہ ابن رشد نے لکھا کہ جمہور کے نزدیک مسافر اور غلام پر جمعہ واجب نہیں ہے، داؤد ظاہری اور ان کے اصحاب کے نزدیک ان پر بھی جمعہ واجب ہے (ہدایۃ المجتہد ص ۱/۱۳۴)۔

بَابٌ لا يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ

(جمعہ کے دن دو آدمیوں کے درمیان) جدائی نہ کرے کہ ان کے بیچ میں گھس کر بیٹھے)

۸۶۱. حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ قَالَ اَنَا ابْنُ اَبِي ذِئْبٍ عَنْ سَعِيْدِ الْمُقْبُرِيِّ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ ابْنِ وَدِيْعَةَ عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَتَطَهَّرَ بِمَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ ثُمَّ ادَّهَنَ اَوْمَسَّ مِنْ طِيْبٍ ثُمَّ رَاحَ وَلَمْ يُفَرِّقْ بَيْنَ اثْنَيْنِ فَصَلّٰى مَا كُتِبَ لَهُ ثُمَّ اِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ اَنْصَتَ غُفِرَلَهُ مَابَيْنَهُ وَمَا بَيْنَ الْجُمُعَةِ الْاُخْرٰى.

ترجمہ۸۶۱۔ حضرت سلمان فارسیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے، اور جس قدر ممکن ہو پاکی حاصل کرے پھر تیل لگائے یا خوشبو ملے، اور مسجد میں اس طرح جائے کہ دو آدمیوں کو جدا کر کے ان کے درمیان نہ بیٹھے، اور جس قدر اس کی قسمت میں تھا، نماز پڑھے، پھر جب امام خطبہ کے لئے نکلے تو خاموش رہے تو اس جمعہ سے لے کر دوسرے جمعہ تک کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: تخطی اور تفریق بین الاثنین کی ممانعت اس لئے ہوئی کہ ان سے ایذاء ہوتی ہے اور جمعہ میں جمع کرنے کی شان ہے، اس لئے بھی تفریق کا فعل بے محل اور خلافِ مقصود ہے۔

قوله فصلے ماكتب له: اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے علامہ ابن تیمیہ کا رد کیا، جو کہتے ہیں کہ جمعہ سے قبل کوئی سنت نہیں ہے، چونکہ امام بخاری مستقل باب اس سلسلے میں آگے لائیں گے، اس لئے پوری بحث وہیں آئے گی۔ ان شاء اللہ۔

بَابٌ لَا يُقِيْمُ الرَّجُلُ اَخَاهُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَيَقْعُدُ فِيْ مَكَانِهٖ

(کوئی شخص جمعہ کے دن اپنے بھائی کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نہ بیٹھے)

۸۶۲. حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ هُوَا بْنُ سَلَامٍ قَالَ اَخْبَرَنَا مُخَلَّدُ بْنُ يَزِيْدَ قَالَ اَخْبَرَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ قَالَ سَمِعْتُ نَافِعًا قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُقِيْمَ الرَّجُلَ اَخَاهُ مِنْ مَّقْعَدِهٖ وَيَجْلِسُ فِيْهِ قُلْتُ لِنَافِعٍ اَلْجُمُعَةِ قَالَ الْجُمُعَةِ وَغَيْرَهَا.

ترجمہ۸۶۲۔ حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا اس بات سے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو اس کی جگہ سے ہٹا کر اس کی جگہ پر بیٹھے، میں نے نافع سے پوچھا کہ کیا یہ جمعہ کا حکم ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ جمعہ اور غیر جمعہ دونوں کا یہی حکم ہے۔

تشریح:۔ مسجد میں جا کر کسی بیٹھے ہوئے نمازی کو ہٹا کر اس کی جگہ بیٹھنے کی ممانعت کی گئی، کہ اس میں بھی ایذاءِ مومن اور تفریق ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا ویقعدَ بالنصب اولی ہے تا کہ دونوں باتوں کی برائی یکساں معلوم ہو۔ حدیث الباب میں خطبہ کے وقت خاموش رہ کر اس کو سننے کی بڑی فضیلت و ترغیب ہے اور اکثر صحابہ و تابعین کے عمل اور فتوے کی بنا پر امام ابوحنیفہ، امام مالک، سفیان ثوری وغیرہ اکثر ائمہ حدیث خطبہ کے وقت نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہیں سمجھتے، اور سلیک کے واقعہ کو خاص ضرورت کی ایک بات قرار دیتے ہیں، جبکہ امام شافعی و احمدؒ صرف اس واقعہ کی وجہ سے خطبہ کے وقت آنے والے کے لئے بھی تحیۃ المسجد کو سنت قرار دیتے ہیں۔

بَابُ الْاَذَانِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ

(جمعہ کے دن اذان دینے کا بیان)

۸۶۳. حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِیْ ذِئْبٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنِ السَّآئِبِ ابْنِ يَزِيْدَ قَالَ كَانَ النِّدَآءُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَوَّلُهٗ اِذَاجَلَسَ الاِمَامُ عَلَى الْمِنْبَرِ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِیْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ فَلَمَّا كَانَ عُثْمَانُ وَكَثُرَ النَّاسُ زَادَ النِّدَآءَ الثَّالِثَ عَلَى الزَّوْرَآءِ قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ الزَّوْرَآءُ مَوْضِعٌ بِالسُّوْقِ بِالْمَدِيْنَةِ.

ترجمہ ۸۶۳۔ سائب بن یزید روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکرؓ کے عہد میں جمعہ کے دن پہلی اذان اس وقت کہی جاتی تھی، جب امام منبر پر بیٹھ جاتا تھا، جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا، اور لوگ زیادہ ہو گئے تو آپ نے تیسری اذان مقامِ زوراء میں زیادہ کی۔ ابو عبداللہ (بخاری) نے کہا کہ زوراء مدینہ کے بازار میں ایک مقام ہے۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضورِ اکرم ﷺ اور صاحبین سیدنا ابوبکر و عمرؓ کے زمانہ میں جمعہ ایک ہی اذان تھی، اور غالباً وہ مسجد سے باہر تھی، جیسا کہ ابوداؤد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسجدِ نبوی کے دروازہ پر ہوتی تھی، پھر جب حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں لوگوں کی کثرت ہوگئی تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک اذان کا اضافہ کر کے زوراء پر خارجِ مسجد جاری کرائی، تا کہ دور تک لوگ لوگ سن لیں اور اپنے کاروبار کو بند کر کے جمعہ کے لئے مسجدِ نبوی کا رخ کریں۔ حافظؒ نے لکھا کہ زوراء ایک اونچا مکان تھا، جس پر پہلی اذان زوال کے بعد دی جانے لگی۔ حافظ نے علامہ مہلب مالکی شارحِ بخاری کا قول نقل کیا کہ اذان اس جگہ (امام کے سامنے) ہونے میں یہ حکمت ہے کہ لوگ امام کے منبر پر بیٹھنے کو جان لیں گے تو خطبہ کی طرف متوجہ ہوں گے، حافظ نے لکھا کہ یہ قول قابلِ اعتراض ہے، کیونکہ طبرانی سے یہ سیاقِ ابن اسحاق عن الزہری اسی حدیث میں آتا ہے کہ بلال مسجد کے دروازے پر اذان دیا کرتے تھے لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ وہ عام طور سے لوگوں کو خبردار کرنے کے لئے تھی، خاص طور سے خطبہ کے لئے خاموشی کے واسطے نہ تھی البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب سے ایک اذان کا اضافہ ہوا تو وہ اعلام کے لئے ہوگئی اور حضور علیہ السلام کے زمانہ والی انصات کے لئے ہوگئی (فتح الباری ص ۲/ ۲۶۸)۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اذانِ عہدِ نبوی کا مقصد انصات للخطبہ نہ تھا، اس لئے اگر اس کو بعد میں بھی بغرض اعلام ہی رکھا جاتا تو کوئی قباحت نہ تھی۔ اذان کا تعدد صبح کے وقت بھی ثابت ہوا ہے جمعہ کے واسطے بھی اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ہو سکتا تھا۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے شاید اسی کی طرف اشارات کئے ہیں، اور یہاں تک بھی فرمایا کہ بنی امیہ کے اس طریقہ کا رواج نہ ہونا چاہئے تھا (کیونکہ ان کا عمل امت کے لئے سند نہیں بن سکتا۔)

حافظؒ نے یہ بھی داؤدی سے نقل کیا کہ پہلے اذان (حضور علیہ السلام کے زمانہ میں) مسجد کے نشیبی حصہ میں ہوتی تھی (جس سے زیادہ دور تک لوگوں کو اس کی آواز نہ پہنچ سکتی تھی) اس لئے حضرت عثمانؓ نے زوراء پر اذان کو جاری کرایا پھر جب ہشام بن عبدالمالک کا دور آیا تو اس نے دوسری اذان کو خطیب کے سامنے کر دیا (فتح ص ۲/ ۲۶۹)۔

علامہ عینیؒ نے لکھا: داؤدی سے نقل ہوا کہ پہلے موذنین اسفلِ مسجد میں اذان دیا کرتے تھے، جو امام کے سامنے نہ ہوتے تھے، پھر جب حضرت عثمانؓ نے ایک موذن زوراء پر اذان دینے کیلئے مقرر کر دیا۔ اسکے بعد جب ہشام کا دور آیا تو اس نے موذنوں کو یا کسی ایک کو خطیب کے سامنے اذان دینے پر مقرر کر دیا اس طرح وہ تین ہو گئے اور حضرت عثمانؓ کے عمل کو اس سلسلہ کا تیسرا نمبر قرار دیا گیا۔ (عمدہ ص ۳/ ۲۹۱)۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہشام سے قبل یہ دوسری اذان بدستور حضور علیہ السلام کے زمانہ کی طرح بابِ مسجد پر رہی ہوگی اور ہشام نے اس

کومسجد کے اندر خطیب کے سامنے کردیا اور اسی وقت سے یہ موجودہ طریقہ چلتا آیا، اور متبعین مذاہب اربعہ نے بھی اسی کو اختیار کرلیا۔ بجز اہلِ مغرب کے کہ ان کے یہاں صرف ایک ہی اذان رہی جو حضور علیہ السلام کے زمانہ میں تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ خطیب کے سامنے مسجد کے اندر اذان کا طریقہ بنوامیہ کا جاری کردہ ہے۔ اور یہی بات فتح الباری وغیرہ سے ملتی ہے۔ جس کے لئے ائمہ اربعہ کے یہاں مجھے کوئی متدل نہیں ملا ہے۔ بجز اس کے کہ صاحبِ ہدایہ نے ''بین یدیہ'' لکھ دیا اور لکھا کہ اسی طرح توارث وتعامل ہمیں ملا ہے۔ پھر اسی کو دوسرے اہلِ مذاہب نے بھی نقل کرنا شروع کردیا۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ میں حیران رہا اور سمجھا کہ کسی کے پاس کچھ سامان تو تھا نہیں، اس لئے صاحبِ ہدایہ کا قول پکڑ لیا کہ بڑا آدمی ہے، انہوں نے قال فی ہدایۃ الحنفیہ سے ادا کیا ہے اور ابنِ کثیر شافعی نے بھی صاحبِ ہدایہ کا نام لے کر نقل کیا ہے، حالانکہ وہ حنیفہ کے اقوال نقل نہیں کیا کرتے، پھر فرمایا کہ قیاساً بنی امیہ کے عمل کو گرنا چاہئے تھا، مگر اب تک اس پر عمل ہوتا آیا۔

حضرتؒ نے درسِ بخاری شریف مورخہ ۲۷ جون ۳۲ء میں فرمایا تقریباً ۲۰۔۲۱ سال پہلے احمد رضا خان نے اذانِ ثانی للجمعہ کے خارجِ مسجد ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ اور صرف یہی مسئلہ ہے کہ اس نے حق کہا ہے مگر اسی میں سب سے زیادہ ذلیل ہوا۔ حضرت مولانا شیخ الہندؒ سے میری اس مسئلہ میں گفتگو ہوئی اور میں نے ان سے بھی یہی بات کہی تھی کہ یہ بات اس نے حق کہی ہے، کیونکہ ابوداؤد میں تصریح کی ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں اذان مسجد کے دروازہ پر ہوتی تھی (اندر نہ ہوتی تھی) اور اندر ہونے کی اصل بنی امیہ سے ہے، اور چاروں مذاہب میں اندر ہونے کا سامان نہیں ہے۔

دوسری آدھی بات خاں صاحب نے یہ بھی سچ کہی تھی کہ اذان مسجد کے اندر کے حصہ میں نہ ہونی چاہئے۔ وہ بھی نہ چلی، شاید اس کی حق بات چلنا مقدر میں نہ تھی، یوں جو باتیں اس نے غلط کہیں، وہ سب خوب چل رہی ہیں۔

سلفی حضرات کی رائے

یہ لوگ بھی خاں صاحب کی تائید میں ہیں، چنانچہ شیخ احمد محمد شاکر نے تعلیق ترمذی ص ۲/۳۹۳ میں لکھا کہ ''روایتِ ابی داؤد کے تحت اذانِ خطبہ بابِ مسجد پر اور مسجد سے باہر ہی ہونی چاہئے، لیکن بہت سے اہلِ علم نے بھی اس کو خطیب کے مواجہہ میں اور منبر کے قریب کا رواج دیا ہے، اور اگر کوئی اس کے خلاف کہے تو اس کو مطعون کیا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ اذانِ عثمان کے بعد اذانِ خطبہ کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی ہے، تاہم اس کو بھی اتباعاً للسنہ باقی رکھنا ہے تو اس کو ابواب پر ہی ہونا چاہئے؟ اس کو نقل کرکے صاحبِ مرعاۃ نے لکھا کہ جہاں مدینہ منورہ کے سے حالات ہوں اور اذانِ عثمان کی ضرورت ہو وہاں اس کو رکھنا چاہئے، اور جہاں ضرورت نہ ہو تو اذانِ خطبہ ہی کو خارجِ مسجد رکھا جائے کہ وہ سنت کے مطابق ہے اور اس کا فائدہ بھی ہے کہ لوگ سن کر آئیں گے، باقی خطیب کے سامنے اور منبر کے قریب سنت نہیں ہے، (مرعاۃ ص ۳/ ۳۰۷)۔

ہم نے یہاں حضرت شاہ صاحبؒ کی پوری بات اور دوسروں کا طریقِ فکر بھی اس لئے پیش کردیا کہ محدثانہ محققانہ بحث ونظر کی راہ ہموار رہے اور مسدود نہ ہو۔ اور یہ ضروری نہیں کہ جتنے بھی فیصلے علماءِ ملت نے کردیئے ہیں، وہ اصولِ نقد وتحقیق سے وراء الوراء ہو چکے ہیں۔

واللہ یحق الحق وھو خیر الفاصلین۔

بذل المجہود ص ۲/۱۸۰ میں لکھا: ''اس حدیثِ ابی داؤد سے صاحب العون نے اذانِ خطبہ داخل المسجد کو مکروہ کہا ہے اور اسی کو اپنے شیخ صاحبِ غایۃ المقصود سے بھی نقل کیا ہے (واضح ہو کہ اذان داخلِ مسجد کو حنفیہ نے بھی مکروہ لکھا ہے اگرچہ وہ کراہت تنزیہی ہو) اور ہمارے زمانہ میں رئیس اہلِ بدعت احمد رضا خان بریلوی نے بھی اسی سے استدلال کرکے اذانِ داخل کو مکروہ قرار دیا ہے، اور اس کے اثبات میں کتابیں اور رسالے لکھے ہیں۔ میں نے ان کے جواب میں ایک مختصر رسالہ تنشیط الاذان لکھا ہے، جس میں اس مسئلہ پر مدلل بحث کی ہے۔

اس کو دیکھا جائے۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے بھی اعلاء ص ۴۹/۸ میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

اسی رسالہ کا حوالہ حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے بھی اپنی تالیفات میں دیا ہے مگر بہتر ہوتا کہ کچھ دلائل مختصر أبذل اور اعلاء اور دوسری حدیثی تالیفات میں بھی نقل کر دیئے جاتے۔ الگ چھوٹے رسالے کہاں میسر اور محفوظ رہتے ہیں، افسوس ہے کہ اتنے ہنگاموں اور مباحثوں کے بعد بھی اپنے جوابات و دلائل کو اہمیت نہ دی گئی، جبکہ دوسرے حضرات نے اپنے دلائل کو مستقل حدیثی تالیفات میں بھی درج کر دیا ہے، ہمارے پاس بھی وہ رسالہ نہیں ہے، اس لئے مراجعت نہ ہو سکی۔ اگر دستیاب ہو تو پھر کچھ عرض کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ پر تحقیقی رنگ غالب تھا، اسی لئے بہت سے مسائلِ حنفیہ میں بھی جمود پسند نہیں تھا بلکہ ان کو کتاب وسنت اور جمہور سلف پر پیش کر کے فیصلہ کرتے تھے اور بعض مسائلِ حنفیہ میں ان روایاتِ فقہ حنفی کو ترجیح دی ہے جو دوسرے مذاہب سے مطابق تھیں۔ ہمارے اکابر میں سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کا طرزِ تحقیق بھی محققانہ محدثانہ تھا، اسی لئے انہوں نے بھی متعدد مسائل میں اپنی الگ تحقیق کی ہے۔ مثلاً مسافتِ قصر بجائے ۳۶ کوس (۴۸ میل) کے ۳۶ میل پر اصرار تھا اور اس بارے میں تمام علماءِ دیوبند و سہارنپور سے الگ رہے، لوگوں نے یہ بھی کوشش کی کہ سب مل کر ایک رائے پر اتفاق کر لیں۔ مگر حضرتؒ نے فرمایا کہ اس امر کی کوشش فضول ہے وغیرہ دیکھو تذکرۃ الخلیل ص ۱۹۹۔ الخ

راقم الحروف کا خیال ہے کہ اذانِ خطبہ داخل و خارج مسجد کے بارے میں بھی مزید تحقیق کھلے دل سے ہونی چاہئے یعنی اس سے قطع نظر کر کے کہ بریلوی و سلفی نقطۂ نظر کیا ہے، سلف سے ہی اس کے لئے آخری فیصلہ کا استخراج ہونا چاہئے۔ **للہ الامر من قبل ومن بعد۔**

اذانِ عثمان بدعت نہیں ہے

حضرتؒ نے فرمایا کہ اذان کا تعدد بدعت نہیں ہے کیونکہ موطأ امام مالک میں بھی ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لوگ مسجدِ نبوی میں نماز پڑھتے رہتے تھے، اور جب حضرت عمرؓ تشریف لا کر منبر پر بیٹھتے تھے اور موذن اذانیں دیا کرتے تھے پھر جب وہ موذنیں اذانیں ختم کر لیتے تھے تو سب لوگ خاموش ہو کر خطبہ کی طرف متوجہ ہو جایا کرتے تھے۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی اذانوں کا تعدد ثابت ہوا ہے۔ صبح کی بھی دو اذانیں ثابت ہیں۔ اور امام احمد و اسحق کے نزدیک تو جمعہ کے لئے بھی قبل الزوال اذان درست ہے۔

بَابُ الْمُؤَذِّنِ الْوَاحِدِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ

(جمعہ کے دن ایک موذن (کے اذان دینے) کا بیان)

حَدَّثَنَا اَبُوْ نُعَيْمٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ اَبِيْ سَلَمَةَ الْمَاجُشُوْنَ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنِ السَّآئِبِ بْنِ يَزِيْدَ اَنَّ الَّذِيْ زَادَالتَّاذِيْنَ الثَّالِثَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ حِيْنَ كَثُرَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ وَلَمْ يَكُنْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُؤَذِّنٌ غَيْرُ وَاحِدٍ وَّكَانَ التَّاذِيْنُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ حِيْنَ يَجْلِسُ الْاِمَامُ يَعْنِيْ عَلَى الْمِنْبَرِ.

ترجمہ ۸۶۴۔ سائب بن یزید روایت کرتے ہیں کہ جب اہلِ مدینہ کی تعداد زیادہ ہو گئی۔ اس وقت جمعہ کے دن تیسری اذان کا اضافہ جنہوں نے کیا وہ حضرت عثمانؓ تھے اور نبی کریم ﷺ کے عہد میں بجز ایک کے کوئی موذن نہ ہوتا تھا، اور جمعہ کے دن اذان اس وقت ہوتی تھی، جب امام منبر پر بیٹھتا تھا۔

تشریح:۔ حافظ ابن حجر نے واضح نہیں کیا کہ اس باب و ترجمہ کا کیا مقصد ہے، ابوداؤد وغیرہ میں حدیث الباب بغیر اس عنوان کے ضمناً مروی ہے البتہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا کہ "یہ جو بعد کو دستور ہو گیا حرمین وغیرہما میں کہ جمعہ کے دن اور دوسرے دنوں میں بھی کئی

موذن جمع ہوکر بلند آواز سے اذان دیتے ہیں یہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں نہیں تھا بلکہ اس وقت ایک ہی مؤذن اذان دیتا تھا۔ تاہم اس معمول کو بدعت اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اس کی اصل ملتی ہے، حضور علیہ السلام نے حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ کو حکم دیا تھا کہ اذان کے کلمات حضرت بلالؓ پر القاء کریں اور اس طرح دونوں بلند آواز سے کہتے تھے:

علامہ عینی نے لکھا کہ اس ترجمہ کا مقصد ابن حبیب وغیرہ کا رد ہے جنہوں نے کہا کہ حضور علیہ السلام کے منبر پر تشریف رکھنے کے بعد یکے بعد دیگرے تین موذن اذان دیا کرتے تھے، اور تیسرے کے فارغ ہونے پر حضور علیہ السلام کھڑے ہوکر خطبہ شروع فرماتے تھے۔ (عمدہ ص ۳/۲۹۲)

جمعہ کے لئے اذان دینے پر حضرت بلالؓ مقرر تھے جیسا کہ ابوداؤد کی روایت میں ایک مؤذن کی تشخیص ان ہی سے کی گئی ہے۔ قولہ **حین یجلس الامام علی المنبر** ۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بہ تصریح روایتِ ابی داؤد یہ اذان حضور علیہ السلام کے زمانہ میں بابِ مسجد کے پاس ہوتی تھی، اور ایک لفظ یہ بھی آیا ہے کہ مینارہ پر ہوتی تھی۔

علامہ عینیؒ نے لکھا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ماذ نہ نہ تھا جس کو منارہ کہتے ہیں، البتہ ہر بلند اونچی جگہ کو بھی منارہ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ (عمدہ ص ۳/۲۹۱)۔

بَابٌ یُجِیْبُ الْاِمَامُ عَلَی الْمِنْبَرِ اِذَا سَمِعَ النِّدَآءَ

(جب اذان کی آواز سنے تو امام منبر پر جواب دے)

۸۶۵۔ حَدَّثَنَا ابْنُ مُقَاتِلٍ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ قَالَ اَخْبَرَنَا اَبُوْ بَكْرِ بْنُ عُثْمَانَ بن سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ عَنْ اَبِىْ اُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ قَالَ سَمِعْتُ مُعٰوِيَةَ بْنَ اَبِىْ سُفْيَانَ رَضِىَ اللّٰهُ عنهما وَهُوَ جَالِسٌ عَلَى الْمِنْبَرِ اَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ فَقَالَ اللّٰهُ اَكْبَرُ اللّٰهُ اَكْبَرُ فَقَالَ مُعٰوِيَةُ اللّٰهُ اَكْبَرُ اللّٰهُ اَكْبَرُ فَقَالَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَقَالَ مُعٰوِيَةُ وَاَنَا قَالَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ مُعَاوِيَةُ وَاَنَا فَلَمَّا اَنْ قَضَى التَّاذِيْنَ قَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى هٰذَا الْمَجْلِسِ حِيْنَ اَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ مَا سَمِعْتُمْ مِّنِّىْ مِنْ مَّقَالَتِىْ.

ترجمہ ۸۶۵۔ ابوامامہ ابن سہل بن حنیف بیان کرتے ہیں کہ جب مؤذن نے اذان کہی تو میں نے معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو منبر پر ہی جواب دیتے ہوئے سنا، چنانچہ جب مؤذن نے اَللّٰہُ اَکْبَر اَللّٰہُ اَکْبَر کہا، تو معاویہ نے بھی اَللّٰہُ اَکْبَر اَللّٰہُ اَکْبَر کہا۔ پھر موذن نے اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا، تو معاویہؓ نے کہا۔ وَاَنَا (یعنی میں بھی) پھر مؤذن نے کہا اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہا تو معاویہؓ نے کہا وَاَنَا (یعنی میں بھی) جب اذان ختم ہوگئی تو معاویہ نے کہا کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ سے اس جگہ پر موذن کے اذان دیتے وقت وہ چیز سنی، جو تم نے مجھ کو کہتے ہوئے سنا۔

تشریح: ۔ امام و خطیب کیلئے تو جوابِ اذان کی اباحیت یا استحباب حدیث الباب سے نکلتی ہے، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ دوسرے لوگوں میں سے جس نے اذانِ اول کا جواب نہ دیا ہو وہ اذانِ خطبہ کا جواب دے سکتا ہے ورنہ خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے عنایہ کا حوالہ دیا اور اسی حدیث الباب بخاری سے اس کو مؤید بتلا کر مختار و راجح قرار دیا۔ (المعروف ص ۲۳۴)۔

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ امام کے نمازِ جمعہ کے لئے نکلنے پر بھی نماز و کلام ممنوع ہوجاتے ہیں کیونکہ حضور علیہ السلام نے فرمایا اذا خرج الامام فلا صلوۃ و لا کلام ۔ اس حدیث کی تخریج و تحقیق کے لئے معارف ص ۴/۳۸۵ دیکھی جائے مزید تحقیق نماز وقتِ خطبہ میں آئے گی۔ ان شاء اللہ

بَابُ الْجُلُوْسِ عَلَى الْمِنبَرِ عِنْدَ التَّاذِيْنَ

(اذان دینے کے وقت منبر پر بیٹھنے کا بیان)

۸۶۶. حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّ السَّآئِبَ بْنَ يَزِيْدَ اَخْبَرَهُ اَنَّ التَّاذِيْنَ الثَّانِيَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَمَرَبِهٖ عُثْمَانُ حِيْنَ كَثُرَ اَهْلُ الْمَسْجِدِ وَكَانَ التَّاذِيْنُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ حِيْنَ يَجْلِسُ الْاِمَامُ.

ترجمہ۸۶۶۔سائب بن یزیدؓ نے بیان کیا کہ جمعہ کے دن دوسری اذان کا حکم حضرت عثمانؓ نے دیا، جب کہ اہلِ مسجد کی تعداد بہت بڑھ گئی اور جمعہ کے دن اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام (منبر پر) بیٹھ جاتا تھا۔

تشریح:۔علامہ عینیؒ نے لکھا کہ اس باب کو" باب التاذين يوم الجمعة حين يجلس الامام على المنبر لکھنا زیادہ مناسب تھا، کیونکہ حدیث الباب میں یہی بتایا بھی ہے کہ دوسری اذان کا اضافہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کے زیادہ ہونے کی وجہ سے کیا تھا اور اذان امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت ہوتی تھی۔(عمدہ ص۳/۲۹۳)۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: وكان التاذين الخ سے مراد یہ ہے کہ جمعہ کی اذان دوسرے دنوں کی اور دوسری نمازوں کے خلاف طریقہ پر مشروع ہوئی ہے کہ اور دنوں میں اور دوسری سب نمازوں کے لئے اذان ونماز کے درمیان کچھ وقفہ ہوتا ہے، لیکن جمعہ کی اذان خطبہ سے متصلاً ہوتی ہے اور خطبہ نمازِ جمعہ کا ہی ایک حصہ ہے۔حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ خطبہ کی اذان مسجد سے باہر کسی انصاری کے گھر پر ہوتی تھی، اور اذان نماز ہی کے لئے تھی، خطبہ کے لئے کوئی اذان نہیں تھی، حضرتؒ نے درسِ ابی داؤد (دیوبند) میں فرمایا کہ اذان اعلامِ غائبین کے لئے ہوتی ہے، اسی لئے وہ اونچی جگہوں پر کہی جاتی ہے اور مسجد سے باہر ہوتی ہے، اقامت حاضرین کے اعلام کے واسطے ہوتی ہے اور اسی لئے وہ مسجد کے اندر ہوتی ہے، باقی کئی آدمیوں کا بیک وقت اذان دینا یہ بنوامیہ کے زمانہ سے شروع ہوا ہے، اور ایسے ہی اذان خطیب کے سامنے کا رواج بھی بعد کو ہوا ہے، لیکن چونکہ دونوں باتوں کا توارث وتعامل امت میں ہوگیا، اس لئے ان کو بدعت حسنہ ہی کہیں گے الخ اور اذانِ ثانی کا اضافہ چونکہ حضرت عثمانؓ کے مجتہدات میں سے ہے اس لئے اس کو تو بدعتِ سیئہ کہہ ہی نہیں سکتے۔ **لقوله عليه السلام عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين . الخ** (انوارالمحمود ص۱/۳۶۳)

امام بخاریؒ نے خطبہ سے متعلق بہت سے ابواب قائم کئے ہیں جو اس تفصیل سے دوسروں کے یہاں نہیں ملتے، مگر خطبہ سے قبل سلام کا باب قائم نہیں کیا، حالانکہ یہ بھی اختلافی مسئلہ ہے، امام شافعی واحمد اس کو بھی سنت کہتے ہیں جبکہ امام ابوحنیفہ و مالک سنت ترکِ سلام کو کہتے ہیں۔

علامہ باجی مالکی نے لکھا کہ امام مالکؒ نے عمل اہلِ مدینہ کو حجت بنایا اور حنفیہ نے کہا کہ یہ موقع عبادت شروع کرنے کا ہے، لہٰذا اس وقت سلام مسنون نہ ہوگا جیسے کہ دوسری عبادات کے شروع میں بھی نہیں ہے۔

شوکانی نے کہا کہ یہ امام ابوحنیفہ و مالک کے نزدیک اس لئے مکروہ ہے کہ مسجد میں داخل ہونے کے وقت امام اس سے فارغ ہوگیا ہے، لہٰذا اب اعادہ کی ضرورت نہیں۔موطا امام مالک میں حضرت عمرؓ کے عمل سے بھی سلام وقت الخطبہ ثابت نہیں ہے، اور ابن عمرؓ سے بھی ایسا ہی ہے اور ابن عمر کے جس اثر سے امام شافعی واحمد استدلال کرتے ہیں وہ ضعیف ہے۔(اوجز ص۱/۳۳۸)

بَابُ الْخُطْبَةِ عَلَى الْمِنبَرِ وَقَالَ اَنَسٌ خَطَبَ النَّبِیُّ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنبَرِ.

(منبر پر خطبہ پڑھنے کا بیان، اور حضرت انسؓ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے منبر پر خطبہ پڑھا)

۸۶۸. حَدَّثَنَا قُتَیْبَۃُ بْنُ سَعِیْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا یَعْقُوْبُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ مُحَمَّدِ ابْنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَبْدِہِ الْقَارِیُّ الْقَرَشِیُّ الْاِ سْکَنْدَرَانِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ حَازِمِ بْنُ دِیْنَارٍ اَنَّ رِجَالاً اَتَوْ اَسَہْلَ بْنَ سَعْدٍ والسَّاعِدِیَّ وَقَدِ امْتَرَوْا فِی الْمِنْبَرِ مِمَّ عُوْدُہٗ فَسَاَلُوْہُ عَنْ ذٰلِکَ فَقَالَ وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَعْرِفُ مِمَّا ھُوَ وَلَقَدْ رَاَیْتُہٗ اَوَّلَ یَوْمٍ وُّضِعَ وَاَوَّلَ یَوْمٍ جَلَسَ عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَّمَ اَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی فُلَانَۃَ اُمْرَاَۃٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ قَدسَمَّا ھَا سَہْلٌ مُرِیْ غُلَا مَکِ النَّجَّارَ اَنْ یَّعْمَلَ لِیْ اَعْوَادًا اَجْلِسُ عَلَیْھِنَّ اِذَا کُلَّمْتُ النَّاسَ فَاَمَرَتْہُ فَعَمِلَھَا مِنْ طَرُفَآءِ الْغَابَۃِ ثُمَّ جَآءَ بِھَا فَاَرْسَلَتْ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَبِھَا فَوُضِعَتْ ھٰھُنَا ثُمَّ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صلّٰی عَلَیْھَا وَکَبَّرَ وَھُوَ عَلَیْھَا ثُمَّ رَکَعَ وَھُوَ عَلَیْھَا ثُمَّ نَزَلَ الْقَھْقَرٰی فَسَجَدَ فِیْ اَصْلِ الْمِنبَرِ ثُمَّ عَادَ فَلَمَّا فَرَغَ اَقْبَلَ عَلَے النَّاسِ فَقَالَ یٰاَیُّھَاالنَّاسُ اِنَّمَا صَنَعْتُ ھٰذَا لِتَاتَمُّوْ ابِی وَلِتَعَلَّمُوْا صَلٰوتِی.

۸۶۹. حَدَّثَنَا سَعِیْدُ بْنُ اَبِیْ مَرْیَمَ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرِ بْنِ اَبِیْ کَثِیْرٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ یَحْیَی بْنُ سَعِیْدٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ ابْنُ اَنَسٍ اَنَّہٗ سَمِعَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ کَانَ جِذْعٌ یَّقُوْمُ اِلَیْہِ النَّبِیُّ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا وُضِعَ لَہُ الْمِنْبَرُ سَمِعْنَا لِلْجِذْعِ مِثْلَ اَصْوَاتِ الْعِشَارِ حَتّٰی نَزَلَ النَّبِیُّ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَوَضَعَ یَدَہٗ عَلَیْہِ وَقَالَ سُلَیْمَانُ عَنْ یَّحیٰی اَخْبَرَنِیْ حَفْصُ بْنُ عُبَیْدِ اللّٰہِ بْنِ اَنَسٍ سَمِعَ جَابِرًا.

۸۷۰. حَدَّثَنَا اٰدَمُ بْنُ اَبِی اَیَاسٍ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِیْ ذِئْبٍ عَنِ الزُّھْرِیِّ عَنْ سَالِمٍ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَخْطُبُ عَلَی الْمِنبَرِ فَقَالَ مَنْ جَآءَ اِلَی الْجُمُعَۃِ فَلْیَغْتَسِلْ.

ترجمہ ۸۶۸۔ ابوحازم بن دینار روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ سہل بن سعد ساعدی کے پاس آئے اور وہ اختلاف کر رہے تھے، منبر کے متعلق کہ اس کی لکڑی کس درخت کی تھی، تو اُن لوگوں نے ان (سہل بن سعد ساعدی) سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ واللہ میں جانتا ہوں کہ منبر کس درخت کی لکڑی کا تھا اور بخدا میں نے پہلے ہی دن اس کو دیکھ جب وہ رکھا گیا تھا، اور سب سے پہلے دن جب اس پر رسول اللہ ﷺ بیٹھے، رسول اللہ ﷺ نے انصار کی فلاں عورت کے پاس (جس کا سہل نے نام بھی بیان کیا) کہلا بھیجا کہ تم اپنی بڑھئی لڑکے کو حکم دو کہ وہ میرے واسطے ایسی لکڑیاں بنادے کہ جب میں لوگوں سے مخاطب ہوں، تو اس پر بیٹھوں، چنانچہ اس عورت نے اس لڑکے کو اس کے بنانے کا حکم دیا، تو غابہ کے جھاؤ کے درخت کا بنایا، پھر اس عورت کے پاس لے کر آیا تو اس عورت نے رسول اللہ ﷺ کے پاس اس کو بھیج دیا آپ نے حکم دیا تو یہاں رکھا گیا پھر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر نماز پڑھی اور تکبیر کہی، پھر اسی پر رکوع بھی کیا، بعدازاں الٹے پاؤں پھرے اور منبر کی جڑ میں سجدہ کیا، پھر واپس اپنی جگہ پر گئے، جب فارغ ہوئے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اے لوگو میں نے ایسا اس لئے کیا، کہ تم میری اقتدا کرو، اور میری نماز سیکھ لو۔

ترجمہ ۸۶۹۔ حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ ایک کھجور کا تنہ تھا، جس سے ٹیک لگا کر رسول اللہ ﷺ خطبہ دیتے تھے، جب

ان کے لئے منبر تیار کیا گیا تو ہم نے اس تنہ میں سے ایسی آواز رونے کی سنی، جیسے دس مہینہ کی حاملہ اونٹنی آواز کرتی ہے، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ اترے اور اپنا دستِ مبارک اس پر رکھا۔

ترجمہ ۸۷۰۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو منبر پر خطبہ دیتے ہوئے سنا اس میں آپ نے یہ فرمایا کہ جو شخص جمعہ کی نماز کے لئے آئے تو چاہئے کہ غسل کرے۔

تشریح:۔ علامہ عینیؒ نے لکھا: احادیث صحیحہ سے ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام (منبر بننے سے قبل) خطبہ کے وقت تنۂ کھجور سے ٹیک لگاتے تھے، اور پہلا منبر تین درجوں کا تھا، پھر مروان نے خلافت حضرت معاویہؓ کے دور میں چھ درجوں کا اضافہ نیچے کی طرف کیا، اوپر کے تینوں درجات عہدِ نبوی ہی کے باقی رکھے۔

حدیث الباب میں جو نمازِ نبوی کا ذکر ہے، اس میں قیام بعد الرکوع اور قراءت بعد التکبیر کا ذکر نہیں ہے، وہ روایتِ سفیان عن ابی حازم میں ہے، اور طبرانی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے پہلے خطبہ دیا۔ پھر اقامت کہی گئی۔ اور آپ نے تکبیر کہہ کر منبر پر ہی نماز پڑھی۔

قولہ ولتعلموا صلاتی۔ پر علامہ نے لکھا کہ آپ کے منبر کے اوپری حصہ پر نماز پڑھنے کا مقصد یہی تھا کہ سب لوگ آپ کی نماز کو اچھی طرح دیکھ لیں، امام احمد، شافعی لیث اور اہلِ ظاہر نے کہا کہ اس طرح نماز پڑھنا جائز ہے۔ جیسے آپ نے پڑھی، مگر امام ابوحنیفہ وامام مالک کے نزدیک درست نہیں کیونکہ یہ صورت صرف حضور علیہ السلام کے لئے خاص تھی، تاہم اگر ایسی ہی کوئی مصلحت وضرورت مقتضی ہو تو اس وقت نماز فاسد یا مکروہ نہ ہوگی۔ الخ (عمدہ ص ۲۹۶/۲۹۵ جلد ثالث) زیارۃ الحرمین ص ۳۰۳ میں ہر زمانہ کے تغیراتِ منبر نبوی کا ذکر ہے، اور اس میں ہے کہ اب موجودہ منبر ۹۹۸ھ کا ہے، جو سلطان مراد عثمانیؒ نے تیار کرایا تھا۔ اور اس وقت سابق منبر کو مسجدِ قبا میں منتقل کرا دیا تھا۔ یہ منبر بے نظیر صنعت کاری کا بہترین نمونہ ہے، ٹھیک اسی جگہ نصب ہے جہاں منبرِ نبوی تھا، یعنی اوپر کے تین درجے نشست گاہ نبوی کے مقام میں ہیں اور باقی ۹ سیڑھیاں آگے کو نکلی ہوئی ہیں۔ اس منبر کی ۱۲ سیڑھیاں ہیں۔ اور منبر پر چار نازک ستونوں پر ایک قبہ قائم ہے۔ تمام کام سنگ مرمر کا ہے، طلائی نقش ونگار کے لحاظ سے اعلیٰ شاہ کار بے مثل اور آیت من آیات اللہ ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ابن حزم نے حضور علیہ السلام کی اس منبر والی نماز کو نافلہ بتلایا ہے، یہ ان کی بڑی غلطی ہے، کیونکہ وہ نمازِ جمعہ تھی جیسا کہ بخاری کی حدیث سے بھی ثابت ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ حافظ نے منبر بننے کا سنہ نوہجری بتایا ہے، میرے نزدیک وہ ۵ھ میں بنا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بَابُ الْخُطْبَةِ وقَآئِمًا وَّقَالَ اَنَسٌ بَيْنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ قَآئِمًا

(کھڑے ہو کر خطبہ دینے کا بیان، اور حضرت انسؓ نے کہا کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دے رہے تھے)

۸۷۱. حَدَّثَنِيْ عَبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ الْقَوَارِيْرِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ الْحَارِثِ قَالَ حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ قَآئِمًا ثُمَّ يَقْعُدُ ثُمَّ يَقُوْمُ كَمَا تَفْعَلُوْنَ الْاٰنَ.

ترجمہ ۸۷۱۔ حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے تھے، پھر بیٹھتے، پھر کھڑے ہوتے تھے جیسا کہ تم کرتے ہو۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ خطبہ کے وقت قیام شافعیہ کے نزدیک واجب اور ہمارے یہاں سنت ہے۔ انوار المحمود ص

۳۶۵/۱ میں درج ہوا کہ قیام للخطبہ عند الشافعی شرط ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک فرض ہے۔ الخ نقل مذاہب میں بھی، چونکہ اختلاف پیش آیا ہے اس لئے ہم یہاں زیادہ موثق صورتِ حال اوجز سے نقل کرتے ہیں۔ علامہ نوویؒ نے ابن عبدالبر سے اس امر پر اجماع نقل کیا کہ اگر طاقت کھڑے ہونے کی ہو تو خطیب کے لئے کھڑے ہو کر ہی خطبہ دینا ضروری ہے امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ بیٹھ کر بھی صحیح ہوگا اور امام مالک نے کہا کہ کھڑے ہو کر خطبہ دینا واجب ہے اگر قیام کو ترک کرے گا تو گنہگار ہوگا، اور جمعہ صحیح ہو جائے گا۔

علامہ شعرانی نے میزان میں لکھا کہ "امام مالک و شافعی قدرت والے کے لئے قیام کو واجب کہتے ہیں اور امام ابوحنیفہ واحمدؒ واجب نہیں کہتے۔" یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ نیل المآرب اور الروض المربع میں قیام کو سنت ہی کہا ہے، اور مالکیہ کی مختصر الخلیل میں یہ بھی ہے کہ وجوبِ قیام میں تردد ہے، کیونکہ دسوقی میں ہے کہ وجوبِ قیام اکثر کا قول ہے اور ابن العربی، ابن القصار اور عبدالوہاب کے نزدیک سنت ہے، اس صورتحال حال میں ابن عبدالبر نے اجماعِ فقہاء کی بات کیسے کہہ دی؟ قابلِ تعجب ہے، حنفیہ کی بدائع میں ہے کہ خطبہ میں قیام سنت ہے، شرط نہیں ہے کہ بغیر اس کے خطبہ صحیح نہ ہوگا، حضرت عثمانؓ سے بھی مروی ہے کہ وہ بوڑھاپے کے زمانہ میں بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے اور ان پر صحابہ میں سے کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔

علامہ عینی نے بخاری کی روایت ابی سعید خدری سے بھی استدلال کیا ہے، جس میں ہے کہ حضور علیہ السلام ایک دن منبر پر بیٹھے اور ہم آپ کے گرد بیٹھے تھے۔ (یہ حدیث اگلے ہی باب میں موجود ہے) اور حضور علیہ السلام نے منبر بھی یہ فرما کر بنوایا تھا کہ میں اس پر بیٹھا کروں گا، اور حضرت معاویہؓ بھی بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے۔ (اوجز ص ۳۳۹/۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام شافعیؒ نے دونوں خطبوں کو بھی واجب قرار دیا ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ مالک احمد، اسحٰق واوزاعی کے نزدیک صرف ایک خطبہ واجب ہے۔ (اور دو سنت ہیں) امام شافعیؒ نے یہ بھی کہا کہ دونوں خطاب کے درمیان بیٹھنا بھی واجب ہے، جمہور کے نزدیک وہ بھی سنت ہے واجب نہیں۔

امام شافعیؒ نے کہا کہ جتنے امور حضور علیہ السلام اور خلفائے راشدین سے ماثور ہوئے، وہ سب واجب ہیں، حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جتنے امور بھی ان حضرات سے ثابت ہوں وہ سب ہی وجوب کا درجہ حاصل کر لیں گے، اور خود حضور علیہ السلام سے تو قصۂ افک میں بیٹھ کر خطبہ دینا بھی ماثور ہے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے۔ (انور المحمود ۳۶۵/۱)

حضور علیہ السلام سے تو خطبہ کے وقت ہاتھ میں عصا لینا بھی ثابت ہے، اور رفعِ یدین بھی حدیثِ بخاری سے دعا کے لئے ثابت ہے، جبکہ شافعیہ بھی اس کو ضروری نہیں کہتے، بلکہ علامہ نووی نے لکھا کہ سنت عدمِ رفع ہے خطبہ میں اور یہی قول امام مالک اور ہمارے اصحاب وغیرہم کا بھی ہے۔ (ص ۲۸۷/۱)۔

بَابُ اِسۡتِقۡبَالِ النَّاسِ الۡاِمَامَ اِذَا خَطَبَ
وَاسۡتَقۡبَلَ ابۡنُ عُمَرَ وَاَنَسُ نِ الۡاِمَامَ

(لوگوں کا امام کی طرف منہ کر کے بیٹھنے کا بیان، جب وہ خطبہ پڑھے، اور ابن عمرؓ اور انسؓ امام کی طرف متوجہ ہوتے تھے)

۸۷۲. حَدَّثَنَا مُعَاذُ بۡنُ فُضَالَةَ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنۡ يَحۡيٰى عَنۡ هِلَالِ بۡنِ اَبِيۡ مَيۡمُوۡنَةَ قَالَ حَدَّثَنَا عَطَآءُ بۡنُ يَسَارٍ اَنَّهٗ سَمِعَ اَبَا سَعِيۡدِ نِ الۡخُدۡرِيَّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ جَلَسَ ذَاتَ يَوۡمٍ عَلَى الۡمِنۡبَرِ وَجَلَسۡنَا حَوۡلَهٗ.

بَابُ مَنْ قَالَ فِي الْخُطْبَةِ بَعْدَ الثَّنَآءِ اَمَّا بَعْدُ رَوَاهُ عِكْرِمَةُ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(اس شخص کا بیان جس نے ثنا کے بعد خطبہ میں اما بعد کہا اس کو عکرمہ نے ابن عباسؓ سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے رویت کیا)

۸۷۳. وَقَالَ مَحْمُودٌ حَدَّثَنَا اُسَامَةُ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ قَالَ اَخْبَرَتْنِيْ فَاطِمَةُ بِنْتُ الْمُنْذِرِ عَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ اَبِيْ بَكْرٍ قَالَتْ دَخَلْتُ عَلٰى عَآئِشَةَ وَالنَّاسُ يُصَلُّوْنَ قُلْتُ مَاشَانُ النَّاسِ فَاَشَارَتْ بِرَأْسِهَا اِلَى السَّمَآءِ فَقُلْتُ اٰيَةٌ فَاَشَارَتْ بِرَأْسِهَا اَيْ نَعَمْ قَالَتْ فَاَطَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جِدًّا حَتّٰى تَجَلَّانِيَ الْغَشْيُ وَاِلٰى جَنْبِيْ قِرْبَةٌ فِيْهَا مَآءٌ فَفَتَحْتُهَا فَجَعَلْتُ اَصُبُّ مِنْهَا عَلٰى رَأْسِيْ فَانْصَرَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ تَجَلَّتِ الشَّمْسُ فَخَطَبَ النَّاسَ فَحَمِدَ اللّٰهَ بِمَا هُوَ اَهْلُهٗ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ قَالَتْ وَلَغَطَ نِسْوَةٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ فَانْكَفَأْتُ اِلَيْهِنَّ لِاُسَكِّتَهُنَّ فَقُلْتُ لِعَآئِشَةَ مَاقَالَ قَالَتْ قَالَ مَامِنْ شَيْءٍ لَّمْ اَكُنْ اُرِيْتُهٗ اِلَّا وَقَدْ رَاَيْتُهٗ فِيْ مَقَامِيْ هٰذَا حَتَّى الْجَنَّةَ وَالنَّارَ وَاَنَّهٗ قَدْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّكُمْ تُفْتَنُوْنَ فِي الْقُبُوْرِ مِثْلَ اَوْ قَرِيْبًا مِّنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ يُؤْتٰى اَحَدُكُمْ فَيُقَالُ لَهٗ مَاعِلْمُكَ بِهٰذَا الرَّجُلِ فَاَمَّا الْمُؤْمِنُ اَوْقَالَ الْمُوْقِنُ شَكَّ هِشَامٌ فَيَقُوْلُ هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ مُحَمَّدٌ جَآءَ نَا بِالْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى فَاٰمَنَّا فَاَجَبْنَا وَاتَّبَعْنَا وَصَدَّقْنَا فَيُقَالُ لَهٗ نَمْ صَالِحًا قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ اِنْ كُنْتَ لَمُؤْمِنًا بِهٖ وَاَمَّا الْمُنَافِقُ اَوِ الْمُرْتَابُ شَكَّ هِشَامٌ فَيُقَالُ لَهٗ مَا عِلْمُكَ بِهٰذَا الرَّجُلِ فَيَقُوْلُ لَا اَدْرِيْ سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ شَيْئًا فَقُلْتُ قَالَ هِشَامٌ فَلَقَدْ قَالَتْ لِيْ فَاطِمَةُ فَاَوْعَيْتُهٗ غَيْرَ اَنَّهَا ذَكَرَتْ مَا يُغَلَّظُ عَلَيْهِ.

ترجمہ ۸۷۳۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ روایت کرتی ہیں کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس آئی، اور لوگ نماز پڑھ رہے تھے، میں نے کہا، لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟ تو انہوں نے آسمان کی طرف اپنے سر سے اشارہ کیا، میں نے کہا کوئی نشانی ہے؟ تو انہوں نے اپنے سر سے اشارہ کیا، یعنی ہاں، پھر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز بہت طویل پڑھی، یہاں تک کہ مجھے غشی آنے لگی، میرے پہلو میں پانی کی ایک مشک تھی، اسے میں نے کھولا اور اس سے پانی لے کر اپنے سر پر ڈالنے لگی۔ اور رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے اس حال میں کہ آفتاب روشن ہو چکا تھا، پھر خطبہ دیا، اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی جس کا وہ مستحق ہے، پھر اس کے بعد اما بعد فرمایا، انصار کی کچھ عورتیں باتیں کرنے لگیں، تو میں انہیں خاموش کرنے کے لئے ان کی طرف متوجہ ہوئی اسماء کہتی ہیں کہ میں نے عائشہؓ سے کہا کہ رسول اللہ نے کیا فرمایا ہے؟ عائشہؓ نے کہا، کہ آپ نے فرمایا، نہیں ہے کوئی چیز ایسی جو مجھے نہ دکھائی گئی ہو، مگر میں نے اسے آج اپنی اسی جگہ پر دیکھ لیا۔ یہاں تک کہ جنت اور دوزخ کو بھی (دیکھ لیا)۔ اور میری طرف وحی کی گئی کہ قبر میں تمہیں فتنۂ مسیح دجال کے قریب قریب یا اس کے مثل سے آزمایا جائے گا، تمہارے سامنے ایک شخص کو لایا جائے گا اور اس کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ اس شخص کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟ جو شخص مومن یا موقن، ایمان و یقین والا ہوگا وہ کہے گا کہ یہ اللہ کے رسول محمد ﷺ ہیں ہمارے پاس ہدایت کی باتیں اور کھلی دلیلیں لے کر آئے، تو ہم ایمان لائے، قبول کیا، انکی پیروی اور تصدیق کی، پھر اس شخص سے کہا جائے گا کہ اے مرد صالح سوجا ہم تو جانتے تھے کہ تو مومن تھا، اور جو لوگ منافق یا شک کرنے والے ہوں گے اور پوچھا جائے گا کہ تم اس شخص کے متعلق کیا جانتے ہو؟ تو وہ کہے گا کہ میں کچھ نہیں جانتا، لوگوں کو کہتے ہوئے میں نے سنا تھا، وہی میں نے کہہ دیا، ہشام کا بیان ہے کہ فاطمہ بنت منذر نے جو کہا، میں نے اسے یاد رکھا بجز اس کے کہ منافقوں پر کی جانے والی سختیاں جو انہوں نے بیان کی تھیں۔ وہ یاد نہ رہیں۔

۸۷۴. حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مَعْمَرٍ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُو عَاصِمٍ عَنْ جَرِيْرِ بْنِ حَازِمٍ قَالَ الْحَسَنَ يَقُوْلُ حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ تَغْلِبَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُتِيَ بِمَالٍ اَوْسَبْيٍ فَقَسَمَهُ فَاَعْطٰى رِجَالاً وَّتَرَكَ رِجَالاً فَبَلَغَهُ اَنَّ الَّذِيْنَ تَرَكَ عَتَبُوْا فَحَمِدَ اللّٰهَ ثُمَّ اَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فَوَاللّٰهِ اِنِّيْ اُعْطِى الرَّجُلَ وَاَدَعُ الرَّجُلَ الَّذِيْ اَدَعُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنَ الَّذِيْ اُعْطِيْ وَلٰكِنْ اُعْطِيْ اَقْوَامًا لِمَا اَرٰى فِيْ قُلُوْبِهِمْ مِّنَ الْجَزَعِ وَالْهَلَعِ وَاَكِلُ اَقْوَامًا اِلٰى مَا جَعَلَ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مِّنَ الْغِنٰى وَالْخَيْرِ فِيْهِمْ عَمْرُو بْنُ تَغْلِبَ فَوَاللّٰهِ مَا اُحِبُّ اَنَّ لِيْ بِكَلِمَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُمْرَ النَّعَمِ.

۸۷۵. حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عُرْوَةُ اَنَّ عَآئِشَةَ اَخْبَرَتْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ لَيْلَةً مِّنْ جَوْفِ اللَّيْلِ فَصَلّٰى فِي الْمَسْجِدِ فَصَلّٰى رِجَالٌ بِصَلٰوتِهِ فَاَصْبَحَ النَّاسُ فَتَحَدَّثُوْا فَاجْتَمَعَ اَكْثَرُ مِنْهُمْ فَصَلُّوْا مَعَهُ فَاَصْبَحَ النَّاسُ فَتَحَدَّثُوْا فَكَثُرَ اَهْلُ الْمَسْجِدِ مِنَ اللَّيْلَةِ الثَّالِثَةِ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلُّوْا بِصَلٰوتِهِ فَلَمَّا كَانَتِ اللَّيْلَةُ الرَّابِعَةُ عَجَزَ الْمَسْجِدُ عَنْ اَهْلِهِ حَتّٰى خَرَجَ بِصَلٰوةِ الصُّبْحِ فَلَمَّا قَضَى الْفَجْرَ اَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَتَشَهَّدَ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّهُ لَمْ يَخْفَ عَلَيَّ مَكَانُكُمْ لٰكِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تُفْرَضَ عَلَيْكُمْ فَتَعْجِزُوْا عَنْهَا تَابَعَهُ يُوْنُسُ.

ترجمہ۸۷۴۔عمرو بن تغلبؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ مال یا قیدی لائے گئے تو آپ نے کچھ لوگوں کو دیا اور کچھ لوگوں کو نہیں دیا، آپ کو خبر ملی کہ جن لوگوں کو نہیں دیا ہے وہ ناراض ہیں تو آپ نے حق تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی۔پھر فرمایا امابعد! بخدا میں کسی کو دیتا ہوں اور کسی کو نہیں دیتا ہوں۔اور جسے میں نہیں دیتا ہوں، وہ میرے نزدیک اس سے زیادہ محبوب ہے جسے میں دیتا ہوں، لیکن میں اُن لوگوں کو دیتا ہوں جن کے دلوں میں بے چینی اور گھبراہٹ دیکھتا ہوں۔اور جنہیں میں نہیں دیتا ہوں، ان لوگوں کو میں اس غنیٰ اور بھلائی کے حوالے کر دیتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رکھی ہے اور ان ہی میں عمرو بن تغلب بھی ہے۔(عمرو بن تغلب نے کہا) واللہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے عوض مجھے سرخ اونٹ بھی محبوب نہیں ہیں۔

ترجمہ۸۷۵۔حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ آدھی رات کو نکلے، اور مسجد میں نماز پڑھی تو لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی، لوگوں نے اسے صبح کو بیان کیا۔تو (دوسرے روز) اس سے زیادہ آدمی جمع ہو گئے، اور آپ کے ساتھ نماز پڑھی، صبح کو لوگوں نے ایک دوسرے سے بیان کی، تو تیسری رات میں اس سے بھی زیادہ لوگ جمع ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ باہر نکلے اور لوگوں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی، جب چوتھی رات آئی تو مسجد میں جگہ نہ رہی۔یہاں تک کہ فجر کی نماز کے لئے باہر نکلے۔جب فجر کی نماز پڑھ چکے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، پھر تشہد پڑھ کر فرمایا، امابعد! تم لوگوں کی یہاں موجودگی مجھ سے مخفی نہیں تھی، لیکن مجھے خوف ہوا کہ کہیں تم پر فرض نہ ہو جائے اور تم اسے ادا نہ کر سکو۔یونس نے اس کے متابع حدیث روایت کی ہے۔

۸۷۶. حَدَّثَنَا اَبُو الْيَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْ حُمَيْدِ السَّاعِدِيِّ اَنَّهُ اَخْبَرَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ عَشِيَّةً بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَتَشَهَّدَ وَاَثْنٰى عَلَى اللّٰهِ بِمَا هُوَ اَهْلُهُ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ تَابَعَهُ اَبُوْ مُعَاوِيَةَ وَاَبُوْ اُسَامَةَ عَنْ هِشَامٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ اَبِيْ حُمَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَمَّا بَعْدُ وَتَابَعَهُ الْعَدَنِيُّ عَنْ سُفْيَانَ فِيْ اَمَّا بَعْدُ.

۸۷۷. حَدَّثَنَا اَبُو الْيَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ حَدَّثَنِيْ عَلِيُّ ابْنُ الْحُسَيْنِ عَنِ الْمِسْوَرِبْنِ مَخْرَمَةَ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّے اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعْتُهُ حِيْنَ تَشَهَّدَ يَقُوْلُ اَمَّا بَعْدُ تَابَعَهُ الزُّبَيْدِيُّ عَنِ الزُّهْرِيِّ.

۸۷۸. حَدَّثَنَا اِسْمٰعِيْلُ بْنُ اَبَانَ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ الْغَسِيْلِ قَالَ حَدَّثَنَا عِكْرِمَةُ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ صَعِدَ النَّبِيُّ صَلَّے اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمِنْبَرَ وَكَانَ اٰخِرَ مَجْلِسٍ جَلَسَهُ مُتَعَطِّفًا مِلْحَفَةً عَلٰى مَنْكِبَيْهِ وَقَدْ عَصَبَ رَاْسَهُ بِعِصَابَةٍ دَسِمَةٍ فَحَمِدَ اللهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِلَيَّ فَثَابُوْٓا اِلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ هٰذَا الْحَيَّ مِنَ الْاَنْصَارِ يَقِلُّوْنَ وَيَكْثُرُ النَّاسُ فَمَنْ وَّلِيَ شَيْئًا مِّنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ فَاسْتَطَاعَ اَنْ يَّضُرَّفِيْهِ اَحَدًا اَوْيَنْفَعَ فِيْهِ اَحَدًا فَلْيَقْبَلْ مِنْ مُّحْسِنِهِمْ وَيَتَجَاوَزْعَنْ مُّسِيْئِهِمْ.

ترجمہ ۸۷۶۔ حضرت ابوحمید ساعدی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات نماز عشاء کے بعد کھڑے ہوئے اور تشہد پڑھا اور اللہ کی تعریف بیان کی، جس کا وہ مستحق ہے، پھر فرمایا امابعد!

ترجمہ ۸۷۷۔ حضرت مسور بن مخرمہ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے، جب وہ تشہد پڑھ چکے تو ان کو امابعد کہتے ہوئے سنا۔

ترجمہ ۸۷۸۔ حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے اور یہ آپ کی آخری مجلس تھی۔ آپ بیٹھے اس حال میں کہ اپنے دونوں مونڈھوں پر چادر لپیٹے ہوئے تھے، اور اپنے سر پر پٹی باندھے ہوئے تھے، اللہ کی حمد وثناء بیان کی، پھر فرمایا، کہ اے لوگو! میرے پاس آؤ۔ تو لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوئے، پھر فرمایا امابعد! یہ انصار کی جماعت کم ہوتی جائے گی اور دوسرے لوگ زیادہ ہو جائیں گے۔ اس لئے امتِ محمدیہ میں سے جو شخص حاکم بنایا جائے اور وہ کسی کو نقصان پہنچانے یا نفع پہنچانے پر قادر ہو، تو انصاف کے نیکو کاروں کی نیکی (بھلائی) کو قبول کرے اور بروں کی برائی سے درگذر کرے۔

تشریح:۔ امام بخاریؒ نے چھ احادیث الباب اس مقصد سے ذکر کی ہیں کہ ثناء کے بعد امابعد کا لفظ ادا کر کے کوئی وعظ یا نصیحت کرنا اتباع سنت ہے جیسے کہ حضور علیہ السلام نے ان سب صورتوں میں اس کو عادۃً اختیار فرمایا ہے چونکہ امام بخاری کو ان کی شرط کے موافق کوئی خاص حدیث خطبۂ جمعہ کی نہیں ملی، اس لئے دوسری وہ احادیث نقل کر دیں، جن سے مقصد مذکور حاصل ہوا اور وہ جمعہ کے لئے بھی قابلِ عمل ہے۔ (فتح وعمدہ)

لامع میں مفصل تحقیق انکم نفتنون فی القبور کے متعلق درج کی گئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام شارحین حدیث نے فتنہ سے مراد اختبار و آزمائش لی ہے، حالانکہ موت کے بعد عالمِ آخرت نہ دار التکلیف ہے نہ عالمِ ابتلا ہے، البتہ قبور میں فتنہ وعذاب پیش آئے گا، حافظؒ نے کتاب الجنائز ص ۳/ ۱۵۷ میں بہتر وضاحت کی کہ قبر میں یہ امتحان و اختیار دنیا کی طرح تکلیف کے لئے نہ ہوگا، بلکہ اتمامِ حجت کے لئے ہوگا، پھر یہ کہ ایسا فتنہ صرف اسی امتِ محمدیہ کے لئے ہوگا یا سابقہ امتوں کے لئے بھی ہوگا؟ یہ بات بھی زیر بحث آئی ہے۔

رائے حکیم ترمذی

حکیم ترمذی نے کہا کہ اسی امت کے لئے ہوگا، پہلی امتیں اگر رسولوں کی اطاعت نہ کرتی تھیں تو ان میں دنیا ہی میں عذاب آ جاتا تھا، حضور علیہ السلام کی رحمۃ للعالمینی کے صدقہ میں اس امت کے لئے یہ ہوا کہ جس نے بھی اسلام ظاہر کیا، خواہ دل میں کفر اور غلط عقیدہ ہی تھا وہ عذابِ دنیوی سے بچ گیا، لیکن مرنے کے بعد قبر میں ان کو فتنہ میں مبتلا کیا گیا کہ دو فرشتے آ کر اس سے سوال کریں گے کہ تیرا دین کیا ہے اور اس شخص (نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تو کیا کہتا ہے؟ تا کہ اس سوال کے ذریعہ ان کے دل کی بات معلوم ہو اور اللہ خبیث کو

طیب سے الگ کردیں، مومنون کی تثبیت کریں اور غیر مومنوں کو عذابِ ضلال میں ڈال دیں جو حافظ نے لکھا کہ اس رائے کی تائید حدیثِ مسلم ومسندِ احمد سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ اس امت کو قبور میں مبتلائے فتنہ کیا جائے گا اور دو فرشتوں کے سوال ما تقول فی هذا الرجل محمد سے بھی یہی ثابت ہوا، مسندِ احمد میں یہ حدیث بھی ہے کہ فتنۂ قبر کی صورت یہ ہوگی کہ میرے بارے میں تم فتنہ میں مبتلا ہو گے اور میرے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا۔

رائے ابن القیم

حافظ نے لکھا کہ دوسری رائے کو ابن القیم نے اختیار کیا ہے اور کہا کہ ہر نبی کی امت کو اسی طرح سوال واتمامِ حجت کے بعد عذاب میں مبتلا کیا جائے گا، کیونکہ احادیث میں ہے کہ پہلی امتوں سے سوال کرنے کی نفی نہیں آئی ہے، اور یہ ایسا ہے جیسے قیامِ قیامت کے بعد بھی سب ہی کفار کو سوال واتمامِ حجت کے بعد عذابِ دائمی میں مبتلا کیا جائے گا۔

تقلید عقائد میں

حافظ نے اس موقع پر یہ بھی لکھا کہ حدیثِ سوال وافتتان فی القبر سے ثابت ہوا کہ باب عقائد میں تقلید مذموم ہے، کیونکہ جو لوگ یہ کہیں گے کہ ہم نے جیسا لوگوں کو کہتے سنا وہی ہم نے بھی کہہ دیا، ہمیں حقیقت یا صحیح واقعہ کا علم نہ تھا، ان کی بات رد ہو جائے گی۔
(فتح ص۳/۱۵۷ باب ما جاء فی عذاب القبر)

اس سے معلوم ہوا کہ سلف سے تقلید فی الفروع ثابت اور حق سمجھی جاتی تھی، اسی لئے حافظ نے تقلید فی العقائد پر نکیر کی۔ جبکہ ہمارے زمانہ میں معاملہ برعکس ہو گیا ہے کہ سلفی فرقہ تقلید فی الفروع کو تو شرک وبدعت اور مذموم قرار دیتا ہے اور تقلید فی العقائد میں خود مبتلا ہے اور اس کو حق سمجھا ہے ہم نے پہلے بھی واضح کیا تھا کہ اہلِ حق میں سے ائمہ اربعہ اصول وعقائد میں متفق تھے، کوئی اختلاف ان کے یہاں نہ تھا، متاخرین حنابلہ نے عقائد میں اختلاف پیدا کیا اور اسی لئے اکابرِ امت نے ان کا رد کیا اور خاص طور سے علامہ محدث ابن الجوزی حنبلی م۵۹۷ھ نے مستقل رسالہ "دفع شبهة التشبيه والرد على المجسمة ممن ينتحل مذهب الامام احمد" لکھا۔ اور امام تقی الدین حصنی م۸۲۹ھ نے دفع شبہ من تشبہ وتمرد ونسب ذلک الی الامام احمد'' لکھی، اور علامہ تقی الدین السبکی الکبیر م۷۵۶ھ نے السيف الصقيل تالیف کرکے ابن القیم کے عقائد مذکورہ قصیدہ نونیہ کا ردِ وافر کیا۔ یہ سب رسائل مع حواشی وتعلقات کے شائع شدہ ہیں اور ہم نے کچھ اشارات اور نشان دہی اس بارے میں پہلے بھی کی ہے، چونکہ عقائدِ مبتدعہ کا فتنہ بھی اس دور کا بڑا فتنہ ہے، اس لئے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور عقائد صحیحہ وباطلہ کی مکمل ومدلل بحث بخاری کے آخر میں آئے گی۔ ان شاء اللہ العزیز۔

متاخرین حنابلہ کے نظریات وعقائد سے متاثر ہونے والے

بنظرِ افادہ یہاں ہم چند اہم اشخاص کے نام ایک جگہ کئے دیتے ہیں تا کہ اہلِ نظر وتحقیق مطلع رہیں اور اس سے غفلت مضر نہ ہو۔ علامہ ابن الجوزی حنبلیؒ نے دفع الشبہ ص۵ میں لکھا کہ میں نے اپنے اصحاب میں سے مسلکِ حنابلہ متقدمین سے انحراف کرنے والے صاحبِ تالیف افراد تین کو پایا (۱) ابوعبداللہ بن حامد م۴۰۳ھ (۲) قاضی ابویعلی محمد بن الحسین حنبلی م۴۵۸ھ (۳) ابوالحسن علی بن عبید اللہ بن نصر الزاغونی حنبلی م۵۲۷ھ جنہوں نے کتابیں لکھ کر اصل مذہبِ حنبلی کو بٹہ لگایا، وہ عوام وجاہلوں کے مرتبہ پر اتر آئے۔ اور انہوں نے صفاتِ باری کو مقتضائے حس پر محمول کر دیا، مثلاً خلق الله آدم على صورته کی شرح میں اللہ تعالیٰ کے لئے صورت وجهه زائد على الذات کو ثابت

کیا اور آنکھیں، ہاتھ، انگلیاں وغیرہ سب ہی مان لیں۔ غرض ان کے کلام سے بہ صراحت تشبیہ نکلتی ہے، پھر بھی وہ دعوے کرتے ہیں کہ ہم اہل السنت ہیں تو پھر ان ہی تینوں کا اتباع علامہ ابن تیمیہ اور ابن القیم نے بھی کیا، اور ان کے بعد ان دونوں کے نظریات سے متاثر ہونے والوں میں حسب ذیل ہوئے۔ محمد بن اسماعیل صنعانی، صاحبِ سبل السلام، علامہ شوکانی، شیخ نذیر حسین دہلوی، شیخ عبدہ، شیخ رشید رضا مصری جن کے بارے میں سلفی حضرات کو بھی عتراف ہے کہ وہ بہت سے مسائل میں جمہور امت سے ہٹ گئے تھے، ہمارے زمانہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی ان ہی سب کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں ان کے علاوہ ہمارے اکابر میں سے بھی حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ ان متاثرین کی صف میں شامل ہوئے ہیں (ولو بقدر قلیل) واللہ غالب علی امرہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔ واللہ المستعان۔

حافظ کا مزید افادہ

حدیث الباب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میت کو قبر میں سوال و جواب کے لئے زندہ کیا جائے گا اور اس سے ان لوگوں کا رد ہو گیا جو آیت قالوا ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین کی وجہ سے قبر کے احیاء مذکور کا انکار کرتے ہیں کیونکہ بظاہر اس سے تین بار حیات و موت معلوم ہوتی ہے جو خلافِ نص آیت مذکور ہے، جواب یہ ہے کہ یہ قبر کی حیات مستقل و مستقر دنیوی واخروی کی طرح نہ ہوگی، جس میں بدن و روح کا اتصال، تصرف، تدبیر وغیرہ سب امور ہوتے ہیں، بلکہ قبر میں تو عارضی چند لمحات کا اعادۂ روح صرف سوال و جواب کے لئے ہوگا، لہٰذا یہ عارضی اعادہ جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، نصِ قرآنی مذکور کے خلاف نہ ہوگا۔ (فتح ص ۲/ ۱۵۷)۔

بَابُ الْقَعْدَةِ بَيْنَ الْخُطْبَتَيْنِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ

(جمعہ کے دن دو خطبوں کے درمیان بیٹھنے کا بیان)

۸۷۹۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا بِشْرُبْنُ الْمُفَضَّلِ قَالَ حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ خُطْبَتَيْنِ يَقْعُدُ بَيْنَهُمَا۔

ترجمہ ۸۷۰۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم دو خطبے پڑھتے تھے، جن کے درمیان بیٹھتے تھے۔

تشریح:۔ دو خطبوں کے درمیان بیٹھنا امام شافعیؒ کے نزدیک واجب ہے، امام ابوحنیفہ و مالک کے یہاں سنت ہے، ابن عبدالبرؒ نے کہا کہ "...... امام مالک، عراقی حضرات اور سارے فقہاء و امصار بجز امام شافعیؒ کے سنیت ہی کے قائل ہیں، اگر اس کو ترک کردے تو کوئی حرج نہیں"، بعض شافعیہ نے کہا کہ مقصود فصل ہے، خواہ وہ بغیر جلوس کے ہی حاصل ہو جائے، امام طحاوی نے لکھا کہ وجوب جلوس بین الخطبتین کا قائل امام شافعی کے سوا کوئی نہیں ہے، اور قاضی عیاض نے جو ایک روایت امام مالکؒ سے وجوب کی نقل کی ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔

شرح الترمذی میں ہے کہ صحتِ جمعہ کے لئے دو خطبوں کی شرط امام شافعی کے نزدیک ہے اور مشہور روایت امام احمد سے بھی ہے، جمہور کے نزدیک ایک خطبہ کافی ہے، یہی قول امام ابوحنیفہ، مالک، اوزاعی، اسحاق بن راہویہ، ابوثور و ابن المنذر کا ہے اور ایک روایت امام احمد سے ایسی ہے (عمدہ ص ۳/۳۱۰)۔

حافظ نے لکھا، علامہ زین بن المنیر نے کہا کہ امام بخاری نے ترجمہ سے وجوب وغیرہ کا حکم نہیں کیا، کیونکہ اس کا مستند فعل نبوی ہے جس کے لئے عموم نہیں ہے۔ صاحب المغنی نے لکھا کہ اس کو اکثر اہل علم نے واجب نہیں کہا۔ (فتح ص ۲/ ۲۸۵)۔

بَابُ الْاِسْتِمَاعِ اِلَى الْخُطْبَةِ

(خطبہ کی طرف کان لگانے کا بیان)

۸۸۰۔ حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِیْ ذِئْبٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ اَبِیْ عَبْدِاللّٰهِ الْاَغَرِّ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَاكَانَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ وَقَفَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ عَلٰى بَابِ الْمَسْجِدِ يَكْتُبُوْنَ الْاَوَّلَ فَالْاَوَّلَ وَمَثَلُ الْمُهَجِّرِ كَمَثَلِ الَّذِيْ يُهْدِيْ بَدَنَةً ثُمَّ كَا الَّذِيْ يُهْدِيْ بَقَرَةً ثُمَّ كَبْشًا ثُمَّ دَجَاجَةً ثُمَّ بَيْضَةً فَاِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ طَوَوْا صُحُفَهُمْ وَيَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ.

ترجمہ ۸۸۰۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جمعہ کا دن آتا ہے تو فرشتے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور سب سے پہلے اور اس کے بعد آنے والوں کے نام لکھتے ہیں اور سویرے جانے والا اس شخص کی طرح ہے جو اونٹ کی قربانی کرے، پھر اس شخص کی طرح جو گائے کی قربانی کرے، اس کے بعد پھر مرغی پھر انڈا صدقہ کرنے والے کی طرح ہے۔ جب امام خطبہ کے لئے آجاتا ہے تو وہ اپنے دفتر لپیٹ لیتے ہیں، اور خطبہ کی طرف کان لگاتے ہیں۔

تشریح:۔ علامہ عینی نے لکھا: امام کے نمازِ جمعہ وخطبہ کے لئے نکلنے پر ہی خاموش ہو کر بیٹھنا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب ہو جاتا ہے، پھر نہ کلام جائز ہے نہ نماز۔ کیونکہ یہاں بخاری میں بھی خروجِ امام پر ہی مدار رکھا گیا ہے لہٰذا حافظ ابن حجر کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ حنیفہ کے جس حدیث سے استدلال کیا وہ ضعیف ہے۔ کیونکہ اگر کوئی حدیث ضعیف بھی ہے تو حدیث الباب تو قوی ہے، دوسرے حضرات جن کے ساتھ امام ابو یوسف وامام محمد بھی ہیں، کہتے ہیں کہ ممانعتِ کلام خروجِ امام سے نہیں ہو جاتی بلکہ خطبہ شروع ہونے سے ہوتی ہے۔ لہٰذا خطبہ شروع ہونے سے پہلے تک کلام جائز ہے (عمدہ ص ۳/۳۱۱)۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حافظ نے جو حرمتِ کلام کی نسبت ابتداءِ خروجِ امام ہی سے سب حنفیہ کی طرف کر دی ہے وہ بھی غلط ہے، کیونکہ اس مسئلہ صاحبین امام شافعی وغیرہ کے ساتھ ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک خطبۂ جمعہ سننا واجب ہے اور امام کے لئے جائز ہے کہ وہ وقت ضرورت درمیان خطبہ کے بھی امر و نہی کر سکتا ہے، صرح بہ الشیخ ابن الہمامؒ اور قوم کے لئے کسی کو اشارہ سے منع کرنا جائز ہے، زبان سے جائز نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا کہ امام بخاری نے حدیث الباب سے یہ ثابت کیا کہ فرشتے خطبہ سنتے ہیں، لہٰذا لوگوں کو بطریق اولیٰ سننا چاہئے کہ وہ عبادات کے مکلف بھی ہیں۔ (شرح تراجم ص ۲۶)۔

بَابٌ اِذَا رَاَى الْاِمَامُ رَجُلًا جَآءَ وَهُوَ يَخْطُبُ اَمَرَهٗ اَنْ يُّصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ

(جب امام خطبہ پڑھ رہا ہو اور وہ کسی شخص کو آتا ہوا دیکھے تو وہ اس کو دو رکعت نماز پڑھنے کا حکم دے)

۸۸۱۔ حَدَّثَنَا اَبُو النُّعْمَانِ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ وَّالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ النَّاسَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَقَالَ اَصَلَّيْتَ يَا فُلَانُ فَقَالَ لَا قَالَ قُمْ فَارْكَعْ.

ترجمہ ۸۸۱۔ حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص آیا اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کو جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے، تو آپ نے فرمایا، اے فلاں تو نے نماز پڑھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں آپ نے فرمایا کہ، کھڑا ہو جا، اور نماز پڑھ لے۔

تشریح: جس وقت امام جمعہ کا خطبہ دے رہا ہو، لوگوں کے لئے کلام ونماز سب ممنوع ہیں اور اس وقت صرف خاموش بیٹھنا ضروری ہے، اگر امام سے دور ہوں کہ آواز نہ آرہی ہو، تب بھی کلام ونماز کی ممانعت ہی ہے، باقی امام بخاری جو یہاں خطبہ کے وقت دو رکعۃ تحیۃ المسجد پڑھنے کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا مکمل رد اور جواب قراءت فاتحہ خلف الامام کی بحث میں گزر چکا ہے۔ ملاحظہ ہو انوار الباری ص۱۴/۸۶ تا ص۹۳/۱۴)۔

اس سے پہلے کے باب استماع خطبہ میں بھی حدیث صحیح آ چکی ہے کہ امام کے خطبہ کے واسطے نکل آنے پر وقت خطبہ سننے کا ہے، نماز بوقت خطبہ کے مسئلہ میں چونکہ محدث ابن ابی شیبہ نے بھی اعتراض کیا ہے، اس لئے علامہ کوثریؒ نے بھی النکت الطریفہ ص۳۰۳/۳۰۱ میں محدثانہ محققانہ بحث کی ہے۔ وہ بھی قابلِ مراجعت ہے۔

افادۂ انور: حضرتؒ کا یہ استدلال بہت وزنی ہے کہ اگر حضور علیہ السلام کے عہدِ مبارک میں آپ کے قولی ارشاد پر ہی عمل جاری ہوتا اور یہ کہ جو بھی مسجد میں جس وقت بھی داخل ہو تو تحیۃ المسجد ضرور پڑھے خواہ امام خطبہ ہی دے رہا ہو تو بتلایا جائے کہ پھر حضور علیہ السلام سلیک کے مسجد میں آنے پر خطبہ سے کیوں رک گئے؟ جو حدیثِ دار قطنی سے معلوم ہوا، آپ کا خطبہ سے رک جانا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ خطبہ کے وقت کوئی نماز نہ پڑھی جائے اور اگر ہم مسلم شریف کی حدیث پر نظر کریں تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سلیک کے دخولِ مسجد کے وقت تک خطبہ شروع ہی نہیں کیا تھا، تو آپ کے اس فعل سے آپ کے اس قول کی شرح معلوم ہو جاتی ہے کہ والامام یخطب سے مراد کادانِ یخطب ہے کہ امام خطبہ شروع کرنے والا ہو۔ اور ایک حدیث مسلم میں **اذاجاء احدکم وقدخرج الامام** بھی ہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ ابھی امام نے خطبہ شروع نہیں کیا۔ اور بخاری میں والامام یخطب اوقدخرج وارد ہے۔ میرے نزدیک اس میں او تنویع کے لئے نہیں ہے بلکہ شکِ راوی کے لئے ہے، لہٰذا جب تک حضور علیہ السلام کے لفظِ مبارک کی صحیح تعیین نہ ہو، اس پر کسی مسئلہ کی بنیاد نہیں رکھ سکتے، دوسری بعض روایات میں بھی او ہے، لہٰذا وہ بھی شک کے لئے ہوگا۔ واللہ اعلم۔

احادیثِ بخاری، ابوداؤد و ترمذی پر نظر اور راویوں کے تصرفات وتفردات

حضرت شاہ صاحبؒ نے بخاری کی حدیثِ ولی کا جواب دار قطنی کے نقد وغیرہ سے پیش کیا تھا، جو پہلے ذکر ہوا ہے اور عجب نہیں کہ امام بخاری نے راوی کا تصرف وتفرد سمجھ کر ہی اس کی روایت کو اپنے لئے مقامِ استدلال میں پیش نہ کیا ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مولانا عبداللہ خاں صاحب نے مقدمۂ فتح الباری ص۳۵۳ سے حافظ کے دفاع کو رجالِ حدیث پر مفصل کلام کر کے نہایت کمزور ثابت کیا ہے اور بتایا کہ دار قطنی کا اعتراض امام بخاری کے خلاف کافی مضبوط ہے۔ مقدمۂ لامع میں روایات منتقدہ بخاری کے ذکر میں یہ ص۱۰/۱۵۶ کی حدیث ذکر نہیں کی گئی، اور لامع ص۲/۹۱ میں بھی اس حدیث الباب کا ذکر نہیں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کو بھی اس طرف تنبہ نہیں ہوا۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی محدثانہ شان ایسے مواقع میں اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی، اور بخاری کی اس حدیث پر جو کچھ کلام سند و متن دونوں کے لحاظ سے کیا گیا ہے، وہ محدثانہ نقطۂ نظر وتحقیق کی رو سے کسی طرح بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں، قطعِ نظر اس کے کہ اس سے حنفیہ وشافعیہ کے ایک اختلافی مسئلہ کے فیصلہ کا بھی تعلق ہے اور مولانا نے ثابت کیا کہ اگر حافظ کے دفاع والے ایک راوی کو بھی ساتھ لے لیں تب بھی روایت بخاری ص۱۵۶ میں چھ کے مقابلہ میں دو راویوں نے تفرد کیا ہے، جبکہ محدثین تین کے مقابلہ میں دو راویوں کے تفرد کو بھی وہم اور غلطی پر محمول کرتے ہیں۔ (بر رسالہ نماز بوقتِ خطبہ ص۷۶) مولانا نے صف ۸۷ میں مسلم شریف کی متابعتِ ناقصہ کا بھی جواب دیا ہے اس کی مراجعت کی جائے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا عبداللہ خاں صاحب نے رسالۂ مذکورہ لکھ کر اہلِ علم وتحقیق کے لئے محدثانہ بحث

ونظر کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کر دیا ہے۔ وفی ذلک فلیتنا فس المتنافسون۔ واللہ الموفق۔

حدیثِ ابی داؤد و ترمذی کے جوابات مولانا عبداللہ خان صاحب نے محدثانہ تحقیق کے ساتھ اپنے رسالہ میں پیش کئے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ روایتِ ابی داؤد میں **ثم اقبل علی الناس** الخ کی زیادتی محمد بن جعفر غندر کی طرف سے ہے، جس کو وہ اپنے شیخ سعید بن ابی عروبہ سے نقل کر رہے ہیں، لیکن غندر کے دو استاذ بھائی روح اور عبدالوہاب ان الفاظ کو سعید سے نقل نہیں کرتے۔ غندر کے اس تفرد کی طرف امام ابوداؤد نے اشارہ کیا اور امام احمد نے تینوں اشخاص کی سند بیان کر کے غندر کا تفرد ظاہر کیا ہے، آپ نے لکھا **قال محمد فی حدیثہ ثم اقبل علی الناس** (مسند احمد) مولانا نے ثابت کیا کہ غندر کا مرتبہ باقی دونوں سے نازل ہے، اور اس ذیل میں مولانا نے فتح الملہم ص ۲/ ۴۱۸ کی عبارت پر بھی نقد کیا ہے، وہ سب تحقیق پڑھنے کے لائق ہے۔

حدیث ترمذی کا جواب یہ ہے کہ امام ترمذی نے اس کا آخری جملہ سفیان بن عیینہ کے شاگرد ابوعمر العدنی سے روایت کیا ہے، اور دارمی نے اسی حدیث کو سفیان کے دوسرے شاگرد مروزی سے روایت کیا تو اس میں یہ جملہ نہیں ہے، اور حاکم و بیہقی نے بھی اسی حدیث کی روایت سفیان سے حمیدی کے واسطہ سے کی تو اس میں بھی یہ اضافہ نہیں ہے، جو مراد و مطلب کے لحاظ سے باب کی دوسری تمام روایات کے خلاف ہے، کیونکہ سنن کبریٰ نسائی صحیح ابن حبان، مسندِ احمد و طحاوی کی روایات میں یہ تفصیل موجود ہے کہ حضور علیہ السلام نے خطبہ کو روک کر سلیک کو تو نماز کا حکم کیا اور ان کی بدحالی کی طرف لوگوں کو متوجہ فرما کر چندہ کرایا۔ لوگ کپڑے وغیرہ دیتے رہے اور اس کام سے فراغت کے بعد حضور علیہ السلام نے پھر خطبہ کو جاری فرمایا، یہ بات کہ سلیک کی نماز کے وقت بھی حضور علیہ السلام خطبہ دیتے رہے، علاوہ عدنی کے کسی کی روایت میں نہیں ہے۔ لہٰذا ترمذی کی یہ روایت باقی روایات کے مقابلہ میں مرجوح ہے۔ مولانا نے یہاں بھی ثابت کیا کہ عدنی کا مرتبہ بابِ روایت میں دوسرے دونوں صاحبان سے نازل ہے۔

چونکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے دوسرے شائع شدہ امالی میں کسی تلمیذ نے بھی ان دونوں احادیث کے جواب میں محدثانہ تحقیق کی طرف توجہ نہیں کی، اس لئے ہم نے حضرت رحمہ اللہ کے ایک تلمیذ رشید کی تحقیق پیش کر دی ہے۔ بذل المجہو د اعلاء السنن لامع وغیرہ میں بھی محدثانہ کلام نہیں ہے، اور بذل میں دوسرے جوابات ہیں، رجال کی تحقیق نہیں ہے۔

انور المحمود ص ۱/ ۳۶۹ میں علامہ نوویؒ وغیرہ کے دلائل اور جوابات کا مختصراً احصاء قابلِ مطالعہ ہے،، مانعینِ صلوٰۃ عندالخطبہ کی تائید آثارِ صحابہ و تابعین سے بھی تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے۔

امام ترمذی نے احادیث نقل کر کے بعض اہلِ علم کا مسلک منع اور بعض کا اثبات بتایا ہے اور اسی کو اصح کہا ہے، علامہ نووی نے قاضی سے نقل کیا کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، لیث ثوری اور جمہور سلف صحابہ و تابعین کا مسلک یہی ہے کہ خطبہ کے وقت نماز نہ پڑھی جائے۔ اور اس وقت مسجد میں پہنچے تو خاموش بیٹھ کر خطبہ سنے۔ اور یہی حضرت عمر، حضرت عثمان و حضرت علیؓ سے بھی مروی ہے، اس کے برخلاف امام شافعی، امام احمد و اسحاق کہتے ہیں کہ خطبہ کی حالت میں بھی دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے اور بغیر اس کے بیٹھ جانا مکروہ ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ص ۱/ ۲۶۴)

بَابُ مَنْ جَآءَ وَالْاِمَامُ يَخْطُبُ صَلَّے رَكعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ

(کوئی شخص آئے اس حال میں کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہوتو دو رکعتیں ہلکی پڑھ لے)

۸۸۲۔ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيٰنُ عَنْ عَمْرٍو سَمِعَ جَابِرًا قَالَ دَخَلَ رَجُلٌ يَّوْمَ الْجُمُعَةِ وَالنَّبِيُّ صَلَّے اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ فَقَالَ اَصَلَّيْتَ قَالَ لَا قَالَ قُمْ فَصَلِّ رَكعَتَيْنِ.

ترجمہ ۸۸۲۔ حضرت جابرؓ نے کہا کہ ایک شخص جمعہ کے دن مسجد میں داخل ہوا، اس حال میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھ رہے تھے، تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے نماز پڑھی اس نے جواب دیا نہیں، تو آپ نے فرمایا کھڑا ہو اور دو رکعتیں پڑھ لے۔

تشریح:۔ یہاں امام بخاری نے اپنے مسلک کی مزید تائید کے لئے دوسرا باب قائم کیا کہ دو رکعت ہلکی ہی پڑھ لے حالانکہ ہر جگہ استدلال صرف حدیثِ سلیک ہی سے ہے، جس کا واقعہ خاص صورت وضرورت کے تحت پیش آیا تھا اور اس سے عام احکام منسوخ نہیں ہوتے، فقہِ حنفی کی ایک بہت بڑی خصوصیت وفضیلت یہ بھی ہے کہ اس کے قواعد واصول کلی اور عام ہیں اور اس میں عام احکامِ شرع کا اتباع ارجح واقدم رہتا ہے، دوسروں کے یہاں ایسا التزام نہیں ہے اس لئے وہ مستثنیٰ اور مخصوص حالات میں پیش آمدہ امور کو بھی قواعد کلیہ کی طرح چلاتے ہیں۔

فقہِ حنفی کی اسی عظیم منقبت کی وجہ سے حافظ ابن حجرؒ نے ارادہ کیا تھا کہ وہ حنفی مسلک کو اختیار کرلیں مگر ایک خواب کی وجہ سے وہ اس سے رک گئے تھے، اس واقعہ کو ہم پہلے حوالہ کے ساتھ نقل کر چکے ہیں۔

بَابُ رَفْعِ الْيَدَيْنِ فِي الْخُطْبَةِ

(خطبہ میں دونوں ہاتھ اٹھانے کا بیان)

۸۸۳۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّادُبْنُ زَيْدٍ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيْزِ عَنْ اَنَسٍ ح وَعَنْ يُّونُسَ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ اَنَسٍ قَالَ بَيْنَمَا النَّبِيُّ صَلَّے اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اِذْقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللهِ هَلَكَ الْكُرَاعُ هَلَكَ الشَّآءُ فَادْعُ اللهَ اَنْ يَّسْقِيَنَا فَمَدَّ يَدَيْهِ وَدَعَا.

ترجمہ ۸۸۳۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ اس اثنا میں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ پڑھ رہے تھے تو ایک شخص آیا، اور اس نے کہا کہ یارسول اللہ گھوڑے تباہ ہوگئے۔ بکریاں برباد ہوگئیں، اس لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے پانی برسائے تو آپ نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور دعا کی۔

تشریح:۔ خطبہ کی حالت میں دونوں ہاتھ اٹھانا کیسا ہے؟ امام بخاری نے ثابت کیا کہ خطبہ کے درمیان دعا کے لئے ہاتھ اٹھا سکتا ہے، جیسے حضور علیہ السلام نے عمل فرمایا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ دعا کیلئے عذر یا مرض وغیرہ کی حالت میں ایک انگلی بھی اٹھا سکتے ہیں، فقہ حنفی کی کتاب بحر سے یہ بات نکلتی ہے، پھر اگر دعا کے لئے ہو تو بطنِ اصبع سے اشارہ کرے، اور وعظ وغیرہ میں تفہیم کے موقع پر اختیار ہے، ظاہر یا باطن دونوں سے کرسکتا ہے۔

ہاتھ اٹھا کر مروجہ دعا کا ثبوت

قولہ فمدّ یدیہ ودعا حضرتؒ نے فرمایا کہ اس سے ہماری مروجہ دعا کی صورت ثابت ہوتی ہے، علامہ عینی نے مختلف قسم کی

دعاؤں میں ہاتھ اٹھانے کے مختلف طریقوں پر بحث کی، اور لکھا کہ بغیر نمازِ استسقاء کے بارش کی دعا کے قائل امام ابوحنیفہؒ ہیں اور انہوں نے اسی حدیث الباب سے استدلال کیا ہے۔ (عمدہ ص۳/۳۲۱)۔

بَابُ الْاِسْتِسْقَآءِ فِی الْخُطْبَةِ یَوْمَ الْجُمُعَةِ۔ (جمعہ کے دن خطبہ میں بارش کے لئے دعا کرنے کا بیان)

۸۸۴۔ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِیْمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ حَدَّثَنَا الْوَلِیْدُ بْنُ مُسْلِمٍ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ عَمْرٍو وَقَالَ حَدَّثَنِیْ اِسْحَاقُ بْنُ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ اَبِیْ طَلْحَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ اَصَابَتِ النَّاسَ سَنَةٌ عَلٰی عَهْدِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَبَیْنَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَخْطُبُ فِیْ یَوْمِ جُمُعَةٍ قَامَ اَعْرَابِیٌّ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ هَلَکَ الْمَالُ وَجَاعَ الْعِیَالُ فَادْعُ اللّٰہَ لَنَا فَرَفَعَ یَدَیْهِ وَمَا نَرٰی فِی السَّمَآءِ قَزَعَةً فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مَاوَضَعَهُمَا حَتّٰی ثَارَالسَّحَابُ اَمْثَالَ الْجِبَالِ ثُمَّ لَمْ یَنْزِلْ عَنْ مِنْبَرِهٖ حَتّٰی رَاَیْتُ الْمَطَرَ یَتَحَادَرُ عَلٰی لِحْیَتِهٖ فَمُطِرْنَا یَوْمَنَا ذٰلِکَ وَمِنَ الْغَدِ وَمِنْ بَعْدِ الْغَدِ وَالَّذِیْ یَلِیْهِ حَتَّی الْجُمُعَةِ الْاُخْرٰی فَقَامَ ذٰلِکَ الْاَعْرَابِیُّ اَوْقَالَ غَیْرُهٗ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ تَهَدَّمَ الْبِنَآءُ وَغَرِقَ الْمَالُ فَادْعُ اللّٰہَ لَنَا فَرَفَعَ یَدَیْهِ فَقَالَ اللّٰهُمَّ حَوَالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا فَمَا یُشِیْرُ بِیَدِهٖ اِلٰی نَاحِیَةٍ مِّنَ السَّحَابِ اِلَّا انْفَرَجَتْ وَصَارَتِ الْمَدِیْنَةُ مِثْلَ الْجَوْبَةِ وَسَالَ الْوَادِیْ قَنَاةُ شَهْرًا وَّلَمْ یَجِیْءُ اَحَدٌ مِّنْ نَّاحِیَةٍ اِلَّا حَدَّثَ بِالْجَوْدِ۔

ترجمہ ۸۸۴۔ حضرت انس مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک سال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لوگ قحط میں مبتلا ہوئے، جمعہ کے دن میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خطبہ پڑھنے کے دوران ایک اعرابی کھڑا ہوا اور کہا یارسول اللہ! مویشی تباہ ہو گئے، بچے بھوکے مر گئے، اس لئے آپ اللہ سے ہمارے حق میں دعا کیجئے، آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اس وقت آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہیں آتا تھا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ آپ نے ہاتھ اٹھائے بھی نہیں تھے، کہ پہاڑوں کی طرح بادل کے بڑے بڑے ٹکڑے اُمڈ آئے پھر آپ منبر سے ابھی اترے بھی نہیں تھے، کہ بارش کو آپ کی داڑھی پر ٹپکتے ہوئے دیکھا، اس دن اور اس کے بعد دوسرے دن اور تیسرے دن، یہاں تک کہ دوسرے جمعہ کے دن تک بارش ہوتی رہی، تو وہی اعرابی یا کوئی دوسرا شخص کھڑا ہوا۔ اور کہا کہ یارسول اللہ مکانات گر گئے، مویشی ڈوب گئے اس لئے آپ ہمارے لئے خدا سے دعا کیجئے، چنانچہ آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور فرمایا، اے میرے اللہ ہمارے اردگرد برسا، ہم پر نہ برسا، اور بدلی کو جس طرف اشارہ کرتے تھے، وہ بدلی ہٹ جاتی تھی، اور مدینہ ایک حوض کی طرح ہو گیا، اور وادیِ قناۃ ایک مہینہ تک بہتی رہی، اور جو شخص بھی کسی علاقے سے آتا، تو اس بارش کا حال بیان کرتا تھا۔

تشریح:۔ الکراع۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ اس کا اطلاق خاص طور سے گھوڑوں کیلئے ہے اور عام طور سے سب چوپاؤں پر بھی ہوتا ہے۔

الجود: حضرتؒ نے فرمایا کہ بڑے بڑے قطروں کی برش کو جود کہتے ہیں اور فتح الباری (ص۲/۳۳۷) میں ہے کہ ایک اعرابی نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضور قحط سالی کی وجہ سے ہم لوگ تباہ ہو گئے پھر یہ شعر پڑھا۔

ولیس لنا الا الیک فدارنا۔ و این فرار الناس الا الی الرسل۔ (کسی بھی پریشانی اور مصیبت کے وقت ہم لوگ آپ ہی کی طرف بھاگ کر آتے ہیں اور سب ہی لوگ اللہ کے رسولوں ہی سے پناہ ڈھونڈتے رہے ہیں۔)

یہ سن کر حضور علیہ السلام کھڑے ہو گئے اور چادرِ مبارک کھینچتے ہوئے منبر پر چڑھے اور بارش کے لئے دعا فرمائی، پھر جب آپ کی دعا سے فوراً ہی خوب بارش ہو گئی تو فرمایا اگر میرے چچا ابوطالب زندہ ہوتے تو ان کی آنکھوں کو کتنی ٹھنڈک اور دل کو سرور ملتا۔ جنہوں نے ''وابیض یستقی الغمام بو جهه ثمال الیتامی عضمة للار امل کہا تھا (اور یہ شعر ان کے بڑے قصیدۂ مدحیہ نبوی کا ایک جز و تھا جو حضور علیہ السلام

کے بچپن ونوعمری کے زمانہ میں کہا تھا) حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ کوئی ہے جو چچا جان کا وہ قصیدہ ہمیں سنائے؟ یہ سن کر حضرت علیؓ کھڑے ہوگئے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! شاید آپ " وابیض یستسقی الغمام" والے قصیدہ کے لئے فرما رہے ہیں، اس کے بعد حضرت علیؓ نے (جو ابوطالب کے صاحبزادے تھے) مکمل قصیدہ کا ایک ایک شعر برجستہ پڑھ کر حضور علیہ السلام اور حاضرین صحابۂ کرام کو سنایا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ واقعہ بیان کر کے فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے چونکہ اپنے بارے میں قصیدۂ مدحیہ استقائیہ کو پسند فرمایا تھا اس لئے میں نے بھی ایک قصیدہ مدحیہ فارسی زبان میں کہا ہے، جس میں اسی مضمون کو ادا کیا ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے۔

اے آنکہ ہمہ رحمتِ مہداۃ قدیری　　باراں صفت و بحرسمت ابر مطیری

غیر اللہ سے توسل وغیرہ

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام سے استغاثہ، توسل واستمداد جائز بلا ریب ہے، پھر یہ جو سلفی حضرات اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو کچھ مانگو خدا سے مانگو دوسروں سے استغاثہ وتوسل حرام اور شرک ہے، کیا اس قسم کا شرک انبیاء کی ساری ہی امتوں میں رائج نہیں رہا ہے؟ اگر یہ شرک تھا تو حضور علیہ السلام اور صحابہ نے اس پر نکیر کیوں نہیں کی؟ اور یہ کیا ہے کہ صحابۂ کرام قحط سالی وغیرہ مصیبتوں کے وقت حضور علیہ السلام کی خدمت میں دوڑ کر آئے، کیا وہ خود براہِ راست اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کر سکتے تھے؟ پھر یہ کہ ایک صحابی نے فراء الرسل کی بات حضور علیہ السلام اور صحابہ کی موجودگی میں کہی اور کسی نے اس کو شرک نہ سمجھا نہ اس پر نکیر کی، کیا آج کل کے سلفیوں کا ہم خیال صحابہ میں سے کوئی بھی نہ تھا؟ اور حدیثِ صحیح میں ایک نابینا کا حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بینائی کے لئے عرض ومعروض کرنا ثابت ہوا اور آپ کے توسل سے وہ بینا ہوا، کیا جس توحید پر عامل صحابۂ کرام تھے، ہم اس سے بھی زیادہ کے مکلّف ہیں؟ بہرحال! مسلک حق یہی ہے کہ صحتِ عقائد کے ساتھ استغاثہ توسل واستمداد سب درست ہیں اور یوں تو ہر چہ گیرد علتی علت شود کا اصول سب ہی کے نزدیک مسلم ہے، دوسرے یہ کہ اس بارے میں انبیاء واولیاء کی تفریق بھی صحیح نہیں، کیونکہ جیسے اولیاء اللہ غیر اللہ ہیں، انبیاء علیہم السلام بھی غیر اللہ ہیں۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ متاخرین حنابلہ کے یہاں تشبیہ، تجسیم، جہت باری، قدم عالم، وغیرہ وغیرہ ساری ہی بیماریاں موجود ہیں، اس پر وہ کس منہ سے اہلِ حق کو معمولی معمولی باتوں پر شرک وبدعت کے طعنے دیتے ہیں، پہلے وہ اپنی آنکھ کے شہتیر پر نظر کریں۔ پھر دوسروں کی آنکھوں کے بال پر نظر رکھیں۔

بَابُ الْاِنْصَاتِ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْاِمَامُ یَخْطُبُ وَاِذَا قَالَ لِصَاحِبِهٖ اَنْصِت فَقَدْ لَغَا وَقَالَ سَلْمَانُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّے اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُنْصِتُ اِذَا تَکَلَّمَ الْاِمَامُ.

(جمعہ کے دن امام کے خطبہ پڑھنے کے وقت خاموش رہنے کا بیان اور جب کسی شخص نے اپنے ساتھی سے کہا کہ خاموش رہ تو اس نے فعلِ لغو کیا، اور سلمانؓ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ خاموش رہے۔ جب امام خطبہ پڑھے)

۸۸۵. حَدَّثَنَا یَحْیَی بْنُ بُکَیْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّیْثُ عَنْ عُقَیْلٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ سَعِیْدُ بْنُ الْمُسَیَّبِ اَنَّ اَبَا هُرَیْرَةَ اَخْبَرَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِکَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ اَنْصِتْ وَالْاِمَامَ یَخْطُبُ فَقَدْ لَغَوْتَ.

ترجمہ ۸۸۵۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تو نے اپنے ساتھی سے جمعہ کے

دن کہا کہ خاموش رہ، اور امام خطبہ پڑھ رہا ہو، تو تو نے لغو فعل کیا۔

تشریح:۔ چند ابواب پہلے باب الاستماع لا چکے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا کہ دونوں میں تلازم نہیں ہے کیونکہ جو لوگ امام سے دور ہوتے ہیں اور ان کو خطبہ کی آواز نہیں پہنچتی، ان پر خطبہ کا استماع یا اس کی طرف کان لگانا واجب نہیں ہے، البتہ انصات یعنی خاموش بیٹھنا ان پر بھی واجب ہوتا ہے (شرح تراجم ص ۳۶)۔

علامہ عینی نے لکھا کہ استماع کے معنی کسی کی بات سننے کے لئے کان لگانا، اور انصات کے معنی خاموش رہنے کے ہیں خواہ آواز نہ سن سکے۔ اور اسی لئے امام بخاری دونوں کے لئے الگ الگ باب لائے ہیں۔

''فقد لغا'' پر ہمارے حضرت شاہؒ نے فرمایا کہ لغو کے معنی لایعنی کام میں مشغول ہونے کے ہیں، کیونکہ یہاں بھی روکنے کے لئے اشارہ کافی تھا، اس لئے زبانی روکنا ایک لغو اور لایعنی و بے ضرورت کام ہوا۔

بَابُ السَّاعَةِ الَّتِیْ فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ

(اس ساعت (مقبول) کا بیان، جو جمعہ کے دن ہے)

۸۸۶. حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَّالِکٍ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ذَکَرَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ فَقَالَ فِیْهِ سَاعَةٌ لَّا یُوَافِقُهَا عَبْدٌ مُّسْلِمٌ وَّهُوَ قَائِمٌ یُّصَلِّیْ یَسْاَلُ اللّٰہَ شَیْئًا اِلَّا اَعْطَاہُ اِیَّاہُ وَاَشَارَ بِیَدِہٖ یُقَلِّلُهَا.

ترجمہ ۸۸۶۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن کا تذکرہ کیا، تو آپ نے فرمایا، کہ اس دن میں ایک ایسی ساعت ہے کہ کوئی مسلمان بندہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے، اور اس ساعت میں جو چیز بھی اللہ سے مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے عطا کرتا ہے اور اپنے ہاتھ سے اس ساعت کے مختصر ہونے کی طرف اشارہ کیا۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک ساعتِ مقبولہ کا بعد العصر ہونا ہی صواب ہے اور میرے نزدیک ساعتِ موعودہ اس کے لئے ہے جو نماز کا پابند ہو نہ کہ صرف جمعہ کو آ جائے۔ ساعت اجابت کی وجہ سے اس کے بعد تتبع کیا تو احیاء العلوم میں کعب احبار سے بھی روایت دیکھی، اور مثل ہے کہ ''خدا زدہ را پیغمبر ے زند'' بس بے نمازی کو کوئی بھی نہیں پوچھتا نہ خدا نہ رسول، پھر فرمایا کہ کعب احبار تابعی ہیں عالمِ تورات اور عبداللہ بن سلام صحابی ہیں عالمِ تورات۔ لہٰذا کعب دوسرے درجہ کے عالم تورات ہیں۔

علامہ عینیؒ نے بڑی تفصیل کی ہے اور ساعتِ اجابت کے بارے میں علماءِ امت کے چالیس اقوال نقل کئے ہیں، اور لکھا کہ ان میں سے بعض اقوال کا دوسروں سے اتحاد بھی ہو سکتا ہے۔ علامہ محبّ طبری نے لکھا کہ اس بارے میں سب سے زیادہ صحیح حدیث حدیثِ ابی موسیٰ ہے اور سب سے زیادہ مشہور قول عبداللہ بن سلام کا ہے، علامہ بیہقی نے امام مسلم سے نقل کیا کہ حدیثِ ابی موسیٰ '' اجود شیء فی ھٰذا لباب و اصحه'' ہے، اور یہی بات خود بیہقی، ابن العربی اور ایک جماعتِ محدثین نے بھی کہی ہے، علامہ قرطبی نے کہا کہ یہ موضعِ خلاف میں بمنزلہ نص کے فیصلہ کن ہے لہٰذا اس کے مقابلہ میں دوسرے محامل کی طرف التفات نہ کرنا چاہئے، علامہ نووی نے کہا کہ یہی صحیح و صواب ہے اور اس لئے بھی قابلِ ترجیح ہے کہ مرفوع صریح ہے اور احد الصحیحین میں ہے، دوسرے حضرات نے عبداللہ بن سلام کے اقوال کو ترجیح دی ہے، امام ترمذی نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ اکثر احادیث سے قولِ عبداللہ بن سلام ہی کی تائید ہوتی ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے اس کو اثبت شئی فی ھٰذا الباب کہا۔

حدیثِ مسلم پر نقدِ دار قطنی

واضح ہو کہ حدیثِ مسلم ابوموسیٰ والی سے معلوم ہوا کہ وہ ساعتِ مستجابہ امام کے منبر پر بیٹھنے سے نماز کے ختم ہونے تک ہے اور عبداللہ بن سلام کا قول بعد العصر الی الغروب کا ہے۔ علامہ عینی نے مذکورہ حدیث مسلم پر ناقدانہ محدثانہ کلام کیا ہے اور آخر میں یہ بھی لکھا کہ یہ وہ حدیث ہے جس پر محدث دار قطنی نے امام مسلم کے خلاف نقد وارد کیا ہے، لہٰذا احادیث بعد العصر والی ہی زیادہ قابلِ ترجیح ہیں کیونکہ وہ زیادہ بھی ہیں اور ان میں اتصال بالسماع بھی ہے، جبکہ حدیثِ مسلم میں انقطاع ہے۔ (عمدہ ص ۳۲۸/۳۴۳ جلد سوم)

ترجیح صحیحین کی شرط

حافظ نے علامہ عینیؒ سے ۳،۳ قول زیادہ ذکر کئے ہیں پھر لکھا کہ بہت سے آئمہ (امام احمد، اسحاق، طرطوشی، مالکی، ابن الزملکان شافعی وغیرہ) نے اسی کو ترجیح دی کہ وہ ساعتِ مقبولہ روزِ جمعہ کی آخرِ ساعت ہے اور انہوں نے اس بات کے جواب میں کہ ابوموسیٰ والی حدیث مسلم کی ہے اور یہ دوسری احادیث بخاری و مسلم کسی کی نہیں ہیں، کہا کہ بخاری و مسلم یا کسی ایک میں موجود حدیث کی ترجیح جب ہے کہ اس پر حفاظِ حدیث نے کوئی نقد نہ کیا ہو، اور یہاں مسلم کی حدیثِ ابی موسیٰ پر انقطاع و اضطراب کا اعلال وارد ہوا ہے اور دار قطنی نے اس کے بجائے مرفوع کے موقوف ہونے کا جزم و یقین کیا ہے۔ (فتح الباری ص ۲/ ۲۸۷)۔

حافظ نے علامہ عینی کی طرح دار قطنی کے نقد کا تو ذکر نہیں کیا (معلوم نہیں کیا مصلحت ہوگی؟) تاہم علامہ نووی کی دونوں وجوہِ استدلال کو گرا دیا کہ انہوں نے مرفوع اور مروی فی احد الصحیحین ہونے کی وجہ سے ترجیح قائم کی تھی۔ حافظ نے دونوں کو رد کر دیا۔ اس سے قبل نماز وقتِ خطبہ کی بحث میں دار قطنی کا نقد بخاری کی حدیث **اذا جاء احدکم** پر بھی گزرا ہے، ان دونوں مواقع کو یاد رکھا جائے علامہ عینیؒ نے آخری اقوال ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ایک قول مطلقاً بعد العصر کا ہے ایک قول سورج پر زردی آنے سے غروب تک کا ہے (رواہ عبدالرزاق) ایک قول آخرِ ساعت بعد العصر کا ہے (ابوداؤد، نسائی و حاکم) ایک قول نصف قرصِ شمس کے غائب ہونے سے مکمل غروب تک کا ہے (طبرانی، دار قطنی و بیہقی) اس میں حضرت فاطمہؓ کا ارشاد مروی ہے کہ میں نے ابا جان صلے اللہ علیہ وسلم سے اس ساعت مقبولہ کے بارے میں دریافت کیا تھا تو یہی بتایا تھا (عمدہ ص ۳/ ۳۲۷)

حافظ نے اس آخری حدیث میں یہ بھی اضافہ کیا کہ حضرت فاطمہؓ جمعہ کے دن غروب کے قریب دعا کی طرف متوجہ ہو جایا کرتی تھیں اور یہ بھی آتا ہے کہ وہ اپنے غلام ارید کو حکم دیا کرتی تھیں کہ ٹیلہ پر چڑھ جائے اور جب سورج کا غروب قریب ہو تو ان کو بتائے اور اس وقت وہ دعا کر کے پھر مغرب کی نماز پڑھا کرتی تھیں۔ (فتح ص ۲/ ۲۸۶) حدیث الباب میں یقللہا بھی ہے، جس سے ثابت ہوا کہ وہ ساعت بہت ہی مختصر ہوتی ہے اس سے نمازِ عصر کے تاخیر سے پڑھنے کی طرف بھی اشارہ سمجھا گیا ہے اور حنفیہ کے یہاں دوسری وجوہ سے بھی ہمیشہ اور ہر موسم میں تاخیرِ عصر کی ہی افضلیت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی فرمایا کہ میرے نزدیک حدیثِ ابی داؤد سے عصر کے لئے تاخیر شدید کا ہی حکم نکلتا ہے سنا ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کا معمول بھی کافی تاخیر کا ہی تھا بعض نے نقل کیا کہ صرف آدھ گھنٹہ غروب سے قبل پڑھا کرتے تھے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ساعتِ اجابت روزِ جمعہ کے بارے میں دوسری حدیث اور ردِ ابنِ تیمیہ

موطأ امام مالک میں حضرت ابوہریرہؓ سے ہی دوسری حدیث طویل مروی ہے، جس میں حضور علیہ السلام کا ارشاد **لا تعمل المطی الا الی ثلاثة مساجد** الخ بھی ہے، اس کے ذیل میں علامہ عینیؒ نے جو مفصل و مدلل کلام کیا ہے، صاحبِ اوجز نے نقل فرما دیا ہے، اور پوری بحث

زیارۃِ نبویہ کی افضیلت واستحباب کے لئے ذکر فرمادی ہے، علامہ ابن تیمیہ کے دلائل حرمتِ سفر زیارۃ نبویہ کا مکمل رد پیش کیا ہے جو قابلِ مطالعہ ہے۔ ہم اس سلسلہ میں بہت کچھ انوارالباری جلد ۱۱ میں لکھ آئے ہیں، اس لئے یہاں اوجز کا بھی صرف حوالہ کافی ہے۔ (اوجز ص ۳۶۷/۳۶۳ اول)

بَابٌ اِذَ انفرَ النَّاسُ عَنِ الْاِمَامِ فِیْ صَلٰوۃِ الْجُمُعَۃِ فَصَلٰوۃُ الْاِمَامِ وَمَنْ بَقِیَ جَآئِزَۃٌ

(جمعہ کی نماز میں اگر کچھ لوگ امام کو چھوڑ کر بھاگ جائیں تو امام اور باقی ماندہ لوگوں کی نماز جائز ہے)

۸۸۷. حَدَّثَنَا مُعٰوِیَۃُ بْنُ عَمْرٍ وَقَالَ حَدَّثَنَا زَآئِدَۃُ عَنْ حُصَیْنٍ عَنْ سَالِمِ اِبْنِ اَبِی الْجَعْدِ قَالَ حَدَّثَنَا جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ نُصَلِّیْ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَبِلَتْ عِیْرٌ تَحْمِلُ طَعَامًا فَالْتَفَتُوْآ اِلَیْھَا حَتّٰی مَابَقِیَ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَّا اثْنَا عَشَرَ رَجُلاً فَنَزَلَتْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃُ وَاِذَا رَاَوْتِجَارَۃً اَوْلَھْوَ اِنْفَضُّوْآ اِلَیْھَا وَتَرَکُوْکَ قَآئِمًا.

ترجمہ ۸۸۷۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک بار نماز پڑھ رہے تھے تو ایک قافلہ آیا، جس کے ساتھ اونٹوں پر غلہ لدا ہوا تھا، تو لوگ اس قافلہ کی طرف دوڑ پڑے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف بارہ آدمی رہ گئے، اس پر یہ آیت اتری کہ "جب لوگ تجارت کا مال یا غفلت کا سامان دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ جاتے ہیں اور تمہیں کھڑا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک مرسل روایتِ ابوداؤد سے ثابت ہے کہ پہلے زمانہ میں خطبہ نمازِ جمعہ کے بعد ہوتا تھا جیسے اب عید کا ہے، اس لئے اس کو وعظ جیسا سمجھ کر صحابہ کرام چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے۔ اس کے بعد ترک پر وعید آئی اور خطبہ بھی قبلیہ ہو گیا، ترجمۃ الباب میں فی صلوٰۃ الجمعۃ اور روایت میں بھی بینما نحن نصلی ایسے ہی کہا گیا جیسے کوئی کہے کہ نمازِ جمعہ کو جاتا ہوں حالانکہ ابھی خطبہ بھی نہیں ہوا، کیونکہ مقصود بالذات اور غایت الغایات کو ذکر کیا کرتے ہیں تو ابع کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ میں نے تاویل نہیں کی بلکہ یہ مجازِ متعارف ہے کہ عام محاورہ پرا تارا ہے اس مرسل روایت کی وجہ سے بات بہت ہلکی ہوگئی اور صحابہ کا چلا جانا کوئی بڑی بات نہیں ہوئی۔ ورنہ ان لوگوں سے جو انبیاء علیہم السلام کے بعد ساری دنیا سے زیادہ متقی و زاہد تھے ایسی بات مستبعد معلوم ہوتی ہے۔

علامہ سہیلیؒ نے لکھا کہ اگرچہ ابتداء میں خطبۂ جمعہ کا نماز کے بعد ہونا کسی قوی دلیل سے ثابت نہیں ہے، تاہم صحابہ کرام کے ساتھ حسن ظن کا تقاضہ یہی ہے کہ یہ بات صحیح ہی ہو علامہ عینی اور حافظ نے بھی مذکورہ روایتِ مرسل کو نقل کیا ہے (معارف ص ۴/ ۴۲۸)۔

علامہ عینی نے لکھا کہ امام بخاری کے ترجمہ اور حدیث الباب سے تو صحابہ کا جانا نماز کا واقعہ معلوم ہوتا ہے مگر مسلم کی روایت میں خطبہ کی صراحت ہے، اور ابوعوانہ، ترمذی و دارقطنی میں بھی خطبہ کا ہی ذکر ہے، لہٰذا علامہ نووی وغیرہ علماء نے نماز سے مراد انتظارِ صلوٰۃ لیا ہے، علامہ ابن الجوزیؒ نے حدیث الباب بخاری کو بھی تاویل کر کے خطبہ پر محمول کیا ہے مگر ایسا کرنے سے ترجمۃ الباب کی مطابقت نہ رہے گی۔ (عمدہ ص ۳/۳۲۹)۔

آخر میں علامہ نے بھی لکھا کہ صحابۂ کرام کے ساتھ حسنِ ظن کا تقاضہ تو یہی ہے کہ اس واقعہ کو خطبہ سے متعلق سمجھا جائے لیکن اصیلی نے یہ اشکال پیش کیا کہ صحابہ کی شان میں تو آیت سورۂ نور رجال لا تلھیھم تجارۃ و لا بیع عن ذکر اللہ وارد ہے، تو یہ بات ان کے لئے خطبہ کے بھی مناسب نہ ہوگی، اس کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے آیتِ مذکورہ کا نزول اس واقعہ کے بعد ہوا ہو، دوسرے یہ کہ پہلے ان کو اس قسم کے امور سے ممانعت نہ آئی ہوگی، مگر جب آیتِ سورۂ جمعہ میں تنبیہ آگئی اور صحابہ نے اس بات کی برائی سمجھ لی تو پھر اس سے اجتناب کیا اور

اس کے بعد سورۂ نور کی آیت مذکورہ نازل ہوئی (عمدہ ص ۳/۳۳۲) حافظ نے بھی لکھا کہ صحابۂ کرام کی جلالتِ قدر کا لحاظ کرتے ہوئے یہی صورت طے شدہ ماننی پڑے گی (فتح ص ۲......۲۹۰) تفسیر درمنثور سیوطیؒ ص ۶/۲۲۰ میں بھی روایتِ مرسل مذکور نقل ہوئی ہے وغیرہ۔

مودودی صاحب کا تفرد اور تنقیدِ صحابہؓ

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا حافظ عینی، سہیلی، حافظ وسیوطی وغیرہ اکابر محدثین ومفسرین نے اس موقع پر صحابۂ کرام پر سے ایک الزام کو دفع کرنے کی پوری سعی کی ہے، مگر ان سب کے برعکس مودودی صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے خاص طریقِ فکر کو پوری قوت سے پیش کیا ہے، آپ نے سورۂ جمعہ کی آیت و اذا را و اتجارة کے تحت لکھا کہ "یہ واقعہ جس طرح معترفین کی تائید نہیں کرتا اسی طرح ان لوگوں کے خیالات کی تائید بھی نہیں کرتا جو صحابہ کی عقیدت میں غلو کر کے اس طرح دعوے کرتے ہیں کہ ان سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی، یا ہوئی بھی تو اس کو ذکر نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان کی غلطی کا ذکر کرنا اور اسے غلطی کہنا ان کی توہین ہے، اور اس سے ان کی عزت ووقعت دلوں میں باقی نہیں رہتی" الخ آگے خود ہی مودودی صاحب نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ "حضور علیہ السلام کے زمانہ میں صحابۂ کرام زیرِ تربیت تھے اور یہ تربیت بتدریج سالہا سال تک ان کو دی گئی، اس کا طریقہ جو قرآن وحدیث میں ہم کو نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ جب کبھی ان کے اندر کسی کمزوری کا ظہور ہوا اللہ اور اس کے رسول نے بروقت اس کی طرف توجہ کی اور فوراً اس خاص پہلو پر تعلیم وتربیت کا ایک پروگرام شروع ہوگیا، جس پر وہ کمزوری پائی گئی تھی، اور ایسی ہی صورت نمازِ جمعہ کے واقعہ مذکورہ میں بھی پیش آئی ہے" الخ (تفہیم القرآن ص ۵/۵۰۳)۔

ناظرین خود انصاف کریں کہ اکابرِ امت کا طریقِ فکر بہتر تھا یا مودودی صاحب کے سوچنے کا انداز؟ اور دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے، پھر جب وہ خود بھی یہ اعتراف کر گئے کہ صحابہ زیرِ تربیت نبوی تھے اور ان کی ہر قسم کی کمی کو اللہ اور اس کے رسول نے بروقت توجہ فرما کر ان کی تربیت کو مکمل فرما دیا تھا، تو اب سوال تو یہی ہے کہ حسبِ ارشاد اکابرِ امت جب صحابۂ کرامؓ انبیاء علیہم السلام کے بعد دنیا کے سارے لوگوں میں سے علم وتقویٰ کے لحاظ سے اعلیٰ ترین سطح پر فائز ہو چکے تھے اور حضور علیہ السلام نے ان کو خود بھی عدول وصدوق وثقہ ہونے کی سند عطا فرما دی تھی۔ تو کسی کے لئے اس کا کیا موقع ہے کہ سندِ نبوی کے خلاف ان کی سابقہ زیرِ تربیت زندگی کی کمی ونقص کے واقعات کو کھود کرید کر نکالے اور ان کو نمایاں کر کے لوگوں کو بتلائے کہ ان میں فلاں فلاں نقص بھی تھے۔

ہم نے مودودی صاحب کی دوسری تحریریں بھی نقدِ صحابہ کے بارے میں پڑھی ہیں اور دیکھا کہ وہ اپنی غلطی ماننے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہیں اور تاویل در تاویل کا چکر دے کر اپنی ہی ضد پر قائم ہیں اس لئے ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ سارے اکابرِ امت کے خلاف ان کی یہ رائے تفرد کا درجہ رکھتی ہے۔ **والتفرد لا یقبل ولا سیما من مثله. والله تعالیٰ اعلم۔**

نطقِ انور: ایک دفعہ حضرت مولانا (شیخ الہندؒ) نے فرمایا کہ جو شخص جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے کلام میں مجاز زیادہ ہوتا ہے یعنی مبہم ہوتا ہے، میں نے کہا کہ بڑے کے کلام میں علوم زیادہ ہوتے ہیں، چنانچہ کسی حدیث پر بڑا عالم گزرتا ہے تو اس کی عبارت مشکل ہوتی ہے اور بعد کے درجہ کا عالم سہل عبارت سے ادا کریگا، خدا سے لے کر اپنے زمانہ تک یہی دیکھا کہ جو اوپر زیادہ ہے اس کا کلام زیادہ اشمل ومبہم ہوتا ہے اور جس قدر وسائط کم ہوئے علوم کم ہوتے گئے اور سہل تر ہوگئے، پہلا سا ظہر وبطن نہیں رہتا بلکہ صرف ڈھانچہ رہ جاتا ہے اور ظاہر ہی ظاہر رہ جاتا ہے۔ جیسے ہدایہ وفتح القدیر کہ ہدایہ اس طرح ہے جیسے کوئی شہنشاہ کلام کرتا ہو اور فتح القدیر کا کلام سہل وآسان معلوم ہوتا ہے حالانکہ وہ کہیں کم ہے اول سے۔

فائدہ: ایک روز مشکلات القرآن کا ذکر کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مولوی صاحب! کوئی کہاں تک اترے؟! یعنی کلام الملوک تو بہر حال ملک الکلام ہی ہوگا (غالباً اسی لئے صحابہ کے علوم میں عمق وگہرائی سب سے زیادہ تھی کہ وہ بھی علمی کمالات میں ساری امت پر فائق تھے)

بَابُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الْجُمُعَةِ وَ قَبْلَهَا

(جمعہ کی نماز کے بعد اور اس سے پہلے نماز پڑھنے کا بیان)

۸۸۸. حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ نَّافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْ قَبْلَ الظُّهْرِ رَكْعَتَيْنِ وَبَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ وَبَعْدَ الْمَغْرِبِ رَكْعَتَيْنِ فِيْ بَيْتِهٖ وَبَعْدَ الْعِشَآءِ رَكْعَتَيْنِ وَكَانَ لَا يُصَلِّيْ بَعْدَ الْجُمُعَةِ حَتّٰى يَنْصَرِفَ فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ.

ترجمہ ۸۸۸۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے دو رکعتیں، اور اس کے بعد دو رکعتیں اور مغرب کے بعد دو رکعتیں اپنے گھر میں اور عشاء کے بعد دو رکعتیں نماز پڑھتے تھے، اور جمعہ کے بعد نماز نہیں پڑھتے تھے، یہاں تک کہ گھر واپس لوٹتے، تب دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

تشریح:۔ حافظ نے لکھا امام بخاری نے ترجمہ وعنوانِ باب میں تو نمازِ جمعہ سے پہلے کی سنتوں کا بھی ذکر کیا ہے مگر حدیث الباب میں ان کا ثبوت نہیں ہے، اس پر علامہ ابن المنیرؒ وابن التین (وقسطلانی) نے کہا کہ امام بخاری نے اصلاً ظہر و جمعہ کے برابر ہونے کی وجہ سے اور دلیل کی ضرورت نہیں سمجھی ہوگی، اور بعد کی سنتوں کی اہمیت زیادہ بتلانی تھی اس لئے اس کو خلافِ عادت ترجمہ میں مقدم بھی کر کے ذکر کیا، ورنہ پہلے کی تقدیم بعد پر کرتے۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ امام بخاری نے یہاں حدیث الباب کے دوسرے طریق کی طرف اشارہ کیا ہے جس کو ابوداؤد میں ذکر کیا گیا ہے اور اس میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ جمعہ سے قبل لمبی نماز پڑھا کرتے تھے اور بعد کو دو رکعت گھر میں پڑھتے تھے۔

علامہ نووی نے اس سے سنت قبل الجمعہ پر استدلال کیا بھی ہے مگر اس پر اعتراض وارد ہوا ہے، البتہ سنتِ قبلیہ کے لئے دوسری احادیثِ ضعیفہ وارد ہیں، ان میں سب سے زیادہ قوی ابن حبان کی وہ صحیح کردہ مرفوع حدیثِ عبداللہ ابن زبیرؓ ہے کہ ہر نمازِ فرض سے پہلے دو رکعت ہیں (فتح ص ۲/۲۹۱)۔

علامہ عینیؒ نے بھی یہی تحقیق کی اور پھر اوسط طبرانی سے حدیثِ ابی عبیدہ مرفوعاً نقل کی کہ حضور علیہ السلام جمعہ سے پہلے چار رکعت اور جمعہ کے بعد بھی چار رکعت پڑھتے تھے (عمدہ ص ۳/۳۴۴)۔

امام ترمذی نے بھی باب الصلوٰۃ قبل الجمعۃ وبعدہا، قائم کر کے حدیثِ جابر وابو ہریرہؓ کی طرف اشارہ کیا جو ابن ماجہ میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے سلیک غطفانی کو فرمایا اصلیت رکعتین قبل ان تجیئ؟ الخ حافظ نے اس حدیث کو ذکر کر کے یہ بھی لکھا کہ علامہ مجد بن تیمیہ نے المنتقیٰ میں لکھا کہ قبل ان تجیئ اس امر کی دلیل ہے کہ جمعہ سے پہلے بھی سنتیں ہیں، جو تحیۃ المسجد کے علاوہ ہیں۔ معارف السنن ص ۴/۴۱۳ میں ہے کہ حافظ کا اس حدیث کو تلخیص ص ۱۴۰ میں اصح کہہ کر مزی کا اعتراض نقل کرنا بے سود ہے کیونکہ مزی کا کلام تمام امت کے سلف و خلفا سکوت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تراجم میں لکھا کہ امام بخاری نے یہاں حدیث الباب پر اس لئے اکتفا کیا کہ قبلِ جمعہ کی سنتوں کا ثبوت بہ صراحت حدیث جابرؓ سے پہلے ہو چکا ہے ص ۸۸۲ ص ۱۲۷ یہی بات جدِ ابن تیمیہؒ نے بھی حدیثِ جابر سے سمجھی ہے ملاحظہ ہوں بستان ص ۱/۳۸۴۔

علامہ ابن تیمیہ وابن القیم کا انکار

ان دونوں حضرات نے جمعہ سے قبل کی سنتوں سے انکار کیا ہے اور دعویٰ کیا کہ وہ کسی حدیث سے ثابت نہیں ہیں، علامہ شوکانی نے

لکھا کہ بعض لوگوں نے ان کے انکار میں مبالغہ سے کام لیا ہے حالانکہ اختیارات میں ہے کہ جمعہ سے پہلے دو رکعت سنتیں حسنہ مشروعہ ہیں اور ان پر مداومت کسی مصلحتِ شرعیہ ہی کی وجہ سے کی جاتی ہے (بستان الاحبار ص ۱/۳۸۴) پھر لکھا کہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث اطالۂ صلوٰۃ قبل الجمعہ اور حدیث من اغتسل ثم اتی الجمعة فصلی ماقدر له دونوں سے مشروعیتِ صلوٰۃ قبل الجمعہ ثابت ہے اور لکھا حاصل یہ ہے کہ نماز قبل الجمعہ کی عام وخاص طریقہ پر ترغیب دی گئی ہے (〃 〃)

معارف السنن ص ۴/۴۱۲ میں ہے کہ ان دونوں کے جواب میں یہ کافی ہے کہ صحابۂ کرام حضرت عبداللہ بن مسعود وابن عمرؓ وغیرہ جمعہ سے پہلے چار رکعت کم وبیش پڑھا کرتے تھے، کیا وہ کسی ایسے عمل پر استمرار کر سکتے تھے جو حضور علیہ السلام کے قول وفعل سے ثابت نہ ہوتا، اور ابن القیم کا یہ دعویٰ کہ علماء کا اصح القولین ترکِ سنت ہی قبل الجمعہ ہے، محض اٹکل کی اور بے تکی بات ہے تفصیل کے لئے مغنی ابن قدامہ اور مجموع النووی دیکھی جائیں۔ اور اس کو عید کی نماز پر قیاس کرنا بھی نہیں کیونکہ قبلِ جمعہ جوازِ نفل پر اجماع ہے، اور عدمِ تطوع قبل العید پر بھی تقریباً اجماع ہے، لہٰذا ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا کیونکر درست ہوسکتا ہے؟!۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ظہر سے قبل کی سنتوں میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ شافعیہ ۲ رکعت کہتے ہیں اور حنفیہ چار۔ حافظ ابن جریر طبری نے کہا کہ حضور علیہ السلام کی اکثری سنت چار تھیں اور کبھی دو بھی پڑھی ہیں، اور حضرت علی سے چار کا ثبوت نہایت قوی ہے اور اکثری سنت چار کا ثبوت ابوداؤد سے بہ سندِ قوی ہے، اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ اکثر صحابہ ظہر سے قبل کی چار سنت ترک نہ کرتے تھے اور ترمذی نے صراحت کردی ہے کہ جمہور صحابہ حنفیہ کے موافق ہیں۔ (العرف ص ۱۹۰) ترمذی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ بھی نقل کیا کہ وہ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے اور بعد کو بھی چار رکعت پڑھتے تھے اور یوں بھی جمعہ کی قبلیہ سنتیں بھی مثل ظہر کے ہیں۔

بَابُ قَوْلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللهِ

(اللہ عز وجل کا فرمانا ہے کہ جب نماز پوری ہوجائے، تو زمین میں پھیل جاؤ، اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو)

۸۸۹. حَدَّثَنِي سَعِيْدُ بْنُ اَبِي مَرْيَمَ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ غَسَّانَ قَالَ حَدَّثَنِي اَبُوْ حَازِمٍ عَنْ سَهْلٍ قَالَ كَانَتْ فِينَا امْرَاَةٌ تَجْعَلُ عَلٰى اَرْبِعَآءَ فِي مَزْرَعَةٍ لَّهَا سِلْقًا فَكَانَتْ اِذَا كَانَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ تَنْزِعُ اُصُوْلَ السِّلْقِ فَتَجْعَلُهُ فِي قِدْرٍ ثُمَّ تَجْعَلُ عَلَيْهِ قَبْضَةً مِّنْ شَعِيْرٍ تَطْحَنُهَا فَتَكُوْنُ اُصُوْلُ السِّلْقِ عَرْقَهُ وَكُنَّا نَنْصَرِفُ مِنْ صَلٰوةِ الْجُمُعَةِ فَنُسَلِّمُ عَلَيْهَا فَتُقَرِّبُ ذٰلِكَ الطَّعَامَ اِلَيْنَا فَنَلْعَقُهُ وَكُنَّا نَتَمَنّٰى يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِطَعَامِهَا ذٰلِكَ.

۸۹۰. حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُسْلَمَةَ قَالَ حَدَّثَنَا بْنُ اَبِي حَازِمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ سَهْلِ ابْنِ سَعْدٍ بِهٰذَا وَقَالَ مَا كُنَّا نَقِيْلُ وَلَا نَتَغَدّٰى اِلَّا بَعْدَ الْجُمُعَةِ.

ترجمہ ۸۸۹۔ سہل بن سعد ساعدی روایت کرتے ہیں کہ ہم میں ایک عورت تھی، جو اپنے کھیت میں نہر کے کنارے چقندر بویا کرتی تھی۔ جب جمعہ کا دن آتا تو چقندر کی جڑوں کو اکھاڑتی اور اسے ہانڈی میں پکاتی، پھر جو کا آٹا پیس کر اس ہانڈی میں ڈالتی تھی تب تو چقندر کی جڑیں گویا، اس کی بوٹیاں ہوجاتیں اور جمعہ کی نماز سے فارغ ہوتے تو اس کے پاس آکر اسے سلام کرتے۔ وہ کھانا ہمارے پاس لاکر رکھ دیتی تھی اور ہم اسے کھاتے تھے، اور ہم لوگوں کو اس کے اس کھانے کے سبب سے جمعہ کو دن کی تمنا ہوتی تھی۔

ترجمہ ۸۹۰۔ حضرت ابو حازم نے سہل بن سعد سے اس حدیث کو روایت کیا، اور کہا کہ ہم نہ تو لیٹتے تھے اور نہ دو پہر کا کھانا کھاتے تھے

مگر جمعہ کی نماز کے بعد (لیٹتے تھے اور دوپہر کا کھانا کھاتے تھے)

تشریح:۔علامہ عینی نے لکھا کہ وابتغوا من فضل اللہ میں امر اباحت کے لئے ہے وجوب کے لئے نہیں، کیونکہ نمازِ جمعہ سے قبل لوگوں کو معاش اور کسبِ رزق سے روک کر نماز کے لئے حکم کیا گیا تھا، لہٰذا بعد نماز کے اس کی اجازت دی گئی۔علامہ محدث ابن التین نے لکھا کہ ایک جماعت اہلِ علم نے کہا کہ یہ اباحت ہے بعد ممانعت کے۔(عمدہ ص۳/۳۳۶)۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں امر بعد ممانعت کے ہے لہٰذا وہ صرف اباحت کے لئے ہے اور اسی طرح قولہ علیہ السلام لا تفعلوا الایام القرآن میں بھی ہے، یہاں بھی استثناء سے صرف اباحت نکلے گی۔

حافظؒ نے لکھا کہ یہاں اجماع سے ثابت ہوا کہ امرِ مذکور اباحت کے لئے ہے، ایسا نہیں کہ وجوب کی نفی امر بعد الحظر سے نکلتی ہے، کیونکہ یہ عدم وجوب کے لئے مستلزم نہیں ہے، داؤدی نے قادر علی الکسب کے لئے اس امر کو بھی وجوب کے لئے کہا ہے، لیکن یہ قول شاذ ہے جو بعض ظاہریہ سے نقل ہوا ہے، اور بعض نے کہا کہ اس شخص پر وجوب ہے جس کے پاس گھر میں کچھ نہ ہوتا کہ بعد جمعہ کے کما کر لائے اور اہل و عیال کو خوش کرے کہ جمعہ بھی عید کی طرح خوشی کا دن ہے۔(فتح ص۲/۲۹۱) قولہ علی اربعاء فی مزرعة۔حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ کھیت بیر بضاعہ سے سیراب کیا جاتا تھا، جیسا کہ بخاری ص۹۳۳ باب تسلیم الرجال علی النساء میں ہے، وہاں سے معلوم ہوا کہ بیر بضاعہ اتنا بڑا تھا کہ اس سے کھیت اور باغ کو پانی دیا جاتا تھا۔یاقوت حموی نے معجم البلدان میں اس پر متنبہ کیا ہے۔اور کسی نے نہیں کیا، اور یہی امام طحاوی کی بھی مراد ہے کہ بیر بضاعہ کا پانی باغات میں جاری تھا، یعنی چقندر کے کھیت اور باغ اس سے سیراب کئے جاتے تھے، لہٰذا اس کا پانی ایک جگہ ٹھہرا ہوا نہ تھا، بلکہ نیچے سے پانی کے سوت نکل کر اوپر کو بہتے رہتے تھے کہ یہ بھی ایک قسم کا جریان ہے، جس طرح پہاڑوں میں سے پانی اوپر سے بہہ کر نیچے کو آتا ہے۔لوگوں نے امام طحاوی کا مقصد نہ سمجھا تو اعتراض کر دیا۔

علامہ ابن تیمیہ کا دعویٰ

آپ نے اپنے فتاویٰ ص۱/۸ میں دعویٰ کیا کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں کوئی کنواں یا چشمہ جاری نہ تھا اور جس نے بیر بضاعہ کو جاری کہا اس نے غلطی کی، اوپر کی تحقیق سے علامہ کے دعوے مذکور کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

علامہ نے غالباً امام طحاوی کے لفظ جاری پر اعتراض کیا ہے۔حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید فرمایا کہ پانی تین قسم کے ہیں، انہار اور بہنے والے دریاؤں کا کہ اوپر سے آکر نیچے کو بہتا ہے، یہ کبھی ناپاک نہیں ہوتا، دوسرا تالاب وغیرہ کا کہ اس میں نہ آئے نہ اس سے نکلے، یہ ناپاک ہوتا ہے تو پھر پاک نہیں ہوسکتا، تیسرا وہ ہے کہ نیچے سے آئے اور اوپر کو نکلے۔وہ بھی پاک ہو جاتا ہے۔یہی مذہب حنفیہ کا ہے، جس کو مصنفین نے وضاحت سے نہیں لکھا۔

فاتحہ خلف الامام

حضرتؒ نے یہاں ضمناً فرمایا کہ جس طرح وذروا البیع (تحریک وممانعت) کے بعد فانتشروا فی الارض الخ کے امر سے صرف اباحت نکلتی ہے، اسی طرح لاتفعلوا الایام القرآن سے بھی صرف اباحت نکلے گی۔کیونکہ مقتدی کے حق میں شافعیہ کے پاس کوئی حدیث ابتداً وجوبِ فاتحہ کی نہیں ہے، جس سے نکلتا کہ مقتدی سواءِ فاتحہ کے نہ پڑھے کیونکہ نماز بغیر اس کے نہ ہوتی، بلکہ حدیث میں اس طرح ملتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے پوچھا کہ میرے پیچھے کوئی پڑھتا ہے؟ کسی نے کہا نعم اور کسی نے کہا لا پس فرمایا لا تفعلوا الایام القرآن اور لا والوں کو کچھ نہیں فرمایا صرف نعم والوں کے لئے یہ الفاظ فرمائے، جو امام کے پیچھے زیادہ سے زیادہ اباحت یا استحباب بتلائیں گے نہ کہ وجوب وفرض۔

شافعیہ نے ابتدائی تعبیر والی بات سمجھ لی ہے جبکہ حدیث میں دوسری ہے، اور دونوں میں آسمان وزمین کا فرق ہے اس کو اچھی طرح سمجھ لو، صدیوں سے جھگڑا چل رہا ہے۔ حالانکہ بات اس قدر واضح ہے۔

بَابُ الْقَآئِلَةِ بَعْدَ الْجُمُعَةِ

(جمعہ کی نماز کے بعد لیٹنے کا بیان)

۸۹۱. حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُقْبَةَ الشَّيْبَانِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ اِسْحٰقَ الْفَزَارِيُّ عَنْ حُمَيْدٍ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسًا يَّقُوْلُ كُنَّا نُبَكِّرُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ثُمَّ نَقِيْلُ.

۸۹۲. حَدَّثَنِيْ سَعِيْدُ بْنُ اَبِيْ مَرْيَمَ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ غَسَّانَ قَالَ حَدَّثَنِيْ اَبُوْ حَازِمٍ عَنْ سَهْلٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّيْ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْجُمُعَةَ ثُمَّ تَكُوْنُ الْقَآئِلَةُ ااَبْوَابُ صَلٰوةِ الْخَوْفِ.

وَقَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اِلٰى قَوْلِهٖ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔ (اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب تم زمین میں چلو (سفر کرو) تو تم پر اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ نماز میں قصر کرو، آخر آیت عَذَابًا مُّهِيْنًا تک)

ترجمہ ۸۹۱۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ ہم جمعہ کے دن سویرے جاتے تھے، پھر (بعد نماز جمعہ) لیٹتے تھے۔

ترجمہ ۸۹۲۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھتے تھے اس کے بعد قیلولہ ہوتا تھا۔

تشریح:۔ علامہ عینی نے لکھا کہ مطابقت ترجمۃ الباب ظاہر ہے، کیونکہ حدیث سے بھی یہی نکلتا ہے کہ وہ حضرات نماز جمعہ کے بعد قیلولہ کیا کرتے تھے اور اول وقت سے نماز جمعہ کے لئے نکل جاتے تھے، جو تبکیر سے ظاہر ہے، اس کے معنی ہیں کسی کام کی طرف جلدی کرنا، اور حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ دوپہر کی نیند مستحب ہے۔ وقد قال اللہ تعالیٰ وحین تضعون ثیابکم من الظهيرة ای من القائلة۔ قائلہ فاعلہ کے وزن پر ہے بمعنی قیلولہ (عمدہ ص ۳/ ۳۳۸)۔

۸۹۳. حَدَّثَنَا اَبُوالْيَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ سَاَلْتُهٗ هَلْ صَلَّى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْنِيْ صَلٰوةَ الْخَوْفِ فَقَالَ اَخْبَرَنَا سَالِمٌ اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ قَالَ غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قِبَلَ نَجْدٍ فَوَازَيْنَا الْعَدُوَّ فَصَافَفْنَا لَهُمْ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ لَنَا فَقَامَتْ طَآئِفَةٌ مَّعَهٗ وَاَقْبَلَتْ طَآئِفَةٌ عَلَى الْعَدُوِّ فَرَكَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْ مَّعَهٗ وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ انْصَرَفُوْا مَكَانَ الطَّآئِفَةِ الَّتِيْ لَمْ تُصَلِّ فَجَآءُوْا فَرَكَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهِمْ رَكْعَةً وَّسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ فَقَامَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ فَرَكَعَ لِنَفْسِهٖ رَكْعَةً وَّسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ.

ترجمہ ۸۹۳۔ شعیب بیان کرتے ہیں کہ میں نے زہری سے پوچھا کہ کیا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز یعنی خوف کی نماز پڑھی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھ سے سالم نے بیان کیا کہ عبداللہ بن عمر نے کہا کہ میں نے اطراف نجد میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کیا، ہم لوگ دشمن کے مقابل ہوئے اور ان کے سامنے ہم لوگوں نے صفیں قائم کیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے، اور ہم لوگوں کو نماز پڑھائی۔ تو ایک جماعت آپ کے ساتھ کھڑی ہوئی اور ایک جماعت دشمن کے سامنے گئی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ رکوع اور دو سجدے کئے، پھر وہ لوگ اس جماعت کی جگہ پر واپس ہوئے، جنہوں نے نماز نہیں پڑھتی تھی، وہ

لوگ آئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک رکوع اور دو سجدے کئے، پھر سلام پھیر لیا اور (ان جماعتوں میں سے) ہر ایک نے ایک رکوع اور دو سجدے اکیلے اکیلے کئے۔

تشریح:۔آیتِ قرآنی واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوٰۃ الآیہ (سورۂ نساء) سے نمازِ خوف ثابت ہے، امام بخاری نے اس سے پہلے کی آیت قصرِ نماز کی بھی ذکر کی، کیونکہ دونوں نمازوں کا حکم ساتھ ہی بیان ہوا ہے، پہلے نمازِ قصر کا حکم بھی حالتِ خوف ہی کے لئے تھا، پھر حق تعالیٰ نے اس کو بطور انعام مطلق سفر کے لئے کر دیا۔نمازِ خوف کی ترکیب بھی خود حق تعالیٰ ہی نے بیان فرمادی ہے،یعنی فوجِ کفار مقابل ہو اور ان کے حملہ کا ڈر ہو تو مسلمانوں کی فوج دو حصے ہو کر نمازِ جماعت ادا کرے،ایک حصہ دشمن کے مقابل ہتھیار بند کھڑا ہو اور دوسرا امام کے ساتھ ہتھیاروں کے ساتھ ہی پہلی رکعت پڑھ کر کفار کے مقابل چلا جائے، وہاں سے پہلا گروہ آ کر امام کے ساتھ دوسری رکعت پڑھے اور پھر یہ دونوں گروہ امام کے بعد اپنی اپنی نماز پوری کرلیں۔اگر چار رکعت والی نماز ہو تو دونوں گروہ ۲۔۲ رکعت پڑھیں گے تین رکعت والی ہو تو پہلا گروہ ۲ رکعت اور دوسرا ایک پڑھے گا۔نماز خوف میں ہتھیار بندھے ہوئے پڑھنا اور آنا جانا معاف ہے (البتہ کلام جائز نہیں) اگر اتنا بھی موقع نہ ملے تو جماعت کا خیال ترک کر دیں اور اپنی نمازیں تنہا تنہا پڑھ لیں اگر سواری پر ہوں اور اترنے میں پریشانی ہو تو سواری پر ہی اشارہ سے پڑھ لیں۔اگر حالتِ جنگ کی وجہ سے اتنا بھی موقع نہ ہو تو نماز کو قضا کر دیں،جس طرح حضور علیہ السلام اور صحابۂ کرام غزوۂ خندق کے موقع پر کئی نمازیں نہیں پڑھ سکے تھے،اور بعد کو موقع پا کر قضا کی تھیں،حالانکہ اس غزوہ سے پہلے نمازِ خوف شروع ہو چکی تھی۔

مذہبِ حنفیہ: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ متونِ حنفیہ میں جو صورت ہے،اس میں بقاءِ ترتیب،فراغِ امام قبل المقتدی اور فراغِ طائفہ اولیٰ قبل الثانیہ وغیرہ محاسن ہیں مگر اس میں آنے جانے کی زیادتی ہے،جو اگرچہ نمازِ خوف کی خاص صورت میں جائز تو ہے،مگر مستحسن نہیں،دوسری صورت شروحِ حنفیہ کی ہے،اس میں یہ زیادتی نہیں ہے،یعنی دوسرا گروہ اپنی رکعت امام کے ساتھ پڑھ کر اسی جگہ اپنی دوسری رکعت بھی ساتھ ہی پڑھ کر نماز پوری کر کے دشمن کے مقابل جائے،۔اگرچہ اس میں دوسرے گروہ کی نماز اول سے پہلے ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ گروہ اس کے بعد اپنی باقی نماز پوری کرے گا۔

مذہبِ شافعیہ:امام پہلے گروہ کو ایک رکعت پڑھائے،اور دوسری رکعت کیلئے اتنی دیر تک قیام وقراءت کرے کہ یہ گروہ اپنی دوسری رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے اور دشمن کے مقابل جا کر کھڑا ہو جائے،وہاں سے دوسرا گروہ آ کر امام کے ساتھ شریک ہو کر ایک رکعت پڑھے،اور اب امام قعدۂ تشہد میں اتنی دیر لگائے اور انتظار کرے کہ یہ دوسرا گروہ بھی اپنی نماز پوری کرلے،اور امام ان کے ساتھ سلام پھیرے (ہدایۃ المجتہد ص ۱/۱۵۰)

مذہبِ مالکیہ:ان کے نزدیک امام دوسرے گروہ کو ایک رکعت پڑھا کر اپنی نماز ختم کرے گا اور بیٹھ کر دوسرے گروہ کے نماز پوری کرنے کا انتظار نہ کرے گا،کیونکہ امام تو متبوع ہے،وہ تابع بن کر مقتدیوں کا انتظار کیوں کرے؟ یہ اصول کے خلاف بات ہے۔(〃 〃)

ایک غلطی پر تنبیہ:العرف الشذی اور فیض الباری میں کاتبوں کی غلطی سے مالکیہ کا مذہب،انتظارِ قوم فی القعدہ چھپ گیا ہے، حالانکہ وہ مذہب شافعیہ کا ہے۔حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شافعیہ نے اس قلبِ موضوع کو اس لئے گوارہ کر لیا ہوگا کہ ان کے یہاں رابطہ قدوہ ضعیف ہے۔لہٰذا اس اختلال میں کوئی خرابی محسوس نہ کی ہوگی۔لیکن حنفیہ کے یہاں وہ رابطہ قوی ہے،اس لئے اس کو گوارہ نہ کیا کہ طائفہ اولیٰ امام سے پہلے اپنی نماز ختم کرلے یا امام سلام پھیرنے کے لئے طائفہ ثانیہ کا انتظار کرے۔اور مالکیہ نے بھی اس کو ناپسند کیا ہے۔

تفہیم القرآن کا تسامح

ص ۱/۳۹۱ میں چار صورتیں نمازِ خوف کی درج کیں ان میں پہلے اور تیسرے طریقہ کا ماحصل ایک ہی ہے،اور وہ ائمۂ متبوعین میں

سے کسی کا مذہب بھی نہیں ہے، اس لئے اس کو اہمیت دینا اور پھر ایک کی دو صورت بنانا موزوں نہیں تھا۔

آیتِ صلوٰۃ خوف کا شانِ نزول

علامہ باجی نے محقق ابن الماجشون سے نقل کیا کہ یہ آیت غزوۂ ذات الرقاع کے موقع پر نازل ہوئی، علامہ زیلعی نے واقدی سے بسندِ جابر نقل کیا کہ حضور علیہ السلام نے پہلی بار صلوٰۃِ خوف غزوۂ ذات الرقاع میں پڑھی، پھر عسفان میں پڑھی، اور ان دونوں کے درمیان چار سال ہیں، اور واقدی نے کہا کہ ہمارے نزدیک یہ قول بہ نسبت دوسرے اقوال کے اثبت واحکم ہے۔

حافظؒ نے باب الصلوٰۃ عند مناہضۃ الحصون میں ضمناً دورانِ بحث لکھا کہ یہ امر اس کے خلاف نہیں جو پہلے اس چیز کی ترجیح ذکر ہو چکی ہے کہ آیت الخوف، خندق سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ (فتح ص۲/۲۹۸)۔

علامہ نووی نے شرح مسلم شریف میں لکھا کہ نمازِ خوف غزوۂ ذات الرقاع میں مشروع ہوئی اور کہا گیا کہ غزوۂ بنی نضیر میں (جو ربیع الاول ۴ھ میں ہوا ہے) علامہ ابی نے شرح مسلم میں لکھا کہ غزوۂ ذات الرقاع نجد ارضِ غطفان) پر ۵ھ میں ہوا اور اسی میں نمازِ خوف کا حکم نازل ہوا اور کہا گیا کہ غزوۂ بنی نضیر میں۔

غرض جمہور کی رائے یہی ہے کہ پہلی نمازِ خوف غزوۂ ذات الرقاع میں پڑھی گئی (قالہ محمد بن سعد وغیرہ) محمد بن اسحاق نے کہا کہ پہلی نماز خوف بدر الموعد سے قبل پڑھی گئی، اور ابن اسحٰق وابن عبدالبر نے ذکر کیا کہ بدر الموعد شعبان ۴ھ میں تھا۔ اور ذات الرقاع جمادی الاول ۴ھ میں تھا۔ ابن القیم نے ہدی میں اس امر کو ترجیح دی کہ غزوۂ ذات الرقاع غزوۂ عسفان کے بعد ہوا ہے اور حافظ کا میلان بھی فتح الباری میں اسی کی طرف معلوم ہوا۔ (اوجز ص۲/۲۵۹)۔

مفسر شہیر علامہ ابن کثیر کے ارشادات

آپ نے لکھا: صلوٰۃِ خوف کی بہت سی انواع ہیں، دشمن کبھی قبلہ کی سمت میں ہوتا ہے، کبھی دوسری سمتوں میں، کوئی نماز چار رکعت کی ہے، کوئی تین کی، کوئی دو کی، کبھی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہے، کبھی مسلسل جنگ کی حالت میں جماعت کا موقع نہیں ہوتا، کوئی سوار ہوتا ہے، کوئی پیادہ، کبھی حالتِ نماز میں بھی مسلسل چلنا پڑ جاتا ہے، وغیرہ سب کے احکام بھی الگ الگ ہیں۔

علامہ نے لکھا کہ نمازِ خوف غزوۂ خندق کے وقت بھی مشروع تھی، کیونکہ حسبِ قول جمہور علماءِ سیر ومغازی غزوۂ ذات الرقاع خندق سے پہلے ہوا ہے، ان علماء میں محمد بن اسحٰق موسیٰ بن عقبہ، واقدی، محمد بن سعد (صاحبِ طبقات) اور خلیفہ بن الخیاط وغیرہم ہیں۔ امام بخاری وغیرہ نے اس کو خندق کے بعد کہا ہے، اور عجیب بات ہے کہ مزنی وامام ابو یوسف وغیرہ نے تاخیرِ نماز یوم خندق کی وجہ سے صلوٰۃِ خوف کو منسوخ کہا ہے، حالانکہ خندق کے بعد بھی نمازِ خوف کا احادیث سے ثبوت ہو چکا ہے اور خندق میں تاخیر شدتِ قتال پر محمول ہے، کہ ایسی معذوری کے وقت تو سب ہی کے نزدیک مؤخر ہو جاتی ہے۔

علامہ نے لکھا کہ ہم یہاں اصل سببِ نزول آیت صلوٰۃ الخوف بھی لکھتے ہیں، محدث ابن جریر نے حضرت علیؓ سے روایت نقل کی کہ بنی النجار نے حضور علیہ السلام سے نمازِ سفر کا حکم دریافت کیا تھا تو آیتِ قصر کا نزول ہوا، پھر وحی منقطع رہی اور ایک سال کے بعد جب حضور علیہ السلام نے ایک غزوہ میں (جماعت کے ساتھ نمازِ ظہر پڑھی، تو مشرکوں نے دیکھ کر آپس میں کہا کہ محمد اور ان کے ساتھیوں نے تو بڑا اچھا موقع ہمیں دیا تھا کہ ہم ان پر نماز کی حالت میں) ان کی پشت کی طرف سے حملہ کر کے ان سب کو ختم کر سکتے تھے، تو ان میں سے کسی نے کہا کہ یہ موقع تو پھر بھی ملے گا، اس کے بعد وہ دوسری نماز بھی پڑھیں گے۔ کیونکہ ان لوگوں کو نماز سے زیادہ دنیا کی کوئی چیز محبوب نہیں ہے حتیٰ کہ وہ اپنی

جانوں اوراولادوغیرہ کوبھی نماز کے مقابلہ میں کچھ نہیں سمجھتے ، یہ توان کا مشورہ ہوا، ادھر سے ظہر وعصر کے درمیان حضرت جبریل علیہ السلام وحی لے کر آ گئے اور نمازِ خوف کی آیات اتریں، جن میں نماز کی ایسی صورت تجویز کردی گئی کہ دشمن کی ماراس وقت بھی نہیں کھا سکتے ۔ چنانچہ عصر کی نماز جماعت کے ساتھ آیتِ کریمہ کے مطابق دوگروہ بن کرہتھیار بند ہوکرادا کی گئی اور حالتِ نماز میں چلنا پھرنا اور آمدورفت بھی جائز کردی گئی ، اورایسی نماز دومرتبہ ہوئی، ایک مرتبہ عسفان میں اور ایک مرتبہ بنوسلیم میں، اوراس طریقہ کی نماز کی روایت نہ صرف مسندِ احمد میں ہے بلکہ ابوداؤد ونسائی، اور بخاری میں بھی ہے ۔ اس طرح سب لوگ نماز میں بھی رہے اور ایک دوسرے کی حفاظت ونگرانی بھی کرتے رہے اور کفار کا منصوبہ فیل ہوگیا کہ مسلمانوں کو غافل پاکران کوقتل کردیں گے، اس نماز میں آنے جانے وغیرہ کی اجازت دے دی گئی ہے، جونمازِ خوف کے علاوہ دوسری نمازوں کے لئے نہیں ہے (تفسیر ابن کثیر ص ۱/ ۵۴۶) علامہ نے یہ بھی ثابت کیا کہ غزوۂ ذات الرقاع غزوۂ خندق سے پہلے ہے (ررص ۱/ ۵۴۷) یہ روایت اور شانِ نزول تفسیر درمنثور وغیرہ میں بھی ذکر کی گئی ہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ نے لکھا: صلوٰۃِ خوف کی روایت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے متعدد طریقوں پر مروی ہے عسفان کی نماز (سنن میں) اس موقع کی ہے جبکہ دشمن قبلہ کی سمت میں تھے، اور بخاری ومسلم کی روایات غزوۂ ذات الرقاع سے متعلق ہیں، جس میں ایک سے چار رکعت والی نماز کا اور دوسری دورکعت کا ثبوت ملتا ہے، ترمذی ونسائی کی روایات سے بھی عسفان والی نماز ملتی ہے اور بخاری کی روایتِ ابن عمرؓ کا تعلق بھی غزوۂ نجد سے متعلق ہے جس میں دوگروہ ہوکر نماز پڑھی گئی ہے، پھر لکھا کہ امام ابوحنیفہؒ نے صلوٰۃِ خوف کی نمازوں میں سے صرف اسی کو اختیار کیا ہے اوراس کے علاوہ کسی صورت کو جائز نہیں رکھا۔ نیز لکھا کہ حضور علیہ السلام کی صرف ذات الرقاع والی نماز کو ہی امام احمد نے بھی اختیار کیا ہے کیونکہ وہ ظاہرِ قرآن کے بہت موافق ہے اور نماز کی پوری احتیاط کے ساتھ دشمن سے حراست وحفاظت بھی اس میں زیادہ ہے اور آیت سے یہ بھی ثابت ہے کہ ہرگروہ امام سے الگ ہوکر چلا جائے گا اور اپنی اپنی نماز پوری کرے گا تو دشمن کا مقابلہ بھی پوری دل جمعی کے ساتھ کرسکے گا، پھر قاضی صاحب نے لکھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حالتِ قتال میں چلتے پھرتے نماز جائز نہیں ہے، کیونکہ قتال اور عملِ کثیران کے نزدیک مفسدِ صلوٰۃ ہے، البتہ سواراشارہ سے پڑھ سکتا ہے اور پیادہ زمین پر کھڑے ہوکر بھی اشارہ سے پڑھ سکتا ہے، امام احمد وشافعی کے نزدیک قتال کی حالت میں اور شدتِ خوف کے وقت جس طرح بھی ممکن ہو پڑھ سکتا ہے، چلنے کی حالت میں یا سوار ہو اور ترکِ استقبالِ قبلہ وعمل کثیر بھی ان کے یہاں جائز ہے (تفسیر مظہری ص ۲/ ۲۲۰) حنفیہ کے یہاں نمازِ خوف میں استقبالِ قبلہ کی شرط ساقط نہیں ہوتی۔

ضروری تنقیح: حضرت قاضی صاحب نے جولکھا کہ اور کوئی صورت حنفیہ کے یہاں جائز نہیں ہے، محلِ نظر ہے، کیونکہ آیتِ کریمہ میں اگرچہ صرف دشمن کے غیر سمتِ قبلہ میں ہونے کی صورت درج ہے، مگرسنن کی روایاتِ صحیحہ میں توسمتِ قبلہ والی نماز بھی ثابت ہے، اوراگرچہ فقہِ حنفی میں اس کو عام طور سے ذکرنہیں کرتے ، تاہم اس کے جواز میں کلام کیونکر ہوسکتا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ اگرلوگوں کا اصرار کسی ایک امام پر نہ ہوتو اس صورت میں خواہ قبلہ کی سمت میں دشمن ہو یا دوسری سمتوں میں تعدد جماعات بہ تعددِ ائمہ جائز بلکہ بعض حالات میں بہتر واحوط بھی ہوسکتا ہے، اوراس زمانہ میں کہ ہزاراں ہزار بلکہ لاکھوں کا اجتماع جنگ وجہاد میں ہوتا ہے، توکسی ایک امام کے ساتھ جماعت کی نماز بہت دشوار بھی ہے، بہرحال! احوال وظروف کے تحت تمام روایاتِ صحیحہ کے موافق عمل حنفیہ کے یہاں درست اور جائز ہی قرار پائے گا۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر درسِ بخاری شریف میں اس امر پر بھی توجہ فرمائی کہ یہ دوسری رکعت میں اگلی صفوں والوں کا پیچھے ہوکراور پچھلی والوں کا آگے ہوکر دوسری رکعت ادا کرنے کی حکمت ووجہ کیا ہوسکتی ہے؟ فرمایا کہ امام نے چونکہ آدھے لوگوں کواپنے ساتھ قریب کرکے ان کوصفِ اول کا ثواب زیادہ دلایا ہے، اس لئے حق تعالیٰ نے پچھلی صفوں والوں کو بھی ایک رکعت میں آگے جانے کا موقع دے دیا، تاکہ دونوں گروہ ثواب میں برابر ہوجائیں اور نمازِ خوف کے علاوہ دوسری نمازِ جماعت میں چونکہ خودلوگوں ہی کی کوتاہی ہوتی ہے کہ وہ جلد آگے

بڑھ کر اگلی صفوں میں شامل نہیں ہوتے۔اس لئے اس کے تدارک کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔فللہ درہ ما ادق نظرہ۔

نظریۂ ابن قیم پر ایک نظر

آپ نے زاد المعاد میں غزوۂ ذات الرقاع کے بیان میں لکھا کہ "یہ غزوہ نجد کے علاقہ میں ہوا، حضور علیہ السلام جمادی الاول ۴ھ میں بنی ثعلبہ (غطفان) سے جنگ کے لئے نکلے اور اسی غزوہ میں آپ نے صلوٰۃِ خوف پڑھائی، ابن اسحٰق اور دوسرے اصحاب سیر نے یہی کہا ہے اور علماء کی جماعتِ کثیر نے اسی کو قبول کیا ہے۔لیکن مشکل یہ ہے کہ یومِ خندق میں حضور علیہ السلام اور صحابہ سے کئی نمازیں فوت ہوئیں اور آپ نے صلوٰۃِ خوف نہیں پڑھی جبکہ غزوۂ خندق، غزوۂ ذات الرقاع کے بعد ۵ھ میں ہوا ہے، لہٰذا صلوٰۃِ خوف کی مشروعیت حسبِ روایت ابو عیاش زرقی عسفان میں ماننی چاہئے، جس کو اہلِ سنن اور امام احمد نے ذکر کیا ہے، پھر چونکہ غزوۂ ذات الرقاع میں بھی نمازِ خوف کا پڑھنا صحیح احادیث سے ثابت ہے، لہٰذا اس کو خندق و عسفان کے بعد مانیں گے، جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو موسیٰؓ غزوۂ ذات الرقاع میں شریک تھے، ان کی شرکت بعد ہی کو ہو سکتی ہے، پس ذات الرقاع کو خندق سے قبل بتلانا غلط ہوا، اور یہ تاویل بھی درست نہیں کہ غزوۂ ذات الرقاع دو مرتبہ ہوا ہے، ایک خندق سے پہلے ایک بعد میں، لہٰذا ہمارے نزدیک سب سے بہتر یہ ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع کو نہ صرف خندق کے بعد بلکہ خیبر کے بھی بعد میں قرار دینا چاہئے، واضح ہو کہ غزوۂ خندق ۵ھ میں اور بقولِ جمہور غزوۂ خیبر ۷ھ میں ہوا ہے (اوجز ص ۲/ ۳۶۵ میں ابن جوزی حنبلی کا بھی جزم بابتہ ۴ھ نقل کیا ہے)۔

ہم اوپر ابن جریر طبری وغیرہ سے روایت ذکر کر چکے ہیں کہ پہلے نمازِ قصر کا حکم اترا اور اس سے ایک سال بعد ہی نمازِ خوف کا حکم آ گیا اور غزوات میں اسی کے مطابق مختلف حالات و ظروف میں متعدد انواع کی نماز ہائے خوف پڑھی گئیں اور ابن القیم کے نزدیک نمازِ خوف کی ابتدا غزوۂ عسفان سے بتلائی ہے اور آیتِ کریمہ صلوٰۃِ خوف کا شانِ نزول اسی کو قرار دیا ہے مگر اس پر ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس غزوہ کی حدیث میں جو صورت اداءِ نمازِ خوف کی بیان ہوئی ہے وہ تو آیتِ کریمہ کی صورت سے مطابق نہیں ہے۔لہٰذا یہ ماننا چاہئے کہ آیتِ کریمہ کا نزول غزوۂ خندق سے قبل ہوا ہے اور خندق میں نمازیں اس لئے نہ پڑھی گئیں کہ میدانِ قتال گرم رہا، نمازِ خوف شدتِ قتال اور مسایفہ (تلواریں چلتی رہنے) کے وقت ممکن نہ تھی۔یہ نہیں ہے کہ خندق سے قبل نمازِ خوف مشروع ہوئی تھی۔(انوار المحمود ص ۱/ ۴۰۳)

امام بخاری کا جواب

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: غزوۂ ذات الرقاع میں ہی آیتِ نمازِ خوف نازل ہوئی ہے۔۴ھ یا ۵ھ کے شروع میں پھر یہ اختلاف ہوا کہ یہ غزوۂ خیبر سے پہلے ہوا یا بعد میں، امام بخاری کا میلان بعد کے لئے ہے اور اس میں انہوں نے سارے ہی علماءِ سیر کے خلاف رائے قائم کی ہے، کیونکہ اور سب اس کو خیبر سے قبل بتلاتے ہیں، تاہم یہ بات قابلِ تعجب ہے کہ خود امام بخاری نے اس کو کتاب المغازی میں خیبر سے قبل لیا ہے اور حافظ نے تاویل سے جواب دہی کی ہے۔میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے ذات الرقاع کی طرف دوبارہ سفر کیا ہے۔ایک دفعہ ۵ھ میں خیبر سے پہلے اور دوسری مرتبہ اس کے بعد ۷ھ میں، اسی کو حاکم نے بھی اکلیل میں اختیار کیا ہے اور مسلم شریف ص ۱/ ۲۷۹ حدیثِ جابر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضور علیہ السلام کے ساتھ جھینہ کے لوگوں سے قتال کیا اور سخت لڑائی ہوئی اور جہینہ سے ہی ذات الرقاع میں قتال مروی ہے اگر چہ بخاری میں قتال کا ذکر نہیں ہے اور حافظ نے بھی فتح اور تلخیص میں ایک ہی واقعہ مانا ہے، لہٰذا تعددِ واقعہ کا قول ضروری ہے اور میرے نزدیک یہی محقق ہے، حافظ نے امام بیہقی سے بھی ذات الرقاع کے تورد کو نقل کیا ہے میں نے امام بخاری یا حافظ کی مخالفت اس بارے میں پوری طرح انشراح کے بعد کی ہے بلکہ اس بارے میں اپنے رب

جلیل کی بارگاہ میں استخارات بھی کئے ہیں اس واقعہ کا ذکر نفحۃ العنبر ص ۱۸۲ میں بھی ہے اور فیض الباری ص ۴/۱۰۲ میں بھی اشارہ ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے امام بخاری کے قول وھی بعد خیبر لان ابا موسیٰ جاء بعد خیبر (ذات الرقاع کا غزوہ خیبر کے بعد ہوا کیونکہ ابوموسیٰ اس کے بعد ہی آئے ہیں) نقل کر کے فرمایا کہ امام بخاری نے ذات الرقاع کے ساتھ ذات قرو وغیرہ کئی مقامات کا ذکر کیا کہ یہ سب آگے پیچھے قریب زمانوں میں ہوئے ہیں، لہٰذا ذات الرقاع بھی موخر ہوا، حالانکہ ذاتِ قرو کا واقعہ خیبر سے تین سال قبل ہوا ہے، جس کی تصریح بخاری ص ۶۰۳ میں بھی ہے اور مسلم میں بھی۔ اور ہوسکتا ہے کہ ابوموسیٰ نے دوبارہ سفر کیا ہوالخ۔

حاشیۂ بخاری ص ۵۹۲ میں ہے کہ محدث علامہ دمیاطیؒ نے کہا کہ ابوموسیٰ کی بات باوجود صحت کے مشکل ہی سے چلے گی کیونکہ اہلِ سیر میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہوا کہ ذات الرقاع خیبر کے بعد ہوا ہے۔ البتہ ابومعشر سے اس کا بعد خندق وقریظہ کے ہونے کا قول تو نقل ہوا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ امام بخاری کے اختیارِ مذکور کے بعد ذات الرقاع کو خیبر سے قبل لانا اس امر کا بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ ذات الرقاع کا غزوہ متعدد ہوا ہو، خیبر سے پہلے اور بعد بھی اوجز ص ۲/۲۶۵ میں ہے کہ علامہ دمیاطی نے بخاری کی غلطی پر جزم کیا اور کہا کہ سارے ہی اہلِ سیر نے ان کے خلاف کہا ہے۔

صاحب روح المعانی کا ریمارک

آپ نے ص ۵/۱۳۶ میں لکھا کہ آیتِ کریمہ صلوٰۃِ خوف کا مصداق ذات الرقاع والی صلوٰۃِ خوف ہی بن سکتی ہے اور نمازِ عسفان پر اس کو محمول کرنا (جیسا کہ ابن القیم نے کیا) نہایت بعید ہے۔

افاداتِ معارف السنن

جمہور کے نزدیک آیتِ کریمہ صلوٰۃ الخوف کا نزول غزوۂ ذات الرقاع میں ہوا ہے جو جمہور کی تحقیق پر ۴ھ میں ہوا، اور اسی کو ابن سعد نے اختیار کیا ہے، باقی اقوال ۵ھ، ۶ھ اور ۷ھ کے بھی ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ذات الرقاع کا واقعہ صحیح قول پر احد کے ایک سال بعد ہوا ہے، جیسا کہ فتح الباری ص ۵/۲۳۵ میں بھی ہے اور میرے نزدیک اس واقعہ کا تعدد ماننا پڑے گا، اور اسی میں نمازِ خوف کا حکم اترا ہے، اس کو غزوۂ انمار وغطفان بھی کہا گیا ہے، جس نے اس کو ۴ھ میں مانا ہے، اس نے اس میں نماز کا بھی ذکر کیا ہے جیسے ابن سعد وغیرہ نے علامہ حلبی نے الحدیبیہ میں ذکر کیا کہ قرآن مجید میں صرف ذات الرقاع والی نماز کا حال بیان ہوا ہے۔ اور نسائی کی حدیثِ ابی عیاش زرقی میں یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ ارضِ نبی سلیم میں بھی نمازِ خوف پڑھی گئی ہے جبکہ علماءِ سیر کے نزدیک وہ غزوہ قرقرۃ الکدر یا غزوۂ نجران ہے اور یہ دونوں عسفان سے پہلے ہوئے ہیں۔ اور بخاری میں غزوۂ سابعہ میں نمازِ خوف پڑھی گئی، اس سے سابق کی نفی نہیں ہوتی۔ اور حافظ کی توجیہ غیر وجیہ ہے (معارف ص ۵/۳۶)۔

ابن القیم کی فروگذاشت

آپ نے جہاں حدیث ابی عیاش زرقی سے استدلال کیا ہے، وہاں اس امر سے تعرض نہیں کیا کہ اسی حدیث سنن کے آخر میں یہ جملہ بھی ضرور ہے کہ یہ نمازِ خوف بنی سلیم میں بھی پڑھی گئی ہے، جبکہ غزوۂ بنی سلیم حسبِ تصریح طبقات ابن سعد ص ۲۴، ۳ھ میں ہوا ہے اور خود ابن القیم نے تو اس کو بدر کے سات دن بعد بتلایا ہے، اس طرح وہ ۳ھ میں ہوا۔

اس سے ابن جریر کی روایتِ حضرت علیؓ کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ابتداءِ دورِ غزوات ہی سے نمازِ خوف مشروع چلی آتی ہے اور حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اوپر فرمایا کہ ذات الرقاع کا واقعہ پہلی بار احد کے ایک سال بعد ہوا ہے یعنی ۴ھ میں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضور علیہ السلام نے کتنی بار نمازِ خوف پڑھی

اوجز ص ۲/۲۶۳ میں ابن العربی سے نقل کیا کہ ۲۴ بار پڑھی، جن میں سے ۱۶ کی روایت اصح ہے۔ ابن حزم نے ۱۴ روایات کو صحیح کہا اوراس کے لئے مستقل رسالہ لکھا، علامہ عینی نے لکھا کہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں ۸ صورتیں نمازِ خوف کی بیان کیں۔ ابن حبان نے ۹ بیان کیں۔ قاضی عیاض نے اکمال میں ۱۳ نقل کیں۔ نووی نے ۱۶ تک بتلائیں۔ حدیثِ ابن ابی حثیمہ وابو ہریرہ وجابر میں نمازِ خوف یوم ذات الرقاع ۵ھ میں پڑھنا ماثور ہے اور حدیثِ ابی عیاش میں عسفان وبنی سلیم کی نمازوں کا ذکر ہے، اور غزوۂ نجد یوم ذات الرقاع میں جو غزوۂ غطفان بھی ہے نماز کا ثبوت ہے۔

حاکم نے اکلیل میں لکھا کہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ نجد دوبار ہوا ہے اور جس میں حضرت ابوموسیٰ وابوہریرہؓ شریک ہوئے ہیں وہ دوسری بار کا غزوہ تھا ابن القیم کی بات ماننے سے یہ لازم ہوگا کہ نمازِ خوف کا حکم اترا غزوۂ عسفان کے موقع پر اور سب سے پہلی نماز بھی اسی وقت ہوئی۔ اور وہ غزوۂ خندق کے بعد ہوا ہے، لہٰذا اتنی مدت تک گویا نمازِ خوف ہی نہیں پڑھی گئی اور وہ سب صرف آخری چند سالوں کی ہیں جبکہ دوسرے تمام اہلِ سیر غزوۂ بنی سلیم سے ہی نمازِ خوف کا سلسلہ شروع مانتے ہیں اور خود اسی حدیثِ زرقی سے بھی عسفان کے علاوہ بنوسلیم کی نمازِ خوف کا ثبوت ہورہا ہے۔ جس کا کوئی جواب ابن القیم کے پاس نہیں ہے۔

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک قسم کی نماز ان مواقع میں ہوئی جہاں دشمن کا لشکر سمتِ قبلہ میں تھا، جیسے عسفان میں اور شاید بنوسلیم کی بھی ایسی ہی ہوگی، کیونکہ عسفان والی نماز کی تفصیل بتا کر راوی نے بنوسلیم کی نماز کا ذکر کیا ہے، دوسری قسم کی احادیث ان مواقع کی ہیں جہاں دشمن کا لشکر سمتِ قبلہ کے سوا دوسری سمتوں میں تھا، جن میں ایک ساتھ سب نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، پھر واضح ہو کہ صلوٰۃِ خوف دشمن کے غیر سمتِ قبلہ والی بھی کئی طرح وارد ہیں، اور پہلے بتلایا گیا کہ حنفیہ کے یہاں دونوں طریقے درست ہیں۔ اسی طرح دشمن کے سمتِ قبلہ ہونے کی صورت میں جو نماز وارد ہے وہ بھی دو قسم کی ہیں، ابوداؤد میں صرف ایک قسم ہے کہ امام سب کو ساتھ لے کر کھڑا ہوگا کہ دشمن سامنے قبلہ ہی کے رخ میں ہے امام سب آدمیوں کو رکوع تک شریک رکھے گا، رکوع کے بعد اس کے قریب کی صفوں والے آدھے آدمی امام کے ساتھ سجدے میں چلے جائیں گے، اور آدھے قومہ میں کھڑے ہوئے حفاظت کا فرض انجام دیں گے، جب پہلی صفوں والے امام کے ساتھ سجدوں سے سر اٹھا کر دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوں گے تو اب پچھلی صفوں والے سجدہ کریں گے اس کے بعد یہ اگلی صفوں کی جگہ چلے جائیں گے اور وہ پیچھے آجائیں گے اور دوسری رکعت میں بھی رکوع تو سب ساتھ کریں گے لیکن سجدہ صرف اگلے آدھے کریں گے اور یہ پچھلے آدھے رکوع کے بعد قومہ میں کھڑے محافظت کریں گے، پھر جب اگلے سجدوں سے فارغ ہو کر قعدہ میں بیٹھیں گے تو یہ پچھلے سجدہ کر کے قعدہ کریں گے اور امام سب کے ساتھ سلام پھیرے گا۔

یہ تو نسائی میں جابر کی دونوں روایتوں میں ہے اور نسائی میں ایک روایت ابوعیاش زرقی سے بھی ابوداؤد کی طرح ہے لیکن دوسری روایت زرقی کی اس طرح ہے کہ پہلی رکعت کے بعد جب اگلے لوگ کھڑے ہوں گے تو وہ پیچھے آجائیں گے اور پچھلے لوگ آگے بڑھ جائیں گے پھر سجدہ کریں گے، اور امام دوسری رکعت سب کو ساتھ پڑھائے گا اور پہلی رکعت کی طرح آگے والے آدھے آدمی رکوع کے بعد امام کے ساتھ سجدہ کریں گے، اور پچھلے آدھے آدمی قومہ میں کھڑے ہو کر حفاظت کریں گے، اور وہ اگلے سجدہ کے بعد پیچھے آکر اپنے ان پیچھے والے ساتھیوں کی جگہ کھڑے ہوں گے، اور یہ آگے جا کر سجدہ کریں گے، پھر امام سب کے ساتھ سلام پھیر کر نماز ختم کرادے گا۔ لہٰذا اس روایت میں سابق تینوں روایتوں سے دو طرح فرق ہے ایک کی طرف صاحب بذل نے ص ۲/۲۴۶ میں اشارہ کیا ہے۔ لیکن دوسرے فرق مذکور کا ذکر نہیں

کیا۔اور بظاہر ترجیح جابر وزرقی کی متفقہ روایت کو ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اعلاء السنن میں دشمن کے سمتِ قبلہ میں ہونے کی صورت والی نماز کی حدیث کا ذکر نہیں کیا، اور اس کا حکم تو کسی نے بھی وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا۔ البتہ اوجز ص ۲۶۴/۳ میں یہ ہے کہ نمازِ خوف کی تمام صورتیں اس وقت ہیں کہ سب لوگ صرف ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنے پر اصرار کریں ورنہ افضل یہ ہے کہ ہر گروہ کو مستقل امام الگ الگ پڑھادے۔ امام ابو یوسفؒ سے جو حضور علیہ السلام کے بعد صلوٰۃ خوف سے انکار نقل ہوا، اس کی وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی موجودگی میں جو سب کا اصرار آپ کی امامت ہی میں نماز پڑھنے کا تھا یا ہوسکتا تھا، وہ دوسروں کے لئے نہیں ہوسکتا، لہٰذا حضور علیہ السلام کے بعد دوسری نمازوں کے طریقہ پر ہی تعددِ جماعات کے ساتھ عمل مناسب اور ایسر بھی ہے تاہم اس نقل میں بھی تسامح ہوسکتا ہے۔ کذا افادہ الشیخ الانورؒ۔

آیتِ کریمہ کس کے موافق ہے؟

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ آیتِ کریمہ میں جو نماز کی صفت بیان ہوئی ہے، اس کو مفسر بیضاوی نے شافعیہ کے موافق ثابت کرنے کی سعی کی ہے اور حنفیہ میں سے صاحب مدارک اور شیخ آلوسیؒ[1] نے اس کو حنفیہ کے موافق ثابت کیا ہے، میرے نزدیک آیتِ کریمہ پورے طور سے کسی کے بھی موافق نہیں ہے۔ بلکہ اس میں قصداً موضعِ تفصیل میں مسلکِ اجمال اختیار کیا گیا ہے اس میں پہلی رکعت کا بیان تو پورا ہے لیکن دوسری مجمل ہے، جو موضعِ انفصال تھی تاکہ عمل میں توسع، اور دونوں کے لئے گنجائش ہو، یہ میرا اغلب گمان ہے اگر صراحت اور تفصیل آجاتی تو صرف ایک ہی صورت متعین ہوجاتی اور یہ توسع حاصل نہ ہوتا۔ تاہم اگر ہم شروحِ حنفیہ والی دوسری شق اختیار کرلیں تو آیتِ کریمہ کا انطباق دونوں جزو پر اچھی طرح ہوجائے گا۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ فتح القدیر میں ایہام شدید ہے کہ صرف وہی صورت حنفیہ کے نزدیک جائز ہے جو متون میں درج ہے باقی نہیں اور فتح الباری میں بھی صرف اسی کو حنفیہ کی طرف منسوب کیا ہے، مگر مراقی الفلاح میں جملہ صفات جائز لکھی ہیں، لیکن اس کا مرتبہ فتح القدیر سے کم ہے، پھر صاحبِ کنز سے بھی دیکھا کہ انہوں نے بھی سب صورتوں کو جائز لکھا ہے تب اس کا یقین کرلیا۔ **وللہ دار الشیخ الانور ما ادق نظرہ و کمل فہمہ و عقلہ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔**

ایک رکعت والی بات صحیح نہیں

حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ بظاہر قرآن مجید سے امام کی دو رکعت اور مقتدیوں کی ایک رکعت معلوم ہوتی ہے اور بعض سلف نے اس کو بھی اختیار کیا ہے مگر فقہاءِ اربعہ میں سے کوئی اس کا قائل نہیں ہوا اور نہ وہ جمہور سلف کا مذہب ہے، وہ کہتے ہیں کہ قوم کی ایک رکعت کا ذکر اس لئے ہوا کہ ان کی دوسری رکعت امام کے ساتھ نہیں ہے، وہ خود الگ سے اپنی پڑھتے ہیں۔ قرآن مجید میں صرف امام کے ساتھ نماز کی کیفیت کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اور بعض سلف نے تو یہ بھی کہا کہ صرف تکبیر بھی کافی ہے، وہ بھی جمہور کا مختار نہیں ہے، اسی لئے ہم نے لکھا تھا کہ مودودی

---

[1] حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ علامہ آلوسیؒ میرے دو واسطوں سے استاذ ہیں، وہ بہت بڑے ادیب تھے۔ تفسیر میں ساری عبارتیں عربی ادب کا شاہکار ہیں، انہوں نے مقاماتِ حریری کا جواب بھی قلم برداشتہ لکھا تھا، نام مقاماتِ خیالی رکھا تھا (چھپی نہیں) اس کے سامنے مقاماتِ حریری کچھ نہیں ہے، ان کے یہاں آمد ہے اور حریری کے یہاں آورد، جس طرح جامی باوجود ذکاءِ مفرط کے سعدی کی شیرینی کلام کو نہ پہنچے، ان کے یہاں بھی آورد ہے اور سعدی کے یہاں آمد علامہ آلوسی چونکہ بڑے ادیب تھے اس لئے ان کے یہاں چبھتے ہوئے جملے بھی ملتے ہیں۔ تفسیر کی ۹ جلدیں ایسی ادیبانہ لکھیں جن کی نظیر نہیں ہے۔ اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ مشکلاتِ قرآن، مشکلاتِ حدیث سے زیادہ ہیں اور قرآنِ مجید کا حق ادا کرنا ناممکن ہے۔ میرا خیال ہے کہ کچھ عرصہ تک قرآن مجید کی خدمت زیادہ ہوگی، اور خدمتِ حدیث میں اضمحلال رہے گا کسی عاقل کا مقولہ ہے کہ کبھی قرآن مجید کے علوم پھیلتے ہیں اور کسی زمانہ میں حدیث کے علوم پھیلتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم ''مؤلف''

صاحب کوتفہیم القرآن میں اس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ بہت سے اقوال ذکر کرنے سے اور ہر اختلاف کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے عوام کے ذہن تشویش میں پڑ جاتے ہیں۔ایسی تفصیلات صرف خواص اہل علم کے لئے موزوں ہوسکتی ہیں۔

امام بخاری کی موافقت

ظاہر یہ ہے کہ امام بخاری نے بھی صفت حنفیہ ہی کو اختیار کیا ہے اور اسی کو اقرب الی نص القرآن بھی سمجھ کر آیت ذکر کی ہے اور اسی لئے یہاں حدیث ابن عمرؓ کو لائے جو اصح مانی الباب بھی ہے یہاں صفتِ شافعیہ والی حدیث بھی نہیں لائے ، بلکہ اسی کو آگے غیر باب الصلوٰۃ میں مغازی کے اندر لائیں گے، یہ بھی بڑا قرینہ موافقتِ حنفیہ کا ہے۔قولہ تعالیٰ ولیا خذو احذرھم پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ دوسرے طائفہ کے ذکر پر حذر کا لفظ اس لئے زیادہ کیا کہ وہ لوگ دشمن کی طرف سے پیٹھ پھیر کر آئیں گے، اس لئے ان پر دشمن کے حملہ کا خوف زیادہ ہے۔لہٰذا زیادہ احتیاط اور تیقظ اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی۔

آیتِ کریمہ میں مقصود قصر عدد ہے یا قصرِ صفت؟

اس بارے میں علماء نے طویل کلام کیا ہے قصرِ عدد سے مراد رکعات کی کمی ہے جو سفر میں ہوتی ہے، اور قصر صفت سے مراد قصرِ جماعت ہے کہ امام کے ساتھ آدھی نماز ہر گروہ پڑھتا ہے اور آدھی خود سے الگ پڑھتا ہے۔ یہ نمازِ خوف میں ہوتا ہے، اس کو ابن القیم نے نہ سیئت کہا ہے، اختلاف قولِ باری تعالیٰ فلیس علیکم جناح ان تقصرو امن الصلوٰۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا" کی وجہ سے ہوا، جس سے اشارہ ملا کہ قصرِ رخصت ہے رفاہیت کے لئے ، اور قصرِ اسقاط نہیں ہے۔لہٰذا قصر وترکِ قصر دونوں کا درجہ برابر ہونا چاہئے ، اور اگر ہم کہیں کہ آیتِ مذکورہ میں قصرِ عدد مراد ہے تو شافعیہ کا مسلک قوی ٹھہرے گا، قصرِ صفت مراد ہو تو بات دوسری ہو جائے گی۔اور وہی نظمِ قرآنی کے لحاظ سے یہاں زیادہ راجح ہو جاتی ہے کیونکہ سفر میں تو قصر کی اجازت بدوں خوف کے بھی بالاتفاق ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ چار صورتیں ہیں (۱) اقامت ہو مع امن کے، اس میں بالاتفاق سب کے نزدیک پوری نماز پڑھی جاتی ہے (۲) سفر بھی ہوا اور خوف بھی دشمن وغیرہ کا اس میں قصر بالاتفاق ہے عدداً بھی اور صفةً بھی (۳) اقامت ہو مع خوف کے تو اس میں بالاتفاق قصرِ صفت ہے (۴) سفر ہو مع امن کے تو اس میں حنفیہ قصرِ عدد کو حتمی ولازمی قرار دیتے ہیں اور شافعیہ اس کو صرف جائز کہتے ہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک آیتِ کریمہ قصرِ ہیئت کے لئے اتری ہے اور ضمناً وتبعاً اس میں قصرِ عدد بھی ملحوظ ہے کیونکہ عادتاً خوف کی نماز حالتِ سفر میں ہوتی ہے، چونکہ اس وقت مخاطب بھی حالتِ سفر میں تھے جن کو دشمن کا مقابلہ پیش آیا، اس لئے مقصود بھی بیان قصرِ صفت ہوا اور قصرِ عدد کا ذکر ضمناً ان کے مسافر ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔ملاحظہ فرمائیں فیض الباری ص ۳۵۲/۲)۔

نماز خوف کے علاوہ قرآن مجید میں کسی اور نماز کی کیفیت وتفصیل کیوں نہیں؟

حضرتؒ نے فرمایا کہ دوسری نمازوں کے ارکان بھی فرداً فرداً بہت سی آیات میں بیان ہوئے ہیں، مثلاً قیام کا قوموا للہ قانتین میں، رکوع وسجود کا وارکعوا واسجدوا میں، قراءت کا ورتل القرآن ممیّزہ ہیں۔ تاہم صفت وکیفیت یکجا طور سے نمازِ خوف کی طرح بیان نہیں ہوئی، کیونکہ قیام، رکوع، سجود، قراءت وتسبیح کا ذکر اسی حیثیت سے ہوا ہے کہ وہ سب اجزاء صلوٰۃ ہیں، اور ان سب کا حکم بہ ضمن صلوٰۃ ہوا ہے، لہٰذا اہم اجزاءِ صلوٰۃ پر تنبیہ کر دی گئی ہے، گویا اس طرح دوسری نمازوں کی بھی صفت وکیفیت بیان ہوگئی ہے، اسی لئے میں رکوع وسجود وغیرہ کو جز و اول کو کل مراد لینے کی صورت مجاز والی نہیں مانتا، اور ہر رکن کے لئے مامور بہ ہونا بحیثیت اس کے کہتا ہوں کہ وہ ضمن صلوٰۃ میں وارد ہے پس

مامور بہ وہ سب اجزاءِ بضمنِ صلوٰۃ ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کس کی صلوٰۃِ خوف حدیث کے موافق ہے؟

حضرتؒ نے فرمایا کہ حدیثِ ابن عمرؓ نے بتایا کہ پہلی رکعت کے بعد پہلا گروہ دشمن کے مقابل چلا جائے گا، پھر دوسرا گروہ آ کر ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھے گا، اور امام سلام پھیر دے گا (کیونکہ اس کی دونوں رکعت پوری ہو چکیں) یہاں تک حدیث صاف طور سے حنفیہ کے موافق ہے، پھر حدیث کے جملہ فقام کل واحد منهم فركع لنفسه ركعة الخ میں ابہام آ گیا کہ دوسری رکعت کس طرح پوری کریں اور اس کے ظاہر سے شروح حنفیہ والی بات ثابت ہوتی ہے۔

فوائد متفرقہ: (۱) حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر کفار جانبِ قبلہ میں ہوں تو صلوٰۃ الخوف سب ساتھ ہی پڑھیں گے۔ بذل المجہود ص ۲/ ۲۴۵، اعلاء السنن ص ۸/ ۱۱۶ میں ہے کہ جتنی بھی صورتیں نمازِ خوف کی رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے صحیح طور سے مروی ہیں وہ سب ہی تمام فقہاء کے نزدیک مقبول ہیں اور اختلاف صرف اولیٰ وافضل کا ہے، بجز دو صورتوں کے کہ امام ابوحنیفہؒ ان میں تاویل کرتے ہیں یا ان کو حضور علیہ السلام کی خصوصیت پر محمول کرتے ہیں۔ (الخ)

علامہ نیمویؒ نے صلوٰۃ الخوف کی روایات ذکر کر کے آخر میں لکھا کہ اس کی انواع مختلف ہیں اور اس کی صورتیں بھی بہت سی اخبارِ صحیحہ میں وارد ہیں، حضرت علامہ کشمیریؒ نے اس کے نیچے حاشیہ لکھا کہ وہ سب صورتیں جائز ہیں جیسا کہ بدائع میں ہے (آثار السنن ص ۲/ ۱۱۶)

فتح القدیر ص ۱/ ۴۴۲ میں ہے کہ امام ابو یوسف سے ایک روایت مطلقاً مشروعیتِ صلوٰۃ خوف کی بھی ہے، اور ان کے نزدیک جب دشمن سمتِ قبلہ میں ہو تو نماز کا طریقہ وہی ہے جو حدیث ابوعیاش زرقی میں مروی ہے، دوسری روایت عدم مشروعیت بعد النبی صلے اللہ علیہ وسلم کی ہے جو صحابۂ کرامؓ کے بعد زمانۂ نبوت پڑھنے کی وجہ سے مرجوح ہے۔ تاہم فقہاء نے یہ بھی لکھا کہ جب کسی ایک امام پر اصرار یا جھگڑا نہ ہو تو افضل یہی ہے کہ الگ الگ امام ایک ایک گروہ کو پوری نماز پڑھائے۔ لہٰذا تفسیر مظہری ص ۲/ ۲۲۱ میں یہ لکھنا محلِ نظر ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے صرف ایک صورت کو جائز کہا اور اس کے سوا کو جائز نہیں رکھا، یا یہ ایک صورت دشمن کی غیر سمتِ قبلہ کی صورتوں میں سے مراد ہے تو بات صحیح ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲: بذل المجہود ص ۲/ ۲۴۵ میں مراقی الفلاح سے نقل کیا کہ نمازِ خوف دشمن کی موجودگی کی صورت میں بھی صحیح ہے۔ اور جب سیلاب میں غرق ہونے یا آگ میں جل جانے کا خوف ہو تب بھی صحیح ہے، اور قوم ایک ہی امام پر جھگڑا کرے کہ بغیر اس کے نماز نہ پڑھے گی تو نمازِ خوف رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے طریقہ پر پڑھی جائے گی۔

بَابُ صَلٰوةِ الْخَوْفِ رِجَالاً وَّرُكْبَانًا رَاجِلٌ قَآئِمٌ

(پیدل اور سوار ہو کر خوف کی نماز پڑھنے کا بیان۔ راجل سے مراد پیدل ہے)

۸۹۴. حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ يَحْيَى بْنِ سَعِيدِ الْقُرَشِيُّ قَالَ حَدَّثَنِي أَبِي قَالَ حَدَّثَنَا بْنُ جُرَيْجٍ عَنْ مُّوسَىٰ بْنِ عُقْبَةَ عَنْ نَّافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ نَحْوًا مِّن قَوْلِ مُجَاهِدٍ إِذَا اخْتَلَطُوْا قِيَامًا وَّزَادَ بْنُ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِنْ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَلْيُصَلُّوْا قِيَامًا وَّرُكْبَانًا.

ترجمہ ۸۹۴۔ نافع نے ابن عمر سے مجاہد کے قول کی طرح نقل کیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے خلط ملط ہو جائیں تو کھڑے ہی نماز پڑھیں اور حضرت ابن عمرؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس زیادتی کے ساتھ روایت کیا کہ اگر دشمن زیادہ ہوں تو مسلمان کھڑے ہو کر اور سوار ہو کر (یعنی جس طرح بھی ممکن ہو سکے) نماز پڑھیں۔

تشریح:۔امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں آیت فان خفتم فرجالا اور کبانا۔(بقرہ آیت نمبر ۲۳۹) کے بارے میں لکھا کہ خوف کی دو قسم ہیں اور اس آیت میں حالتِ قتال کا خوف مراد ہے اور دوسری آیت سورۃ نساء والی جس میں نماز خوف کی ترکیب بھی بتلائی گئی ہے، وہ حالتِ غیر قتال سے متعلق ہے، لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ جب میدانِ کارزار گرم ہو تو امام شافعیؒ کے نزدیک مجاہدین بحالتِ سواری اور چلتے ہوئے بھی نماز پڑھ سکتے ہیں، وہ اسی آیت بقرہ سے استدلال کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ چلنے والا نماز نہ پڑھے گا بلکہ نماز کو مؤخر کرے گا جیسا کہ غزوۂ خندق میں حضور علیہ السلام نے مؤخر کردی تھی (الخ) امام رازی نے مسلکِ شافعیؒ کی تائید خوب کی ہے اور علامہ جصاصؒ نے اپنی تفسیر احکام القرآن میں حنفیہ کی تائید اچھی طرح کی ہے۔وہاں دیکھ لی جائے۔

حضرت شیخ الاحدیث دامت برکاتہم نے اوپر کی تفصیل نقل کرکے لکھا کہ اس میں شک نہیں یہاں حدیثِ موطأ امام مالکؒ میں صلوا رجالا کے ساتھ قیماً علی اقدامھم کی تفسیر سے حنفیہ کی ہی تائید ہوتی ہے، اور امام بخاریؒ کا میلان بھی اسی طرف ہے، انہوں نے بھی راجل کا مطلب قائم لکھا ہے۔حافظ ابن حجرؒ نے تسلیم کیا کہ امام بخاری یہی بتانا چاہتے ہیں کہ یہاں آیتِ قرآنیہ میں راجل سے مراد قائم ہے۔اگرچہ دوسری جگہ سورۂ حج کی آیت یاتوک رجالا میں اس کا اطلاق ماشی (چلنے والے) پر بھی ہوا ہے۔(اوجز ص ۲/۲۷۰) امام بخاری نے حدیث الباب میں بھی مرفوعاً روایت کیا کہ دشمن زیادہ ہوں تو نماز قیاماً (کھڑے ہوکر) پڑھی جائے۔اس حدیث میں بجائے رجالا کے قیاماً وارد ہے، اور اس کے ساتھ رکباناً ہے معلوم ہوا کہ مقابلہ یہاں ماشی وراکب کا نہیں بلکہ قائم وراکب ہی کا ہے۔واللہ اعلم۔

حافظ نے لکھا کہ بہ سندِ صحیح مجاہد سے مروی ہوا کہ خوف کے وقت ہر جہت کی طرف کھڑے ہوکر اور سواری پر نماز پڑھی جائے (فتح ص ۲/۲۹۵)

تفسیر مظہری ص ۱/۳۳۸ میں ہے۔امام شافعی واحمدؒ نے آیت فرجالا اور کبانا سے استدلال کیا کہ نماز حالتِ قتال میں بھی جائز ہے اور ابن الجوزی حنبلیؒ نے حدیثِ ابن عمر بخاری سے استدلال کیا کہ جب حضرت ابن عمرؓ سے نمازِ خوف کے بارے میں سوال کیا جاتا تو اس کا طریقہ بتلایا کرتے تھے، پھر فرماتے تھے کہ اگر خوف بہت شدید ہو تو لوگ پاپیادہ کھڑے کھڑے نماز پڑھیں گے، یا سوار ہوں تو سواریوں پر بھی، خواہ اس وقت استقبالِ قبلہ بھی ہو یا نہ ہو۔حضرت نافع نے فرمایا مجھے اطمینان ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے یہ بات حضور علیہ السلام سے ہی استفادہ کرکے بیان فرمائی ہوگی۔

حضرت قاضی صاحبؒ نے لکھا کہ آیت میں کوئی دلیل اس امر پر نہیں ہے کہ بحالتِ قتال بھی نماز جائز ہے کیونکہ راجل کے معنی چلنے والے کے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد دونوں پاؤں پر کھڑا آدمی ہے اور حدیث میں بھی رجالا وقیاماً بطور عطف تفسیری وارد ہے، اس سے بھی جوازِ صلوٰۃ ماشیاً کی نفی ہوتی ہے، اور حضرت نافع کا زعم بھی مضمونِ حدیث کے مرفوع ہونے کا ہے۔اگرچہ وہ صراحتِ رفع کے برابر نہیں ہے۔

اگر کہا جائے کہ نمازِ خوف میں تو آنا جانا اجماعاً جائز ہے، جیسا کہ آیتِ سورۂ نساء سے ثابت ہے۔لہٰذا چلنے کی حالت میں بھی نماز درست ہونی چاہئے، تو ہم کہیں گے کہ جو امر خلافِ قیاس شریعت سے ثابت ہوتا ہے وہ صرف اسی پر مقصود رہتا ہے دوسرے یہ کہ نماز کے اندر چلنا ایسا ہی ہوگا کہ جیسے حدث والا وضو کے لئے جاتا ہے، تو یہ پھر بھی کم درجہ کا ہے۔بہ نسبت اس کے کہ پوری نماز ہی چلتے چلتے پڑھی جائے، لہٰذا ادنیٰ کو اعلیٰ کے ساتھ نہیں ملا سکتے۔

مسئلہ: حضرت قاضی صاحبؒ نے فرمایا کہ اس آیت کی بنا پر سب نے مان لیا کہ خوف شدید ہو تو سواری اپنی سواریوں پر ہی نماز پڑھ لیں گے اور رکوع وسجدہ اشارہ سے کریں گے، اور قبلہ کی طرف رخ کرنا ممکن نہ ہو تو وہ بھی ضروری نہ رہے گا، لیکن امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ یہ نماز جماعت سے نہ ہوگی، تنہا الگ الگ پڑھیں گے، صاحبِ ہدایہ نے لکھا اس لئے کہ سواریوں پر نماز میں اتحادِ مکان نہیں ہوتا، امام محمدؒ نے جماعت کی بھی اجازت دی ہے۔(تفسیرِ مظہری ص ۱/۳۳۸) امام ابو یوسف بھی امام صاحب کے ساتھ ہیں۔

صاحبِ روح المعانی نے ص۲/۱۵۸ میں لکھا کہ بروئے انصاف ظاہر آیت شافعیہ کے لئے صریح ہے آپ نے حنفیہ کے لئے تائیدی دلیل کا ذکر مختصراً کر دیا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے موطا مالک، بخاری و مسلم سے **صلوا رجالا علی اقدامھم** اور کبانا اور حضرت ابن عمر کا قول مسلم سے **فصل راکبا او قائما تؤمئ ایماء** اور ابن ابی حاتم سے روایت ابن عباس بھی اس آیت کی تفسیر میں نقل کی کہ سوار اپنی سواری پر اور پیدل اپنے دونوں پیروں پر نماز پڑھے گا۔ (ص۱/۲۹۵)۔

تفسیر درمنثور للسیوطیؒ ص۱/۳۰۸ میں امام مالک، شعبی، عبدالرزاق، بخاری، ابن جریر و بیہقی سے روایت ابن عمرؓ کی نقل کی جس میں **صلوا رجالا قیا ما علی اقدامھم اور کبانا** ہے اور ابن ابی شیبہ، مسلم و نسائی سے حدیث ابن عمرؓ میں **فاذا کان الخوف اکثر فصل راکبا او قائما تؤمی ایماءً** ہے اور ابن ابی حاتم والی بھی اوپر کی روایت ذکر کی، پھر بعد کو امام شافعی کے مستدل آثار بھی ذکر کئے جو اوپر کے درجہ کے نہیں ہیں اس سے اندازہ ہوا کہ ان کا انصاف برخلاف صاحبِ روح المعانی کے حنفیہ کے ساتھ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ذکرِ تراجم وفوائد

حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ اس طرح ہے: ''پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھ لو یا سوار اور فوائد میں علامہ عثمانیؒ نے لکھا'' اور پیادہ بھی اشارہ سے نماز درست ہے گو قبلہ کی طرف منہ نہ ہو'' (ص۴۹) آپ نے دیکھا کہ ترجمہ اور فوائد اور دونوں میں اجمال ہے، جو کافی نہیں۔ ایسے معرکۃ الآرا اختلافی مسئلہ میں وضاحت اور مسلکِ حنفیہ کے موافق ترجمہ و تفسیر ہونی چاہئے تھی۔ البتہ حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ نے ترجمہ اس طرح کیا: ''پھر اگر تم کو خوف ہو تو یا پیادہ کھڑے کھڑے پڑھ لو یا سواری پر پڑھ لو۔ (ص۱/۶۰) اور حاشیہ میں بھی مسلکِ حنفی کی وضاحت کی مگر حضرت شاہ عبدالقادرؒ سے اجمال ہی نقل ہوا (ضمیمہ)

حضرت تھانوی قدس سرہ نے ترجمہ کیا: ''پھر اگر تم کو اندیشہ ہو تو تم کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے پڑھ لیا کرو'' اور آپ نے حاشیہ میں لکھا: شافعیہ نے رجالا سے استدلال کیا کہ نمازِ خوف میں جب وقتِ خوف چلنے کی اجازت آ گئی تو وقتِ قتال بھی چلتے چلتے نماز درست ہوگی۔ اس کا جواب ہمارے علمائے حنفیہ نے یہ دیا ہے کہ رجال سے مراد وہ ہے جو اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔ کیونکہ راجل ماشی اور واقف دونوں کے لئے مستعمل ہے بطور اشتراک معنوی کے پھر چونکہ مشی فعل کثیر ہے، جس کے جواز پر یہاں کوئی دلیل نہیں ہے تو وہ مفسدِ صلوٰۃ ہوگی، لہٰذا مجبوری اور قتال کے وقت چلتے چلتے نماز درست نہ ہوگی، اور اس کو مؤخر کریں گے۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے غزوۂ خندق میں مؤخر کی تھی اور نمازِ خوف کا حکم غزوۂ ذات الرقاع میں خندق سے پہلے آ چکا تھا جیسا کہ روح المعانی میں ابن اسحٰق وغیرہ اہل سیر سے نقل ہوا ہے۔ (بیان القرآن ص۲/۹۴)

نطق انور: حضرتؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کے نزدیک چلتے پھرتے نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے اور نہ قتال کی حالت میں اور صلوٰۃ الخوف کی نماز میں جو آنے جانے کی اجازت ہے اس میں اور پوری نماز ہی چلنے کی حالت میں پڑھنے میں فرق ہے ان دونوں کو ایک درجہ نہیں دے سکتے، امام بخاری نے راجل کی تفسیر قائم سے نقل کر کے بتایا کہ وہ مذہبِ حنفی کو ترجیح دے رہے ہیں اور حالتِ مشی کی نماز کو جائز نہیں قرار دیتے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ اسی طرح ہمارے یہاں سواری پر چلتے ہوئے بھی فرض نماز جائز نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ سوار مطلوب ہو، یعنی دشمن اس کے تعاقب میں ہو اور اگر طالب ہو کہ وہ خود دشمن کا تعاقب کر رہا ہو تو اتر کر نماز پڑھے گا، کیونکہ اسے کوئی ڈر نہیں ہے۔ اس باب میں عمدۃ القاری ص۳/۳۴۴ بھی دیکھی جائے۔ **فان فیھا ایضا افادات قیمۃ۔**

بَابٌ يَحْرُسُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا فِيْ صَلٰوةِ الْخَوْفِ

(نمازِ خوف میں ایک دوسرے کی حفاظت کا خیال رکھیں)

۸۹۵. حَدَّثَنَا حَيْوَةُ بْنُ شُرَيْحٍ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَرْبٍ عَنِ الزُّبَيْدِيِّ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَامَ النَّاسُ مَعَهُ فَكَبَّرَ وَكَبَّرُوْا مَعَهُ وَرَكَعَ وَرَكَعَ نَاسٌ مِنْهُمْ ثُمَّ سَجَدَ وَسَجَدُوا مَعَهُ ثُمَّ قَامَ لِلثَّانِيَةِ فَقَامَ الَّذِيْنَ سَجَدُوْا وَحَرَسُوْا اِخْوَانَهُمْ وَاَتَتِ الطَّائِفَةُ الْاُخْرٰى فَرَكَعُوْا وَسَجَدُوْا مَعَهُ وَالنَّاسُ كُلُّهُمْ فِيْ صَلٰوةٍ وَّلٰكِنْ يَّحْرُسُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا.

ترجمہ ۸۹۵۔ حیوۃ ابن شریح، محمد ابن حرب، زبیدی، زہری، عبیداللہ بن عتبہ، حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور لوگ بھی ان کے ساتھ کھڑے ہوئے، آپ نے تکبیر کہی تو لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ تکبیر کہی، آپ نے رکوع کیا تو لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ رکوع کیا، پھر آپ نے سجدہ کیا تو لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا، پھر دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے تو جن لوگوں نے سجدہ کیا تھا وہ کھڑے ہوئے اور اپنے بھائیوں کی نگرانی کی، اور ایک دوسری جماعت آئی، جس نے آپ کے ساتھ رکوع اور سجدے کئے اور سب لوگ نماز ہی میں تھے۔ لیکن ایک دوسرے کی نگرانی بھی کر رہے تھے۔

تشریح:۔ حافظ نے لکھا: ابنِ بطالؒ نے کہا کہ حراست بعض للبعض کی صورت اس وقت ہوتی ہے جب دشمن سمتِ قبلہ میں ہو۔ لہٰذا الگ گروہ بننے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، بخلاف حدیثِ ابن عمرؓ والی صورت کے اور امام طحاوی نے کہا کہ حدیث الباب والی صورت قرآن مجید کی بیان کردہ ھیئتِ صلوٰۃ **والتات طائفة اخرى لم يصلوا** (الآیہ) کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اس وقت کے لئے ہے دشمن قبلہ کے علاوہ کسی دوسری سمت میں ہو جس کی وضاحت حضور علیہ السلام کے ذریعہ بھی ہوگئی، دوسری صورت کو حضور علیہ السلام نے ہی بتایا کہ دشمن سمتِ قبلہ میں ہو تو نماز کس طرح پڑھی جائے۔ واللہ اعلم (فتح ص۲/ ۲۹۶ وعمدہ ص۳/ ۳۴۵)۔

علامہ عینیؒ نے یہ بھی لکھا کہ مطابقت ترجمہ **قولہ حرموا اخوانھم** میں ہے اور لکھا کہ دوسری حدیث حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے غزوۂ ذی قرد میں نمازِ خوف پڑھائی جبکہ مشرکین آپ کے اور قبلہ کے درمیان تھے اور ابوعیاش زرقی وجابر سے بھی مرفوعاً یہی نماز کی صورت مروی ہے، اور یہی مذہب حضرت ابن عباس، پھر ابن ابی لیلیٰ وامام شافعی کا بھی ہے اور امام طحاوی نے امام ابویوسف سے بھی اس کو نقل کیا۔

امام مالک وامام ابوحنیفہ نے اس صورت کو مخالفتِ صورت قرآن کے سبب سے ترک کیا، کیونکہ اس میں سب کی نماز ایک ساتھ نہیں ہے۔ **اشھب و سمنون** نے کہا کہ جب دشمن قبلہ کی سمت میں ہو تب بھی سارے لشکر کے ساتھ نماز پڑھنا، اسلئے پسندیدہ معلوم نہیں ہوتا کہ دشمن سب کو نماز میں مشغول دیکھ کر حملہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں بھی اگر دو گروہ والی ہی قرآنی نماز کی صورت کو اختیار کیا جائے تو بہتر ہے۔ واللہ اعلم (عمدہ ص۳/ ۳۴۶)۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ ترجمۃ الباب بخاری نے اس لئے باندھا کہ متنِ حدیث میں لفظ حراست آیا ہے اور جو صورت حدیث الباب میں وارد ہے وہ اس صورت میں زیادہ نافع ہے کہ دشمن سمتِ قبلہ میں ہو۔

قولہ فکبرو کبروامعہ سے معلوم ہوا کہ اس نماز کی صورت میں وہ سب ہی تحریمہ میں امام کے ساتھ رکوع تک شریک ہوں گے، پھر پچھلے آدمی سجدہ میں تناوب کریں گے کہ اگلی صفوں والے دونوں رکعت میں امام کے ساتھ سجدہ کریں گے اور یہ پیچھے والے بعد کو کریں گے، کیونکہ حراست کے لئے یہ ضروری ہے۔

قولہ واتت الطائفۃ الاخری سے یہ مطلب نہیں کہ ایک جا کر دوسری آئے گی بلکہ یہاں صفوں ہی کے اندر تقدم وتاخر مراد ہے تاکہ دونوں گروہ کو ثواب برابر مل جائے۔

افادۂ شیخ الحدیث دام ظلہم

حضرت نے لکھا کہ میری سمجھ میں ایسا آتا ہے کہ امام بخاری نے اس باب میں خاص صورت بتلانے کا ارادہ نہیں کیا بلکہ ایک دوسری اہم بات پر تنبیہ کی ہے وہ یہ کہ احادیث میں بہ کثرت آیا ہے کہ نماز پوری توجہ سے پڑھی جائے، اور دوسری کسی چیز کی طرف التفات بھی نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نماز کے اندر بندے کی طرف خاص توجہ فرماتے ہیں۔ جب تک کہ وہ دوسری طرف دھیان نہ دے، اور جب وہ ایسا کرتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس کی طرف سے توجہ ہٹا لیتے ہیں۔ تو یہاں یہ بتانا ہے کہ نمازِ خوف ان سب امور سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ اس کی مشروعیت میں یہ امر بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ حالتِ صلوٰۃ میں ایک دوسرے کی حفاظت کا بھی دھیان وخیال رکھو، بس اگر کوئی شخص نمازِ خوف میں بھی صرف نماز میں دھیان رکھے گا اور ایک دوسرے کی حراست وحفاظت کا خیال نہ کرے گا تو اس نماز کا بڑا فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ جس میں بہت سے افعال بھی جائز قرار دے دیئے گئے ہیں مثلاً نماز میں مسلح ہتھیار بند رہنا، چلنا وغیرہ اور تمام دوسری نمازوں کے خلاف خاص صورت سے نماز پڑھنا، اور شدید قتال کے وقت استقبالِ قبلہ بھی ضروری نہ رہنا، وغیرہ، پھر حضور علیہ السلام کی اپنی نماز ہی پر نظر کرو کہ وہ کتنے خشوع وخضوع واہتمام کے ساتھ ہوتی تھی، مگر ابوداؤد میں ہے کہ ایک بار صبح کی نماز کیلئے تثویب ہوئی اور آپ نے نماز شروع فرمائی تو آپ نماز میں دشمن کے قبیلہ کی طرف التفات کرتے تھے، جس کی طرف آپ نے ایک گھوڑے سوار کورات کے وقت بھیجا تھا کہ ان کے آنے سے باخبر ہو اور حفاظت کرے۔ تو جب حضور علیہ السلام بھی ایسے مواقع میں التفات کرتے تھے تو خاص طور سے دشمنوں کے نرغے اور حملہ کے وقت تو اور بھی زیادہ تیقظ اور چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اگر نمازِ خوف میں التفات وغیرہ ایک دوسرے کی حفاظت کے خیال سے ہو تو اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا (لامع ص۲/۳۲)

جذبۂ ایثار واخلاص

یوں تو ہر وقت اور ہر موقع پر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کی جان ومال وآبرو کی حفاظت کرے، مگر دیکھا گیا کہ جہاد وغزوات کے مواقع میں مسلمان مجاہدین ایک دوسرے پر جاں نثاری کا حق ادا کرنے میں بے نظیر وبے مثال تھے، اور ایک بار لوگوں نے حضرت خالد سے پوچھا تھا کہ آخر آپ لوگوں کی غیر معمولی فتوحات کا راز کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا تھا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کرتا ہے اور یہ اخلاص وایثار کا جذبہ ہی ہماری کامیابی کا بڑا سبب ہے۔ برخلاف اس کے کافر ومشرک ہیں کہ وہ سب اپنی اپنی جان بچاتے ہیں بلکہ وہ اپنے ساتھیوں کو خطرہ میں ڈال کر بھی اپنی جان بچا لیا کرتے ہیں لیکن ایک مسلمان کی شان اس کے برعکس اور نرالی ہے کہ وہ خود کو خطرہ میں ڈال کر بھی دوسرے مسلمان بھائی کی جان بچاتا ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ مسلمان کفار کے مقابلہ میں "بنیان مرصوص" کی طرح ہوا کرتے ہیں، یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیواریں اور آہنی چٹانیں، ظاہر ہے چند اینٹوں سے جڑی ہوئی دیوار میں جو قوت وطاقت ہے وہ ہزاروں لاکھوں منتشر اینٹوں کے ڈھیر میں نہیں ہو سکتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بَابُ الصَّلٰوةِ عِنْدَمُنَا هَضَةِ الْحُصُوْنِ وَلِقَاءِ الْعَدُوِّ وَقَالَ الْاَوْزَاعِيُّ اِنْ كَانَ تَهَيَّا الْفَتْحُ وَلَمْ يَقْدِرُوْا عَلَى الصَّلٰوةِ صَلُّوْا اِيْمَآءً كُلُّ امْرِئٍ لِنَفْسِهٖ فَاِنْ لَمْ يَقْدِرُوْا عَلَى الْاِيْمَآءِ اَخَّرُوْا الصَّلٰوةَ حَتّٰى يَنْكَشِفَ الْقِتَالُ اَوْيَاْ مَنُوْا فَيُصَلُّوْا رَكْعَتَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يَقْدِرُوْ اَصَلُّوْا رَكْعَةً وَسَجْدَتَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يَقْدِرُوْا فَلَا يُجْزِءُ هُمُ التَّكْبِيْرُ وَيُؤَخِّرُوْنَهَا حَتّٰى يَاْمَنُوْا وَبِهٖ قَالَ مَكْحُوْلٌ وَّقَالَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ حَضَرْتُ مُنَاهَضَةَ حِصْنِ تُسْتَرَ عِنْدَاِضَاءَةِ الْفَجْرِ وَاشْتَدَّ اشْتِعَالُ الْقِتَالِ فَلَمْ يَقْدِرُوْا عَلَى الصَّلٰوةِ فَلَمْ نُصَلِّ اِلَّا بَعْدَ ارْتِفَاعِ النَّهَارِ فَصَلَّيْنَاهَا وَنَحْنُ مَعَ اَبِيْ مُوْسٰى نَفْسِحَ لَنَا قَالَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ وَّمَا تَسُرُّنِيْ بِتِلْكَ الصَّلٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا.

(قلعوں پر چڑھائی اور دشمن کے مقابلہ کے وقت نماز پڑھنے کا بیان، اوزاعی نے کہا کہ اگر فتح قریب ہو اور لوگ نماز پر قادر نہ ہوں تو ہر شخص اکیلے اکیلے اشارے سے نماز پڑھے، اور اگر اشارے پر بھی قادر نہ ہوں تو نماز کو مؤخر کردیں، یہاں تک کہ جنگ ختم ہو جائے، یا لوگ محفوظ ہو جائیں تو دو رکعتیں پڑھیں، اگر دو رکعتوں کے پڑھنے پر بھی قادر نہ ہوں تو ایک رکوع......اور دو سجدے کرلیں اور اس پر بھی قادر نہ ہوں تو ان کے لئے تکبیر کافی نہیں ہے، بلکہ امن کے وقت تک اس کو مؤخر کریں اور مکحول کا بھی یہی قول ہے، انس بن مالکؓ نے بیان کیا کہ میں صبح کے وقت جب کہ قلعہ تستر پر چڑھائی ہو رہی تھی موجود تھا، اور جنگ کی آگ بہت مشتعل تھی، لوگ نماز پر قادر نہ تھے، آفتاب بلند ہونے کے بعد ہی ہم نماز پر قادر ہو سکے، ہم لوگوں نے نمازیں پڑھیں، اس حال میں کہ ہم لوگ ابوموسیٰ کے ساتھ تھے، پھر وہ قلعہ ہم لوگوں کے لئے فتح ہو گیا انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ اس نماز کے عوض ہمیں دنیا اور اس کی تمام چیزوں کے ملنے سے بھی خوشی نہ ہوگی)

۸۹۶. حَدَّثَنَا يَحْيٰى قَالَ حَدَّثَنَا وَكِيْعٌ عَنْ عَلِيِّ بْنِ الْمُبَارَكِ عَنْ يَّحْيَى بْنِ اَبِيْ كَثِيْرٍ عَنْ اَبِيْ سَلَمَةَ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ جَاءَ عُمَرُ يَوْمَ الْخَنْدَقِ فَجَعَلَ يَسُبُّ كُفَّارَ قُرَيْشٍ وَّيَقُوْلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَاصَلَّيْتُ الْعَصْرَ حَتّٰى كَادَتِ الشَّمْسُ اَنْ تَغِيْبَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا وَاللّٰهِ مَا صَلَّيْتُهَا بَعْدُ قَالَ فَنَزَلَ اِلٰى بُطْحَانَ فَتَوَضَّأَ وَصَلَّى الْعَصْرَ بَعْدَ مَا غَابَتِ الشَّمْسُ ثُمَّ صَلَّى الْمَغْرِبَ بَعْدَهَا.

ترجمہ ۸۹۶۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ غزوۂ خندق کے دن آئے اور کفار قریش کو برا بھلا کہنے لگے، اور کہنے لگے کہ یارسول اللہ، ہم عصر کی نماز نہ پڑھ سکے، یہاں تک کہ آفتاب غروب ہونے کے قریب ہو گیا تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بخدا میں نے بھی اب تک نماز نہیں پڑھی، پھر آپ بطحان میں اترے اور وضو کیا۔ اور عصر کی نماز پڑھی، جب کہ آفتاب غروب ہو چکا تھا، پھر اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی۔

تشریح:۔ حافظ نے لکھا: علامہ زین بن المنیر نے کہا: گویا امام بخاری نے اس صورت کو الگ باب میں اس لئے ذکر کیا کہ اس میں رجا اور خوف دونوں جمع ہیں، خوف مقتضی صلوٰۃ الخوف ہے اور فتح کی امید مقتضی جوازِ تاخیر صلوٰۃ ہے۔ اسی لئے بعض لوگوں نے اسکے لئے دوسرا حکم دیا ہے۔
امام بخاری نے ثابت کیا کہ ایسے موقع پر جماعت کی نماز پر قدرت نہ ہو تو الگ الگ ہر شخص اشارہ سے پڑھے گا۔ اور اشارہ پر بھی قدرت نہ ہو جیسا کہ شدید جنگ کی حالت میں اشارہ کی نماز کے لئے بھی دل جمعی نہیں ہو سکتی تو نماز کو مؤخر کردیں گے یا مامون ہو جانے پر پڑھیں گے۔ لیکن ایسی صورت میں صرف تکبیر نماز کے قائم مقام نہ ہوگی، چنانچہ حدیث الباب میں حضرت انسؓ نے قضا نماز پڑھنے کا ذکر کیا، پھر یہ بھی فرمایا کہ اس نماز کے وقت پر نہ پڑھ سکنے اور قضا ہونے کا اتنا رنج و افسوس ہے کہ اس کی تلافی ساری دنیا ملنے سے بھی نہیں ہو سکتی، یا یہ کہ مجھے اس نماز کو بطورِ قضا پڑھ لینے کی بھی اتنی خوشی ہے کہ ساری دنیا ملنے کی بھی خوشی اس کے برابر نہیں ہو سکتی، کیونکہ اصل نماز کے وقت جہاد وغزوہ میں شرکت ملی، وہ بھی

بڑی اہم عبادت تھی، جس کی وجہ سے نماز جیسی عبادت نہ ہو سکی، مگر اب اس کا ادا کر لینا بھی بڑی خوشی کا موقع ہے۔ (فتح ص ۲/ ۲۹۷)۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ تستر معرب ہے شوستر کا مشہور شہر ہے بلاد اہواز میں ہے جو حضرت عمرؓ کی خلافت میں ۲۰ھ میں فتح ہوا تھا۔

بَابُ صَلٰوةِ الطَّالِبِ وَالْمَطْلُوبِ رَاكِبًا وَّاِيْمَآءً وَّقَالَ الْوَلِيْدُ ذَكَرْتُ لِلْاَوْزَاعِي صَلٰوةَ شُرَحْبِيْلَ بْنِ السِّمْطِ وَاَصْحَابِهٖ عَلٰى ظَهْرِ الدَّآبَّةِ فَقَالَ كَذٰلِكَ الْاَمْرُ عِنْدَنَا اِذَا تَخَوَّفَ الْفَوْتُ وَاحْتَجَّ الْوَلِيْدُ بِقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُصَلِّيَنَّ اَحَدُنِ الْعَصْرَ قَالَ اِلَّا فِيْ بَنِيْ قُرَيْظَةَ.

(دشمن کا پیچھا کرنے والا یا جس کے پیچھے دشمن لگا ہوا ہو اس کا اشارہ سے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا بیان، اور ولید نے کہا کہ میں نے اوزاعی سے شرجیل بن سمط اور ان کے ساتھیوں کے سواری پر نماز پڑھنے کا تذکرہ کیا، تو کہا کہ میرے نزدیک یہی درست ہے، بشرطیکہ نماز کے فوت ہونے کا خوف ہو اور ولید نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے دلیل اخذ کی کہ کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ میں پہنچ کر)

۸۹۷۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ اَسْمَآءَ قَالَ حَدَّثَنَا جُوَيْرِيَةُ عَنْ نَّافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنَا لَمَّا رَجَعَ مِنَ الْاَحْزَابِ لَا يُصَلِّيَنَّ اَحَدُ الْعَصْرَ اِلَّا فِيْ بَنِيْ قُرَيْظَةَ فَاَدْرَكَ بَعْضُهُمُ الْعَصْرَ فِي الطَّرِيْقِ وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَا نُصَلِّيْ حَتّٰى نَاْتِيَهَا وَقَالَ بَعْضُهُمْ بَلْ نُصَلِّيْ لَمْ يُرَدْ مِنَّا ذٰلِكَ فَذُكِرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يُعَنِّفْ اَحَدًا مِّنْهُمْ.

ترجمہ ۸۹۷۔ حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جنگ احزاب سے واپس ہوئے، تو ہم لوگوں سے فرمایا، کہ کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ میں پہنچ کر، چنانچہ بعض لوگوں کے راستہ ہی میں عصر کا وقت آ گیا تو بعض نے کہا کہ ہم نماز نہیں پڑھیں گے جب تک کہ (بنی قریظہ تک) نہ پہنچ جائیں اور بعض نے کہا کہ ہم تو نماز پڑھیں گے اور آپ کا مقصد یہ نہ تھا (کہ ہم قضا کریں) جب اس کا ذکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا، تو آپ نے کسی کو ملامت نہ کی۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: یہ مسئلہ طالب و مطلوب والا نماز خوف کے ساتھ خاص نہیں ہے، حنفیہ کے نزدیک طالب کی نماز اشارہ سے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو مغلوب دشمن کا تعاقب کر رہا ہے۔ بخلاف مطلوب کے جو سوار ہو کہ دشمن اس کے تعاقب میں ہے، اور یہ مغلوب ہے، اس لئے وہ سواری پر ہی اشارہ سے نماز پڑھ سکتا ہے۔ اور پیدل بھاگنے والا چلتے چلتے اشارہ سے نہ پڑھے گا۔

قوله لا يصلين احد العصر الا في بني قريظة ۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ لوگ طالب تھے، اور ظاہر یہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو بہت عجلت کے ساتھ پہنچنے کا حکم دیا تھا، لہٰذا انہوں نے سواریوں پر ہی نماز پڑھی ہوگی اور امام بخاری کی کا حدیث الباب سے یہ استدلال کرنا کہ طالب و مطلوب دونوں اشارہ سے پڑھ سکتے ہیں، بہت کمزور ہے، کیونکہ انہوں نے سکوت سے استدلال کیا ہے کہ اس میں نہ یہ ہے کہ انہوں نے سواریوں سے اتر کر نماز پڑھی نہ یہ ہے کہ سواریوں پر پڑھی۔ اس کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ ان لوگوں کی تعجیل ایسی ہی ہے جیسی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی کہ وہ امرِ ربی پا کر اپنی زوجۂ محترمہ کو درد زِہ کی حالت میں چھوڑ کر فرعون کی طرف چلے گئے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام چٹیل میدان میں اپنی زوجۂ محترمہ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے، جہاں دانہ پانی کچھ نہ تھا تو یہ جلدی تعمیلِ حکم میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی اقتدا میں تھی۔

بَابُ التَّكْبِيْرِ وَالْغَلَسِ بِالصُّبحِ وَالصَّلٰوةِ عِنْدَ الْإِغَارَةِ وَالْحَرْبِ تَكْبِير

(اور صبح کی نماز اندھیرے میں اور سویرے پڑھنا اور غارت گری وجنگ کے وقت نماز پڑھنے کا بیان)

۸۹۸. حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيْزِ بْنِ صُهَيْبٍ وَّثَابِتِ نِ الْبُنَانِيِّ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الصُّبْحَ بِغَلَسٍ ثُمَّ رَكِبَ فَقَالَ اللّٰهُ اَكْبَرُ خَرِبَتْ خَيْبَرُ اِنَّا اِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ فَخَرَجُوْا يَسْعَوْنَ فِي السِّكَكِ وَيَقُوْلُوْنَ مُحَمَّدٌ وَالْخَمِيْسُ قَالَ الْخَمِيْسُ الْجَيْشُ فَظَهَرَ عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَتَلَ الْمُقَاتِلَةَ وَسَبَى الذَّرَارِيَّ فَصَارَتْ صَفِيَّةُ لِدِحْيَةَ الْكَلْبِيِّ وَصَارَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ تَزَوَّجَهَا وَجَعَلَ صِدَاقَهَا عِتْقَهَا فَقَالَ عَبْدُ الْعَزِيْزِ لِثَابِتٍ يَّآ اَبَا مُحَمَّدٍ ءَ اَنْتَ سَاَلْتَ اَنَسًا مَّآ اَمْهَرَهَا فَقَالَ اَمْهَرَهَا نَفْسَهَا قَالَ فَتَبَسَّمَ.

ترجمہ ۸۹۸۔ حضرت انسؓ بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھی، پھر سوار ہوئے اور فرمایا کہ اللہ اکبر، خیبر ویران ہو جائے، جب ہم کسی قوم کے میدان میں اترتے ہیں تو ڈرائے ہوئے لوگوں کی صبح بری ہوتی ہے، چنانچہ وہ لوگ (یہودی) گلیوں میں یہ کہتے ہوئے دوڑنے لگے، کہ محمد لشکر کے ساتھ آ گئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان پر غالب آ گئے، جنگ کرنے والوں کو قتل کر دیا، اور عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا، حضرت صفیہؓ دحیہ کلبی کے حصہ میں آئیں، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ملیں، جن سے بعد میں آپ نے نکاح کر لیا، اور ان کی آزادی کو ان کا مہر مقرر کیا، عبدالعزیز نے ثابت سے کہا کہ اے ابو محمد کیا تم نے حضرت انسؓ سے پوچھا تھا کہ رسول اللہ نے ان کا مہر کیا مقرر کیا تھا تو ثابت نے کہا کہ آپ نے ان ہی کو ان کا مہر مقرر کیا تھا، کہا کہ پھر وہ مسکرائے۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ نعرۂ تکبیر جہاد کے مواقع پر مجاہدین بلند کیا کرتے تھے، جس طرح دورِ خلافت و ترکِ موالات میں ہندوستان کے مسلمان نعرۂ تکبیر لگاتے تھے، دوسرے نسخہ میں التبکیر ہے، یعنی عجلت اختیار کرنا۔

قولہ صلے الصبح بغلس پر فرمایا کہ یہ غزوۂ خیبر کی بات ہے، لہٰذا اس کو سنتِ مستمرہ سمجھ کر مواقیتِ صلوٰۃ میں استدلال کرنا درست نہیں ہے، علامہ عینیؒ نے لکھا کہ اس سے نمازِ صبح غلس میں پڑھنے کی عادت سمجھنا صحیح نہیں کیونکہ اس موقع پر تو جلدی اس لئے کی گئی تھی کہ فارغ ہو کر بہ عجلت سامانِ سفر کر کے سوار ہوں۔ پھر یہ کہ بہ کثرت احادیثِ صحیحہ نمازِ صبح کے لئے امر بالاسفار کی وارد ہوئی ہیں (عمدہ ص ۳/۳۵۳)۔

كِتَابُ الْعِيدَيْنِ

(عیدین کا بیان)

بَابُ مَاجَآءَ فِي الْعِيدَيْنِ وَالتَّجَمُّلِ فِيهِمَ

(اس چیز کا بیان جو عیدین کے متعلق منقول ہے، اور ان دونوں میں مزین ہونے کا بیان)

۸۹۹. حَدَّثَنَا اَبُو الْيَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ اَخْبَرَنِي سَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللهِ اَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ قَالَ اَخَذَ عُمَرُ جُبة مِّنْ اِسْتَبْرَقٍ تُبَاعُ فِي السُّوقِ فَاَخَذَهَا فَاَتَى بِهَا رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللهِ ابْتَعْ هٰذِهٖ تَجَمَّلْ بِهَا للعيد وَالْوُفُوْدِ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا هٰذِهٖ لِبَاسُ مَنْ لَّاخَلَاقَ لَهٗ فَلَبِسَ عُمَرُ مَاشَآءَ اللهُ اَنْ يلبس ثُمَّ اَرْسَلَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِجُبَّةِ ديباج فَاَقْبَلَ بِهَا عُمَرُ فَاَتَى بها رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللهِ اِنَّكَ قُلْتَ هٰذِهٖ لِبَاسُ مَنْ لَّاخَلَاقَ لَهٗ وَاَرْسَلْتَ اِلَيَّ بِهٰذِهِ الْجُبَّةِ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَبِيْعُهَا وَتُصِيْبُ بِهَا حَاجَتَكَ.

ترجمہ ۸۹۹۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک ریشمی جبہ لیا، جو بازار میں بک رہا تھا، اور اس کو لے کر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ اسے خرید لیں اور عید اور وفود کے آنے کے دن اسے پہن کر اپنے کو آراستہ کریں تو آپ نے فرمایا کہ یہ اس شخص کا لباس ہے، جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، حضرت عمرؓ ٹھہرے رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس ایک ریشمی جبہ بھیجا، اسے حضرت عمرؓ نے لے لیا پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئے، اور عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ نے فرمایا تھا کہ یہ اس شخص کا لباس ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں (اس کے باوجود) آپ نے یہ جبہ میرے پاس بھیجا، تو ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے بیچ دو، اور اپنی ضرورت پوری کرو۔

تشریح:۔ دو عید سے مراد عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہیں۔ عید کا لفظ عود سے مشتق ہے چونکہ وہ بار بار لوٹ کر آتی ہے اس لئے عید کہا جاتا ہے۔ ابن حبان وغیرہ نے کہا کہ سب سے پہلی عید کی نماز حضور علیہ السلام نے ہجرت کے دوسرے سال پڑھی جس سے قبل شعبان میں صیامِ رمضان کی فرضیت نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد آپ نے آخرِ حیات تک عید کی نمازیں مداومت کے ساتھ پڑھی ہیں۔

بیانِ مذاہب: حنابلہ کے نزدیک عیدین کی نماز فرضِ کفایہ ہے، حنفیہ کے یہاں واجب ہے، جس پر جمعہ واجب ہے اس پر عید کی نماز بھی واجب ہے، البتہ خطبۂ جمعہ کی طرح خطبۂ عید شرط صحتِ صلوٰۃ نہیں ہے بلکہ سنت کے درجہ میں ہے، مالکیہ و شافعیہ کے نزدیک عیدین کی نماز سنتِ مؤکدہ کے درجہ میں ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے یہ بھی لکھا کہ عیدین، کسوف و خسوف اور استسقاء کی نمازیں امتِ محمدیہ کے خصائص میں سے ہیں لیکن مشکوٰۃ شریف کی صحیح حدیث میں استسقاء کی نماز کا ثبوت حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کا بھی وارد ہے (لامع ص ۲/۳۶)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک تکبیراتِ تشریق نمازِ جمعہ وعید کی طرح صرف شہروں اور قصبات کے لئے ہیں، صاحبینؒ تکبیرات کو دیہات میں بھی مانتے ہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ استبرق موٹے ریشم کے لئے اور سندس باریک کے لئے بولا جاتا ہے اور ملکیت کا تعلق استمتاع فی الجملہ سے ہے، یعنی جو چیز جائز ومباح الاستعمال ہو خواہ صرف عورتوں کے لئے، وہ بھی مردوں کے لئے مملوک ہوسکتی ہے اور اس کی بیع وشراء بھی ان کے لئے جائز ہے۔ جیسے یہاں ریشمی کپڑے کا خریدنا حضرت عمرؓ کے لئے جائز ہوا کیونکہ اس کا استعمال عورتوں کے لئے جائز ہے۔

علامہ عینیؒ نے لکھا کہ پہلے کتاب الجمعہ میں جبہ کا لینا جمعہ کے لئے آیا تھا اور یہاں عید کے لئے ہے وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے دونوں کے لئے روایت کیا تھا، جس کو ان سے روایت کرنے والے حضرت سالمؒ نے عید کے لئے نقل کیا اور حضرت نافعؒ نے جمعہ کے لئے ذکر فرمادیا۔ علامہ کرمانیؒ نے اس طرح تطبیق دی کہ قصہ تو ایک ہی ہے اور جمعہ بھی مسلمانوں کے لئے عید ہی ہے۔ محقق عینیؒ نے فوائدِ حدیث میں ذکر کیا کہ ایامِ عید و جمعہ اور ملاقاتِ وفود و عیان کے موقع پر عمدہ لباس پہننے کی مشروعیت ثابت ہوئی۔ لہٰذا بعض متقشفین جو ہر وقت موٹا جھوٹا لباس ہی زیب تن رکھنے کو پسند کرتے ہیں، یہ اس کے خلاف ہے، چنانچہ حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے کہ وہ ایک دن عمدہ یمانی حلہ (سوٹ) میں نکلے اور فرقدؒ اونی جبہ میں تھے، انہوں نے بڑے غور سے اور تنقیدی نظر سے حضرت حسنؒ کے لباس کو دیکھا تو حضرت حسن نے فرمایا کہ اے فرقد! میرے کپڑے اہلِ جنت کے ہیں اور تمہارے اہل جہنم کے جیسے ہیں، یعنی قسیسیں ورہبان والے، پھر فرمایا کہ تقویٰ کا مدار ان ظاہری کپڑوں اور لباس پر نہیں ہے، بلکہ تقویٰ کی جگہ دلوں کے اندر ہے، اور ان کے مشروع مطالبات کے موافق عملی زندگی اختیار کرنے میں ہے۔ (عمدہ ص ۳/۳۵۴)۔

بَابُ الحِرَابِ وَالدَّرَقِ يَوْمَ العِيد

(عید کے دن ڈھالوں اور برچھیوں سے کھیلنے کا بیان)

۹۰۰۔ حَدَّثَنَا اَحْمَدُ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عَمْرٌو اَنَّ مُحَمَّدَ بْنَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْاَسَدِیَّ حَدَّثَهٗ عَنْ عَآئِشَةَؓ قَالَتْ دَخَلَ عَلَیَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَعِنْدِیْ جَارِیَتَانِ تُغَنِّیَانِ بِغِنَآءِ بُعَاثٍ فَاضْطَجَعَ عَلَی الْفِرَاشِ وَحَوَّلَ وَجْهَهٗ وَدَخَلَ اَبُوْ بَکْرٍ فَانْتَهَرَنِیْ وَقَالَ مِزْمَارَةُ الشَّیْطَانِ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ فَقَالَ دَعْهُمَا فَلَمَّا غَفَلَ غمز تُهُمَا خَرَجَتَا وَکَانَ یَوْمُ عِیْدٍ یَّلْعَبُ السُّوْدَانُ بِالدَّرَقِ وَالْحِرَابِ فَاِمَّا سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاِمَّا قَالَ تَشْتَهِیْنَ تَنْظُرِیْنَ فَقُلْتُ نَعَمْ فَاَقَامَنِیْ وَرَآءَهٗ خَدِّیْ عَلٰی خَدِّهٖ وَهُوَ یَقُوْلُ دُوْنَکُمْ یَابَنِیْ اَرْفِدَةَ حَتّٰی اِذَا مَلِلْتُ قَالَ لِیْ حَسْبُکِ؟ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَاذْهَبِیْ.

ترجمہ ۹۰۰۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ میرے پاس نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور میرے پاس دو لڑکیاں جنگ بعاث کے متعلق گیت گارہی تھیں، آپ بستر پر لیٹ گئے اور اپنا منہ پھیر لیا، حضرت ابوبکرؓ آئے تو مجھے ڈانٹا اور کہا کہ یہ شیطانی باجہ اور وہ بھی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں! تو آپ نے فرمایا کہ چھوڑ دو جب وہ (ابوبکرؓ) دوسری طرف متوجہ ہوئے، تو میں نے ان دونوں لونڈیوں کو اشارہ کیا (چلے جانے کا) تو چلی گئیں، اور عید کے دن حبشی ڈھالوں اور برچھیوں سے کھیلتے تھے، یا تو میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی یا آپ نے فرمایا کہ کیا تو تماشہ دیکھنا چاہتی ہے، تو میں نے کہا ہاں، تو آپ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کیا، میرا رخسار آپ کے دوش پر تھا، آپ نے فرمایا کہ اے بنی ارفدہ تماشہ دکھاؤ، یہاں تک کہ جب میں اکتا گئی تو آپ نے فرمایا "بس" تو میں نے کہا جی ہاں! آپ نے فرمایا تو چلی جاؤ۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: اصل مذہبِ حنفیہ میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اگر فتنہ سے امن ہو تو اجنبی عورت کے چہرہ اور کفین کی طرف نظر[1] کرنا جائز ہے پھر سدِ بابِ فتنہ کے لئے بعد کے فقہاءِ حنفیہ نے فتویٰ عدم جواز کا دیا ہے۔ اور ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ دونوں لڑکیاں گانے کے ساتھ دف بھی بجا رہی تھیں، دوسرے واقعہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ گانے والی حضرت عمرؓ کے آنے پر چپ ہو گئی اور دف[2] پر بیٹھ گئی، تاکہ یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس جگہ گانے بجانے کا کوئی سلسلہ تھا، اسی لئے حضور علیہ السلام نے حضرت عمرؓ کے مناقب میں فرمایا کہ جس راستہ پر حضرت عمرؓ چلتے ہیں اس میں شیطان داخل نہیں ہوتا۔

اہم اشکال و جواب

حضرتؒ نے فرمایا یہاں اشکال یہ ہے کہ اگر حضور علیہ السلام نے ابتداء میں غنا اور دف کو بدرجۂ مباح رکھا تھا، تو پھر بعد کو وہ ایسے امورِ منکرہ میں سے کیسے ہو گیا، جن میں شیاطین کا دخل ہوتا ہے؟ اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ مغنی اس کو کہا جاتا ہے جو خاص طور سے اپنے فن کے مطابق گاتا ہے، جس میں لے ہوتی ہے جس میں زیر و بم ہوتا ہے، جذبات کو ہیجان میں لانے والی باتیں ہوتی ہیں اور فواحش و

---

[1] کیونکہ احادیث و آثار سے ثابت ہوا کہ چہرہ اور کفین (ہتھیلیاں) "الا ما ظھر منھا" میں داخل ہیں۔ کہ بہت سی ضروریاتِ دینی و دنیوی ان کے کھلا رکھنے پر مجبور کرتی ہیں (فوائد عثمانی ص ۴۵۸) اس کی تائید میں وہ حدیثِ صحیح بھی ہے، جس میں حضرت عائشہؓ کے حبشیوں کے کھیل تماشے اور جنگی کرتبوں کے ملاحظہ کا ذکر ہے اور حضور علیہ السلام نے خود ان کو یہ کرتب دکھائے تھے، اور جب تک وہ اچھی طرح دیکھ کر آسودہ نہ ہوئیں حضور علیہ السلام ان کو دکھاتے رہے، دوسری طرف وہ حدیث ام سلمہؓ بھی ہے کہ میں حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھی، اس وقت آپ کے پاس حضرت میمونہؓ بھی تھیں، اتنے میں حضرت ابن ام مکتوم (نابینا صحابی) آ گئے، اور یہ واقعہ حجاب (پردہ) کا حکم آ جانے کے بعد کا ہے، وہ گھر میں داخل ہوئے تو حضور علیہ السلام نے ہم دونوں کو حکم دیا کہ ان سے پردہ کر لو، ہم نے عرض کیا: کیا وہ اندھے نہیں ہیں؟ نہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں نہ پہچانتے ہیں، آپ نے فرمایا: تو کیا تم بھی اندھی ہو؟ اور تم ان کو نہیں دیکھتی ہو (جمع الفوائد ص ۱/۲۳۱ از ترمذی و ابی داؤد)

اس میں حضور علیہ السلام نے حضرت ام سلمہ و حضرت میمونہ دونوں کی غلط فہمی پر سختی سے تنبیہ فرما دی، اور واضح فرما دیا کہ شریعت کی نظر میں دونوں کی برائی برابر ہے، نہ عورتوں کے لئے غیر مردوں پر غلط نظریں ڈالنا درست ہے اور نہ مردوں کے لئے اجنبی عورتوں کو بری نظر سے دیکھنا جائز ہے، سورۂ نور میں غضِ بصر کا حکم بھی مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ہے، جس سے ظاہر ہے کہ دونوں ہی کو بدنظری سے روکا گیا ہے کیونکہ وہ زنا اور دوسری فواحش کا پیش خیمہ ہے۔ اسی لئے علامہ نوویؒ نے حضرت عائشہؓ کے واقعہ کا یہ جواب دیا کہ وہاں بالقصد نظر کھیل و کرتب کی طرف تھی اور مردوں کی جانب نظر بالتبع تھی۔ دوسرے یہ کہ کھیل و کرتب دکھانے کی غرض و منشا عورتوں کے ساتھ حسنِ معاشرت کا ایک سبق تھا کہ محتاط صورتوں میں اس حد تک بھی جواز کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اس سے حسنِ معاشرت کی غایتِ اہمیت بھی ثابت ہوتی ہے، اس کے علاوہ طبعِ سلیم اور عقلِ مستقیم ان دونوں صورتوں میں بھی فرق کرے گی کہ ایک میں تو عورت گھر کے اندر ہو اور اس کی نظر باہر کے کسی مرد پر پڑ جائے اور وہ بھی اگر بالتبع ہو تو اس کی برائی میں مزید کمی آ جاتی ہے، دوسری صورت یہ کہ اجنبی مرد کسی عورت کے گھر میں داخل ہو اور عورت اس کو دیکھے یا اس سے بات کرے تو ظاہر ہے، اس کی برائی پہلی صورت سے کہیں زیادہ اور فتنوں کا دروازہ کھولنے والی ہے، اسی لئے قرآن مجید میں حکم ہوا کہ اگر کسی عورت سے کوئی چیز طلب کرنے کی ضرورت پیش آ جائے تو گھر پر جا کر باہر ہی سے اور پردہ کی اوٹ سے طلب کرو۔ اس سے بھی کسی کے گھر میں اندر جانے کی ممانعت نکلتی ہے۔

[2] اس میں حضرتؒ نے اشارہ اس حدیث کی طرف فرمایا جو مناقب سیدنا عمرؓ میں آتی ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم بعض مغازی سے لوٹے تو ایک لونڈی کالے رنگ کی حاضر ہوئی اور کہا کہ میں نے نذر مانی تھی جب اللہ تعالیٰ آپ کو سلامتی و عافیت کے ساتھ لوٹائے گا۔ تو میں آپ کے حضور میں خوشی کے طور پر دف بجاؤں گی اور گاؤں گی۔ آپ نے فرمایا اگر تم نذر کر چکی ہو تو ایسا کر لو، اس نے کہا کہ میں نے ضرور نذر کی تھی اور پھر وہ دف بجانے لگی۔ محدث رزین (راویِ حدیث) نے یہ بھی اضافہ کیا کہ وہ یہ اشعار پڑھ رہی تھی۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع   وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

اسی حالت میں کہ دف بجا کر گا رہی تھی حضرت ابوبکر صدیقؓ آ گئے، پھر حضرت علیؓ، پھر حضرت عثمانؓ بھی آئے اور وہ بدستور بجاتی رہی۔ پھر حضرت عمرؓ آئے تو وہ دف کو اپنے نیچے ڈال کر اس پر بیٹھ گئی، اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اے عمر! تم سے تو شیطان بھی ڈرتا ہے، میں بیٹھا تھا تو وہ گاتی بجاتی رہی، ابوبکر آئے، تب بھی، پھر علی کے آنے پر بھی اور عثمان کے آ جانے پر بھی بجاتی رہی، لیکن جب تم آئے تو دف کو سامنے سے ہٹا کر پھینک دیا اور اس پر بیٹھ گئی۔ (جمع الفوائد ص ۲/۲۰۶)

منکرات کی تصریح یا تعریض بھی ہوتی ہے، اور یہاں وہ صورت نہیں تھی، چنانچہ آگے حدیث بخاری میں آتا ہے کہ وہ دونوں لڑکیاں مغنیہ نہیں تھیں علامہ قرطبیؒ نے اس کی شرح میں لکھا کہ وہ دونوں گانے بجانے کے فن سے واقف نہ تھیں، جس سے عام طور پر پیشہ ور گانے بجانے والی واقف ہوا کرتی ہیں اسی لئے محدثین نے غناءِ معروف کو غیر مباح قرار دیا ہے اور گانے بجانے کے آلات استعمال کرنے کو تو بعض حضرات نے اجماعی طور سے حرام نقل کیا ہے۔

تسامح نقل عینی رحمہ اللہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ علامہ عینیؒ[1] نے شرح کنز باب ردالشہادۃ میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف بالاطلاق حرمتِ غنا کو منسوب کیا ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ امام صاحب نے اصل سے نفی نہ کی ہوگی، بلکہ باعتبار احوال حکم کیا ہوگا، اور ابن حزم نے بھی غنا کو مباح کہا ہے، اور امام غزالیؒ کا میلان بھی احیاء میں اسی طرف ہے، پھر انہوں نے یہ بھی لکھا کہ بعض مباح امور اصرار سے گناہ صغیرہ بن جاتے ہیں، جیسا کہ صغیرہ گناہ اصرار سے کبیرہ ہو جاتے ہیں میرے نزدیک یہ تحقیق بہت عمدہ اور احق بالقبول ہے، اور مباح کے صغیرہ بن جانے میں کچھ استبعاد بھی اس لئے نہ ہونا چاہئے کہ بعض مباحات حق تعالیٰ کے نزدیک نہایت مبغوض بھی ہیں جیسا کہ ابن ماجہ میں ہے کہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک طلاق ابغض المباحات ہے، بس طلاق باوجود مباح ہونے کے مبغوض بھی قرار دی گئی، لہٰذا امرِ مباح پر اصرار کی وجہ سے اس کے بمنزلۂ صغیرہ ہو جانے میں بھی کوئی بعد نہیں رہا۔

میرے نزدیک اسی قبیل سے ابوداؤد کی وہ حدیث بھی ہے، جس میں اپنے لئے دوسروں کے تعظیماً کھڑے ہونے پر مسرور ہونے والے کو مستحقِ وعید قرار دیا گیا ہے، پھر اسی کے ساتھ خود حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی دوسروں کے لئے کھڑا ہونا ثابت ہے، جیسا کہ بخاری ص ۵۳۴ **باب قول النبی صلے اللہ علیہ وسلم للا نصار انتم احب الناس الی** میں اور ص ۷۷۸ **باب ذهاب النساء والصبیان الی العرس** میں ہے۔

اس میں بھی الگ الگ حکم باختلافِ احوال ہے، وجہ یہ ہے کہ کبھی کوئی چیز آخری مراتبِ اباحت میں ہوتی ہے کہ اس کے بعد کوئی درجہ بجز ممانعت کے باقی نہیں رہتا، لہٰذا اس مرتبہ میں اباحت و نہی متجاذب ہوتی ہیں۔ نفس الامر میں تو وہ مباح ہی ہے مگر اس خدشہ کے پیشِ نظر کہ وہ درجہ حرام تک نہ پہنچ جائے۔ اس سے روکا بھی جاتا ہے۔

اسی لئے مسئلہ زیر بحث میں سب سے بہتر اور انسب و اعدل طریقہ وہی ہے جو حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا کہ جواری کے غنا اور دف کے وقت اپنا چہرۂ مبارک اس طرف سے پھیر لیا اور ایک روایت یہ ہے کہ چہرۂ مبارک کو کپڑے سے ڈھانپ لیا، گویا مسامحت اور چشم پوشی کے ساتھ اپنی ناپسندیدگی بھی ظاہر فرمادی اور یہ بھی کہ آپ اس غنا اور دف سے محظوظ نہیں ہو رہے تھے۔

لہٰذا اگر آپ اس کو صراحۃً روک دیتے تو اباحت کا آخری درجہ بھی ختم ہو جاتا، اور مسامحت کا معاملہ نہ فرماتے یا اس سے محظوظ ہوتے تو کراہت و ناپسندیدگی بھی ظاہر نہ ہوتی۔ درحقیقت یہی حال ''اباحتِ مرجوحہ'' کا ہوتا ہے۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس تفصیل سے تمہیں حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے طریقوں میں فرق بھی معلوم ہو گیا ہوگا، کیونکہ حضور علیہ السلام کا طریقہ اغماض و چشم پوشی کا تھا اور حضرت ابوبکرؓ کا طریقہ ناراضی وغصہ کا تھا۔ پس اگر حضور علیہ السلام حضرت ابوبکرؓ کا رویہ اپنا لیتے تو غنا حرام ہو جاتا اور اس کا کوئی مرتبہ حدِ جواز میں نہ رہتا، اور اگر حضرت ابوبکرؓ حضور علیہ السلام کا طریقہ اپنا

[1] علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری ص ۳/۳۵۹ میں بھی امام صاحب اہل عراق مذہب تحریم غنا نقل کیا ہے اور مذہب امام شافعی و مالک کراہت لکھا ہے۔

لیتے تو وہ ان کے لئے مستحسن ومناسب نہ تھا کیونکہ کوئی کام ان کے انکار یا استحسان کے سبب سے حرام یا حلال نہیں ہوسکتا تھا، لہٰذا ان کی شان کے مناسب یہی تھا کہ وہ سدباب مقاصد کی رعایت کریں، حضرت شاہ محمد اسماعیلؒ نے فرمایا تھا کہ وہ فعل تو شیطان کا ضرور تھا اور قبیح بھی تھا مگر یہ ضروری نہیں کہ اس کے سب ہی افعال حرام کے درجہ میں ہوں، اس کا مآل بھی وہی ہے جو ہم نے اوپر بتایا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ فرق کیا جائے گا قلیل اور کثیر غنا میں اور اس کے عادی ہونے اور عادی نہ ہونے میں، پس قلیل کو مباح کہیں گے اور اصرار سے وہ حدِ ممانعت میں داخل ہو جائے گا، اور یہی تفصیل دف کے بارے میں بھی ہوگی۔

حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ قلت وکثرت کا فرق شریعت میں متعدد مواقع میں ثابت ہے، چنانچہ ہماری فقہ میں اشربہ غیر اربعہ میں سے قدرِ قلیل کا استعمال جائز ہے، (بطور دواء وغیرہ کے) اور ریشم کا استعمال بھی بقدرِ اصابع اربعہ جائز ہے، زیادہ نہیں، نیز قرآن مجید میں ہے "**الا من اغترف غرفة**" پس بقدرِ غرفہ کو مباح اور زائد کو ممنوع قرار دیا۔ اور میرے نزدیک اسی باب سے حدیث ائتمام بھی ہے (**انما جعل الا مام ليؤتم به فاذاصلى قاعداً فصلوا قعودا** (الخ) اس میں بھی زیادہ سے زیادہ صرف احبیتِ قعود اور جوازِ قیام نکلتا ہے، جیسا کہ حافظ نے اس کو اختیار کیا ہے، اور مسئلہ قیام للقادم کو مدخل میں ابن امیر الحاج نے خوب لکھا ہے۔ اس کی مراجعت کی جائے۔

دف وغیرہ کے احکام

حضرتؒ نے درسِ ترمذی شریف میں فرمایا: دف وہ ہے جو ایک طرف سے مڑھا ہوا ہو، فقہاء نے اس کو تشہیرِ نکاح کے لئے جائز کہا ہے، البتہ گھر دار باجہ والے دف کو ممنوع قرار دیا ہے، میرے نزدیک بھی اس میں توسع ہے، اور دہل، تاشہ، نقارہ، طبل (ڈھول) وغیرہ جائز ہیں کیونکہ ان میں کوئی حظِ نفس نہیں ہے۔ اور اسی لئے طبلِ غزاۃ کو بھی جائز کہا گیا ہے، اسی طرح دف عید اور دوسری خوشی کے مواقع پر بھی جائز ہوگا کما ہو عن ابی یوسفؒ ایضاً۔

اکثر کتبِ فقہ میں صرف دف کا ذکر ہے، اور مجھے اس بارے میں توسیع صرف تکملۂ فتح القدیر قاضی زادہ رومی میں ملی، اس میں اس کی طرف اشارہ ہے اور حدیث صحیح میں بھی لڑکیوں کے حضور علیہ السلام کی موجودگی میں دف بجانے کا ذکر ہے جس کو آپ نے منع نہیں کیا، پھر جب حضرت عمرؓ آئے تو وہ بھاگ گئیں، اور حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ عمر سے شیطان بھاگتا ہے (العرف ص ۳۹۱) اور اس اشکال کا جواب اوپر آچکا ہے کہ جب وہ شیطان کا عمل تھا تو اس کو حضور علیہ السلام نے کیوں گوارا کیا۔ نیز آگے حدیثِ بخاری میں بھی حضرت ابوبکرؓ کا ارشاد آئے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں مزامیر (بانسری) نہ تھیں، حضرت ابوبکرؓ نے بطریقِ الزام یہ جملہ فرمادیا تھا۔ واضح ہو کہ آخر ابوداؤد باب کراہیۃ الغناء والزمر کی ایک حدیث میں بھی آتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے مزار (بانسری) کی آواز سن کر کانوں میں انگلیاں دی تھیں تا کہ اس کی آواز نہ سنیں، اس پر بھی ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درسِ ابن داؤد دارالعلوم دیوبند میں فرمایا تھا کہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ فعل حضور علیہ السلام کی اقتدا میں تھا، حرمت کی وجہ سے نہیں تھا اسی لئے حضرت نافع کے سننے میں کوئی قباحت نہ سمجھی گئی۔ (انوار المحمود ص ۲/ ۵۶۷)

حضرت تھانویؒ کی تحقیق

حضرتؒ کی ایک سوال کے جواب میں مفصل تحقیق بوادر النوادر ص ۳۷۵ تا ص ۳۸۱ میں قابل مطالعہ ہے، اور قولِ جواز کے لئے کچھ قیود وشرائط لکھی ہیں، اور اباحت قدر قلیل کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

افاداتِ علامہ عینیؒ

حافظ کے دو تسامح:۔ قولہ تشبیہن پر علامہ نے لکھا کہ دونوں احتمال حدیثی روایات کے تحت برابر کے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے حضرت

عائشہؓ سے ابتداء فرمایا کہ تم حبشیوں کے کرتب دیکھنا چاہتی ہو یا پہلے انہوں نے حضور علیہ السلام سے دیکھنے کی خواہش کی اور آپ نے قبول فرمالی، علامہ عینی نے لکھا کہ حافظ ابن حجرؒ نے جو صرف دوسری شق پر جزم کرلیا اور پھر تطبیق کی صورت نکالی ہے وہ محلِ نظر ہے۔

دوسرا تسامح یہ ہے کہ حدیثِ نسائی میں حضور علیہ السلام کا ارشاد اس طرح ہے کہ اے حمیراء کیا تم حبشیوں کے کرتب دیکھنا چاہتی ہو؟ حافظ نے اسی حدیث نسائی کو نقل کر کے لکھا کہ میں نے اس حدیث کے سوا کسی اور صحیح حدیث میں حمیرا کا ذکر نہیں دیکھا، اس پر علامہ عینی نے لکھا کہ ہشام بن عروہ عن عائشہؓ کی حدیث میں بھی اس طرح ذکر وارد ہوا ہے اگر چہ وہ ضعیف ہے حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ میں نے دھوپ میں رکھ کر پانی گرم کیا ہے، آپ نے فرمایا اے حمیراء ایسا مت کیا کرو کیونکہ ایسے پانی سے برص کا مرض پیدا ہوتا ہے (عمدہ ص ۳/۳۵۸) ان دونوں ریمارک سے علامہ کا حدیثی تفوق ظاہر ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حدیثی فوائد: حدیث الباب کے تحت حافظ وعلامہ دونوں نے گراں قدر فوائد ذکر کئے ہیں، جو لائقِ ذکر ہیں۔

(۱) علامہ قرطبی نے لکھا کہ گانے کے ممنوع ہونے میں کوئی خلاف نہیں ہے کہ وہ لہو ولعبِ مذموم ہے، البتہ جو محرمات سے خالی ہو، اس کا قلیل حصہ عیدوں یا شادیوں وغیرہ میں جائز ہوگا جیسا کہ حدیث الباب سے ثابت ہوا، امام ابو یوسفؒ سے دف کے بارے میں دریافت کی گیا کہ کیا آپ اس کو شادی بیاہ کے سوا میں ناپسند کرتے ہیں مثلاً عورت اپنے گھر میں گائے یا جیسے بچے گاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اس میں کراہت نہیں، البتہ جس میں لعبِ فاحش ہو اور اس کو گایا جائے تو میں اس کو ناپسند کرتا ہوں۔

(۲) حربی ضرورتوں سے ہتھیاروں کی مشق اور اسلحہ کے کھیل جائز ہیں، اور تلوار بازی وغیرہ بھی درست ہے کیونکہ ان سے ہتھیاروں کے استعمال کا تجربہ ہوتا ہے۔

(۳) قاضی عیاض نے کہا کہ عورتوں کا اجنبی مردوں کے جنگی و مشقی کرتب دیکھنا جائز ہے، کیونکہ ناجائز وہ نظر ہے جو غیر مردوں کے محاسن کی طرف ہو یا لذت حاصل کرنے کے لئے ہو، اور اسی طرح عورتوں کے لئے مردوں کے چہروں کی طرف بھی شہوت کے ساتھ نظر حرام ہے، بلکہ بعض علماء نے تو بلا شہوت بھی حرام کہا ہے، اور بعض علماء نے کہا کہ یہ حضرت عائشہؓ کا دیکھنا نزولِ آیت **قل للمومنات یغضضن من ابصارھن** سے پہلے کا واقعہ ہے یا ان کے زمانۂ بلوغ سے قبل کا ہے، مگر یہ بات محلِ نظر ہے کیونکہ روایتِ ابن حبان میں ہے کہ یہ واقعہ وفدِ حبشہ کے آنے کے وقت کا ہے اور وہ ۷ھ میں آئے تھے، اور اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر پندرہ سال تھی، امام بخاری نے ص ۷۸۸ میں ایک باب **نظر المرأة الی الحبش، نحوھم من غیر ریبة** بھی قائم کیا ہے۔ (فتح ص ۲/۳۰۴)۔

(۴) معلوم ہوا کہ عیدوں کے موقع پر اہل وعیال کو انواع واقسام کی تفریحِ طبع اور خوشی منانے کا موقع دینا چاہئے تا کہ ان کے اجسام وارواح کو راحت میسر ہو، اور ایسے وقت ان کی لغزشوں پر چشم پوشی بھی کی جائے۔

(۵) عیدوں کے مواقع پر خوشی کا اظہار شعائرِ دین میں سے ہے۔

(۶) باپ کو حسبِ معمول وممادت بیٹی کے گھر جانا جائز ہے، جبکہ اس کا شوہر اس کے پاس ہو۔

(۷) باپ کو جائز ہے کہ وہ شوہر کی موجودگی میں اپنی بیٹی کو ادب سکھائے، گرچہ شوہر نے خاموشی اختیار کی ہو، کیونکہ ادب سکھانا باپ کا وظیفہ ہے، اور شوہروں کا وظیفہ بیویوں پر نرمی وشفقت ہے۔

(۸) شوہر کو بیوی کے ساتھ نرمی کا معاملہ کر کے اس کی محبت حاصل کرنی چاہئے۔

(۹) اہلِ خیر حضرات کے گھروں کو کھیل تماشوں وغیرہ سے خالی ہونا چاہئے، اگر چہ ایسے امور کا گناہ ان پر صرف اسی وقت ہوگا کہ ان کی اجازت سے ہوں۔

(۱۰) شاگرد اگر اساتذ کے یہاں کوئی غیر موزوں بات دیکھے تو وہ اس پر نکیر کر سکتا ہے، جسے حضرت ابوبکرؓ نے کیا کیونکہ یہ بات ادب کے خلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ شریعت کا لحاظ ہر ادب سے اوپر درجہ رکھتا ہے۔

(۱۱) شاگرد اپنے شیخ واستاذ کی موجودگی میں بھی فتوے دے سکتا ہے، اگر چہ یہاں یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے یہ سمجھا ہو کہ حضور علیہ السلام سوئے ہوئے ہیں اور سوچا ہو کہ آپ بیدار ہو کر ان کی بیٹی (حضرت عائشہؓ) پر عتاب فرمائیں گے، لہٰذا اس خیال و ڈر سے غنا اور دف کو روکنے کی کوشش کی ہوگی۔

(۱۲) باندیوں کی آواز گانے کی سننا جائز ہوا اگر چہ وہ اپنی مملوکہ نہ ہوں کیونکہ حضور علیہ السلام نے حضرت ابوبکرؓ کے اعتراض پر نکیر فرمائی، اور پھر بھی گاتی رہیں یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ نے ہی ان کو نکل جانے کا اشارہ فرمایا، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ جواز کا محل وہی ہے کہ فتنہ سے امن ہو، ورنہ جواز نہ ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ حضور علیہ السلام کی موجودگی میں فتنہ سے امن تھا۔

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ وہ اعرابیوں (دیہاتی عربوں) کے گانے کو جائز فرماتے تھے۔ وہ بھی عدم فتنہ کے سبب ہوگا۔ واللہ اعلم

(۱۳) حدیث الباب سے حضور علیہ السلام کے کمالِ اخلاق حسنہ اور غایتِ رأفت وشفقت کا بھی ثبوت ہوا ہے۔

(۱۴) حدیث الباب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر عورت شوہر یا کسی ذی رحم محرم کی آڑ میں کھڑی ہو جائے تو اتنا پردہ کافی ہے، جس طرح حضرت عائشہؓ حضور علیہ السلام کے پیچھے کھڑی ہو کر تماشہ دیکھتی ہیں۔ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام مجھے اپنی چادرِ مبارک سے پردہ کر کے تماشہ دکھاتے رہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہ واقعہ حجاب کے احکام اترنے کے بعد کا ہے۔ اور حافظؒ نے لکھا کہ حضرت عائشہؓ سے یہ قول بھی مروی ہے کہ میں نے تماشہ دیکھنے میں خوب دیر لگائی تا کہ دوسری عورتوں کو حضور علیہ السلام کی جناب میں اپنا مرتبہ بتلا دوں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ بعد کا ہے جب حضرت عائشہؓ کی بہت سی سوتنیں ہوگئی تھیں، اور ان پر آپ کو فخر کرنا تھا۔ (عمدہ ص ۳/۳۵۹ و فتح ص ۳۰۴)۔

امام بخاری حدیث الباب کو ص ۶۵ میں بھی لا چکے ہیں، اور یہاں ص ۱۳۰ میں دو جگہ ہے پھر ص ۱۳۵، ص ۴۰۷، ص ۵۰۰، ص ۷۸۰ اور ص ۷۸۸ میں بھی لائیں گے۔

بَابُ سُنَّةِ الْعِيْدِ لِاَهْلِ الْاِسْلَامِ

(اہل اسلام کے لئے عید کی سنتوں کا بیان)

۹۰۱. حَدَّثَنَا حَجَّاجٌ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ اَخْبَرَنِیْ زُبَيْدٌ قَالَ سَمِعْتُ الشَّعْبِيَّ عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ فَقَالَ اِنَّ اَوَّلَ مَانَبْدَءُ مِنْ يَوْمِنَا هٰذَا اَنْ نُّصَلِّيَ ثُمَّ نَرْجِعَ فَنَنْحَرَ فَمَنْ فَعَلَ فَقَدْ اَصَابَ سُنَّتَنَا.

۹۰۲. حَدَّثَنَا عُبَيْدَةُ بْنُ اِسْمَاعِيْلَ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ اُسَامَةَ عَنْ هِشَامٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ دَخَلَ اَبُوْ بَكْرٍ وَّعِنْدِيْ جَارِيَتَانِ مِنْ جَوَارِى الْاَنْصَارِ تُغَنِّيَانِ بِمَاتَقَا وَلَتِ الْاَنْصَارُ يَوْمَ بُعَاثٍ قَالَتْ وَلَيْسَتَا بِمُغَنِّيَتَيْنِ فَقَالَ اَبُوْ بَكْرٍ مَزَامِيْرُ الشَّيْطَانِ فِيْ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَذٰلِكَ فِيْ يَوْمِ عِيْدٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَابَكْرٍ اِنَّ لِكُلِّ قَوْمٍ عِيْدٌ وَّ هٰذَا عِيْدُنَا.

ترجمہ ۹۰۱۔ حضرت براءؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے ہوئے سنا، آپ نے فرمایا کہ سب سے پہلی چیز، جس سے ہم آج کے دن ابتدا کریں وہ یہ کہ ہم نماز پڑھیں، پھر گھر واپس ہوں، پھر قربانی کریں، اور جس نے اس طرح کیا تو اس نے میری سنت کو پالیا۔

ترجمہ ۹۰۲۔ عروہ بن زبیر حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ابوبکرؓ آئے اور میرے پاس انصار کی دولڑکیاں جنگِ بعاث کے دن شعر گا رہی تھیں، اور ان لڑکیوں کا پیشہ گانے کا نہیں تھا، تو ابوبکرؓ نے فرمایا، کہ یہ شیطانی باجہ اور رسول اللہ کے گھر میں اور وہ عید کا دن تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوبکرؓ ہر قوم کی عید ہوتی ہے اور آج ہم لوگوں کی عید ہے۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ **سمعت النبی صلے اللہ علیہ وسلم یخطب** سے شبہ ہوتا ہے کہ پہلے خطبہ دیتے تھے حالانکہ وہ خطبہ نماز کے بعد کا تھا، راوی نے پہلے ذکر کر دیا، تعبیراتِ رواۃ بعض دفعہ موہم اغلاط ہو جاتی ہیں۔ اور **فقد اصاب سنتنا** میں ترجمۃ الباب کا ثبوت ہے۔

دوسری حدیث الباب میں **وعندی جارتیان من جواری الانصار** پر حضرت گنگوہیؒ نے درسِ بخاری شریف میں فرمایا کہ یہ اس لئے وضاحت کی تا کہ معلوم ہو وہ دونوں لونڈیاں پیشہ ور گانے والی نہ تھیں، شریف عورتوں اور ان کی لڑکیوں کے لئے (گھر کے اندر خوشیوں کے موقع پر) گانا جائز ہے جبکہ اس میں کوئی فتنہ اور مفسدہ مثل نظر الی **المحارم، شھوۃ حرام** (بوجہ سماعِ غیر محارم وغیرہ) یا فواتِ طاعات اور مزامیر باجے وغیرہ، آلاتِ لہو نہ ہوں، اور اشعار کے مضامین بھی غیر مشروع نہ ہوں، حاصل یہ ہے کہ **حرمتِ غناالغیرہ** ہے، اور فقہاء نے اس کو سدِ بابِ فتنہ کے لئے ممنوع کہا ہے ورنہ فی نفسہ وہ مباح ہے۔ (لامع ص ۲/۳۷)۔

قولہ وہذا عیدنا پر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث لانے کا مقصد امام بخاریؒ یہ بتاتا ہے کہ عید کے دن میں سارے مسلمانوں کے لئے وہ سب کھیل تماشے اور دل بہلانے، خوشی منانے کا طریقہ جائز ہیں، جن میں کوئی شرعی قباحت اور گناہ نہ ہو۔ (ایضاً ۲/۳۰۱)

حاشیۂ لامع میں اس مضمون کی تائید علامہ عینی و کرمانی، کی عبارات سے بھی پیش کی گئی ہے اور عید کے موقع پر اظہارِ سرور کو شعائر دین سے ثابت کیا ہے۔

بَابُ الْاَكْلِ يَوْمَ الْفِطْرِ قَبْلَ الْخُرُوْجِ

(عیدگاہ جانے سے پہلے عید الفطر کے دن کھانے کا بیان)

۹۰۳۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحِيْمِ اَخْبَرَنَا سَعِيْدُ بْنُ سُلَيْمَانَ اَخْبَرَنَا هُشَيْمٌ قَالَ اَخْبَرَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ اَبِىْ بَكْرِ بْنِ اَنَسٍ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَغْدُوْ يَوْمَ الْفِطْرِ حَتّٰى يَاْكُلَ تَمَرَاتٍ وَّقَالَ مُرَجَّى بْنُ رَجَآءٍ حَدَّثَنِىْ عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ اَبِىْ بَكْرٍ قَالَ حَدَّثَنِىْ اَنَسٌ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَاْكُلُهُنَّ وِتْرًا.

ترجمہ ۹۰۳۔ حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن جب تک چند چھوہارے نہ کھا لیتے عیدگاہ کی طرف نہ جاتے، اور مرجی بن رجاء نے عبید اللہ بن ابی بکر سے اور انہوں نے انس سے، اور انس نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ چھوہارے طاق عدد میں کھاتے تھے۔

تشریح:۔ عید الفطر کے دن صبح کو نمازِ عید سے قبل ہی کچھ کھانا مستحب ہے، تا کہ روزوں کے مسلسل ایک ماہ کے بعد عید کے دن روزہ کی صورت باقی نہ رہے کیونکہ جس طرح رمضان کے دنوں میں دن کے وقت کھانا، پینا حرام تھا، عید کے دن روزہ رکھنا حرام قرار دیا گیا ہے۔

دوسری وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ عید الفطر میں نماز سے قبل صدقۃ الفطر نکالا جاتا ہے تا کہ مساکین کو امداد ملے، اسی لئے اسی وقت خود بھی کھائے پیئے تو بہتر ہے۔

برخلاف اس کے عیدِ قربان کے موقع پر قربانی اور صدقۂ لحم کا وقت بعد نماز ہے، اسی لئے اسی وقت خود بھی اسی میں سے کھائے تو بہتر ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

بَابُ الْاَكْلِ يَوْمَ النَّحْرِ

(قربانی کے دن کھانے کا بیان)

۹۰۴۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيْرِيْنَ عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فَلْيُعِدْ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ هٰذَا يَوْمٌ يُشْتَهٰى فِيْهِ اللَّحْمُ وَذَكَرَ مِنْ جِيْرَانِهٖ فَكَانَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَدَّقَهٗ قَالَ وَعِنْدِيْ جَذَعَةٌ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ شَاتَيْ لَحْمٍ فَرَخَّصَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَا اَدْرِيْ بَلَغَتِ الرُّخْصَةُ مَنْ سِوَاهُ اَمْ لَا۔

۹۰۵۔ حَدَّثَنَا عُثْمَانُ قَالَ حَدَّثَنَا جَرِيْرٌ عَنْ مَنْصُوْرٍ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍؓ قَالَ خَطَبَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْاَضْحٰى بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَقَالَ مَنْ صَلّٰى صَلٰوتَنَا وَنَسَكَ نُسُكَنَا فَقَدْ اَصَابَ النُّسُكَ وَمَنْ نَسَكَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فَاِنَّهٗ قَبْلَ الصَّلٰوةِ وَلَا نُسُكَ لَهٗ فَقَالَ اَبُوْ بُرْدَةَ بْنُ نِيَارٍ خَالُ الْبَرَآءِ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَاِنِّيْ نَسَكْتُ شَاتِيْ قَبْلَ الصَّلٰوةِ وَعَرَفْتُ اَنَّ الْيَوْمَ يَوْمُ اَكْلٍ وَّشُرْبٍ وَّاَحْبَبْتُ اَنْ تَكُوْنَ شَاتِيْ اَوَّلَ شَاةٍ تُذْبَحُ فِيْ بَيْتِيْ فَذَبَحْتُ شَاتِيْ وَتَغَدَّيْتُ قَبْلَ اَنْ اٰتِيَ الصَّلٰوةَ قَالَ شَاتُكَ شَاةُ لَحْمٍ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاِنَّ عِنْدَنَا عَنَاقًا لَّنَا جَذَعَةً اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ شَاتَيْنِ اَفَتَجْزِيْ عَنِّيْ قَالَ نَعَمْ وَلَنْ تَجْزِيَ عَنْ اَحَدٍ بَعْدَكَ۔

ترجمہ۹۰۴۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، روایت کرتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نماز سے پہلے قربانی کرے تو وہ دوبارہ قربانی کرے، ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ آج کے دن گوشت کی بہت خواہش ہوتی ہے اور اس نے اپنے پڑوسیوں کا حال بیان کیا، نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق کی۔ اور اس نے کہا کہ میرے پاس ایک جذعہ (ایک سال سے کم کا بھیڑ کا بچہ) ہے جو گوشت کی دو بکریوں سے مجھے زیادہ محبوب ہے، اور اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیدی، مجھے معلوم نہیں کہ یہ اجازت اس کے سوا دوسرے لوگوں کو بھی ہو یا نہیں۔

ترجمہ۹۰۵۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگوں کے سامنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بقرعید کے دن نماز کے بعد خطبہ پڑھا اور فرمایا کہ جس نے ہماری طرح نماز پڑھی اور ہماری طرح قربانی کی تو اس کی قربانی درست ہوگئی اور جس نے نماز سے پہلے قربانی کی تو وہ نماز سے پہلے ہے (یعنی صرف گوشت کے لئے ہے) اور اس کی قربانی نہیں ہوگی، براء کے ماموں ابو بردہ بن نیار نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں نے اپنی بکری نماز سے پہلے ذبح کر ڈالی، اور میں نے سمجھا کہ آج کھانے اور پینے کا دن ہے، اور میں نے سمجھا کہ میری بکری میرے گھر میں سب سے پہلے ذبح ہو، چنانچہ میں نے اپنی بکری ذبح کر ڈالی، اور عیدگاہ جانے سے پہلے میں نے اسے کھا بھی لیا تو آپ نے فرمایا کہ تمہاری بکری گوشت کی بکری ہے، ابو بردہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ میرے پاس ایک سال سے کم عمر بھیڑ کا بچہ ہے جو میرے نزدیک دو بکریوں سے زیادہ محبوب ہے کیا وہ میرے لئے کافی ہو جائے گا، آپ نے فرمایا، ہاں لیکن تمہارے بعد کسی دوسرے کے لئے کافی نہ ہوگا۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ قربانی کے دن مستحب یہی ہے کہ پہلے اپنی قربانی کا گوشت کھائے اور دیہات میں قربانی بقرعید کے دن طلوعِ فجر کے بعد ہی سے جائز ہے کیونکہ ان پر عید کی نماز نہیں ہے، البتہ شہروں میں بعد نمازِ عید ہی جائز ہوگی، امام ترمذی نے

حدیث ذکر کرنے کے بعد لکھا کہ اہلِ علم کا عمل اسی پر ہے کہ شہروں میں نماز عید سے قبل قربانی نہ کی جائے، اور کچھ حضرات اہلِ علم نے دیہات والوں کو طلوعِ فجر ہی سے اجازت دی ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ امام ترمذی شافعیؒ کی اس عبارت سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ اہلِ علم کے نزدیک جمعہ وعید کے بارے میں شہر اور گاؤں کا فرق تھا، اور جمعہ وعید کی نماز دیہات میں نہ تھی۔

حاشیۂ فیض الباری ص ۲/ ۳۵۸ میں ترمذی کی دوسری عبارت بھی باب الاعتکاف سے نقل کی گئی ہے، جس میں ہے کہ اگر معتکف ایسے شہر میں ہو جس میں جمعہ پڑھا جاتا ہو تو اس کو مسجد جامع[1] میں اعتکاف کرنا چاہئے تا کہ نماز جمعہ کے لئے اپنے معتکف سے نکلنا نہ پڑے، یہاں بھی مصر جامع کی قید نے بتایا کہ دیہات میں جمعہ نہ تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

جذعہ: بکری یا بھیڑ کا چار ماہ کا بچہ، جو قربانی میں جائز نہیں ہے، کیونکہ بھیڑ یا دنبہ کا بچہ بھی صرف وہ جائز ہے جو کم سے کم چھ ماہ کا ہو اور اتنا فربہ ہو کہ ایک سال کا معلوم ہوتا ہو، اسی لئے حضور علیہ السلام نے یہاں کم عمر والے کی اجازت خاص طور سے دی تھی اور فرما دیا کہ اس کے بعد اتنا چھوٹا بھیڑ کا بکرا بھی کسی کے لئے جائز نہ ہوگا۔ اور بکرا کم سے کم ایک سال کا ہونا چاہئے۔

بَابُ الْخُرُوْجِ اِلَى الْمُصَلّٰى بِغَيْرِ مِنْبَرٍ

(عیدگاہ بغیر منبر کے جانے کا بیان)

۹۰۶۔ حَدَّثَنِیْ سَعِیْدُ بْنُ اَبِیْ مَرْیَمَ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ زَیْدُ بْنُ اَسْلَمَ عَنْ عِیَاضِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ سَرْحٍ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَخْرُجُ یَوْمَ الْفِطْرِ وَالْاَضْحٰی اِلَی الْمُصَلّٰی فَاَوَّلُ شَیْءٍ یَّبْدَاُ بِهِ الصَّلٰوةُ ثُمَّ یَنْصَرِفُ فَیَقُوْمُ مُقَابِلَ النَّاسِ وَالنَّاسُ جُلُوْسٌ عَلٰی صُفُوْفِهِمْ فَیَعِظُهُمْ وَیُوْصِیْهِمْ وَیَاْمُرُهُمْ فَاِنْ کَانَ یُرِیْدُ اَنْ یَّقْطَعَ بَعْثًا قَطَعَهٗ اَوْ یَاْمُرَ بِشَیْءٍ اَمَرَ بِهٖ ثُمَّ یَنْصَرِفُ فَقَالَ اَبُوْسَعِیْدٍ فَلَمْ یَزَلِ النَّاسُ عَلٰی ذٰلِکَ حَتّٰی خَرَجْتُ مَعَ مَرْوَانَ وَهُوَ اَمِیْرُ الْمَدِیْنَةِ فِیْ اَضْحٰی اَوْ فِطْرٍ فَلَمَّا اَتَیْنَا الْمُصَلّٰی اِذَا مِنْبَرٌ بَنَاهُ کَثِیْرُ بْنُ الصَّلْتِ فَاِذَا مَرْوَانُ یُرِیْدُ اَنْ یَّرْتَقِیَهٗ قَبْلَ اَنْ یُّصَلِّیَ فَجَبَذْتُ بِثَوْبِهٖ فَجَبَذَنِیْ فَارْتَفَعَ فَخَطَبَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فَقُلْتُ لَهٗ غَیَّرْتُمْ وَاللّٰهِ فَقَالَ یَا اَبَا سَعِیْدٍ قَدْ ذَهَبَ مَا تَعْلَمُ فَقُلْتُ مَا اَعْلَمُ وَاللّٰهِ خَیْرٌ مِّمَّا لَا اَعْلَمُ فَقَالَ اِنَّ النَّاسَ لَمْ یَکُوْنُوْا یَجْلِسُوْنَ لَنَا بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَجَعَلْتُهَا قَبْلَ الصَّلٰوةِ۔

ترجمہ ۹۰۶۔ حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور بقرعید کے دن عید گاہ کو جاتے، اور اس دن سب سے پہلے جو کام کرتے، وہ یہ کہ نماز پڑھتے، پھر نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کے سامنے کھڑے ہوتے اس حال میں کہ لوگ اپنی صفوں پر بیٹھے ہوتے، آپ انہیں نصیحت کرتے تھے اور وصیت کرتے تھے اور انہیں حکم دیتے تھے، اور اگر کوئی لشکر بھیجنے کا ارادہ کرتے، تو اس کو روانہ کرتے، اور جس چیز کا حکم دینا ہوتا دیتے، پھر واپس ہو جاتے، ابوسعید نے کہا کہ لوگ ہمیشہ اسی طرح کرتے رہے یہاں تک کہ میں مروان کے ساتھ عید الاضحیٰ یا عید الفطر میں نکلا جو مدینہ کا گورنر تھا، جب ہم لوگ عید گاہ پہنچے تو دیکھا کہ وہاں منبر موجود تھا جو کثیر ابن صلت نے بنایا تھا، مروان نے نماز پڑھنے سے پہلے اس منبر پر چڑھنے کا ارادہ کیا تو میں نے اس کا کپڑا پکڑ کر کھینچا اس نے بھی مجھے کھینچا اور منبر پر چڑھ گیا۔ اور نماز سے پہلے خطبہ پڑھا، میں نے اس سے کہا کہ بخدا تم نے سنت کو بدل ڈالا۔ مروان نے کہا کہ اے ابوسعید وہ چیز جا چکی جو تم

[1] یہاں فیض الباری میں مسجد حرام غلط چھپ گیا ہے۔

جانتے ہو، میں نے کہا، بخدا میں جو چیز جانتا ہوں وہ اس سے بہتر ہے جو میں نہیں جانتا ہوں، مروان نے کہا، لوگ نماز کے بعد ہماری بات سننے کے لئے نہیں بیٹھتے، اس لئے ہم نے خطبہ کو نماز سے پہلے کر دیا ہے۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: سنت یہی ہے کہ عید گاہ کے لئے امام بغیر منبر کے نکلے کیونکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اسی طرح نکلتے تھے اور آپ کے زمانہ میں عید گاہ میں بھی منبر نہ تھا، البتہ روایات سے اتنا ثابت ہے کہ وہاں کوئی بلند جگہ تھی جس پر آپ خطبہ دیتے تھے، اور بخاری میں بھی ثم نزل وارد ہے، پھر کثیر بن الصلت نے عہدِ خلفاء میں کچی اینٹوں اور مٹی سے منبر بنا دیا تھا۔

پھر دوسری سنت یہ ہے کہ نماز کو خطبہ پر مقدم کیا جائے، اور مروان نے اس کے برعکس خطبہ کو نماز پر مقدم کر دیا تھا کیونکہ وہ خطبہ کے اندر حضرت علیؓ کے حق میں برے کلمات استعمال کرتا تھا اور لوگ اٹھ کر چلے جاتے تھے تا کہ ان کو نہ سنیں، اس پر مروان نے یہ ترکیب کی کہ خطبہ سنیں۔ اور حضرت عثمانؓ سے جو روایت تقدیم خطبہ کی نقل ہوئی ہے اس کی وجہ دوسری تھی، یعنی مصلحت تکثیرِ جماعت وغیرہ تا کہ لوگوں کو نمازِ عید مل جائے۔ باقی اکثر عادت ان کی بھی ایسی نہ تھی۔ چنانچہ آگے قریب ہی بخاری میں روایت آ رہی ہے کہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ سب ہی نمازِ عید۔ خطبہ سے قبل پڑھتے تھے۔

مروان کے حالات

یہاں جو واقعہ مروان کا بیان ہوا ہے، وہ اس زمانہ کا ہے جب وہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے مدینہ طیبہ کا گورنر تھا، اور حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر فرمایا کہ مروان رجال بخاری سے ہے اور وہ بڑا فتنہ پرداز تھا، اور صحابی کو قتل کیا ہے، قبل نماز کے خطبہ اس لئے کیا تھا کہ حضرت علیؓ پر سب و شتم کرے اور لوگوں کو سنائے۔ امام بخاریؒ اس کا جواب نہیں دے سکتے کہ ایسے شخص کو کیوں راوی بنایا۔

صحیح بخاری ص ۱۰۵ باب القراءۃ فی المغرب میں امام بخاری نے مروان کی روایت سے حدیث نقل کی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے وہاں بھی درسِ بخاری میں فرمایا تھا کہ یہ شخص فتنہ پرداز، خوں ریزیوں کا باعث، اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کا بھی باعث تھا، اس کی غرض ہر جنگ میں یہ ہوتی تھی کہ بڑوں میں سے کوئی نہ رہے تا کہ ہم صاحبِ حکومت بنیں، جنگِ جمل کے واقعہ میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ کون ہے جو حرمِ نبی پر دست درازی کرتا ہے؟ اشترِ نخعی تو یہ سن کر ہٹ گئے اور چھوڑ کر چلے گئے، مگر مروان نے پیچھے سے جا کر حضرت طلحہؓ کو تیر مار کر زخمی کر دیا (جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے)۔

ہندو پاک میں کچھ عرصہ سے ''خلافت و ملوکیت'' ایسی اہم بحث چل رہی ہے، اور اس سلسلہ میں ابتدائی دور کی اسلامی تاریخ کے رجال بھی تذکروں میں آ رہے ہیں، چونکہ چند صدیوں سے اسلامی تاریخ کو غلط طور پر اور مسخ کر کے پیش کرنے کی مہم یورپ کے مستشرقین نے بھی چلائی تھی، اور اس سے ہمارے کچھ بڑے بھی متاثر ہو گئے تھے، مثلاً شیخ محمد عبدہ، علامہ رشید رضا محمد الخضری (صاحب المحاضرات) عبدالوہاب النجار وغیرہ، اس لئے ان کا رد اور صحیح حالات کی نشاندہی کا فریضہ علماء امت پر عائد ہو چکا تھا۔ خدا کا شکر ہے اس کے لئے علامہ مورخ شیخ محمد العربی التبانی فی استاذِ مدرسۃ الفلاح والحرم المکیؒ نے ہمت کی اور دو جلدوں میں ''تحذیر العبقری من محاضرات الخضری'' لکھ کر شائع کی جو الحمدللہ نہایت محققانہ اور مستند حوالوں سے مزین ہے، اور اس میں اپنے بڑوں سے جو غلطیاں ہو گئی ہیں وہ بھی واضح کر دی گئی ہیں، مثلاً ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ سے کتاب کی دونوں جلدوں کا مطالعہ اہلِ علم خصوصاً مؤلفین کے لئے نہایت ضروری ہے، یہاں ہم کچھ حصہ مروان کے بارے میں پیش کر رہے ہیں۔

(۱) مروان بن الحکم بن ابی العاص م ۶۵ھ نے روایتِ حدیث بھی کی ہے مگر اس نے حضور علیہ السلام کی زیارت نہیں کی اور نہ آپ سے خود

کوئی حدیث سنی ہے، اس کی توثیق عام احادیث کے بارے میں نہیں بلکہ صرف فصلِ زبیرؓ کے بارے میں حضرت عروہؓ نے کی تھی، طلبِ خلافت کا شوق چرایا تو یہ تک کہہ دیا کہ ابن عمر مجھ سے بہتر نہیں ہیں۔ محدث شہیر حافظ اسماعیلی م ۹۵ھ نے امام بخاریؒ پر سخت نقد کیا کہ انہوں نے اپنی صحیح بخاری میں مروان کی حدیث کیوں ذکر کی، اور اس کے نہایت بدبختانہ اعمال سے یہ بھی ہے کہ اس نے یومِ جمل میں حضرت طلحہؓ کو تیر مار کر شہید کیا تھا، پھر خلافت بھی بزورِ تلوار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ (تہذیب ص ۱۰/۹۱)۔

بخاری ص ۵۲۷ میں ہے کہ حضرت طلحہ نے حضور علیہ السلام کی حفاظت کرتے ہوئے اپنا ہاتھ بیکار کر دیا تھا، علامہ کرمانی نے لکھا کہ جنگِ احد میں حضور علیہ السلام کی حفاظت کرتے ہوئے صرف طلحہؓ رہ گئے تھے تو انہوں نے اپنے جسم مبارک پر اسی سے زیادہ زخم کھا کر بھی حضور کو بچایا تھا اور اسی پر حضور علیہ السلام نے خوش ہو کر فرمایا تھا کہ طلحہؓ کے لئے جنت واجب ہوگئی۔ ایسے جنتی پر قاتلانہ حملہ کرنے کا حوصلہ صرف مروان جیسا شقی ہی کر سکتا تھا۔

(۲) بقول حضرت شاہ صاحبؒ کے قتلِ عثمانؓ کا باعث بھی مروان ہی تھا، کیونکہ وہ ان کا سیکرٹری تھا اور اسی نے حضرت عثمانؓ کی طرف سے ایک جھوٹا خط عاملِ مصر ابن ابی سرح کے نام لکھا تھا اور حضرت عثمانؓ کی مہر بھی بغیر ان کی اجازت کے لگادی تھی اور حضرت عثمانؓ ہی کے اونٹ پر ان کے ہی غلام یا کسی دوسرے کو بٹھا کر مصر کو خط روانہ کر دیا کہ جتنے لوگ مصر سے شکایات لیکر مدینہ آئے ہیں، جب وہ مصر پہنچیں تو ان سب کو فلاں فلاں طریقہ پر قتل کر دینا۔ وہ خط راستہ میں پکڑا گیا اور اس کو لے کر مصری وفد واپس آیا اور حضرت عثمانؓ سے کہا کہ آپ نے ایسا خط لکھا ہے؟ انہوں نے حلف اٹھایا کہ میں نے ہرگز ایسا خط نہیں لکھا نہ میرے امر و علم سے لکھا گیا، اس پر سارے بلوائیوں نے متفقہ مطالبہ کیا کہ یا تو مروان کو ہمارے سپرد کریں تا کہ ہم اس سے پوری تحقیق کر کے اس کا تدارک کرائیں، یا آپ اپنے آپ کو معزول کر لیں ورنہ تیسری صورت آخر یہ ہے کہ آپ خود شہید ہو جائیں گے۔ پھر جس طرح بلوہ کے دنوں میں بلوائیوں کو مروان نے بار بار مشتعل کیا، اور حضرت علیؓ کے بہتر مشوروں کو حضرت عثمانؓ محض مروان کی وجہ سے نہ مان سکے، اس کی پوری تفصیل تحذیر العبقری میں مستند تاریخوں سے درج کی گئی ہے۔

(۳) حضرت معاویہؓ کے دوسرے گورنروں کے بارے میں تو یہ بحث کسی حد تک چل سکتی ہے کہ وہ خطبۂ جمعہ وعید میں سبِ علی کرتے تھے یا نہ کرتے تھے، مگر مروان کے بارے میں یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ وہ اپنے عاملِ مدینہ ہونے کے زمانہ میں ضرور ایسا کرتا تھا اور اسی لئے اس نے خطبۂ عید کو بھی نماز پر مقدم کر دیا تھا۔

(۴) حضرت علیؓ کے علاوہ اس سے حضرت حسنؓ کے بارے میں بھی فحش کلامی ثابت ہے۔

(۵) حضرت حسنؓ کی وفات پر حضرت عائشہؓ نے ان کو اپنے نانا جان صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس دفن ہونے کی اجازت دے دی تھی، مگر مروان ہی نے شدید مخالفت کی تھی حالانکہ اس وقت وہ امیر مدینہ بھی نہ تھا، اور وہاں قتل و قتال کی نوبت آجاتی، اگر حضرت ابو ہریرہؓ بیچ میں پڑ کر حضرت حسینؓ کو دفنِ بقیع کے لئے آمادہ نہ کر لیتے۔

(۶) واقعہ حرہ ۶۳ھ میں بھی اگرچہ مروان امیرِ مدینہ نہیں تھا مگر اس نے اور اس کے بیٹے عبدالملک نے ہی لشکرِ شام کو بنی حارثہ کے راستہ سے مدینہ طیبہ میں داخل کرا دیا تھا، اس وقت یزید کی طرف سے عثمان بن محمد بن ابی سفیان گورنرِ مدینہ تھا، اور اس کی غلط کاریوں کے سبب سے مدینہ طیبہ کے لوگ یزید سے بے زار ہو گئے تھے، عثمان نے یزید کو خبر دی تو اس نے مسلم بن عقبہ کی سرکردگی میں ایک بہت بڑا لشکرِ جرار مدینہ طیبہ پر چڑھائی کے لئے روانہ کیا، اہلِ مدینہ نے حضور علیہ السلام کے زمانہ کی خندق کو کھود کر پھر سے کارآمد کر لیا اور ہر طرف سے مدینہ کو محفوظ کر لیا تھا، مسلم بن عقبہ کا لشکر مدینہ سے باہر آ کر رک گیا، اور کوئی صورت حملہ کی نہ دیکھی تو مروان اور اس کے بیٹے سے مدد چاہی اور ان دونوں نے ایک

خفیہ راستہ بتا کر مدینہ پر حملہ کرا دیا۔ اور پھر لشکرِ یزید نے تین دن تک مدینہ میں لوٹ مار اور قتلِ عام کا بازار گرم کیا اور ایسے ایسے مظالم کئے، جن کو لکھنے سے ہمارا قلم عاجز ہے۔ پھر یہی مسلم مکہ معظمہ پر چڑھائی کے لئے اپنا لشکر لے کر چلا اور تین دن کی مسافت طے کر کے راستہ ہی میں مر گیا تھا۔ حضرت سعید بن المسیبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر نماز کے بعد بنی مروان کے لئے بددعا کرتا ہوں۔

(۷) مستدرکِ حاکم ص ۲/۴۸۱ میں یہ حدیث ہے۔ جس کی سند صحیح ہے اور اس کی توثیق علامہ ذہبی نے بھی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم اور اس کی اولاد پر لعنت کی ہے۔

علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا کہ مروان کے اعمال ہلاکت خیز ہیں، اس نے حضرت طلحہؓ کو بھی قتل کیا اور کتنے ہی برے اعمال کا مرتکب ہوا ہے۔

(۸) تحذیر العبقری ص ۲/۲۸۲ میں مروان کے افعالِ مشؤمہ کو مختصراً ایک جگہ بھی جمع کیا ہے اور ان میں اس کے غدر و بدعہدی کا واقعہ بھی نقل کیا ہے جو اس نے ضحاک بن قیس کے ساتھ روا رکھا تھا اور ان کو مع ان کے اسی رفقاء اشراف شام کے قتل کرا دیا تھا۔

(۹) عبدالملک بن مروان نے حجاج کے ذریعہ کعبۃ اللہ پر گولہ باری کرائی تھی اور حجاج کو بھیج کر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو شہید کرایا تھا۔ حضرت عامر بن عبداللہ بن زبیرؓ فرمایا کرتے تھے کہ بنی مروان نے ساٹھ سال تک حضرت علیؓ کو برا بھلا کہا اور کہلایا مگر حضرت علیؓ کو اس سے کچھ نقصان نہ پہنچا بلکہ ان کی اور بھی عزت و رفعت میں اضافہ ہوا۔ اور شام کے بعض لوگوں کے منہ زندگی ہی میں خنزیر کے سے ہو گئے تھے (جو حضرت علیؓ پر روزانہ ایک ہزار بار لعنت کرتے تھے) یہ بھی دیکھا گیا ہے (رر ص ۲/۱۹۹)۔

(۱۰) ۶۴ھ میں مروان کو بھی ۹ ماہ کے لئے حکومت مل گئی تھی، اور اس کی موت اس کی بیوی کے ذریعے ہوئی تھی، جس نے اس کو ایک بیہودہ حرکت کی وجہ سے سونے کی حالت میں گلا دبا کر قتل کر دیا تھا، اور اس کا بیٹا بدلہ بھی نہ لے سکا، اس بدنامی سے ڈر کر کہ لوگ کہیں گے کہ مروان ایسا بڑا بادشاہ ایک عورت کے ہاتھوں مارا گیا۔ (رر ص ۲۸۱)

(۱۱) مروان کا باپ حکم بھی بہت بدکردار تھا، وہ حضور علیہ السلام کی ازواجِ مطہرات کے حجروں پر جاسوسی کیا کرتا تھا، ان میں وہ جھانکتا تھا اور راز کی خبریں لوگوں کو پہنچایا کرتا تھا، حضور علیہ السلام کی نقلیں اتارتا تھا وغیرہ اسی لئے حضور علیہ السلام نے اس کو اور اس کے بیٹے مروان کو مدینہ منورہ سے جلاوطن کر کے طائف بھیج دیا تھا پھر وہ حضرت ابوبکر و عمرؓ کے زمانوں میں بھی نہ آسکا، اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں باپ بیٹے دونوں مدینہ طیبہ آگئے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری، کتاب الفتن میں حدیث " ھلاک امتی علی یدی اغیلتم سفھاء کے تحت لکھا کہ بہت سی احادیث حکم اور اس کی اولاد کے ملعون ہونے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں جن کی تخریج طبرانی وغیرہ نے کی ہے، ان میں زیادہ تو محلِ نظر ہیں مگر بعض جید بھی ہیں۔

مروان ایسے فتنہ پرداز، سفاک و ظالم غیر ثقہ شخص کو رواۃ و رجالِ بخاری میں دیکھ کر بڑی تکلیف و حیرت بھی ہوتی ہے اور اسی لئے محدث اسماعیلی، محدث مقبلی یمانی وغیرہ نے تو سخت ریمارک کئے ہیں کہ یہ کیا ہے؟ امام محمدؒ جیسے (عظیم و جلیل محدث و فقیہ (استاذ امام شافعیؒ) سے تو بخاری میں روایت نہ لی جائے اور مروان سے لے لی جائے جس کی کوئی بھی توثیق نہیں کر سکتا۔ لیکن مقدرات نہیں ٹلتے جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا مگر اس کے ساتھ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ بات بھی کبھی نہ بھولی جائے کہ ضعیف و متکلم فیہ راویوں کی وجہ سے احادیثِ بخاری نہیں گریں گی۔ کیونکہ وہ سب احادیث دوسری احادیث مرویہ کے سبب سے قوت و صحت حاصل کر چکی ہیں واللہ المستعان۔

بَابُ الْمَشِيْ وَالرُّكُوْبِ اِلَى الْعِيدِ بِغَيْرِ اَذَانٍ وَّلَا اِقَامَةٍ

(نماز کے لئے پیدل اور سوار ہو کر جانے کا بیان، اور بغیر اذان و اقامت کے نماز کا بیان)

۹۰۷. حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ الْمُنْذِرِ الْحِزَامِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا اَنَسُ بْنُ عَيَاضٍ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ عَنْ نَّافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْ فِي الْاَضْحٰى وَالْفِطْرِ ثُمَّ يَخْطُبُ بَعْدَ الصَّلٰوةِ.

۹۰۸. حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ مُوْسٰى قَالَ اَخْبَرَنَا هِشَامٌ اَنَّ ابْنَ جُرَيْجٍ اَخْبَرَهُمْ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عَطَآءٌ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمَ الْفِطْرِ فَبَدَاَ بِالصَّلٰوةِ قَبْلَ الْخُطْبَةِ قَالَ وَاَخْبَرَنِيْ عَطَآءٌ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍؓ اَرْسَلَ اِلَى ابْنِ الزُّبَيْرِ فِيْ اَوَّلِ مَا بُوْيِعَ لَهٗ اَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ يُؤَذَّنُ بِالصَّلٰوةِ يَوْمَ الْفِطْرِ وَاِنَّمَا الْخُطْبَةُ بَعْدَ الصَّلٰوةِ وَاَخْبَرَنِيْ عَطَآءٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ وَّعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ لَمْ يَكُنْ يُؤَذَّنُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَلَا يَوْمَ الْاَضْحٰى وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ فَبَدَاَ بِالصَّلٰوةِ ثُمَّ خَطَبَ النَّاسَ بَعْدُ فَلَمَّا فَرَغَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَزَلَ فَاَتَى النِّسَآءَ فَذَكَّرَهُنَّ وَهُوَ يَتَوَكَّاُ عَلٰى يَدِ بِلَالٍ وَّبِلَالٌ بَاسِطٌ ثَوْبَهٗ تُلْقِيْ فِيْهِ النِّسَآءُ صَدَقَةً قُلْتُ لِعَطَآءٍ اَتَرٰى حَقًّا عَلَى الْاِمَامِ الْاٰنَ اَنْ يَّاْتِيَ النِّسَآءَ فَيُذَكِّرُهُنَّ حِيْنَ يَفْرُغُ قَالَ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ عَلَيْهِمْ وَمَا لَهُمْ اَنْ لَّا يَفْعَلُوْا.

ترجمہ ۹۰۷۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ، اور عید الفطر میں نماز پڑھتے تھے، پھر نماز کے بعد خطبہ دیتے تھے۔

ترجمہ ۹۰۸۔ حضرت عطاؒ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ان کو کہتے ہوئے سنا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن عیدگاہ کی طرف تشریف لے گئے اور خطبہ سے پہلے نماز پڑھی، ابن جریج نے کہا، مجھ سے عطاء نے بیان کیا کہ ابن عباس نے ابن زبیر کو جب ان کے لئے بیعت لی جارہی تھی، کہلا بھیجا کہ عید الفطر کے دن نماز کے لئے اذان نہیں کہی جاتی تھی، اور خطبہ نماز کے بعد ہوتا تھا، اور عطاء نے مجھ سے بواسطۂ ابن عباسؓ و جابر بن عبداللہ بیان کیا کہ نہ تو عید الفطر میں اور نہ عید الاضحیٰ کے دن اذان دی جاتی تھی اور جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے، پہلے نماز پڑھی، پھر بعد میں لوگوں کے سامنے خطبہ دیا۔ جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو عورتوں کے پاس آئے اور انہیں نصیحت کی اس حال میں کہ بلال پر تکیہ کئے ہوئے تھے اور بلال اپنا کپڑا پھیلائے ہوئے تھے، عورتیں اس میں صدقات ڈال رہی تھیں۔ میں نے عطاء سے پوچھا کہ کیا آپ امام کے لئے واجب سمجھتے ہیں کہ وہ عورتوں کے پاس آئے اور انہیں نصیحت کرے، جب وہ نماز سے فارغ ہوجائے، انہوں نے جواب دیا کہ بلاشبہ یہ ان کے ذمہ واجب ہے اور انہیں کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایسا نہیں کرتے۔

تشریح:۔ حافظ نے لکھا: امام بخاریؒ نے اس باب کے عنوان و ترجمہ میں تین باتوں کا ذکر کیا ہے (۱) نمازِ عید کے لئے پیروں سے چل کر جانا یا سوار ہو کر (۲) نمازِ عید خطبہ سے پہلے (۳) نمازِ عید کے لئے اذان و اقامت نہیں لیکن ان کا ذکر کردہ پہلا حکم کسی حدیث الباب سے ثابت نہیں ہوا، جس پر علامہ ابن التین نے اعتراض بھی کیا ہے، اس کے جواب میں علامہ زین بن المنیر نے کہا کہ حدیث نہ لانے سے امام بخاری نے بتایا کہ دونوں باتیں برابر درجہ کی اور جائز ہیں اور شاید اس سے یہ بھی اشارہ کرنا ہو کہ (ترمذی وغیرہ کی) جن احادیث سے چل کر جانے کا استحباب ثابت ہوتا ہے وہ ضعیف ہیں، لہٰذا ان سے سنیت یا استحبابِ مشی کا اثبات مرجوح ہے (فتح ص ۲/ ۳۰۸)۔

تفرداتِ ابن زبیرؓ

دوسری اہم بات یہاں یہ ہے کہ حضرت ابن زبیرؓ عید کے لئے اذان و اقامت کے قائل تھے، اور بقول ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ

کے یہ ان کے تفردات میں سے تھا، اوران کے تفردات پر بعض مباحث میں حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی نقد کیا ہے، جبکہ ہم لوگ خود حافظ ابن تیمیہؒ کے تفردات پر بھی نقد کرتے ہیں، اور انوارلباری میں خاص طور سے یہ بات نمایاں ملے گی کہ تفرداتِ اکابر کی نشان دہی کی گئی ہے، اور جمہور سلف وخلف کے طریقے کو اعلیٰ وافضل ثابت کیا گیا ہے۔ واللہ المعین۔

یہاں یہ بھی ذکر آیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے جو حضرت ابن زبیرؓ سے عمر میں سات سال بڑے تھے، ۶۴ھ میں جب ان کے لئے یزید بن معاویہ کی موت پر، بیت خلافت ہوگئی، تو ان کو کہلا کر بھیجا کہ پہلے سے عید کے لئے اذان واقامت نہ تھی، اور خطبہ بھی نماز کے بعد ہوتا تھا، تاکہ حضرت ابن زبیرؓ اپنے تفرد مذکور کو ختم کر دیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوا کہ وہ پھر بھی اپنے تفرد ہی پر قائم رہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ کلماتِ اذان کے علاوہ دوسرے کلمات الصلوٰۃ جامعۃ وغیرہ کی اجازت عید وکسوف کی نماز جماعت کے لئے سب کے نزدیک پائی جاتی ہے اور فرمایا کہ ان امور میں سب سے بہتر فیصلہ امام احمدؒ کا ہے کہ اصل عبادات میں تو یہ ہے کہ کوئی چیز بطورِ عبادت مشروع نہ بنے گی بجز اس کے جس کو اللہ تعالیٰ نے مشروع کر دیا ہے۔ اور اصل معاملات میں یہ ہے کہ کسی معاملہ سے اس وقت تک نہ روکیں گے جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے روک دیا ہے۔

بدعت رضاخانی

حضرتؒ نے فرمایا کہ رضاخاں صاحب نے رسالہ لکھا کہ جب مردہ کو قبر میں رکھیں تو اذان کہی جائے، کیونکہ خیر کی چیز ہے، میں نے کہا کہ یہ خیر کی چیز تھی تو پہلے کیوں نہیں ہوئی؟ جیسے عیدین کے لئے اذان نہ تھی اور بعد کو اس کا اجراء تفرد قرار دیا گیا اور رد ہوا، اسی طرح اس بدعتِ رضاخانی کو بھی رد کریں گے۔

اکثارِ تعبد کا بدعت ہونا

اہلِ حدیث دوسری طرف بڑھے کہ اکثارِ تعبد کو بھی بدعت قرار دے دیا، جس کے جواب میں مولانا عبدالحئی لکھنویؒ کو رسالہ لکھنا پڑا، پھر فرمایا کہ عبادت وزہد میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا کوئی مثیل نہیں تھا۔ اور حضرت محمد بن حنفیہ بھی بڑے عباد وزہاد میں سے تھے۔ لیکن ان کو اور حضرت ابن عباسؓ کو بھی خلافت کے بارے میں حضرت زبیرؓ نے قید کر دیا تھا۔

بَابُ الْخُطِيبِ بَعْدَ الْعِيْدِ

(عید کی نماز کے بعد خطبہ پڑھنے کا بیان)

۹۰۹۔ حَدَّثَنَا اَبُوْ عَاصِمٍ قَالَ اَخْبَرَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ قَالَ اَخْبَرَنِيْ الْحَسَنُ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ طَاؤسٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ شَهِدْتُ الْعِيْدَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَّاَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ وَعُثْمَانَ فَكُلُّهُمْ كَانُوْا يُصَلُّوْنَ قَبْلَ الْخُطْبَةِ.

۹۱۰۔ حَدَّثَنَا يَعْقُوْبُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ اُسَامَةَ قَالَ حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ عَنْ نَّافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبُوْ بَكْرٍ وَّعُمَرُ يُصَلُّوْنَ الْعِيْدَيْنِ قَبْلَ الْخُطْبَةِ.

۹۱۱۔ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَدِيِّ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى يَوْمَ الْفِطْرِ رَكْعَتَيْنِ لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهَا وَلَا بَعْدَهَا ثُمَّ اَتَى النِّسَآءَ وَمَعَهُ بِلَالٌ فَاَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ فَجَعَلْنَ يُلْقِيْنَ تُلْقِي الْمَرْاَةُ خُرْسَهَا وَسِخَابَهَا.

۹۱۲. حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا زُبَيْدٌ قَالَ سَمِعْتُ الشَّعْبِيَّ عَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍؓ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ مَانَبْدَأُ فِيْ يَوْمِنَا هٰذَا اَنْ نُصَلِّيَ ثُمَّ نَرْجِعَ فَنَنْحَرَ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ اَصَابَ سُنَّتَنَا وَمَنْ نَحَرَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فَاِنَّمَا هُوَ لَحْمٌ قَدَّمَهٗ لِاَهْلِهٖ لَيْسَ مِنَ النُّسُكِ فِيْ شَيْءٍ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ يُقَالُ لَهٗ اَبُوْبُرْدَةَ بْنُ نِيَارٍ يَّارَسُوْلَ اللّٰهِ ذَبَحْتُ وَعِنْدِيْ جَذَعَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّسِنَّةٍ قَالَ اجْعَلْهُ مَكَانَهٗ وَلَنْ تُوَفِّيَ اَوْتُجْزِيَ عَنْ اَحَدٍ بَعْدَكَ.

ترجمہ۹۰۹۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا میں عید کی نماز میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ کے ساتھ نماز میں شریک ہوا، یہ تمام لوگ خطبہ سے پہلے نماز پڑھتے تھے۔

ترجمہ۹۱۰۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور ابو بکرؓ وعمرؓ عیدین کی نماز خطبہ سے پہلے پڑھتے تھے۔

ترجمہ۹۱۱۔ حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر کے دن دو رکعت نماز پڑھی، نہ تو اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد نماز پڑھی، پھر عورتوں کے پاس آئے اور آپ کے ساتھ بلال تھے، عورتوں کو آپ نے صدقہ کرنے کا حکم دیا، تو ان عورتوں میں سے کوئی اپنی بالی اور کوئی اپنا ہار پھینکنے لگی۔

ترجمہ۹۱۲۔ حضرت براء بن عازب روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلی چیز جس سے ہم آج کے دن ابتدا کریں، وہ یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں، پھر گھر کو واپس ہوں، اور قربانی کریں، جس نے ایسا کیا اس نے میری سنت کو پالیا، اور جس نے نماز سے پہلے قربانی کی تو وہ صرف گوشت ہے جو اس نے اپنے گھر والوں کے لئے تیار کیا قربانی میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے تو انصار میں سے ایک شخص نے جنہیں ابو بردہ بن نیار کہا جاتا تھا، عرض کیا کہ یارسول میں نے تو نماز سے پہلے ذبح کرلیا، اور میرے پاس ایک سال سے کم عمر کا بکری کا بچہ ہے جو ایک سال کے بچہ سے بہتر ہے تو آپ نے فرمایا کہ اس کو اس کی جگہ ذبح کردو اور تمہارے بعد کسی کو کافی نہیں ہوگا، یا فرمایا کسی کی قربانی نہ ہوگی۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ پہلی حدیث الباب میں راوی حدیث حسن بن مسلم ہیں، جو طاؤس (تلمیذ حضرت ابن عباسؓ) کے اخص تلامذہ میں سے ہیں، بخاری کی جزو رفع الیدین میں ہے کہ انہوں نے اپنے استاد طاؤس سے رفع یدین کے بارے میں سوال کیا ہے۔ اور شام میں امام اوزاعی سے بھی سوال کیا گیا ہے، اور امام شافعیؒ سے بھی سوال ہوا ہے اور آپ نے جواب میں فرمایا کہ فعلِ رسول کی کیا حکمت پوچھتے ہو؟ تو یہ مکہ معظمہ و شام وغیرہ میں سوالات بتاتے ہیں کہ رفع یدین کی بات اتنی بدیہی اور عام نہ تھی، جیسی دوسرے لوگوں نے سمجھی ہے بلکہ لوگ تردد میں تھے کہ کریں یا نہ کریں اور کریں تو کیوں؟ میں نے اسی لئے نیل الفرقدین میں ایک فصل کے اندر تاریخ سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ عمل شارع علیہ السلام قلیل تھا۔ بعد کو کثیر ہوا ہے، کیونکہ جو چیز رات دن دیکھی جاتی ہو، اس کے بارے میں سوالات نہیں ہوا کرتے، اور تردد والی چیز میں ہی سوالات ہوا کرتے ہیں، اور اسی طرح میری رائے جہر آمین کے بارے میں بھی ہے کہ پہلے وہ کم تھا، پھر زیادہ ہوا ہے۔

امام بخاری نے خطبہ بعد عید کی اہمیت و سنیت دکھانے کیلئے متعدد احادیث ذکر کی ہیں، تاکہ مروان وغیرہ کے غلط تعامل سے پیدا شدہ غلط فہمی اچھی طرح سے دور ہوجائے۔

قوله ولم يصل بعد ها سے بطور اجتہاد سمجھا گیا کہ عیدگاہ میں نمازِ عید کے بعد بھی نوافل یا نماز چاشت نہ پڑھی جائے، اگرچہ اس کے روزانہ پڑھنے کی عادت بھی ہو اور اس کو بحر میں ذکر کیا گیا ہے، مولانا عبدالحئیؒ لکھنوی نے کہا کہ حضور علیہ السلام سے عدم ثبوتِ صلوٰۃ

بالمصلیٰ سے کراہتِ صلوٰۃ ثابت نہیں ہوتی، میں نے کہا کہ اس میں مجتہد کے نزدیک حجت بننے کی صلاحیت موجود ہے، اور اس کے لئے جائز ہے کہ وہ حضور علیہ السلام کے عدمِ فعل مذکور کو کراہت صلوٰۃ بالمصلیٰ کے لئے حجت مان لے، جیسا کہ محاذات کے مسئلہ میں بھی ایسا ہی ہوا ہے، اسی لئے میرے نزدیک مواضع اجتہاد میں نصوص کا مطالبہ صحیح طریقہ نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مزید وضاحت

حضرتؒ نے فرمایا کہ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو عیدگاہ میں نفل نماز پڑھتے دیکھا تو اس کو منع نہ کیا، لوگوں نے کہا کہ آپ اس کو منع نہیں فرماتے!! آپ نے فرمایا کہ میں نے عید کے دن یہاں حضور علیہ السلام کو نفل نماز پڑھتے کبھی نہیں دیکھا، مگر میں اس کو منع اس لئے نہیں کرتا کہ کہیں میں آیت ارأیت الذی ینھی عبداً اذا صلے'' کے تحت نہ آ جاؤں، حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ ہے موضعِ اجتہاد، اور حضرت عمرؓ نے ایسے مواقع کے افعال پر سخت نکیر کی ہے، ان کا یہ طریقہ حنفیہ کے موافق ہے، اور میں نے ان ہی چیزوں کو دیکھ کر جہراً آمین اور قراءت خلف الامام وغیرہ کے مسائل میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ منکر و ممنوع ہی تھے مگر قرونِ اولیٰ میں اگر کسی نے کیا تو اس پر نکیر نہ کی گئی ہوگی، لہٰذا میرا طریقۂ استدلال مولانا عبدالحیؒ کے طریقہ سے بالکل مختلف ہے۔

ایک واقعہ اور مسئلہ

حضرتؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں بجنور میں تھا، عید کے لئے رویت ۳۰ رمضان کو صبح ۹ بجے معلوم ہوئی تو میں نے قاضی صاحب بجنور سے کہا کہ نماز کرا دو، وہ کھسک گئے اور اس روز نماز نہ پڑھائی اس میں ان کی مصلحت ہوگی، اگلے روز پڑھائی تو میں نے کہا کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہاں نماز نہیں ہوئی، کہ ان کے یہاں قضا نہیں ہے۔ البتہ صاحبین کے نزدیک ہو جاتی ہے۔

بَابُ مَایُکْرَهُ مِنْ حَمْلِ السِّلَاحِ فِی الْعِیْدِ وَالْحَرَمِ وَقَالَ الْحَسَنُ نُهُوْا اَنْ یَّحْمِلُوا السِّلَاحَ یَوْمَ الْعِیْدِ اِلَّا ان یخافوا عدوًّا

(عید کے دن اور حرم میں ہتھیار لے کر جانے سے منع کیا گیا، بشرطیکہ دشمن کا خوف نہ ہو)

۹۱۳۔ حَدَّثَنَا زَکَرِیَّآءُ بْنُ یَحْیٰی اَبُو السُّکَیْنِ قَالَ حَدَّثَنَا الْمُحَارِبِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سُوْقَةَ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ جُبَیْرٍ قَالَ کُنْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ حِیْنَ اَصَابَهُ سِنَانُ الرُّمْحِ فِیْ اَخْمَصِ قَدَمِهٖ فَلَزِقَتْ قَدَمُهٗ بِالرِّکَابِ فَنَزَلْتُ فَنَزَعْتُهَا وَذٰلِکَ بِمِنًی فَبَلَغَ الْحَجَّاجَ فَجَآءَ یَعُوْدُهٗ فَقَالَ الْحَجَّاجُ لَوْ نَعْلَمُ مَنْ اَصَابَکَ فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ اَنْتَ اَصَبْتَنِیْ قَالَ وَکَیْفَ قَالَ حَمَلْتَ السِّلَاحَ فِیْ یَوْمٍ لَّمْ یَکُنْ یُحْمَلُ فِیْهِ وَاَدْخَلْتَ السِّلَاحَ الْحَرَمَ وَلَمْ یَکُنِ السِّلَاحُ یَدْخُلُ فِی الْحَرَمِ۔

۹۱۴۔ حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ یَعْقُوْبَ قَالَ حَدَّثَنِیْ اِسْحٰقُ بْنُ سَعِیْدِ بْنِ عَمْرِو ابْنِ سَعِیْدِ بْنِ الْعَاصِ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ دَخَلَ الْحَجَّاجُ عَلَی ابْنِ عُمَرَ وَاَنَا عِنْدَهٗ فَقَالَ کَیْفَ هُوَ قَالَ صَالِحٌ فَقَالَ مَنْ اَصَابَکَ قَالَ اَصَابَنِیْ مَنْ اَمَرَ بِحَمْلِ السِّلَاحِ فِیْ یَوْمٍ لَّا یَحِلُّ فِیْهِ حَمْلُهٗ یَعْنِی الْحَجَّاجَ۔

ترجمہ ۹۱۳۔ حضرت سعید بن جبیر روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ تھا، جب ان کے تلوے میں نیزے کی نوک چبھ

گئی، اوران کا پاؤں رکاب سے چمٹ گیا، تو میں اترا اوراس نیزے کو نکالا، یہ واقعہ منیٰ میں ہوا تھا جب حجاج کو خبر ملی تو ان کی عیادت کرنے آیا تو حجاج نے کہا، کاش ہمیں معلوم ہو جاتا، کہ کس نے آپ کو یہ تکلیف پہنچائی، ابنِ عمر نے جواب دیا کہ تو نے ہی ہمیں یہ تکلیف پہنچائی ہے، حجاج نے پوچھا کیونکر؟ ابن عمرؓ نے جواب دیا کہ تو ایسے دن ہتھیار لے کر آیا، جس دن ہتھیار لے کر نہیں آیا جاتا تھا، اور تو نے ہتھیار حرم میں داخل کئے، حالانکہ حرم میں ہتھیار داخل نہیں کئے جاتے تھے۔

ترجمہ ۹۱۴۔ اسحٰق بن سعید بن عمرو بن سعید بن عاص اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حجاج ابن عمر کے پاس آیا اور میں ان کے پاس تھا اس نے پوچھا کیا حال ہے، ابن عمر نے جواب دیا، اچھا ہوں، حجاج نے پوچھا کس نے آپ کو یہ تکلیف پہنچائی، انہوں نے کہا، مجھے تکلیف اس شخص نے پہنچائی، جس نے ایسے دن میں ہتھیار اٹھانے کی اجازت دی، جس دن ہتھیار اٹھانا جائز نہ تھا، انہوں نے اس سے حجاج کو مراد لیا۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: عید کے دن ہتھیار لگا کر نکلنے کا مسئلہ نفیاً یا اثباتاً ہماری کتابوں میں ذکر نہیں ہوا ہے، اور امام بخاری بھی لفظِ من کے ساتھ لائے ہیں، جو میرے نزدیک ساری بخاری میں تبعیض کے لئے ہے لہٰذا اشارہ تقسیم کی طرف کیا ہے کہ بعض حالات میں ہتھیار باندھ کر نکلنا مکروہ ہے۔

قولہ انت اصبتنی پر فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ تم ہی سب بنے ہو اس کے لئے، کیونکہ تم نے آج کے دن ہتھیار لگا کر نکلنے کی لوگوں کو اجازت دی، اور نیزے سے مجھے زخم لگا، نہ تم اجازت دیتے نہ میں زخمی ہوتا۔ یا یہ مقصد تھا کہ حجاج نے چونکہ حضرت ابن عمرؓ پر حسد وغیرہ کی وجہ سے دانستہ کسی کے ذریعہ زخم پہنچایا تھا، تاکہ لوگ ان کی شخصیت سے متاثر نہ ہوں، اور وہ ایسے زہر آلود نیزے کا زخم تھا کہ اسی سے حضرت ابن عمرؓ کی وفات بھی ہوئی ہے۔ اس لئے فرمایا ہوگا کہ تم نے ہی تو زخم لگوایا ہے۔

علامہ کرمانی نے کہا کہ ابنِ بطال نے حدیث الباب کے بارے میں فرمایا: اس میں ہتھیار باندھ کر نکلنے کا مسئلہ ان مشاہد کے لئے ہے جن میں دشمنوں کے ساتھ لڑائی و جنگ کے مواقع پیش نہیں آتے، کہ ان میں اس طرح نکلنا مکروہ ہے، کیونکہ اس سے لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے زخمی ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ (حاشیۂ لامع ص ۲/۴۰)

بَابُ التَّبْكِيرِ لِلْعِيدِ وَقَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ بُسْرٍ اِنْ كُنَّا فَرَغْنَا فِيْ هٰذِهِ السَّاعَةِ وذٰلِکَ حِيْنَ التَّسْبِيْحِ

(عید کی نماز کے لئے سویرے جانے کا بیان، اور عبداللہ بن بسر نے کہا کہ ہم نماز سے اس وقت فارغ ہو جاتے تھے، جس وقت تسبیح (نفل نماز پڑھنا) جائز ہو جاتا ہے۔

۹۱۵۔ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ زُبَيْدٍ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنِ الْبَرَآءِ ابْنِ عَازِبٍؓ قَالَ خَطَبَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ النَّحْرِ فَقَالَ اِنَّ اَوَّلَ مَا نَبْدَأُ بِهٖ فِيْ يَوْمِنَا هٰذَا اَنْ نُصَلِّيَ ثُمَّ نَرْجِعَ فَنَنْحَرَ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِکَ فَقَدْ اَصَابَ سُنَّتَنَا وَمَنْ ذَبَحَ قَبْلَ اَنْ يُّصَلِّيَ فَاِنَّمَا لَحْمٌ عَجَّلَهٗ لِاَهْلِهٖ لَيْسَ مِنَ النُّسُکِ فِيْ شَيْءٍ فَقَامَ خَالِيْ اَبُوْ بُرْدَةَ بْنُ نِيَارٍ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللهِ اِنِّيْ ذَبَحْتُ قَبْلَ اَنْ اُصَلِّيَ وَعِنْدِيْ جَذَعَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّسِنَّةٍ فَقَالَ اجْعَلْهَا مَكَانَهَا اَوْقَالَ اِذْبَحْهَا وَلَنْ تَجْزِيَ عَنْ اَحَدٍ بَعْدَکَ.

ترجمہ ۹۱۵۔ حضرت براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں کہ قربانی کے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا تو فرمایا کہ سب سے پہلے ہم اس دن جو کام کریں وہ یہ کہ نماز پڑھیں، پھر واپس ہوں اور قربانی کریں، جو ایسا کرے تو اس نے میری سنت کو پالیا، اور جس نے

نماز سے پہلے ذبح کیا تو وہ گوشت ہے، جواس نے اپنے گھر والوں کے لئے جلدی تیار کیا ہے، قربانی نہیں ہے، میرے ماموں ابو بردہ بن نیار کھڑے ہوئے، اور کہا یا رسول اللہ میں نے نماز سے پہلے ذبح کرلیا، اور میرے پاس بکری کا ایک سال سے کم کا بچہ ہے، جو سال بھر کے بچے سے بہتر ہے، آپ نے فرمایا کہ اس کو اس کا قائم مقام بنالے، یا فرمایا کہ اس کی جگہ ذبح کرلے لیکن تیرے بعد کسی کے لئے کافی نہ ہوگا۔

تشریح:۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ نمازِ عید کے لئے سنت یہی ہے کہ وہ طلوع کے بعد کراہت کا وقت نکلتے ہی اول وقت پڑھ لی جائے اور زوال تک جائز ہے۔ اگر کسی شرعی مجبوری سے اول دن نہ پڑھی جائے۔ مثلاً نماز کا وقت نکل جانے پر روزِ عید ہونے کا فیصلہ ہوا تو دوسرے دن جائز ہوگی۔ اور اگر بلا عذر ترک کی گئی تو اگلے دن اس کی قضا امام صاحب کے نزدیک صحیح نہیں ہے، البتہ صاحبین کے نزدیک درست ہوگی۔

بخاری کے دوسرے نسخہ میں بجائے تکبیر کے تکبیر ہے، جس سے مراد یہاں عید گاہ کو جاتے آتے تکبیر مراد ہوگی کیونکہ تکبیراتِ نماز عیدین اور تکبیراتِ تشریق کا ذکر دوسرے ابوب میں ہے۔

اس کا مسئلہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عید الفطر میں سری تکبیر ہے اور عید الاضحیٰ میں جہری ہے۔ صاحبین کے یہاں دونوں عید میں جہری ہے، اور ایک روایت فتح القدیر ص ۱/۴۲۳ میں امام صاحب سے صاحبین کے موافق بھی ہے۔ فیض الباری ص ۲/۳۶۰ سطر ۱۶ میں بجائے عند الامام ابی حنیفہؒ کے عند ابن الہمام (الخ) غلط چھپ گیا ہے اور شیخ ابن الہمامؒ نے خلاف اصلِ تکبیر میں نقل کر کے اس کو رد کیا ہے پھر لکھا کہ ذکر کو کسی وقت میں بھی اور کسی طریقہ پر بھی ممنوع نہیں کہا جاسکتا خواہ وہ کسی غیر مسنون یا بدعی طریقہ پر بھی ہو۔ (فتح القدیر ص ۱/۴۲۳)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ علامہ ابن نجیمؒ نے فرمایا کہ حقیقتِ بدعت یہ ہے کہ کسی کام کو جس کا ثبوت سلف سے نہ ہو، معمول بہ بنالیا جائے۔ میرے نزدیک شیخ ابن ہمام کی بات اس لئے بھی زیادہ قوی ہے کہ طحاوی میں متعدد روایات ہیں جن میں سلف سے تکبیر کا ثبوت جہری طور سے بھی ہے، اسی لئے میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ عید الفطر میں بھی جہری تکبیر کہی جائے۔

بَابُ فَضْلِ الْعَمَلِ فِيْ اَيَّامِ التَّشْرِيْقِ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍؓ وَّاذْكُرُوا اللهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ اَيَّامُ الْعَشْرِ وَالْاَيَّامُ الْمَعْدُوْدَاتُ اَيَّامُ التَّشْرِيْقِ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ وَاَبُوْ هُرَيْرَةَ يَخْرُجَانِ اِلَى السُّوْقِ فِي الْاَيَّامِ الْعَشْرِ يُكَبِّرَانِ وَيُكَبِّرُ النَّاسُ بِتَكْبِيْرِهِمَا وَكَبَّرَ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ خَلْفَ النَّافِلَةِ۔

(ایامِ تشریق میں عمل کی فضیلت کا بیان، اور ابن عباسؓ نے کہا، کہ اللہ تعالیٰ کے قول واذکروا اللہ فی ایام معلومات میں دس دن مراد ہیں۔ اور ایام معدودات تشریق کے دن ہیں، ابن عمرؓ اور ابو ہریرہؓ ان دس دنوں میں بازار نکلتے تھے، تو تکبیر کہتے تھے، لوگ انکی تکبیر کیساتھ تکبیر کہتے اور محمد بن علی نفل نمازوں کے بعد بھی تکبیر کہتے تھے۔

۹۱۶۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَرْعَرَةَ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ سُلَيْمَانَ عَنْ مُسْلِمِ نِ الْبُطَيْنِ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا الْعَمَلُ فِيْ اَيَّامٍ اَفْضَلَ مِنْهَا فِيْ هٰذِهٖ قَالُوْا وَلَا الْجِهَادُ قَالَ وَلَا الْجِهَادُ اِلَّا رَجُلٌ خَرَجَ يُخَاطِرُ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فَلَمْ يَرْجِعْ بِشَيْءٍ۔

ترجمہ ۹۱۶۔ حضرت ابن عباس نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو عمل ان دنوں میں کیا جائے، اس سے کوئی عمل افضل نہیں ہے، لوگوں نے سوال کیا، کیا جہاد بھی نہیں، آپ نے فرمایا جہاد بھی نہیں، بجز اس شخص کے جس نے اپنی جان و مال کو خطرے میں ڈالا۔ اور کوئی چیز واپس لے کر نہ لوٹا۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ہر عبادت ان پہلے دس ایامِ ذی الحجہ میں، دوسرے سال کے دنوں میں عبادت سے افضل و برتر ہے باعتبار اجر و ثواب کے، اور یہ بھی ثابت ہوا کہ سال کے دنوں میں سے دس دن ذی الحجہ کے زیادہ افضل ہیں اور راتوں میں سے

رمضان کی راتیں سب سے افضل ہیں۔ سلفِ صالح کا خاص عمل ان دنوں میں روزہ اور تکبیر رہی ہے، گویا صرف یہی دونوں ان دنوں کی خصوصی عبادت سمجھی گئیں۔ پھر تکبیرات کا ثبوت شروع تاریخ ذی الحجہ سے بھی ہوا ہے، گویا وہ ان ایام کے لئے بطورِ شعار ہیں بلکہ ان کی شعاریت تلبیہ سے بھی زیادہ ہے، لہٰذا متونِ فقہ میں جو صرف چند روز کی تکبیر کا ذکر ہے وہ بیانِ واجب[1] ہے، باقی خصوصی وظیفہ اور ورد سب ہی دنوں کے لئے تکبیر ہے، لہٰذا امام ابوحنیفہؒ سے جو حضرت علیؓ کے ارشاد "**لا جمعة و لا تشريق الا فی مصر جامع**" کی وجہ سے یہ فیصلہ مروی ہے کہ شرائطِ تکبیر بھی شرائطِ جمعہ ہیں، وہ بھی باعتبار وجوب کے ہے ورنہ ظاہر ہے کہ تکبیرات کا جواز دیہات والوں کے لئے بھی ہے، کیونکہ ذکر اللہ کسی حال میں بھی ممنوع نہیں ہوسکتا۔

پھر میں نے یہ بھی تتبع کیا کہ آیا امام صاحب کے سوا بھی کسی نے تشریق سے مراد تکبیرات بھی لی ہیں، تو ابوعبید کی "غریب الحدیث" میں دیکھا کہ ان سے پوچھا گیا کہ قولِ حضرت علی لاجمعۃ ولاتشریق میں تشریق سے مراد تکبیر تشریق سواء امام صاحب کے اور بھی کسی نے لی ہے، تو فرمایا کہ نہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ ابوعبید امام احمد کے ہم عصر اور ہم پلہ ہیں اور امام محمدؒ سے بھی مستفید ہیں، بہت سی روایات واحادیث ولغات وغیرہ ان سے پوچھی ہیں۔

فرمایا کہ ایام معلومات سے مراد پورا عشرہ ذی الحجہ ہے اور ایامِ معدودات سے مراد ایامِ تشریق ہیں کیونکہ معدود کمی پر دال ہے۔

قوله و يكبر الناس بتكبيرهما، پر فرمایا کہ اس سے اور دوسرے آثار سے بھی جو امام بخاری آگے لا رہے ہیں، معلوم ہوا کہ تکبیر میں دوسرے لوگوں کی بھی موافقت وہمنوائی مطلوب ہے (جس طرح تلبیہ میں بھی آتا ہے کہ جب کوئی تلبیہ کہتا تھا تو اس کے دائیں بائیں والے بھی کہتے تھے، حتیٰ کہ زمین کے سارے حصوں تک یہ سلسلہ پہنچ جاتا تھا (ترمذی) اور سورۂ انبیاء میں حضرت داؤد علیہ السلام کے قصہ میں آتا ہے کہ جب وہ زبور پڑھتے یا تسبیح وتحمید کرتے تو پہاڑ اور پرندے وجانور بھی ان کے ساتھ آواز سے تسبیح پڑھنے لگتے تھے۔)

حضرتؒ نے فرمایا کہ حدیثِ مسلم سے ثابت ہوا کہ سبحان اللہ نصف میزان ہے اور ایسے ہی الحمدللہ بھی، اور بروایتِ ترمذی اللہ اکبر ان دونوں کی برابر ہے، یعنی ہر ایک کا دوگنا ہے کہ زمین سے آسمان تک کے سارے علاقہ کو بھر دیتا ہے، میرے نزدیک اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ اللہ اکبر میں رفعِ صوت ہے اور اس میں دوسروں کی شرکت بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا تکبیر کے وقت سارا جو زمین سے آسمان تک بھر جاتا ہے، یہ خصوصیت دوسرے اذکار، سبحان، الحمدللہ وغیرہ میں نہیں ہے۔

آگے بخاری کی حدیث میں یلبی الملبی اور یکبر المکبر بھی آرہا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ان دنوں میں اولیٰ تکبیر وتلبیہ ہی ہے، نہ تسبیح وتحمید، اور تلبیہ کی طرح اللہ اکبر بمنزلہ شعار بھی ہے، تسبیح وتحمید میں یہ بات نہیں ہے[2]۔

قوله ما العمل فی ايام پر فرمایا کہ دوسرا نسخہ جو حاشیہ پر ہے، وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ تفصیلِ شی علی نفسہ باعتبار زمانۂ واحد محال ہے

---

[1] یعنی امام صاحب سے ۸ وقتوں کی تکبیرات (عرفہ کی صبح سے دسویں کی عصر تک) اور صاحبین سے ۲۳ وقتوں کی (صبح عرفہ سے ۱۳ ویں ذی الحجہ کی عصر تک) یہ سب اختلاف واجب تکبیرات میں ہے اور بہتر ومستحب وافضل یہی ہے کہ تکبیرات کا ورد سب دنوں میں اور زیادہ سے زیادہ رکھا جائے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ قولہ وکان ابن عمر وابوہریرہ یخرجان الی السوق (الخ) سے بھی معلوم ہوا کہ ان دنوں میں وظیفہ اور ورد ہی تکبیر تھا اور حضرت محمد بن علی باقرؒ سے نقل ہوا کہ وہ نوافل کے بعد بھی تکبیر کہتے تھے۔

حضرتؒ نے تفسیر کشاف کے حوالہ سے یہ بھی نقل فرمایا کہ بعض سلف نے قولِ باری تعالیٰ و لتكبروا الله على ما هداكم کا محمل خارج کی تکبیراتِ فاضلہ کو بھی بنایا ہے۔ اور میرے نزدیک یہ بہت اچھا کیا ہے۔ "مؤلف"۔

[2] علامہ خطابی وابن بطالؒ نے فرمایا کہ ان ایام میں تکبیر کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ جاہلیت کا خلاف ہو کہ وہ ان دنوں میں اپنے بتوں کے نام پر ذبیحہ کیا کرتے تھے پس تکبیر کو ذبح للہ کا شعار ونشان بنادیا گیا، تاکہ ان ایامِ ذبح میں غیر اللہ کا نام ہی نہ آئے، اور اللہ اکبر ہی کی صدا ہر وقت فضا میں گونجتی رہے (عمدہ ص ۳۸۵/۳)

لہٰذا صحیح اور معنی مقصود اسی حوض کے نسخہ سے ادا ہوتا ہے، پھر یہ حدیث بہ کثرتِ طرق مروی ہے، اور سب میں ذکر ایام عشر میں فضلِ عمل کا ہی ہے۔

قولہ ولا الجهاد في سبيل الله ۔فرمایا کہ دوسرے حضرات نے یہ توجیہ کی کہ جہاد کی مفضولیت اس وجہ سے ہوگی کہ اس کی وجہ سے حج فوت ہو جائے گا۔لیکن میرے نزدیک وجہ یہ ہے کہ ان ایام کے خاص اعمال روزہ اور تکبیر کو دوسرے دنوں کے سب اعمال پر فضیلت اس لئے دی گئی کہ وقتی وظیفہ کی اہمیت وفوقیت اور تقدیم مسلم ہے۔ یہ شرح میں نے زیلعی سے اخذ کی ہے، پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ سب تحقیق اس وقت ہے کہ جہاد فرض نہ ہو، کیونکہ بحث فضائل میں چل رہی ہے، فرائض میں نہیں۔فرض کے مقابلہ میں فضائل اور اعمالِ مستحبہ کو نہیں لایا جا سکتا۔

بَابُ التَّكْبِيرِ أَيَّامَ مِنًى وَإِذَا غَدَا إِلَى عَرَفَةَ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ يُكَبِّرُ فِي قُبَّتِهِ بِمِنًى فَيَسْمَعُهُ أَهْلُ الْمَسْجِدِ فَيُكَبِّرُونَ وَيُكَبِّرُ أَهْلُ الْأَسْوَاقِ حَتَّى تَرْتَجَّ مِنًى تَكْبِيرًا وَّكَانَ ابْنُ عُمَرَ يُكَبِّرُ بِمِنًى تِلْكَ الْأَيَّامَ وَخَلْفَ الصَّلَوَاتِ وَعَلَى فِرَاشِهِ وَفِي فُسْطَاطِهِ وَمَجْلِسِهِ وَمَمْشَاهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامَ جَمِيعًا وَّكَانَتْ مَيْمُونَةُ تُكَبِّرُ يَوْمَ النَّحْرِ وَكَانَ النِّسَاءُ يُكَبِّرْنَ خَلْفَ أَبَانَ بْنِ عُثْمَانَ وَعُمَرَ بْنِ عَبْدِالْعَزِيْزِ لَيَالِيَ التَّشْرِيْقِ مَعَ الرِّجَالِ فِي الْمَسْجِدِ.

(منیٰ کے دنوں میں تکبیر کہنے کا بیان اور جب عرفہ کے دن صبح کے وقت مقام عرفات کو جائے، اور ابن عمرؓ منیٰ میں اپنے خیمہ ہی میں تکبیر کہتے، جب اس کو مسجد والے سنتے تو تکبیر کہتے یہاں تک کہ منیٰ کی زمین تکبیر سے گونج جاتی، اور ابن عمرؓ منیٰ میں ان دنوں میں تکبیر کہتے، اور نمازوں کے بعد اپنے بستر پر اپنے خیمہ میں، اپنی مجلس میں اور راستہ چلتے ان تمام دنوں میں اور میمونہؓ یوم نحر میں تکبیر کہتی تھیں، اور عورتیں ابان بن عثمان اور عمر بن عبدالعزیز کے پیچھے تشریق کے زمانہ میں مسجد میں مردوں کیساتھ تکبیر کہتی تھیں۔)

۹۱۷۔ حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ حَدَّثَنَا مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ قَالَ حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ أَبِي بَكْرِ نِ الثَّقَفِيُّ قَالَ سَأَلْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ وَّنَحْنُ غَادِيَانِ مِنْ مِّنًى إِلَى عَرَفَاتٍ عَنِ التَّلْبِيَةِ كَيْفَ كُنْتُمْ تَصْنَعُونَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ يُلَبِّي الْمُلَبِّي لَا يُنْكَرُ عَلَيْهِ وَيُكَبِّرُ الْمُكَبِّرُ فَلَا يُنْكَرُ عَلَيْهِ.

۹۱۸۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ حَفْصٍ قَالَ حَدَّثَنَا أَبِي عَنْ عَاصِمٍ عَنْ حَفْصَةَ عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ كُنَّا نُؤْمَرُ أَنْ نَخْرُجَ يَوْمَ الْعِيدِ حَتَّى نُخْرِجَ الْبِكْرَ مِنْ خِدْرِهَا حَتَّى نُخْرِجَ الْحُيَّضَ فَيَكُنَّ خَلْفَ النَّاسِ فَيُكَبِّرْنَ بِتَكْبِيرِهِمْ وَيَدْعُونَ بِدُعَائِهِمْ يَرْجُونَ بَرَكَةَ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَطُهْرَتَهُ.

ترجمہ ۹۱۷۔ محمد بن ابی بکر ثقفی روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ صبح کے وقت منیٰ سے عرفات کو جا رہے تھے تو میں نے انس بن مالک سے تلبیہ کے متعلق پوچھا کہ آپ لوگ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کس طرح کرتے تھے، تو انہوں نے جواب دیا کہ لبیک کہنے والا لبیک کہتا تو اس پر کوئی اعتراض نہ کرتا اور تکبیر کہنے والا تکبیر کہتا تو اسے بھی کوئی برا نہیں سمجھتا تھا۔

ترجمہ ۹۱۸۔ حضرت حفصہ، ام عطیہ سے روایت کرتی ہیں کہ ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ عید کے دن گھر سے نکلیں یہاں تک کہ کنواری عورتیں بھی اپنے پردہ سے باہر ہوتیں، اور حائضہ عورتیں بھی گھر سے باہر نکلتیں، پس وہ مردوں کے پیچھے رہتیں، اور مردوں کی تکبیر کے ساتھ تکبیر کہتیں اور انکی دعاؤں کے ساتھ دعا کرتیں، اس دن کی برکت اور اس کی پاکی کی امید رکھتیں۔

تشریح:۔ اس باب میں ایام منیٰ کی تکبیرات بیان ہوئیں، جو یوم عید کے بعد ۲ دن ہیں اگر حج کرنے والا منیٰ سے ۱۲ویں ذی الحجہ کو مکہ معظمہ واپس ہو اور اگر ۱۳ کو آئے تو تین دن ہیں۔ دونوں صورتیں درست ہیں۔

قولہ و اذا غدا سے بتایا کہ یہ نویں تاریخ کی تکبیر ہے (عمدہ ص ۳/۳۸۴)۔

قولہ و کان عمرؓ پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہی وہ موقعِ استدلال ہے، جس کی وجہ سے میں نے کہا تھا کہ سنت ان سب ہی دنوں کے اندر تمام اوقات میں تکبیر کہنا ہے اور بعد نمازوں والی تکبیر واجب ہے۔

قولہ و کان النساء یکبرن پر فرمایا کہ یہاں سے یہ نہیں نکلتا کہ عورتیں تکبیر بلند آواز سے کہیں، حدیثِ ترمذی[1] سے بھی اشارہ اسی طرف ہے کہ جہر کا حکم صرف مردوں کے لئے ہے اور وہ سنت مردوں کے لئے ہی ہے، عورتوں کے لئے نہیں، اسی لئے اس پر اجماع نقل ہوا کہ عورتیں تلبیہ زور سے نہ کہیں اور حضرت عائشہ وحضرت میمونہؓ سے جو نقل ہوا وہ اتفاقاً کبھی ہوا ہوگا۔ لامع ص ۲/۴۲ میں درمختار سے نقل ہوا کہ عورتیں بھی جماعت میں ہوں تو بہ تبعیتِ رجال تکبیر کہیں مگر پست آواز سے (کہ مرد اس کو نہ سنیں) علامہ شامی نے کہا اس لئے کہ ان کی آواز بھی عورت ہے اور بہت سے اہلِ بصیرت و دانشوروں کے نزدیک تو حسنِ صوت کا فتنہ حسنِ صورت سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ اب یہ فتنہ ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ ہر گھر میں داخل ہو گیا ہے، واللہ خیر حافظاً وہوارحم الراحمین۔

قولہ من خِدرھا۔ اس پر علامہ عینی نے لکھا کہ عورتیں بھی عیدگاہ جائیں یا نہ جائیں؟ اس کو ہم مفصل باب شہود الحائض العیدین میں لکھ چکے ہیں۔ (عمدہ ص ۳/ ۳۸۵) انوارالباری ص ۸/ ۱۴۷ تا ص ۸/ ۱۵۱ میں بھی یہ بحث پوری گزر چکی ہے۔

بَابُ الصَّلٰوۃِ اِلَی الْحَرْبَۃِ یَوْمَ الْعِیْد

(نیزے کی آڑ میں عید کے دن نماز پڑھنے کا بیان)

۹۱۹. حَدَّثَنِیْ مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَھَّابِ قَالَ حَدَّثَنَا عُبَیْدُ اللہِ عَنْ نَّافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ

---

[1] ترمذی باب ماجاء فی رفع الصوت بالتلبیۃ میں حدیث ہے کہ مجھے حضرت جبریل علیہ السلام نے حکم کیا کہ میں اپنے اصحاب کو اہلال یا تلبیہ بلند آواز سے کہنے کا حکم کروں۔ پھر جس شان سے صحابۂ کرام تلبیہ بلند آواز سے کہتے تھے کہ مثلاً حضرت عمرؓ کے تلبیہ کی آواز پہاڑوں کے درمیان گونجتی تھی اور عام صحابہ اتنی زور سے تلبیہ پڑھتے تھے کہ ان کی آواز پڑ جاتی تھی، وہ تو عورتوں کے لئے کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔

علامہ ابن تیمیہ نے فتاویٰ ص ۱/۱۶۲ میں دعویٰ کیا کہ "جمعہ سے قبل کوئی سنتِ راتبہ قول و فعلِ نبوی سے ثابت نہیں ہے اسی لئے جماہیر ائمہ نے بھی اس کو تسلیم نہیں کیا۔ اور عدمِ سنیت ہی کا مذہب مالک وشافعی اور اکثر اصحاب شافعی کا ہے اور امام احمد کا بھی مشہور مذہب ہے البتہ ایک طائفہ اصحاب احمد وشافعی نے ۲ رکعت مانی ہیں اور اصحابِ ابی حنیفہ اور ایک طائفہ اصحابِ احمد نے چار کہیں۔ انہوں نے امام احمد سے روایت شدہ احادیث سے بھی اس کے لئے استدلال کیا ہے؟ اس میں علامہ نے امام شافعی کی طرف نسبت غلط کی ہے اور اکثر بلکہ اکابر اصحاب شافعی کا بھی یہ مذہب نہیں ہے، ابن القیم نے احتیاط کی اور لکھا کہ یہ مذہب مالک و احمد کا مشہور روایت میں اور ایک قول اصحاب شافعی کا ہے مگر انہوں نے اس بات کو حذف کر دیا کہ ایک طائفہ اصحاب احمد نے بھی ۲ رکعت اور دوسرے نے ۴ تسلیم کی ہیں۔ (یہ حقیقت ہے جماہیر ائمہ سے متعلق علامہ ابن تیمیہ کے دعوے کی کہ جماہیر ائمہ جو سنیت کے قائل تھے، ان کو منکر بتادیا۔

علامہ ابن القیم نے اعتراف کیا کہ ابن تیمیہ نے اپنے جدِ امجد کے مسئلہ کی تغلیط کی ہے۔ آپ نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ ضبط سنن صلوٰۃ کا اعتناء کرنے والے کسی محدث نے بھی حدیثِ ابن ماجہ کو سنتِ قبلیہ جمعہ کے لئے پیش نہیں کیا، حالانکہ اس کو جدِ امجد نے بھی منتقی میں پیش کیا ہے دیکھو بستان ص ۱/۳۸۵۔ اور وہ اپنے حفید سے کہیں زیادہ اعلیٰ قدر محدث تھے، اور محدث شہیر ابن ابی شیبہ نے بھی مستقل باب صلوٰۃ قبل الجمعہ کے لئے قائم کر کے آثار مرفوعہ وموقوفہ روایت کئے ہیں۔ (ص ۲/۱۳۱) وہ تو ابن ماجہ سے بھی زیادہ عالی قدر اور سارے اصحاب صحاح کے استاذِ حدیث ہیں۔ علامہ نے یہ بھی لکھا کہ ابن ماجہ کے افراد اکثر غیر صحیح ہیں یہ بھی مبالغہ ہے اور یہاں تو حدیثِ ابن ماجہ کی تائید بہت سے دوسرے آثارِ مرفوعہ وموقوفہ سے ہو چکی ہے۔ لہٰذا وہ تو کسی طرح بھی افراد غیر صحیحہ میں سے نہیں ہو سکتی ہے۔

چنانچہ حدیث جابر بخاری ص ۱۲۷ سے اور ترمذی و بخاری کے تراجم ابواب میں ثبوتِ سنتِ قبلیہ کی طرف مشیر ہیں اور ابوداؤد کی حدیث میں حضرت ابن عمر کا یہ ارشاد بھی روایت ہوا کہ جس طرح میں نماز جمعہ سے قبل نماز پڑھتا ہوں حضور علیہ السلام بھی پڑھا کرتے تھے۔ (بذل ص ۲/۱۹۸ میں تفصیل ہے)۔

علامہ بنوریؒ نے لکھا کہ اصح القولین کا دعویٰ بھی ابن القیم کا مجازفہ (اٹکل کے درجہ کی چیز) ہے جس کا حال مغنی ابن قدامہ اور مجموع النووی کے مطالعہ سے ہوگا۔ (معارف ص ۴/۴۱۲ مع دیگر دلائل) اس مسئلہ میں سب سے بہتر دلائل وجوابات اعلاء السنن جلد ۷ میں قابلِ مطالعہ ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن القیم کا دعویٰ بابۃ عدمِ سنیتِ نماز قبل جمعہ ہر لحاظ سے ناقابلِ قبول ہے۔

النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ تُرْكَزُ لَهُ الْحَرْبَةُ قُدَّامَهُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَالنَّحْرِ ثُمَّ يُصَلِّيَ.

بَابُ حَمْلِ الْعَنَزَةِ وَالْحَرْبَةِ بَيْنَ يَدَيِ الْإِمَامِ يَوْمَ الْعِيدِ

(نیزہ اور برچھی کا امام کے سامنے عید کے دن لے جانے کا بیان)

۹۲۰. حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ حَدَّثَنَا الْوَلِيدُ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُوعَمْرٍو نِ الْأَوْزَاعِيُّ قَالَ حَدَّثَنِي نَافِعٌ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَغْدُو إِلَى الْمُصَلَّى وَالْعَنَزَةُ بَيْنَ يَدَيْهِ تُحْمَلُ وَتُنْصَبُ بِالْمُصَلَّى بَيْنَ يَدَيْهِ فَيُصَلِّيَ إِلَيْهَا.

ترجمہ ۹۱۹۔ حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے عید الفطر اور عید قربان کے دن نیزہ گاڑا جاتا تھا، پھر اس کے سامنے آپ نماز پڑھتے تھے۔

تشریح:۔ علامہ عینیؒ نے لکھا کہ یہ حدیث باب سترۃ الامام سترۃ لمن خلفہ (ص ۷۱) میں گزر چکی ہے اور باب الصلوٰۃ الی الحربۃ (ص ۷۱) میں بھی گزری ہے (عمدہ ص ۳/۳۸۶) پہلے امام بخاری نے آلاتِ حرب کے عید وغیرہ اجتماعات کے موقع پر ساتھ رکھنے کی کراہت کا باب باندھا تھا، شاید اسی لئے یہاں باب لائے کہ اگر نیزہ وغیرہ سے سترہ کا کام نمازِ عید کے لئے لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

ترجمہ ۹۲۰۔ حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم عیدگاہ کی طرف صبح کو جاتے۔ اور نیزہ ان کے آگے لے کر چلتے اور عیدگاہ میں ان کے سامنے نصب کیا جاتا تھا، پھر اس کے سامنے آپ نماز پڑھتے تھے۔

تشریح:۔ باب سابق میں امام بخاری نے یہ ثابت کیا تھا کہ عید جیسے اجتماع کے مواقع میں اگرچہ کھلے ہتھیار لے کر شرکت مناسب نہیں کہ اژدھام میں کسی کو تکلیف و زخم پہنچنے کا ڈر ہے، مگر سترہ وغیرہ ضرورتوں کے لئے ہتھیار، نیزہ وغیرہ ساتھ لے سکتے ہیں، اس باب میں بتایا کہ ہتھیار لے کر امام کے ساتھ آگے چلنا بھی جائز ہے اور ضرورت پڑے تو اس سے بھی سترہ کا کام لے سکتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں حدیث الباب سے ثابت ہوئیں۔ حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ امام بخاری کے زمانہ میں بات عام ہوگئی تھی کہ بادشاہ وقت جب نمازِ عیدین وغیرہ کے لئے نکلتے تھے تو ان کے سامنے لوگ ہتھیار لے کر چلتے تھے، ترجمۃ الباب میں اسی کے جواز کی طرف اشارہ کیا ہے اور حدیث لائے ہیں، ابوداؤد میں بھی حضرت ابن عمرؓ سے حدیث مروی ہے کہ حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم جب عید کے لئے نکلتے تھے تو نیزہ ساتھ لے جانے کا حکم فرماتے تھے تاکہ اس کی طرف سترہ بنا کر نماز پڑھیں اور سفر میں بھی ایسا ہی کرتے تھے، اسی لئے امراء نے بھی یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا (حاشیہ لامع ص ۲/۴۲)۔

غرض بخاری کے ابواب میں تضاد یا اشکال کی بات نہیں ہے کیونکہ ممانعت کی وجوہ اور تھیں اور جواز کے اسباب دوسرے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بَابُ خُرُوجِ النِّسَآءِ وَالْحُيَّضِ إِلَى الْمُصَلّٰى

(عورتوں اور حائضہ عورتوں کا عیدگاہ جانے کا بیان)

۹۲۱. حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ عَبْدِ الْوَهَّابِ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ أَيُّوبَ عَنْ مُحَمَّدٍ عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ أُمِرْنَا أَنْ نُخْرِجَ الْعَوَاتِقَ ذَوَاتِ الْخُدُورِ وَعَنْ أَيُّوبَ عَنْ حَفْصَةَ بِنَحْوِهِ وَزَادَ فِي حَدِيثِ حَفْصَةَ قَالَ قَالَتِ الْعَوَاتِقَ وَذَوَاتِ الْخُدُورِ وَيَعْتَزِلْنَ الْحُيَّضُ الْمُصَلّٰى.

ترجمہ ۹۲۱۔ حضرت ام عطیہؓ نے فرمایا، کہ ہمیں حکم دیا جاتا تھا کہ ہم جوان پردے والی عورتوں کو باہر نکالیں، اور ایوب سے

بواسطہ حفصہؓ اسی طرح روایت ہے اور حفصہ کی روایت میں اس قدر زیادہ ہے کہ حضرت حفصہؓ نے کہا کہ جوان اور پردے والی عورتیں (نکالی جاتی تھیں) اور حائضہ عورتیں نماز کی جگہ سے علیحدہ رہتی تھیں۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: مسئلہ ہدایہ میں ہے کہ عورتوں کا نماز کے لئے نکلنا جائز ہے اگر امن ہو فتنہ سے، ہدایہ میں تفصیل اس طرح ہے کہ عورتوں کے لئے جماعت کی نمازوں میں جاکر شرکت کرنا مکروہ ہے[1] یعنی جوان عورتوں کے لئے کیونکہ اس میں فتنہ کا اندیشہ ہے۔ (کہ خود مبتلا ہوں گی یا مردان کی وجہ سے مبتلا ہوں گے) البتہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بوڑھی عورتیں فجر مغرب وعشا کی نمازوں میں شرکت کے لئے نکل سکتی ہیں، صاحبین فرماتے ہیں کہ ان کا نکلنا تمام نمازوں کے لئے جائز ہے، کیونکہ فتنہ کا ڈر نہیں، کہ ان کی طرف کسی کو رغبت نہیں ہوتی، لہٰذا مکروہ نہ ہوگا جیسا کہ عید کے لئے ان کا نکلنا جائز ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ فاسق فاجر وشہوت پرست لوگوں کے فتنہ سے عورتوں کی عصمت بچانا ہے، اور ان کا کام ہی آوارہ گردی ہے۔ اس لئے دن کے اوقات میں ان کا فتنہ زیادہ ہے، اس لئے ظہر، عصر اور جمعہ کے اوقات میں بوڑھی عورتوں کو بھی نہ نکلنا چاہئے، البتہ فجر اور عشاء کا وقت آوارہ مزاج لوگوں کے سونے کا وقت ہے اور مغرب کے وقت کھانے میں مشغولیت ہوتی ہے اور برخلاف جمعہ کے عید کی اجازت اس لئے ہے کہ اس کی نماز کھلے میدان اور جنگل میں ہوتی ہے، وہاں عورتیں مردوں سے دور رہیں گی، اس لئے کراہت نہ ہوگی۔ (ہدایہ ص ۱/ ۱۱۷ باب الامامۃ)۔

حاشیہ میں مزید لکھا کہ بظاہر اعتراض ہوسکتا ہے کہ جس طرح بوڑھی عورتوں کے لئے تین وقتوں میں فتنہ نہیں ہے، جوان عورتوں کے لئے بھی نہ ہوگا تو ان اوقات میں ان کو بھی اجازت ہونی چاہئے۔ جواب یہ ہے کہ گمان غالب ہے فاسق فاجر لوگ جوانوں کے لئے نیند اور کھانے پینے کو چھوڑ دیں گے، بوڑھیوں کے لئے اس کا احتمال نہ ہونے کے برابر ہے، لہٰذا جوان عورتوں کے حق میں فتنہ وفساد اغلب ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک عورتوں کی شرکتِ عید کے لئے زیادہ توسع ہے اس کو ہم آگے حدیث ص ۴۲۷ کے تحت ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

---

[1] ہدایہ کے حاشیہ میں ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک نمازِ جماعت کے لئے عورتوں کا نکلنا مباح ہے، کیونکہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اللہ کی بندیوں کو مساجد میں جانے سے مت روکو''۔ حنفیہ کا استدلال اس سے ہے کہ باوجود حدیثِ مذکور کے بھی حضرت عمرؓ عورتوں کو بوجہ فتنہ کے نکلنے سے روکتے تھے۔ (نہایہ)

انوار الباری ۱۸

اردو شرح

صحیح البخاری

تقدمہ
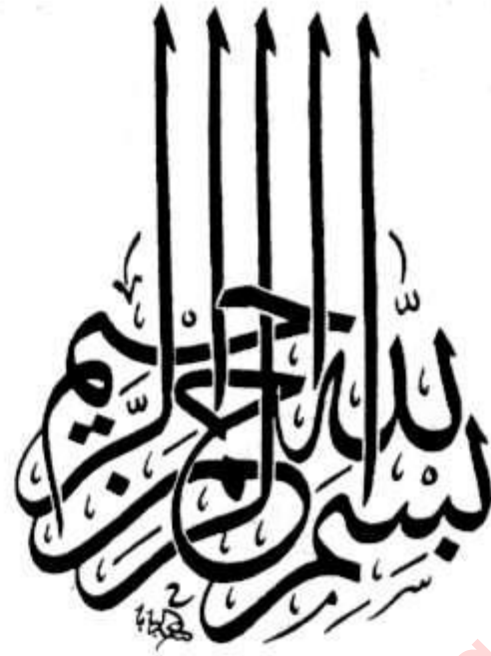
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بسم اللہ و بہ استعین واصلی واسلم علی رسولہ النبی الامین ،قسط نمبر ۱۷ کے بعد قسط ہذا کافی تاخیر سے پیش کی جارہی ہے دوسرے عوارض وموانع کے علاوہ مالی مشکلات بھی حائل رہیں، کیونکہ اس عرصہ میں جو آمدنی ہوئی وہ ختم شدہ حصوں کی مکرر اشاعت پر صرف ہوتی رہی تاکہ نئے خریداروں کے لئے مکمل سیٹ مہیا ہوتے رہیں، ایسی صورتیں بھی سامنے آئیں کہ کافی رقوم مل سکتی تھیں، جو ہماری آزادحق گوئی پراثر انداز ہوتیں، اس لئے ان کو قطعی طور سے نظرانداز کیا گیا۔اورایسا ہی آئندہ بھی ہوگا ان شاءاللہ تعالیٰ۔

اس مشکل کا ایک حل یہ خیال کیا گیا کہ میں پاکستان کا سفر کروں، چنانچہ دسمبر ۸۰ء میں وہاں گیا۔اورخاص احباب ومخلصین سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا گیا۔اور چونکہ ایک مدت سے گیارہویں جلد کے بعد وہاں کتاب نہیں جارہی تھی، جبکہ زیادہ خریدار بھی وہیں تھے، محصول ڈاک بھی بہت زیادہ ہوگیا تھااور وہاں سے رقوم بھی نہ آسکتی تھیں، اس لئے طے کیا گیا کہ پاکستان میں ہی انوارالباری کی طباعت واشاعت کا انتظام کیا جائے، کئی ادارے اس کے لئے آمادہ تھے مگر قرعۂ فال محترم جناب مولانا عبدالعزیز صاحب خطیبِ اوقاف و مالک مکتبہ حفیظیہ گوجرانوالہ کے نام نکلااوراکابرواحباب کی رائے سے خداپر بھروسہ کرکے ان ہی کو یہ کام سپرد کردیا گیا۔معاہدہ میں یہ طے ہوا کہ وہ شائع شدہ سترہ جلدوں کو جلد سے جلد پاکستان میں طبع کراکر شائع کریں گے۔اور قیمت کتاب کا دس فی صدی مکتبہ ناشر العلوم بجنور کو عطا کرتے رہیں گے۔تاکہ اس سے یہاں اگلی جلدوں کی طباعت میں مدد ملتی رہےاور یہاں سے نئی جلدیں بھی ان کو بھیجتے رہیں گے۔

مگرافسوس کہ وہ اپنے عزائم پورے نہ کرسکےاوراب تک صرف چار جلدیں طبع کراسکے ہیں۔انہوں نے کتابت وطباعت کا معیار بھی بہت بلند کردیا تھا، آفسٹ سے اعلیٰ کاغذ پر اشاعت کی، لیکن پورے سیٹ کے نئے خریدار اور گیارہویں حصہ کے بعد کے سابق خریدار بھی کتاب نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہیں۔اب ارادہ ہے کہ پھر پاکستان جاؤں اوراکثر جگہ کے احباب اورعلماء ومدارس سے رابطہ کروں تاکہ ان کوتوجہ دلاکر اس مسئلہ میں مزید اور بہتر پیش رفت ممکن ہو۔وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہ بعزیز۔

اس سلسلہ میں ایک تائیدِ غیبی یہ بھی پیش آئی ہے کہ دسمبر ۸۳ء میں ایک تقریب سے جنوبی افریقہ کا سفر ہوا، اور وہاں کے قدیم وجدید احباب ومخلصین نے انوارالباری کی تکمیلِ تالیف واشاعت کیلئے اصرار کیا توان کو حالات ومشکلات سے واقف کیا گیا، اس پر انہوں نے پھر سے ہمت وحوصلہ دلایا کہ باقی ۱۲ جلدیں تالیف کرکے شرح بخاری شریف کوتیس جلدوں میں حتی الامکان جلد شائع کردیا جائے۔لہٰذا اب سابقہ شائع شدہ حصوں کو بھی پھر سے شائع کرکے سیٹ مکمل کئے جارہے ہیں، اور یہ نئی جلد بھی پیش کی جارہی ہے۔ناظرینِ انوارالباری کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ اس سلسلہ کی تکمیل اورآسانیوں کیلئے دعافرمائیں، اور ہرقسم کے علمی واصلاحی مشوروں سے بھی مدد فرماتے رہیں۔

اس جلد سے متن بخاری شریف کا التزام ختم کیا جارہا ہے۔یوں بھی بخاری شریف میں اسناد ومتونِ احادیث کا تکرار بہت زیادہ ہے، پھر یہ کہ اس سے شرح کی ضخامت میں بھی تقریباً ۱۵۔۲۰ جلدوں کا اضافہ ہوجائے گا، جن کی وجہ سے دقت ولاگت میں غیرمعمولی زیادتی ہوگی،

جس کو موجودہ احوال وظروف میں مناسب نہیں سمجھا گیا۔

انوار الباری کا مقصد علمی حدیثی ابحاث وانظار کو پیش کرنا اور اکابرِ امت کے منتشر محققانہ افادات کو یکجا کر دینا نیز حضرت العلامۃ المحدث شاہ صاحبؒ کے محدثانہ علوم وتحقیقاتِ عالیہ کو وثوق واحتیاط کے ساتھ حتی الامکان سہل وواضح انداز میں مرتب کرنا ہے۔ اس میں کمی نہ ہوگی۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔ وہوالمعین۔

حضرت الاستاذ العلام شاہ صاحبؒ کے ملفوظاتِ گرامی کا ایک مجموعہ ''نطقِ انور'' کے نام سے بہت عرصہ پہلے شائع کیا تھا، اب ارادہ ہے کہ حسبِ گنجائش ہر جلد کے ساتھ ان کو دیا کریں گے۔

مقدمۂ فیض الباری کا ذکرِ خیر

ناظرین انوار الباری جانتے ہیں کہ ۱۹۳۸ء میں راقم الحروف نے محترم مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی رفاقت میں حرمین شریفین اور مصر وترکی کا سفر کیا تھا۔ اور مصر میں طویل قیام کر کے فیض الباری اور نصب الرایہ کو طبع کرایا تھا۔ فیض الباری کے شروع میں مولانا بنوریؒ کا مقدمہ بھی تھا، جو کئی بار کی طباعتوں میں بدستور شائع ہوتا رہا۔ پھر اسی کے ساتھ عزیز مولوی سید آفتاب عالم سلمہ کے اہتمام سے بھی پہلی دو جلدیں لاہور سے شائع ہوئیں، جن میں حضرت مولانا سید بدر عالم صاحبؒ کے حواشی واستدراکات کا اضافہ ہے، ان میں مفید علمی وحدیثی افادات دیکھ کر بہت مسرت ہوئی جزاھم اللہ خیر الجزاء، مگر اس کے مقدمہ وغیرہ میں حذف والحاق کا جو غیر موزوں اقدام کیا گیا ہے، اس سے مجھے نہایت افسوس بھی ہوا۔

اس کے بارے میں چونکہ میرا وہم وگمان بھی نہ تھا نہ ایسی توقع تھی، اس لئے صرف ان حواشی ہی کا مطالعہ کیا تھا، مقدمہ وغیرہ نہیں پڑھا تھا، جب پاکستان کا سفر ہوا تو کراچی کے احباب نے اس کا ذکر کیا اور یہ بھی بتلا دیا کہ افریقہ کے احباب کو بھی اس پر اعتراض ہے۔ لاہور واپس ہوا تو وہاں بھی بعض علماء نے اس پر نکتہ چینی کی اور اب سفرِ افریقہ کے دوران بھی علماء کو ان پر معترض پایا۔ تاہم یہ رائے ہوئی کہ اس معاملہ کو اخبارات ورسائل کی سطح پر نہ لایا جائے اور صرف اہلِ علم ہی اس پر مطلع ہوں اور احقر ہی اس کو انوار الباری میں کسی موقع پر لکھ دے تاکہ مغالطہ کی صورت خوش اسلوبی کے ساتھ ختم ہو جائے۔ اگر عزیز موصوف اس اقدام سے قبل ہی مجھ سے رجوع کر لیتے، تو میں ان کو صحیح صورتِ حالات سے واقف کر کے اس سے روک دیتا۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب نے باوجود درسی مشغولیتوں کے فیض الباری ایسا اہم علمی کام انجام دیا اور علم حدیث کی دنیا میں ایک بڑی خدمت پیش فرما دی، اس لئے وہ ہم سب کے دلی تشکر کے مستحق ہیں۔

جیسا کہ خود انہوں نے بھی اپنے مقدمہ میں اعتراف فرمایا ہے کہ اس تالیف کا کام انہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد کیا ہے اور میرے علم میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرتؒ کی حیات کے آخری سال میں الحاج مولانا محمد بن موسیٰ سلکیؒ سے اس کام کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور انہوں نے غالباً حضرتؒ سے استمزاج کے بعد خاموشی اختیار کر لی تھی، لیکن مجھے اس کام کی اہمیت کا خیال تھا، اس لئے حضرتؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید محمد بدر عالمؒ سے گزارش کی کہ وہ اس کام کو کریں، اور مجھے توقع تھی کہ وہ اس کام کو العرف الشذی اور انوار المحمود سے بہتر کریں گے، غرض میں نے حضرت مولانا میاں صاحبؒ کو لکھا تو انہوں نے میری رائے سے اتفاق فرما لیا اور کام ہوتا رہا۔

یہ کام ہم نے ''مجلسِ علمی'' کے لئے کرایا تھا۔ مگر طباعت کے وقت اس کے مصارف کی ذمہ داری جمعیت علماءِ ٹرانسوال نے لے لی۔ اس طرح اس کو جمعیت کی طرف سے اور نصب الرایہ کو مجلسِ علمی کے خرچ پر مصر میں طبع کرا کر شائع کرنے کا پروگرام بنا لیا گیا۔

مولانا بنوریؒ میرے رفیقِ سفر ہوئے، اور قاہرہ جا کر یہ طے ہوا کہ مولانا فیض الباری کے اصول وپروف دیکھیں۔ حتی الامکان عبارات

وکتابت کی غلطیاں بھی درست کریں، اور میں نصب الرایہ کا کام اسی طرح کروں۔ ۸۔۹ ماہ کا طویل عرصہ ہم نے اس کام میں لگایا، دورانِ طباعت میں مولانا نے مجھے بار بار کہا کہ تہذیبِ عبارات اور تصحیح پروف وغیرہ کا کام تو میں کر رہا ہوں اور کر بھی سکتا ہوں مگر کتاب میں دوسری خامیاں بھی ہیں، جن کے لئے بیسیوں کتابوں کی مراجعت درکار ہے، وہ اس وقت نہیں ہوسکتی، اور خاص طور سے حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف بہ کثرت انتسابات مشکوک ومشتبہ نظر آتے ہیں، اس پر میں نے کہا کہ اب تو صرف یہی ہوسکتا ہے کہ آپ مقدمہ میں ان امور کی طرف اشارہ کردیں گے، اور وہ بھی اس طرح کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات بھی خطاؤں سے محفوظ ہوسکے۔ اور مولانا کو اس طرح بچائیں کہ وہ مراجعت کا وقت نہ پاسکے اور دوسرے فارغین طلبہ کی درسی تقاریر بھی ان کے سامنے تھیں، ان سے ایسی اغلاط کی دراندازی ہوئی ہوگی۔

یہ واقعہ ۱۹۳۸ء کا ہے اور خدا شاہد ہے کہ مولانا جب بہت پریشان ہوئے اور مجھے بھی پریشان کیا تو اس صورت کے علاوہ ہمارے پاس کوئی علاج نہ تھا، کیونکہ فیض الباری کی طباعت کو روک دینا بھی ہم مناسب نہ سمجھتے تھے، کہ اور کچھ نہیں تو **العرف اور انوار المحمود** ہی کی طرح کافی مفید محققانہ علمی حدیثی ابحاث سامنے آ ہی جائیں گی۔ اور اغلاط کا تدارک پھر ہوتا رہے گا۔

غرض مولانا نے بہت احتیاط سے اور مولانا بدر عالم صاحب سے ڈرتے ڈرتے مقدمہ لکھ دیا۔ اور طبع بھی کرالیا۔ مگر میں نے وہ طبع شدہ فرمہ مولانا موصوف کے پاس ڈابھیل ارسال کردیا کہ ہم نے ضرورت سے مجبور ہوکر ایسا کردیا ہے، لیکن آپ ناپسند کریں تو میں اس کو شائع نہ کروں گا۔ اس پر مولانا کا جواب آیا کہ تم نے اچھا کیا، اور اس کو شائع کرنے پر مجھے اعتراض نہیں ہے۔

حضرت مولانا نے **کلمة الشکر** لکھ کر ارسال فرمایا، وہ بھی ہم نے ٹائٹل سے اگلے صفحہ پر فہرست مضامین سے قبل شائع کردیا اس کے بعد ہم لوگ ڈابھیل واپس ہوئے۔ اور عرصے تک ہم لوگ ساتھ رہے۔ حضرت مولانا مرحوم نے کبھی کوئی ناگواری کا اظہار مولانا بنوریؒ کے مقدمہ کے بارے میں نہیں کیا۔ پھر یہ کہ حضرت مولانا نے خود بھی اپنے مقدمہ میں مندرجہ ذیل امور کا اعتراف فرمایا ہے۔

(۱) حضرت شاہ صاحبؒ درس میں بہت تیزی سے بولتے تھے، جس کی وجہ سے مجھ کو آپ کی مراد ومقصد کے سمجھنے اور ضبط کرنے میں سخت دشواری پیش آتی تھی، کیونکہ اس کیلئے جید حفظ، مکمل تیقظ حدید نظر، سریع قلم، سیال ذہن وبالغ فکر کی ضرورت تھی جو کم کسی کو حاصل ہوتا ہے۔

(۲) کبھی ہم آپ کے کلام کی طرف پوری توجہ کرتے تھے تو املاء رہ جاتا۔ اور کبھی کتابت کی طرف توجہ کرتے تو آپ کی بات پوری طرح نہ سن سکتے تھے۔

(۳) میں نے مقدور بھر سعی کی کہ آپ کی پوری بات ضبط کرلوں، مگر یہ بات میرے مقدور سے باہر رہی۔ اس لئے بہت سی اہم باتیں ضبط کرنے سے رہ گئیں، بلکہ بسا اوقات علماء اور کتابوں کے ناموں میں تصحیف اور نقلِ مذاہب میں تحریف بھی ہوگئی۔

(۴) مجھے بڑی تمنا تھی کہ میں اس تالیف کو حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی میں جمع کرلیتا کہ حضرتؒ اس کو ملاحظہ فرما کر اصلاح فرمادیتے مگر یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

(۵) میری پوری سعی کے باوجود اس میں قسم قسم کی اغلاط وسہو ہوگئے ہیں۔

(۶) شواغلِ مدرسہ اور دوسرے افکار نے اس کی تحریر کے لئے مجھے فرصت نہیں دی۔

(۷) اگر مجھے پہلے سے اس کام کی صعوبت ومشکلات کا اندازہ ہوتا تو میں اس کا ارادہ ہی نہ کرتا۔

(۸) میں جہاراً وسراً ہر طرح سے بتا چکا ہوں کہ مجھے تمام مباحث میں رجعتِ اصول اور تصحیح نقول کی فرصت نہیں ملی، جبکہ اس کے لئے طویل فرصتوں کی ضرورت تھی۔ البتہ نقولِ صحاح ستہ کی تصحیح میں میں نے زیادہ اعتنا کیا ہے۔

(۹) میں پوری سچائی کے ساتھ یہ اقرار کرتا ہوں کہ میں درس کے اندر ضبط وتحریر میں خطاؤں سے سالم نہیں رہا۔

(۱۰) اگر کہیں کسی بحث کے اندر لہجہ کی تیزی یا ترفع کی شان وغیرہ دیکھوتو اس کو صرف میری طرف منسوب کرنا (یعنی حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف نہیں) کیونکہ وہ سب میری سوءِ تعبیر اور خباثتِ نفس کا اثر ہوگا۔

اوپر کی تفصیل اس لئے بھی ضروری ہوئی کہ خود حضرت مولانا بدر عالم صاحب ہی کے بیان سے بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم و تحقیقاتِ عالیہ کی وقت وعظمت اور اس کام کی غیر معمولی دشواریوں کی تفصیل سامنے آجائے، اور حضرتؒ کے مقصد ومراد کو پوری طرح سمجھ لینا اور اداءِ مطالب پر قادر ہونا تو ایک بڑا مرحلہ تھا ہی، بغیر مراجعت اصول ومطالعۂ کتب کے ان مضامینِ عالیہ دقیقہ کو پیش کر دینا بھی بڑا نقص تھا اور اس کا اعتراف خود مؤلف نے بھی بار بار اور جہاراُ وسراُ ہر طرح کیا ہے۔ تو پھر یہ بات کیوں کر موزوں ومناسب تھی کہ مولانا بنوریؒ کی تنقیدِ صحیح کی عبارت کو ان کے مضمون میں سے حذف کر کے دوسری عبارات داخل کر دی گئیں، جن میں ان کے مقصد ومنشا کے بالکل خلاف یہ دعویٰ کیا گیا کہ مؤلف فیض الباری کو اس کام کے لئے خدا کی طرف سے توفیق کامل حاصل ہوئی تھی اور ان کے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے یہ آسانی بھی مل گئی تھی کہ وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے علومِ عالیہ کا احاطہ کرلیں اور انہوں نے اس کام کے لئے سعی بلیغ کی اور امالی شیخ کو ضبطِ تام کیا تھا، اور انہوں نے اس کام کے لئے مصادر کی مراجعت نامہ مرۃ بعد مرۃ کی تھی۔ اور بلاشک وریب حضرتؒ کے علوم کی خدمت ان سے زیادہ اتم واکمل کوئی دوسرا تلمیذِ شیخ کر ہی نہ سکتا تھا۔

مولانا بنوریؒ نے اپنے نقد میں یہ بھی کہا تھا کہ "باوجود سعیِ شکور کے مؤلف یہ دعوے نہیں کر سکتے کہ انہوں نے حضرتؒ کے امالی و مشکلات علوم وتراجم رجال وغیرہ کو بنقیرہ وقطمیرہ جمع کرلیا ہے اور آپ کے فوائد علمیہ ونظریاتِ عمیقہ میں سے کسی کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔

اس عبارت کو سراسر بدل کر یہ دعویٰ بلسان العلامۃ البنوری درج کر دیا گیا کہ مؤلف نے امالی شیخ کو بنقیرہ وقطمیرہ جمع کر دیا ہے۔ اور حضرتؒ کے تمام ہی مشکلاتِ علوم، تراجمِ رجال، فوائد مختلفہ ونظریاتِ عمیقہ کا احاطہ کرلیا ہے۔ حتیٰ کہ امالی شیخ میں سے کوئی کلمہ بھی بغیر احصاء وضبط کے نہیں چھوڑا۔ اور خود مؤلف نے جو اپنے مقدمہ میں (اس کے خلاف) لکھا ہے وہ محض ان کی تواضع اور کسرِ نفس ہے اور کچھ نہیں۔

واضح ہو کہ یہ سب حذف والحاق کی کارروائی ص ۳۱ وص ۳۲ میں موجود ہے اور مولانا بنوریؒ کا آخری مضمون سراسر بدل کر ان کا نام بھی آخر سے حذف کر دیا گیا ہے، **فیا للعجب**! اس کے علاوہ حضرت المؤلف کی طرف سے جو کلمۃ الشکر کا ایک صفحہ مصری ایڈیشن میں شائع ہوا تھا، وہ بھی حذف کر کے عزیز آفتاب میاں سلمہ نے دوسرے مضمون کا کلمۃ الشکر شائع کیا ہے، تاکہ یہ امر صفحۂ تاریخ سے محو ہو جائے کہ کس کی تحریک سے یہ تالیفِ فیض الباری کا کام شروع ہوا تھا، کس ادارہ نے پہلی سرپرستی کی، معاوضہ بھی ادا کیا، اور پھر کس ادارہ نے اس کے مصارف طبع برداشت کئے، اور کس نے طباعتِ قاہرہ کے زمانہ میں اس کتاب کی اصلاحِ مضامین وعباراتِ تصحیحِ اصول وپروف ریڈنگ وغیرہ کی زحمتیں ۸۔۹ ماہ تک گوارا کی تھیں۔ والی اللہ المشتکیٰ۔

افسوس ہے کہ مجھے یہ سب واقعات لکھنے پڑے، اور اس کا بھی افسوس ہے کہ مذکورہ بالا حذف والحاق وغیرہ امور کا ارتکاب یا مشورہ دینے والے حضرات نے صرف حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحبؒ کے تعلق وعقیدت کا تو لحاظ کیا اور حضرت شاہ صاحبؒ کی غیر معمولی عظمت واہم علمی مقام کو نظر انداز کر دیا، جن کے بارے میں علامۂ محقق شیخ کوثریؒ نے فرمایا تھا کہ پانچ سو سال کے بعد شیخ ابن الہمامؒ کے بعد ایسا جامعِ علوم وکمالات محقق پیدا ہوا اور حضرت تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک ایک جملہ پر ایک ایک رسالہ لکھا جا سکتا ہے اور وہ آپ سے مسائل مشکلہ میں آپ کی درایت وروایت دونوں سے استمداد فرماتے تھے، اور علامہ مفتی کفایت اللہؒ نے لکھا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا علم وہبی وارثی ہے، صرف کسب سے اتنا علم حاصل ہونا بہت مستبعد ہے، اور حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے فرمایا تھا کہ آپ کی وفات سے ہم جیسے علمی اشتغال رکھنے والے بھی یتیم ہو گئے۔ اور فرمایا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا رسالہ **کشف الستر** سترہ بار

پڑھا تب معلوم ہوسکا کہ آپ نے کن کن مشکلاتِ علوم کو حل فرمادیا ہے۔

حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحبؒ کی عظمت و شخصیت و کمالات سے میں خوب واقف ہوں، ۱۶ سال ہم ڈابھیل میں ساتھ رہے ہیں، ساتھ کھانا پینا اور طویل علمی مجلسیں رہی ہیں، درس وارشاد میں وہ اعلیٰ خصوصیات کے مالک تھے، مگر تصنیف و تالیف کے میدان میں خاص طور سے جہاں سینکڑوں کتابوں کی مراجعت درکار ہوتی ہے، وہ بہت آگے نہ آسکے۔ حضرتؒ کے رواں دواں درسِ امالی کو پوری طرح حفظ و ضبط میں بھی نہ لا سکے، اور تراجمِ رجال میں بھی غلطیاں ہوگئیں، جبکہ حضرتؒ کے یہاں اس قسم کی غلطیاں تقریباً ناممکن تھیں۔ برخلاف ان کے مولانا بنوریؒ تھے وہ درس کے ساتھ تصنیف کے بھی مردِ میدان تھے، اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ان کو حضرت شاہ صاحبؒ کے درس میں ۴۔۵ بار ترمذی و بخاری میں شرکت کا موقع مولانا سید بدر عالم صاحب کی طرح مل سکتا تو وہ حضرتؒ کے علوم کی وہ خدمت کر جاتے کہ باید و شاید، مگر افسوس ہے کہ وہ حضرت شاہ صاحبؒ سے صرف کچھ حصہ ترمذی شریف کا اور چند اوراق بخاری شریف کے پڑھ سکے تھے، اور وہ سال حضرتؒ کی طویل علالت کے سبب سب سے کم درسِ حدیث کا سال تھا۔

وجہ یہ کہ وہ تمام علوم وفنون سے غیر معمولی مناسبت کے ساتھ مطالعۂ کتب کے بھی بڑے عاشق وعادی تھے، مطالعہ کا شوق مجھے بھی تھا مگر وہ مجھ سے بہت آگے تھے، تاہم مجھے کہا کرتے تھے کہ یہ سب پڑھ پڑھ کر کنویں میں ڈال رہے ہو، کچھ تصنیف بھی کیا کرو۔ مگر نہ میری اس وقت اس کی طرف نہ توجہ تھی اور نہ ''مجلسِ علمی'' کی انتظامی مشغولیات اس کی مہلت دیتی تھیں، بہت عرصہ کے بعد جب ''مجلسِ علمی'' کا تعلق ختم کرکے ہندوستان میں ہی مستقل قیام کا عزم ہوگیا تو اپنی قدیم یادداشتوں کو دیکھنا شروع کیا، اور اپنی دو سال کی درسِ بخاری شریف کی املائی تقاریر انوری کو انوارالباری کی شکل میں لانے کا خیال پیدا ہوا۔ وللہ الحمد۔

میرے نہایت ہی محترم ومحسن مولانا محمد بن موسیٰ میاں سملکی ثم افریقیؒ جو مجھے مجلسِ علمی کراچی میں بھی رکھنے پر بہت مصر تھے اور اپنی طرف سے میرے اہل وعیال کے لئے مکان بھی تجویز کر دیا تھا جو بعد کو بھی کئی سال تک میری امید پر روکے رکھا مگر میں ترکِ وطن پر آمادہ نہ ہوسکا تھا۔ ان کو جب مقدمۂ انوارالباری کی دونوں جلدیں پہنچیں تو مجھے مبارکباد دی اور ''مجلسِ علمی'' چھوڑنے پر بڑے افسوس کا اظہار کیا، اور تاکید کی کہ انوارالباری میں حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم وتحقیقات کو خوب اجاگر کرنا، پھر انوارالباری کی توسیع اشاعت کے لئے بھی سعی فرمائی، مگر افسوس ہے کہ اس کے بعد ان کی رحلت جلد ہوگئی، اور وہ بعد کے حصے ملاحظہ نہ کر سکے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

جس طرح حضرت مولانا سید محمد بدرِعالم صاحبؒ کو توجہ دلا کر فیض الباری کی تالیف وترتیب پر احقر نے آمادہ کیا اور مولانا سملکیؒ کو اس کی اشاعت کے لئے ترغیب دی، جبکہ وہ خود مولانا موصوف کی تحریک پر بھی آمادہ نہ ہو سکے تھے، اسی طرح احقر نے محترم مولانا بنوری کو جامعہ ڈھابھیل میں بلانے کی سعی کی، اور العرف الشذی کو معارف السنن کی صورت میں بدلنے کا کام مجلسِ علمی کے لئے کرایا، چنانچہ مولانا نے اس کا کام زیادہ تر ڈابھیل ہی میں کیا تھا، اور پھر کراچی میں دوسری مصروفیات کے سبب سے تصنیفی خدمت کا وقت نہ نکال سکے۔ یہ کام چونکہ مراجعتِ اصول اور وسیع مطالعہ کے ساتھ ہوا تھا، اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ کے تمام امالیِ درس پر برتر وفائق ہوا ہے۔ اور حضرتؒ کی حیات مبارکہ کے زمانہ میں آپ کے امالیِ درسِ ترمذی شریف ''العرف الشذی'' نے بھی علومِ انوریہ کا تعارف اعلیٰ پیمانہ پر کرادیا تھا، اگرچہ اس میں ضبط وکتابت وطباعت کی خامیاں بھی تھیں، پھر بھی اس سے بہت بڑا فائدہ ہوا، اور محققانہ درسِ حدیث کا ایک نہایت گراں قدر اعلیٰ نمونہ سامنے آیا، جس سے سب ہی اساتذۂ حدیث نے استفادہ کیا۔ یہ تالیف محترم مولانا محمد چراغ صاحب دام فیضہم کی سرسری محنت کا نتیجہ تھی، جس سے ان کا علم وفضل اور حدیثی مناسبت وتفوق نمایاں ہے اور اگر ان کو اسی زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی میں حضرت شاہ صاحبؒ کی نگرانی کا شرف مل جاتا کہ وہ مراجعتِ اصول ومطالعۂ کتب کے ساتھ العرف الشذی کو شرح ترمذی شریف کی صورت میں تالیف کر دیتے، تو یہ نہایت ہی گرانقدر

علمی حدیثی خدمت ہو جاتی۔ کاش مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدیر دارالعلوم کی توجہ دوسرے امور سے زیادہ اس طرف ہوتی۔

انوار المحمود: اس کے بعد دوسری خدمت حدیث امالی ابی داؤد کی صورت میں ظاہر ہوئی کہ مولانا ابوالعتیق محمد صدیق صاحب ساکن نجیب آباد ضلع بجنور نے انوار المحمود کے نام سے دوضخیم جلدوں میں حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ کے درسِ ابی داؤد کے امالی مرتب کر کے شائع کئے، جس کا حصہ اول حضرت شاہ صاحبؒ کے ملاحظہ سے بھی گزرا تھا اور آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ ''انوار المحمود'' کو بعض بعض جگہ سے بغور دیکھا، عبارتی اور مضمون کی غلطی سے مبرا پایا اور یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ میری مراد کو سمجھ کر صحیح عبارت میں ادا کیا گیا ہے، اور اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان عباراتِ شارحینِ شروح سے لی جائیں۔ خلافِ امید اتنا بڑا کام باوجود مشغلۂ درس و تدریس کے جو تم نے انجام دیا ہے، اس سے بے حد مسرت ہوئی، فجزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء فی الدارین، اللہ تعالیٰ وقت و ہمت میں برکت عطا فرمائے۔ میری رائے ہے کہ اس کو اسی طرح جلد طبع کرادیا جائے اس سے طلباء کو العرف الشذی سے بہت زیادہ فائدہ ہوگا، اور جو اس میں خامی تھی وہ بھی رفع ہوگئی، صرف اس کالحاظ بہت زیادہ کیا جائے کہ کتابت کی غلطیاں نہ ہونے پائیں۔ تم خود اس کو طبع کراؤ میں بھی ان شاء اللہ مدد دوں گا اور بعض مخلصین سے بھی امداد کے متعلق کہا ہے۔ محمد انور عفا اللہ عنہ۔

مؤلف انوار المحمود نے لکھا کہ صرف جلد اول حضرتؒ کے مطالعہ کے لئے گئی تھی اور وہ بھی طبع نہ ہوسکی تھی کہ روحِ انور عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی طباعت میں حضرت شاہ صاحبؒ کی کھلی کرامت ہے ورنہ یہ کام میری استطاعت سے بالکل باہر تھا۔''

اس کتاب میں نہایت محققانہ محدثانہ ابحاث ہیں، ضرورت ہے کہ مجلسِ علمی کراچی یا ارباب دارالعلوم علامہ بنوری کراچی اس طرف جلد خصوصی توجہ کریں اور مزید تحقیقات و حوالوں سے مزین کر کے اس کو شرح ابی داؤد کی صورت میں شائع کرادیں۔

درحقیقت جو محدثانہ تحقیقی رنگ حضرت شاہ صاحبؒ کا ہے، وہ دوسری تالیفات میں کمیاب ہے اور اگر جلد ایسے اہم کاموں کی طرف توجہ نہ دی گئی تو آئندہ ان کاموں کی تکمیل کرانے والے باصلاحیت و استعداد، اساتذۂ حدیث بھی نہ رہیں گے، جس طرح احقر کی رائے ہے کہ اگر علمِ حدیث کی بڑی درس گاہوں میں تخصیصِ حدیث کا درجہ نہ کھولا گیا تو علمِ حدیث کا فن بڑی تیزی سے انحطاط پذیر ہوگا۔ کیونکہ تخصصِ حدیث کرانے والے اساتذہ اب بھی گنے چنے رہ گئے ہیں۔ **وللّٰہ الامر من قبل و من بعد**۔

آخر میں مختصراً گزارش ہے کہ فیض الباری میں اب بھی بہت سی مسامحات و اغلاط ہیں۔ جن میں کچھ کی نشاندہی بھی اصحابِ تصانیف نے کی ہیں یہ بھی عدمِ مراجعت اصول اور عدمِ واقفیتِ تراجمِ رجال کا نتیجہ ہے۔ جبکہ حضرت شاہ صاحبؒ ایسی اغلاط سے مبرا تھے اور اس کی طرف ان کی نسبت کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔ اس لئے پاکیِ داماں کی حکایت طویل کرنے سے بہتر ہے کہ مراجعاتِ اصول اور مطالعۂ تراجمِ رجال کر کے ان خامیوں کا ازالہ کیا جائے، اور اس خوش فہمی کا سہارا نہ لیا جائے کہ خود حضرتِ مؤلفؒ نے جن خامیوں کا اعتراف کر لیا تھا وہ محض تواضع و کسر نفسی تھی۔ پھر یہ کہ مولانا بنوری کے مقدمہ میں جو حذف و الحاق کیا گیا ہے، اس کی معذرت شائع کی جائے، یا اس کو لکھنے والے صاحب خود اپنی طرف منسوب کریں مولانا مرحوم کا جتنا حصہ ان کو باقی رکھنا ہے اس پر ختم کر کے مولانا نے جس طرح اپنا مقدمہ ختم کیا تھا اسی طرح ختم کردیں اور اب میں اس پر ختم کرتا ہوں۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

مختصر حالات سفر حرمین شریفین

اپنے ربِ کریم کی لاتعداد نعمتوں کا شکر کس زبان و قلم سے ادا کروں کہ سب سے پہلے اس نے میرے نہایت ہی مشفق باپ کے دل

میں یہ داعیہ پیدا فرمایا کہ مجھے دینی تعلیم دیں، اس کی جگہ وہ اگر مجھے عصری تعلیم دلاتے اور کروڑوں اربوں کی دولت بھی میرے لئے چھوڑ جاتے تو وہ ہیچ در ہیچ ہوتی، پھر تکمیل کے بعد ہی حضرت شاہ صاحبؒ کی دو سالہ معیت و استفادہ کی نعمت سے ذرہ نوازی کی گئی، جس کے صدقہ میں سولہ سال مجلسِ علمی میں رہ کر علمی دنیا سے روشناسی ملی۔ علم تو بہت بڑی چیز ہے، اور بڑوں کے ہی نصیب میں خدا نے دی ہے۔ لیکن اکابرِ امت کے علمی دروازوں میں جھانکنے کی سعادت ملنے کا اعتراف شاید بے جا نہ ہو۔ وکفی بہ فخر المثلی الظلوم الجھول۔ آخری دور میں حضرت شاہ صاحبؒ کو دیکھا گویا تمام جبالِ علم و تقویٰ اکابرِ امت کی روشن تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی، سب سے پہلے علمی سفر رفیقِ محترم مولانا بنوریؒ کی معیت میں حرمین شریفین کا ۱۹۳۸ء میں ہوا دونوں نے حج کی درمیانی مدت مصر میں اقامت کی تھی، مصری علماء خاص کر علامہ کوثریؒ سے طویل استفادہ نعمتِ غیر مترقبہ تھا، علماء حرمین میں سے حضرت الشیخ سلیمان الصنیع رئیس ھیۃ الامر بالمعروف والنھی عن المنکر کی طویل علمی مجالس بھی نہایت اہم تھیں۔

وہ بڑے وسیع قلب اور کثیر مطالعہ کے عالم تھے، نجدی علماء میں ایسے کم دیکھے ہیں۔ وہ اکثر اختلافی مسائل میں اکابرِ دیوبند کی آراء کو دریافت کرتے اور ان پر بحث و نظر کرتے تھے، اور ہم دونوں ان کو بقدرِ امکان تشفی کرتے تھے، آخر میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اکثر مسائل میں اکابرِ دیوبند ہی کی رائے درست ہے اور نجدی علماء بھی وسعتِ مطالعہ کے بعد ان سے اتفاق کریں گے۔

اس کے بعد راقم الحروف کو ۶۰ء میں، پھر ۷۱ء میں پھر سفر افریقہ کے ساتھ ۱۹۷۵ء میں حج و زیارت کی سعادت ملی، اور صرف عمرے و زیارتِ مبارکہ کا شرف مئی ۸۰ء میں اپریل ۸۲ء میں اور اب سفرِ افریقہ کے بعد جنوری ۸۴ء میں حاصل ہوا۔ وللہ الحمد والمنۃ۔ ہر سفر میں علماءِ نجد و حجاز و شام سے ملاقاتوں اور علمی مذاکرات کے مواقع میسر ہوئے اور یہ معلوم ہو کر بڑی مسرت ہے کہ تدریجی طور سے وہاں بھی وسعتِ خیال میں بڑی حد تک پیش رفت ہوئی ہے اللھم زد فزد۔

چنانچہ کئی سال قبل اکابر علما و نجد و حجاز نے بہ استثناءِ شیخ ابن باز کثیر مطالعہ اور بحث و نظر کے بعد متفقہ فیصلہ کیا کہ یک لفظی طلاقِ ثلاث تین ہی ہوں گی۔ ایک نہ ہوگی، یعنی اس نہایت اہم مسئلہ میں بہ مقابلۂ علامہ ابن تیمیہ و ابن القیمؒ جمہور اکابرِ امت کے فیصلہ کو ترجیح دے دی گئی۔ اور اب الحمدللہ یہی حکم قلمرو نجد و حجاز میں کئی سال سے جاری و نافذ بھی ہے۔ اور یہ رجحان بھی ترقی پذیر ہے کہ اختلافی مسائل میں جمہورِ امت کے ہی مسلک کو ترجیح دی جایا کرے۔ اور درحقیقت یہی رجحان حرمین شریفین کی علمی و دینی و سیاسی مرکزیت کے لئے موزوں تر بھی ہے۔ واللہ ولی الامور۔

لمحۂ توقف: سابقہ دونوں سفر مئی ۸۰ء اور اپریل ۸۲ء میں عمرے کی نیت سے کئے تھے، اور زیارتِ مبارکہ گویا ضمناً تھی، لیکن اب جنوری ۱۹۸۴ء میں سفر بہ نیت زیارۃ مبارکہ نبویہ کیا گیا اور عمرہ اس کے بعد ہوا۔ ہمارے اکابر نے لکھا ہے کہ حج و عمرے کے سفر کے بعد ایک سفر خالص زیارت نبویہ کی نیت سے بھی کرنا چاہئے، اس لئے دل کا تقاضا ہوا کہ اس سعادت کو بھی حاصل کیا جائے کہ یہ سفر اشرف الاماکن و افضل البقاع علی الاطلاق کے لئے ہے، جس کی تفصیل ہم دوسری جگہ کر چکے ہیں۔ بہت عرصہ قبل علامہ شیخ تقی الدین حصنیؒ م ۸۲۹ھ کی نہایت گرانقدر تالیف "دفع شبہ من تشبہ و تمرد و نسب ذلک الی سیدنا الامام احمد" (ص ۱۲۲) میں علامہ ابن القیمؒ کا ایک واقعہ دیکھا تھا کہ وہ جب قدس شریف گئے تو اپنی مجلسِ وعظ میں ممانعتِ سفرِ زیارت کا مسئلہ بیان کر کے فرمایا کہ لو! اب میں یہاں سے لوٹتا ہوں اور حضرتِ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کی قبر کی زیارت نہیں کروں گا۔ پھر وہاں سے نابلس گئے تو وہاں کی مجلسِ وعظ میں بھی اسی مسئلہ کو دہرا کر کہا کہ وہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی بھی زیارت نہیں کریں گے، اس پر لوگ کھڑے ہو گئے اور ان کو قتل کرنے پر آمادہ ہوئے، والی نابلس نے ان کی جان بچائی، پھر مالکی قاضی کی عدالت میں طلب کئے گئے تو اپنی بات سے رجوع ظاہر کرنے پر بری کئے گئے۔ واضح ہو کہ ان دونوں حضرات کے ساتھ ممانعتِ سفرِ زیارت کے قائل مشہور مفسر ابن کثیر بھی تھے، و لعلہ لا رابع لھم من اکابر الملۃ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

جب ان حضرات اوران کے غالی متبعین کی ایک غلط بات کے لئے اتنی شدت ہے تو ہمیں جمہور کے صحیح مسلک کے اتباع میں اور بھی زیادہ استقلال وثابت قدمی دکھلانی چاہئے۔ واللہ الموفق۔

مؤتمر عالمِ اسلامی کا ذکرِ خیر

جمعیت علماءِ ہند کے مؤقر جریدۂ عربیہ "الکفاح" بابۃ ستمبر ۸۳ء ۱۷ جلد ۱۰ میں جلالۃ الملک فہد بن عبدالعزیز دام عزہ وسلطانہ کی وہ عربی تقریر شائع ہوئی ہے۔ جو آپ نے بموقع افتتاح مجمع عالمی للفقہ الاسلامی ۲۶ شعبان ۱۴۰۳ھ (م ۷ جون ۱۹۸۳ء) کو مکہ معظمہ میں ارشاد فرمائی، اس نہایت گراں قدر اور شاندار افتتاحی تقریر کے چند اہم نکات قابل ذکر ہیں۔

(۱) سیاسی، ملکی وانفرادی جدوجہد کی حدود سے بالاتر ہو کر یہ پہلی عالمی تنظیم ہے، جس کا مطمحِ نظر وحدتِ امت اسلامیہ ہے۔

(۲) یہ اس عالمی مؤتمر کی قرارداد کے نتیجہ میں منعقد کی جارہی ہے، جس کو زعماءِ عالم اسلامی نے مجمع الفقہ الاسلامی کے نام سے موسوم کیا تھا۔

(۳) جو کچھ مشکلات وآفات اور ضعف وذلت کی صورتیں مسلمانوں کو پیش آرہی ہیں، وہ صرف ضعفِ ایمان وعقیدہ اور ترک کتاب وسنت کی سزا ہے۔

(۴) میرا یقین وعقیدہ ہے کہ وحدتِ امت کی بنیاد صرف اپنے باہمی اختلافات ختم کر دینے سے ہی مضبوط ومستحکم ہو سکتی ہے، آیاتِ قرآن مجید واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا اور ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم وغیرہ اس پر شاہد ہیں۔

(۵) نصف صدی سے زیادہ ہوا کہ ملک عبدالعزیزؒ نے پہلی مؤتمر اسلامی مکہ معظمہ میں منعقد کی تھی۔ تاکہ زعماءِ عالمِ اسلامی کے مشورہ سے مصالح امت پر اجتماعی غور وفکر کر کے اجتماعی فیصلے کئے جائیں۔ پھر اسی کی روشنی میں مسلمانوں کو تعلیماتِ قرآن وسنت کی طرف رجوع کرانے کی مساعی برابر جاری رہیں۔

(۶) ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کی مشکلات ومسائل میں تو اضافہ ہو رہا ہے، مگر علماءِ اسلام باوجود اپنی عددی کثرت کے اپنے اختلافات کی وجہ سے اجتماعی رائے کے ذریعہ فیصلے کرنے سے عاجز ہیں لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ تمام علماءِ اسلام، فقہاء، حکماء اور مفکرینِ عالم اسلامی سرجوڑ کر بیٹھیں اور تمام مسائل ومشکلات کے اجتماعی حل پیش کریں۔

(۷) روحِ تعصب اسلام سے بعید ترین چیز ہے، جس سے باہم تباغض۔ افتراق اور فکری انتشار پیدا ہوتا ہے، اور حق تعالیٰ نے مسلمانوں میں بغض وعداوت پیدا کرنے والی سب باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر یہ کہ جب صرف کتاب وسنت پر ہی پورا اعتماد ہونا چاہئے تو دینِ اسلام میں تعصب کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔

(۸) آخر میں سیاسۃ السعودیہ کے عنوان سے ملکِ معظم نے فرمایا کہ حکومتِ سعودیہ نے ائمۂ مسلمین میں سے اقتداءِ سلفِ صالح کا التزام کیا ہے، اور جلالۃ الملک عبدالعزیزؒ نے حتمی فیصلہ کیا تھا کہ مذاہبِ اسلامیہ معتمدہ کے اندر جن مسائل میں اختلاف ہے، ان میں بھی ہیئتِ علمیہ کتاب وسنت کی روشنی میں جس حکم کو بھی قوی تر سمجھے گی، صرف اسی ایک حکم کو نافذ کیا جائے گا۔ اور ہم خیال کرتے ہیں کہ تمام بلادِ اسلامیہ میں ایک ہی جیسے احکام تمام شؤنِ حیات میں موافق احکام شرعیہ نافذ ہونا ضروری ہیں کہ یہی وحدتِ اسلامیہ کا تقاضہ ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ مہم بہت شاق اور مرحلہ دشوارتر ہے۔ مگر خدا کے بھروسہ پر اس سمت میں آگے بڑھنے کا حوصلہ کرو گے، تو منزل ضرور آسان ہوگی، وھو الموفق۔

ضروری معروضات

جلالۃ الملک فہد طال بقاءہ کے افتتاحیہ میں جو زیادہ اہم اور مفید اجزاء ہمارے نزدیک تھے وہ افادۂ ناظرین کے لئے پیش کر دیئے

گئے، وحدتِ امت۔ جمع کلمۂ مسلمین اور مسائل ومشکلات کے اجتماعی حل کے لئے جن بہتر وموثر تر تجاویز وہدایات کی ضرورت تھی، وہ انہوں نے بڑی خوبی سے پیش کردی ہیں۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔ ملک موصوف عزّ سلطانہ نے پچاس سال قبل کی مؤتمر عالمِ اسلامی کا بھی ذکر کیا ہے جو ملک عبدالعزیز مرحوم نے ۱۳۴۴ھ (م ۱۹۲۶ء) میں منعقد کی تھی۔ اس میں بھی عالمِ اسلام کے تمام زعماء نے شرکت کی تھی۔ اور جمعیت علماء ہند کی طرف سے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی تشریف لے گئے تھے، جس کا ذکر انہوں نے اپنی فتح الملہم شرح صحیح مسلم ص ۲/۲۲۳ میں کیا ہے۔ جس طرح اس وقت عصری مسائل ومشکلات کی اہمیت ہے اس وقت آثار ومقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کا مسئلہ زیادہ اہم تھا، اور اس پر کئی روز تک بحث ہوئی تھی۔ خود ملک عبدالعزیزؒ بھی علماء داعیانِ عالم اسلامی کی مجالس میں شرکت کرتے اور ابحاث سنتے تھے۔ فیصلہ اس وقت بھی کتاب وسنت ہی پر موقوف تھا۔ لیکن مولانا کا بیان ہے کہ جب ہم نے احادیث وآثارِ صحابہ وتابعین سے تبرک بآثار الصالحین کا جواز پیش کیا تو علماءِ نجد نے قبول نہ کیا اور وہ اپنی بات تبرک بالا مکنہ والمواضع کو بدعت وغیر مشروع ہی ماننے پر مصر رہے۔ اور ملک کو اس طرف متوجہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں کچھ نہیں جانتا، آپ ہمارے علماء کو مطمئن کر دیں۔ چنانچہ تمام آثار متبرکہ کو تدریجاً تقریباً ختم کر دیا گیا۔ اور ایسے امور میں اب تک بھی غیر ضروری تشدد اور تعصب کی شان موجود ہے، اس وقت شیخ الاسلام عبداللہ بن بلیہد پیش پیش تھے، تو اس دور میں شیخ ابن باز، آگے آگے ہیں۔ افسوس ہے کہ اب حضرت علامہ عثمانیؒ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث اور علامہ بنوریؒ ایسے کثیر المطالعہ محققین اصحابِ علم وفضل اور جرأت مندانہ اظہارِ حق کرنے والے بہت کم ہیں۔ یہ حضرات علماء سعودیہ پر بھی دلائل کے ساتھ برابر اتمامِ حجت کرتے رہے، ان کے برعکس اس دور میں کم سواد "متاعِ قلیل" کے حریص اور اخفاءِ حق کے مریض زیادہ ہیں۔ والی اللہ المشتکی لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

ابھی چند سال قبل یک لفظی طلاقِ ثلاث کی بحث علماءِ نجد وحجاز کے سامنے آئی تو سب نے جمہور کے مسلک کو راجح تسلیم کر لیا شیخ ابن باز نے اس سے اختلاف کیا، درود شریف میں سیدنا کے استعمال کے خلاف بھی ان کا تشدد بدستور ہے۔

یہاں اس واقعہ کی یاددہانی مناسب ہوگی کہ جلالۃ الملک عبدالعزیز، مفتی مدینہ منورہ اور مولانا خلیل احمد صاحب مسجد نبوی میں ایک ساتھ بیٹھے تھے، اور درود شریف میں سیدنا کے استعمال کو اس وقت بڑی شد ومد سے بدعت کہہ کر روکا جا رہا تھا۔ مولاناؒ نے حدیث انا سید ولد بنی آدم پیش کی تھی، اس پر جلالۃ الملک نے مفتی صاحب کو کہا کہ جب ایک جگہ ثابت ہو گیا اور دوسری کسی جگہ ممانعت نہیں آئی تو پھر اتنی سختی کیوں کی جا رہی ہے؟ اس پر مفتی صاحب ونجدی علماء خاموش ہو گئے تھے لیکن اس زمانہ کے مفتی صاحب شیخ ابن باز کو اب بھی لفظِ سیدنا کے بدعت وممنوع ہونے پر اصرار ہے۔

ضرورت ہے کہ ملکِ معظم علماءِ نجد کے اس قسم کے تشدد وتعصب کو ختم کرائیں، علامہ ابن تیمیہؒ کی عظمت وجلالت قدر کو ہم بھی مانتے ہیں اور ان کی گراں قدر علمی خدمات بھی مسلم ہیں مگر ان کے سینکڑوں تفردات سے بھی قطعِ نظر نہیں کی جاسکتی۔ خصوصاً جب کہ ان کے تفردات اصول وعقائد کے اندر بھی ہیں اور بہت سے وہ مسائل بھی ہیں جن میں انہوں نے ائمہ اربعہ اور جمہورِ امت کا بھی خلاف کیا ہے، جس طرح طلاقِ ثلاث کے مسئلہ میں ان کا تفرد جمہور کے خلاف تھا۔

تو کیا ملک موصوف کے سامنے ایسی کوئی تجویز نہیں ہے کہ جمہور سلف وخلف کے خلاف جتنے بھی مسائل ہیں، ان سب پر ہی بحث وتحقیق ہو اور جو مسلک کتاب وسنت وآثارِ صحابہ وتابعین کی روشنی میں سب سے زیادہ قوی ہو اور ظاہر ہے کہ وہ طلاقِ ثلاث کی طرح جمہور کا ہی مسلک ہوسکتا ہے، اس کو ہی راجح قرار دینے پر سب اتفاق کر لیں۔ پھر بھی اگر شیخ ابن باز ایسے متشدد نہ مانیں یا اختلاف کریں تو ان کو نظر انداز کیا جائے۔

ہم حنفی شافعی وغیرہ کے تعصب، تشدد وتنگ نظری کو پسند نہیں کرتے، اور ہمیں جلالۃ الملک عبدالعزیز مرحوم ومغفور کی اس رائے سے کلی اتفاق

ہے کہ جو حکم بھی کتاب وسنت کے لحاظ سے اقویٰ ہو صرف اسی کو قبول ونفاذ کا درجہ حاصل ہو۔ اور اسی طرح وحدتِ امت اور جمعِ کلمہ کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ جس طرح علماءِ داعیانِ نجد وحجاز کی ہیئت علمیہ کے سامنے طلاقِ ثلاث کا مسئلہ آیا تھا، اس کے سامنے دوسرے بھی اہم مسائل ضرور ہونگے، اور ان کے متفقہ یا کثرتِ رائے کے فیصلے جلد جلد ہمارے سامنے آتے رہیں گے۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز.**

بظاہر علامہ شیخ سلیمان الصنیع مرحوم کی ۳۸ء کی پیش گوئی، جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں پوری ہونے کا وقت آ چکا ہے ورنہ سعودی علماء کی ہیئت علمیہ طلاقِ ثلاث کے بارے میں تقریباً اتفاق رائے سے (کہ صرف شیخ ابن باز نے خلاف کیا) جمہور کے مسلک کو جو علامہ ابن تیمیہؒ کے خلاف ہے، ہرگز ترجیح نہ دے سکتے۔ اور "بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست"

ہیئت علمیہ سعودیہ کی خدمت میں ایک سوال

اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ سفرِ زیارت نبویہ کے بارے میں سعودی علماء کا کیا موقف ہے؟ آیا وہ علامہ ابن تیمیہؒ کی وجہ سے سفرِ معصیت کہتے ہیں یا جمہور کے اتباع میں جائز مانتے ہیں، مسندِ امام احمدؒ میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے حدیث مروی ہے کہ "شدرحال یعنی سفر کسی مسجد کی طرف نماز پڑھنے کے ارادہ سے نہ چاہئے، بجز مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری اس مسجد کے اس حدیث پر حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ "یہ حدیث شدِ رحال والی دوسری مشہور حدیث کیلئے تفسیر بن سکتی ہے، جس سے بعض حضرات نے سفرِ زیارتِ نبویہ تک کو بھی ممنوع سمجھ لیا ہے لہٰذا اس حدیث سے مشاہدو مقابر کی طرف سفر کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی، خاص طور سے جبکہ اس میں کوئی دوسرا مفسدہ، اور خرابی بھی نہ ہو۔ (الطرائف والظرائف)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت امام احمدؒ تو خود اس حدیث کے راوی ہیں، جس سے صرف دوسری مساجد کی طرف سفر کی ممانعت ہے، اسی لئے ان سے یا دوسرے آئمہ مجتہدین ومحدثین وفقاءِ مذاہب اربعہ وغیرہم سے ممانعتِ سفرِ زیارۃ منقول نہیں ہے۔ بلکہ علامہ ابن تیمیہ و ابن القیم سے قبل وبعد کے اکابر امت اور جمہور سلف وخلف سے بھی سفرِ زیارت کا معصیت ہونا ثابت نہیں ہے۔

لہٰذا جلالۃ الملک عبدالعزیز مرحوم ومغفور اور جلالۃ الملک فہد بن عبدالعزیز کی رائے کے مطابق ہیئت علمیہ سعودیہ کو طلاقِ ثلاث کی طرح اس مسئلہ کو بھی جمہور کے قوی مذہب کے مطابق طے کرا کر اعلان کر دینا چاہئے، تاکہ ایک بہت بڑی غلط فہمی رفع ہو جائے۔ ولہم الاجر۔

نجد وحجاز کی یونیورسٹیاں

اس سفرِ زیارت طیبہ میں مدینہ طیبہ، مکہ معظمہ اور جدہ کی یونیورسٹیاں بھی دیکھنے کا موقع ملا اور خاص طور سے لائبریریاں دیکھیں، جو نہایت ہی شاندار ہیں عرصہ ہوا ترکی اور مصر کے کتب خانے دیکھے تھے، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مشہور آزاد لائبریری، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد، اور پٹنہ ورام پور کی لائبریریاں بھی دیکھیں مگر حکومتِ سعودیہ کی اس بارے میں پیش رفت لاجواب ہے دینی وعصری علوم کی یونیورسٹیوں پر اربوں روپے خرچ کئے جا رہے ہیں۔ متعلمین ومعلمین وانتظامیہ وغیرہ پر بے دریغ رقوم صرف ہوتی ہیں۔ یہ سب دیکھ کر قدم قدم پر حکومتِ سعودیہ کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، پھر سب سے بڑا کارنامہ جس کی نظیر ساری دنیائے اسلام میں نہیں ہے یہ کہ ہر یونیورسٹی میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے بالکل الگ الگ انتظام ہے، مخلوط تعلیم کہیں نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے مصارف ڈبل ہوتے ہیں۔ خاص طور سے ہر شعبہ میں اعلیٰ معیار کی معلمات کا مہیا کرنا بہت دشوار ہے۔ مگر اس دشواری کو بھی حل کر دیا گیا ہے اور اگر کہیں کسی شعبہ کے لئے معلّمہ نہیں مل سکی تو اس کا نہایت معقول انتظام یہ کیا ہے کہ مردانہ یونیورسٹی کا معلم ٹی وی پر درس دیتا ہے، جس کو زنانہ یونیورسٹی کی طالبات اسی طرح سنتی ہیں جس طرح سامنے معلم موجود ہو، اور ہر طالبہ کے پاس فون ہوتا ہے، جس کے ذریعہ وہ استاذ سے سوالات کرتی ہیں اور معلم وہاں سے جواب ٹی وی پر ہی دے دیتا ہے۔ کیا اس میں اربابِ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لئے کوئی لمحۂ فکریہ ہے؟ کہ وہاں نہ صرف مخلوط تعلیم ہے بلکہ مخلوط اجتماعات

بھی کرائے جاتے ہیں۔کیا اسلامی کردار یہی ہے؟

بجنور جیسی چھوٹی جگہ میں دو ڈگری کالج ہیں۔ایک میں مخلوط تعلیم ہے۔دوسرے میں صرف لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں اور معلمات بھی عورتیں ہیں۔غیرت مند مسلمانوں کو اس سے سبق لینا چاہئے۔

مسلم یونیورسٹی کے لئے اقلیتی کردار کی مانگ کرنے والے سوچیں کہ وہ خود کس راہ پر چل رہے ہیں، کیونکہ بہت سے مسلمان بھی کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ مل جل کر رہنا اور ایک جگہ پر تعلیم حاصل کرنا ہی ترقی کا زینہ ہے۔یقیناً حکومتِ سعودیہ کا یہ کارنامہ قابلِ صد مبارکباد ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ حکومتِ سعودیہ کا عام نظم و نسق خاص طور سے سالانہ حج کے موقع پر عظیم تر و غیر معمولی انتظامات نہایت عالی شان یونیورسٹیاں نشر و اشاعت کے علمی ادارے، طویل و عریض، اعلیٰ معیار کی سڑکوں کا جال، ٹریفک پر مکمل کنٹرول، ہر قسم کی ضروریات کی فراوانی و ارزانی، مسجد حرام اور مسجدِ نبوی کے خصوصی و اعلیٰ انتظامات، ہر بات محیر العقول اور دادطلب ہے۔**اللهم زد فزد۔**

ریاض و طائف دیکھنے کا ہر مرتبہ اشتیاق ہی رہا۔حج و عمرے کے لئے سعودیہ جانے والوں کے واسطے دوسرے مقامات پر جانے کی اجازت نہیں ہے۔اور کوشش پر بھی کامیابی مشکل ہی سے ہوتی ہے۔

ایک بڑی تکلیف اس سے ہوتی ہے کہ حرمین شریفین کیلئے ہجرت کا دروازہ بند ہے۔بعض لوگ بیس بیس سال سے وہاں اس امید پر وقت گزار رہے ہیں کہ حکومتِ سعودیہ ان کو مستقل اقامہ کی اجازت دے گی، دوسرے یہ کہ وہاں کے اعیان میں تو کم مگر علماء میں تشدد و تعصب زیادہ پایا جاتا ہے۔خدا کرے اس سرزمینِ مقدس میں کوئی بات بھی کسی کے لئے تکلیف و شکایت کی باقی نہ رہے۔**واللہ ولی الامور۔**

سفرِ پاک: ۱۱ دسمبر ۱۹۸۰ء کو لاہور پہنچا۔اور ۲۷ جنوری ۱۹۸۱ء کو پاکستان سے واپسی ہوئی۔اس سفر میں لاہور سرگودھا اور کراچی کے مقیم عزیزوں سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں اور جن شہروں میں علماء و اعیان سے ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا، وہ حسب ذیل ہیں۔

لاہور کے طویل قیام میں حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب خلیفہ حضرت مدنیؒ و شیخ الحدیث جامعہ مدینہ، کریم پارک راوی روڈ کی علمی و روحانی مجالس سے اہم استفادات کا موقع میسر ہوا۔بخاری شریف کا درس محققانہ محدثانہ رنگ میں دیتے ہیں، مطالعہ نہایت وسیع ہے اور نہایت گرانقدر علمی و حدیثی یادداشتیں جمع کی ہیں، جو طبع ہو جائیں تو اہلِ علم کو نفع عظیم حاصل ہوگا۔نہایت متواضع خلقِ مجسم اور خمول و خلوت پسند ہیں۔

ان کے جامعہ میں دوسرے اساتذہ بھی اصحابِ فضل و کمال جمع ہیں۔لاہور کے جامعہ اشرفیہ میں حاضر ہوا، احقر کے استاذِ معظم مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے صاحبزادے مولانا عبدالمالک صاحب اس کے شیخ الحدیث ہیں۔یہ جامعہ بھی گرانقدر عظیم علمی خدمات انجام دے رہا ہے۔

گوجرانوالہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر دام فیضہم اور مولانا صوفی عبدالحمید صاحب کی سرپرستی میں بڑا علمی ادارہ قائم ہے۔جس میں مکمل درسِ نظامی کے علاوہ شعبۂ تالیف و نشر و اشاعت بھی عظیم الشان خدمات انجام دے رہا ہے اور مولانا صفدر صاحب کے درسِ حدیث اور علمی و حدیثی تالیفات کی شہرت و مقبولیت پورے پاکستان میں ہے۔

محترم مولانا محمد چراغ صاحب دام ظلہم مؤلف ''العرف الشذی'' کے مدرسہ عربیہ میں بھی حاضر ہوا، اور آپ کی نیز دوسرے ارکان و اساتذہ کی ملاقات و اکرام سے مشرف ہوا۔مولانا نے حضرت شاہ صاحبؒ کے درسِ بخاری شریف کی مختصر عربی تقریر بھی عنایت فرمائی، جس سے مستفید ہوا۔**جزاھم اللہ خیر الجزاء۔**

ساہیوال کے جامعہ رشیدیہ میں حاضر ہوا۔حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب شیخ الجامعہ، حضرت العلامہ مولانا غلام رسول صاحب صدر المدرسین دام ظلہم حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب ناظم اعلیٰ جامعہ و مدیر محترم ''الرشید'' اور دوسرے اساتذہ کی تشریف و شفقتوں سے ممنون ہوا اور علمی حدیثی و تالیفی خدمات سے دل نہایت متاثر ہوا بارک **اللہ فی مساعیھم۔**

فیصل آباد (لائلپور) میں محترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ کے برادرِ مکرم مولانا محمد یحییٰ صاحب مہتمم مدرسہ اشرف المدارس کی خصوصی دعوت پر حاضر ہوا۔اور حضرت مولانا غلام محمد صاحب صدر مدرس ودیگر اساتذہ سے بھی نیاز حاصل ہوا۔

مدرسہ تعلیم الاسلام سنت پورہ میں حضرت مولانا محمد انوریؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا عزیز الرحمٰن انوری مہتمم مدرسہ اور دوسرے صاحبزادگان واساتذہ سے ملاقاتیں رہیں۔

مدرسہ علوم عربیہ وتجوید وحفظ میں بھی حضرت مولانا نذیر احمد صاحب شیخ الحدیث جمال احمد صاحب صدر مدرس اور حضرت مولانا محمد ظریف صاحب ناظم تعلیمات کی دعوت پر حاضری ہوئی۔محترم جناب مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب نے نہایت پر تکلف کھانے کی دعوت دی،جس میں سب اساتذہ اور دوسرے اعیان شریک ہوئے۔

سرگودھا میں قیام عزیز قمرالحسن نقوی سلمہ کے پاس رہا،مولانا سیف اللہ صاحب پانی پتی۔خطیب جامع مسجد بلاک ۲۳ اور مولانا حکیم نیاز احمد صاحب کرنالی سے اکثر ملاقاتیں اور علمی مجالس رہیں،باوجود علمی ودرسی مشغلہ نہ ہونے کے دونوں حضرات اسلامی علوم وفنون کا بڑا مطالعہ رکھتے ہیں۔اور حکیم صاحب کی نظر حدیث ورجال پر بھی بہت وسیع ہے،مولانا موصوف نے ایک عصرانہ کا بھی اہتمام کیا،جس میں وہاں کے بہت سے اکابر اعیان وعلماء نے شرکت کی،گرانقدر علمی مذاکرات ہوئے،ان سب حضرات نے انوارالباری کے سلسلہ میں بھی حوصلہ افزائی کی اور توسیع اشاعت کے لئے مفید مشورے دیئے۔چند حضرات کے نام یہ ہیں۔

مولانا حکیم عبدالغفور صاحب مہتمم مدرسہ تعلیم القرآن سٹی گراؤنڈ سرگودھا،مولانا قاری جلیل الرحمٰن صاحب خطیب جامع مسجد گول چوک،مولانا صالح محمد صاحب مدرس جامعہ سراج العلوم بلاک ا،مولانا سید محمد حسین شاہ صاحب صدر مدرس ضیاء العلوم۔مولانا قاری شہاب الدین صاحب مہتمم مدرسہ امینیہ مولانا برکت علی صاحب،مولانا محمد یوسف صاحب خطیب جامع مسجد نیو پنجاب سوپ فیکٹری،مولانا قاری عطاءالرحمٰن صاحب مدرسہ اشرف العلوم۔مولانا وقاراللہ صاحب ناظم مدرسہ انوارالعلوم مولانا عبداللطیف صاحب خطیب جامع مسجد چوک،مولانا پیر محمد صاحب خطیب بی اے ایف کالج،مولانا ضیاءالحق ناظم ضیاءالعلوم میاں محمد عارف صاحب مسلم بازار،کراچی میں عزیزوں سے ملاقاتیں رہیں اور قیام حضرت مولانا بنوریؒ کے دارالعلوم نوٹاؤن میں عزیز مکرم مولانا سید محمد میاں خلفِ ارشد علامہ بنوریؒ کے پاس رہا۔دارالعلوم کو تو مولانا بنوریؒ کی زندگی میں بھی ۱۹۷۵ء کے ایک روزہ قیام میں دیکھا تھا،اب اکابر اساتذہ،مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی صدر مدرس،مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی،مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحب،مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی،مولانا محمد حبیب اللہ مختار،مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی مدیر بینات ودیگر اساتذہ کرام سے ملاقاتیں رہیں،مولانا محمد طاسین صاحب ناظم مجلس علمی،کراچی سے بھی نیاز حاصل ہوا۔سب حضرات کی پرخلوص پذیرائی اور شفقتوں کا ممنون ہوں۔

تدریس وتربیت کا معیار بہت بلند ہے،درجۂ تخصص بھی قائم ہے۔جس میں نو طلبہ فقہ میں اور ایک حدیث میں تخصص کررہے ہیں۔محترم مولانا نعمانی عم فیضہم اسی درجہ کے استاذ ونگراں ہیں۔میں نے گزارش کی کہ مولانا بنوریؒ کے جامعہ میں صرف ایک طالب علم کا درجۂ تخصص حدیث میں ہونا موجب تعجب ہے،یہاں تو کم سے کم دس طالب علم اس میں ہوتے،کیونکہ حدیث کا تخصص تمام دوسرے تخصصات سے زیادہ اہم اور مشکل بھی ہے،پھر یہ کہ کچھ دنوں کے بعد تخصص کرانے والے کامل الفن محدثین بھی نہ رہیں گے۔

جامعہ مدینۃ لاہور،جامعہ ساہیوال اور دوسرے جامعات کے اکابر کو بھی میں نے توجہ دلائی کہ اس فنِ حدیث کا بقاء صحیح معنے میں بغیر تخصص کا درجہ قائم کئے نہ ہو سکے گا،جس کے لئے بہت وسیع مطالعہ اور فنِ رجال وغیرہ سے پوری واقفیت ضروری ہے۔صرف دورہ کے سال کی رواں دواں تعلیم محدث بننے کے لئے کافی نہیں ہے۔

پہلے علماءِ دیوبند کے درس میں بھی تفقہ فی الحدیث اور نصرتِ فقہ حنفی پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی، رجال وطبقاتِ رواۃ، عللِ حدیث وطرقِ حدیث کی تحقیق کا اعتناء کم تھا، حالانکہ قدماء محدثین کے یہاں ان سب امور کی بھی مزاولت اور بحث وتمحیص ضروری تھی، حضرت شاہ صاحبؒ نے دیکھا کہ اب قدماء کے ہی طریقہ کو اختیار کرنا پڑے گا، ورنہ معاندینِ حنفیہ غیر مقلدین وغیرہم کے جا و بے جا اعتراضات کی جواب دہی نہ ہو سکے گی۔

یہ وہ وقت تھا کہ غیر مقلدین کے سرخیل نواب صدیق حسن خاں اور میاں نذیر حسین صاحب دہلوی اور ان کے تلامذہ نے مشہور اختلافی فروعی مسائل کا فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین وغیرہ پر رسائل لکھ کر حنفیہ کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا تھا اور ان کے ذیل میں رواۃ ورجال اور طرقِ روایت وطبقات کی بحثیں زندہ کر دی تھیں۔ اس وقت مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ نے اس فتنہ کا مقابلہ کیا۔ ان کے پاس قدماء کی بھی کتابیں تھیں، بڑا کتب خانہ تھا، مگر بقول علامہ کوثریؒ انہوں نے غیر مقلدین کی درازلسانیوں اور مغالطہ آمیزیوں سے مرعوب ومتاثر ہو کر بعض مسائلِ حنفیہ کا ضعف تسلیم کر لیا تھا جس سے غیر مقلدین کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ان سب حالات کے پیشِ نظر درسِ حدیث کا طریقہ بدلا اور احادیثِ احکام پر رواۃ کی جرح وتعدیل اور طرق ومتونِ حدیث کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس کی، تاکہ جھوٹوں کو گھر تک پہنچایا جا سکے اور آپ کا درس قدیم محدثین کے طرز پر شروع ہو گیا جس میں بال کی کھال نکالی جاتی تھی، حضرتؒ کا مطالعہ بہت وسیع اور حافظہ بے نظیر تھا۔

بقول علامہ بنوریؒ امام طحاوی حنفی بڑے ہی وسیع النظر محدث ہیں، ہر موضوع پر اتنا مواد اور ذخیرہ احادیث وآثار کا پیش کر دیتے ہیں کہ عقل حیران ہو جاتی ہے، اور انہوں نے اتنا سامان دلائلِ حنفیہ کا جمع کر دیا ہے کہ وہ بہت کافی ووافی ہے تاہم چند مباحث میں جو کمی نظر آتی ہے، اس کی تکمیل حضرت شاہ صاحبؒ نے فرما دی ہے۔ اس لئے یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ امام طحاوی کے بعد ایک ہزار سال تک کوئی ان کے درجے کا محدث حنفی نہیں آیا جس نے ان کے علوم پر اضافہ کیا ہو بجز حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ کے ان کے یہاں بہت سے اضافے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اصولِ حدیث میں بھی اضافے کئے ہیں۔

غرض حضرتؒ کا محققانہ محدثانہ رنگ قدماءِ محدثین سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے، مجھے یاد ہے کہ مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند جو خود بھی بڑے محدث وشارح کتبِ حدیث ہیں، فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کا محدثانہ محققانہ رنگ دوسرے اکابرِ دیوبند وسہارنپور کی حدیثی تالیفات وشروح سے ممتاز ہے۔ اور آپ کے رسائل فاتحہ خلف الامام، نیل الفرقدین، کشف الستر وغیرہ اس پر گواہ ہیں۔

بات لمبی ہو گئی، کہنا یہ تھا کہ اب حضرت شاہ صاحب ایسے محقق تو درسِ حدیث دینے والے ملنے بہت مشکل ہیں، اور ان کا محققانہ طریق درسِ حدیث اختیار کئے بغیر کام چلے گا بھی نہیں، اس لئے اس کمی کی تلافی صرف درجہ تخصصِ حدیث قائم کرنے سے ہی ہو سکے گی۔ پھر یہ کام صرف مطالعہ سے اور بغیر کامل الفن استاذِ حدیث کی تربیت ونگرانی کے بھی نہیں ہو سکتا اس لئے جلد سے جلد اس کی طرف توجہ ضروری ہے۔

دارالعلوم کورنگی کراچی میں بھی حاضری ہوئی۔ یہ بھی بہت بڑا جامعہ عربیہ اسلامیہ ہے، جو حضرت الاستاذ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ کا قائم کردہ ہے۔ آپ کے دو جلیل القدر صاحبزادے مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی استاذِ حدیث اور مولانا محمد تقی عثمانی استاذِ حدیث ورکنِ اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان اس کے سرپرست ومنتظم ہیں۔

اس جامعہ کا رقبہ ۵۶ ایکڑ ہے۔ اساتذہ کے لئے بیس مکانات تعمیر کئے گئے ہیں، کتب خانہ کی بہت عالی شان عمارت زیرِ تعمیر ہے، اور کتب خانہ کے لئے نہ صرف مطبوعہ کتابیں بلکہ قلمی کتابیں بھی ضخیم جلدوں کی فوٹو آفسٹ کے ذریعہ حاصل کر کے منگوا رہے ہیں۔ طلبہ کی رہائش وآسائش کا نہایت معقول انتظام ہے۔ ان کے کمروں میں بجلی کے پنکھے بھی ہیں، ان کو اجتماعی طور سے کھانا کھلانے کا نظم ہے اور صبح کو

ناشتہ بھی دیا جاتا ہے، مطعم کا بڑا ہال بھی زیر تعمیر ہے۔

تخصص فی الفقہ والافتاء کا درجہ قائم ہے، کاش اس کے ساتھ تخصص فی الحدیث کی طرف بھی جلد توجہ ہو، ماشاء اللہ مولانا تقی عثمانی دام فضلہم خود فن حدیث کے بہت اچھے متخصص ہیں، ''درسِ ترمذی'' اس پر شاہد ہے۔ اور وہ فتح الملہم شرح صحیح مسلم علامہ عثمانیؒ کا تکملہ بھی فتح المنعم کے نام سے تیار کررہے ہیں۔ زادھم اللہ بسطۃ فی العلم والفضل۔

اس جامعہ میں بڑے پیمانہ پر دارالتربیت، اور مدرسۃ البنات بھی قائم ہے، دارالتصنیف کا شعبہ بڑا کام کررہا ہے۔ مولانا تقی عثمانی کی ادارت میں ماہوار ''البلاغ'' بھی بڑی شان سے نکل رہا ہے۔ یہ سب بڑے بڑے کام ہورہے ہیں جبکہ حیرت در حیرت ہے کہ ۱۳۹۷ء میں بجٹ صرف ۱۳ الاکھ کا تھا۔ حال کا حال معلوم نہیں، کچھ البرکۃ فی مال الغازی جیسی بات معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

کراچی میں حضرت عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی مدظلہم خلیفۂ حضرت تھانویؒ کی خدمتِ اقدس میں بھی کئی بار حاضری ہوئی، اور زمانۂ قیام کراچی میں میرے ایک نہایت مخلص کرم فرما رفعت احمد خاں صاحب بجنوری بھی برابر ملتے اور عنایات فرماتے رہے۔ یہ آج کل ''بیگم عائشہ باوانی وقف کراچی'' کے شعبۂ نشر و اشاعت کے ڈائریکٹر ہیں۔

قیامِ پاکستان کے زمانہ میں خانقاہِ سراجیہ کندیاں (میاں والی) حاضری کا شرف بھی ضرور قابلِ ذکر ہے، جس کی تقریب یہ ہوئی کہ راقم الحروف واپسی ہند کا عزم کرچکا تھا۔ اچانک معلوم ہوا کہ حضرت اقدس مرشدی مولانا خان محمد صاحب نقشبندی مجددی لاہور تشریف لائے ہوئے ہیں، فوراً ہی جامعہ مدنیہ کی گاڑی میں وہاں کا رخ کیا اور حضرت کی خدمت میں حاضری دی، حضرت نے فرمایا کیا خانقاہِ سراجیہ دیکھے بغیر ہی واپس ہوجاؤ گے؟ عرض کیا، نہیں، اب ارادہ کرلیا ہے، حضرت نے فرمایا کہ میں کل پہنچ جاؤں گا، تم بھی آجانا۔

لہٰذا پروگرام بنا کر مولانا حبیب احمد صاحب مدرس مدرسہ اسلامیہ چوہڑ کانہ منڈی، ضلع شیخو پورہ کی ہمراہی میں خانقاہ شریف حاضر ہوا اور کئی روز قیام کیا، حضرت قبلہ دام فیضھم کے فیضِ صحبت اور مجالس علم و معرفت سے بقدرِ ظرف استفاضہ کیا وللہ الحمد۔ حضرت الشیخ المعظم مولانا احمد خاں صاحب قدس سرہ کے عالی شان کتب خانہ سے بھی مستفید ہوا۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ بھی حضرت کے گراں قدر علم و فضل و تبحر اور فیوض روحانیہ، نیز نوادرِ کتب خانہ مذکور کا ذکر فرمایا کرتے تھے، اور خود بھی ایک مرتبہ وہاں حضرتؒ کی حیات میں تشریف لے گئے تھے۔ حضرت مرشدی دام ظلہم نے خاص شفقتوں سے نوازا۔ اور رخصت کے وقت ایک قلم، چادر اور رومال مرحمت فرمایا۔ الحمدللہ حضرت کی توجہ بھی انوار الباری کی تکمیل و اشاعت کی طرف مبذول ہے۔ حق تعالیٰ ان کے فیوضِ عالیہ سے تمام مسترشدین کو دیر تک مستفید فرماتا رہے۔ آمین۔

یہ تذکرہ سفر پاک ناقص رہے گا اگر میں اپنے نہایت ہی محترم و مخلص مولانا عبیداللہ انور خلفِ ارشد حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کا ذکر نہ کروں، جو قیام لاہور میں برابر اپنی شفقتوں سے نوازتے رہے۔ اور آخر میں اپنے نہایت ہی محترم و مکرم میزبان حضرت مولانا حامد میاں صاحب دام فیضہم و فضلہم اور ان کے عالی قدر صاحبزادوں کے ذکرِ خیر پر اس کو ختم کرتا ہوں۔ جن کی وجہ سے مجھے بہت ہی راحتیں میسر ہوئیں، اور ان کی شبانہ خاص علمی و روحانی مجالس کا لطف و سرور تو ہمیشہ یاد رہے گا، الحال اللہ بقاء و تمد الدین والعلم۔ مولانا دام ظلہم نے از راہ شفقت یہ بھی فرمایا کہ ہم رائے ونڈ میں بڑی جگہ حاصل کرکے اپنے جامعہ کو منتقل کرنیوالے ہیں، تم بھی آجاؤ اور تخصصِ حدیث کی خدمت اپنی نگرانی میں کراؤ۔ مولانا بنوریؒ بھی لکھا کرتے تھے کہ انوار الباری کا کام میرے پاس رہ کر کرو۔ ان کے حکم کی بھی تعمیل نہ ہوسکی تھی۔ محترم مولانا حامد میاں صاحب بھی ضرور ایسے ہیں کہ ان کے پاس رہ کر بہت سے علمی، حدیثی تالیفی کام اعلیٰ پیمانہ پر انجام دیئے جاسکتے ہیں۔ اور ان سے بہت بڑا علمی تعاون مل سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ اب باہر کے مختصر سفروں کی بھی ہمت باقی نہ رہی، طویل قیام یا ہجرت کی ہمت و حوصلہ تو بڑی چیز ہے۔

سفرِ افریقہ: جامعہ اسلامیہ عربیہ ڈابھیل (سورت) مشہور علمی ادارہ ہے، جس میں عالمی شہرت کے مالک علم وفضل کے آفتاب و ماہتاب حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری دیوبندی اور حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثانی دیوبندی نے قیام فرما کر علوم وحقائق کے دریا بہائے ہیں۔

خطۂ گجرات کے مسلمان کتنے خوش نصیب تھے کہ انہوں نے ان حضرات کی قدر جانی اور پہچانی، ان کی وجہ سے ایک چھوٹے سے مدرسہ تعلیم الدین کو عظیم الشان جامعہ کی صورت میں بدلنے کے لئے لاکھوں روپے بے دریغ صرف کر دیئے اور اس کو اوجِ کمال تک پہنچانے میں تن من دھن کی بازی لگا دی، تو حق تعالیٰ نے بھی ان کی مالی قربانیوں کو اعلیٰ شرفِ قبول سے نوازا۔ ضلع سورت اور اطراف کے یہی لوگ افریقہ میں تجارتی کاروبار کرتے ہیں، اور ان کو وہاں اس کے صلہ میں نیز حضرت شاہ صاحبؒ وغیرہ ایسے اہل اللہ کی دعاؤں کی برکت سے ہر قسم کی عزت و دولت میسر ہوئی ہے اور وہاں کے دولت مندوں میں یہ بات خاص طور سے دیکھی گئی کہ دنیا کے ساتھ دین وعلم کا دامن بھی نہایت مضبوط ہاتھوں سے تھامے ہوئے ہیں مساجد آباد ان کے ساتھ دینی تعلیم کے مکاتب کا اہتمام، ہر نماز کے وقت ہر مسجد کے پاس کاروں کی قطاریں، جن میں جوان، بوڑھے، سب ہی ٹھیک وقت پر نمازیں ادا کرنے کے لئے موجود، ہر مسجد کے ساتھ نہایت صاف ستھرے وضو خانے، گرم وسرد پانی تولیے، صابن موجود، جماعت خانہ میں عمدہ قیمتی قالینوں کا فرش، ہر بات قرینے قاعدے کی دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔

میں نے ان لوگوں سے کہا کہ یہ سب نعمتیں حضرت شاہ صاحب وغیرہ اکابر اہل اللہ کی دعاؤں کا ثمرہ ہیں، جو آپ لوگوں کو بڑی فراوانی سے میسر ہوگئی ہیں۔ ورنہ ہم دنیا کے اور خطوں میں بھی گئے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے اس طرح دین ودنیا کو جمع ہوتے نہیں دیکھا۔

اعلیٰ قسم کی ضیافتوں کا اتنا اہتمام کہ ہر کھانے پر انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات اور اعلیٰ قسم کے پھل موجود، اتفاق سے احقر اور رفیقِ محترم مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی دونوں اکل وشرب کے میدان میں تھانوی المشرب، چند لقیمات کو اقامتِ صلب کے لئے کافی سمجھنے والے، اور کھانے سے زیادہ صرف دیکھ کر سیراب ہونے والے، بہر حال! وہاں کے احباب ومخلصین کی سیر چشمی، محبت وخلوص، قدر دانی وقدر افزائیاں لائقِ صد قدر ومنزلت ہیں۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء۔

یہاں بتانا یہ ہے کہ اس جامعہ ڈابھیل کے بہت سے علماء وفضلاء نے افریقہ پہنچ کر علمی درس گاہیں بھی قائم کی ہیں۔ اور مولانا قاسم محمد سیما صاحب افریقی فاضلِ جامعہ نیوکاسل (ناٹال) میں ایک بہت بڑا دارالعلوم چلا رہے ہیں۔ وہ خود ماشاءاللہ علوم اسلامیہ عربیہ کے بڑے فاضل اور انگریزی زبان کے بھی عالم ہیں، خوب بولتے اور لکھتے ہیں۔ انتظامی صلاحیتوں کا تو کہنا ہی کیا کہ انہوں نے اپنے مخلص دوستوں کی مدد سے ایک بڑے عظیم الشان جامعہ کی بنیاد ڈال دی۔ جس کے لئے ایک مشن کالج کی عالیشان دو منزلی عمارت مع باغ ووسیع اراضی کے خریدی گئی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں جب راقم الحروف مولانا ہی کی دعوت پر وہاں حاضر ہوا تھا، تو اس دارالعلوم کا ابتدائی دور تھا، اب سالِ گزشتہ تک اتنی ترقی دے دی کہ دورۂ حدیث کا بھی ایک سال بڑی کامیابی سے پورا کرا دیا۔ خود مولانا نے باوجود گوناگوں انتظامی مصروفیات کے بخاری شریف کا درس دیا اور دوسرے اساتذہ حدیث نے باقی کتب صحاح پڑھائیں، جن میں مولانا منصور الحق اور مولانا ممتاز الحق پاکستانی فاضلان دارالعلوم نیوٹاؤن کراچی اعلیٰ درجے کے اساتذہ قابل ذکر ہیں۔ جو حضرت مولانا بنوریؒ فاضل جامعہ ڈابھیل کے تلمیذ رشید ہیں۔ اس طرح یہ سب فیض جامعہ ڈابھیل کا ہے، اور اہلِ گجرات کے لئے قابلِ فخر۔

گزشتہ سال دورۂ حدیث سے سات طلبہ فارغ ہوئے تھے، جن کی دستار بندی وتقسیم اسناد وانعامات کے لئے پورے جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کا بڑا جلسہ کیا گیا تھا، اور اس میں شرکت کے لئے مولانا سیما نے ہندوستان سے مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی اور راقم الحروف کو مدعو کیا تھا۔

یہاں سے افریقہ کے لئے انڈورسمنٹ ملنا اور وہاں سے ویزا کا حصول نہایت دشوار ہے۔ تاہم بڑی کوشش کے بعد ہم دونوں کو پہلے افریقہ جا چکنے کی بنیاد پر انڈورسمنٹ اور وہاں سے مولانا کی مساعی سے ویزا حاصل ہوگیا۔ چنانچہ ہم دونوں ۸ دسمبر ۱۹۸۳ء کی شام کو دہلی سے

بمبئی و نیروبی ہوکر ۹ دسمبر کو ۳ بجے جوہانسبرگ پہنچ گئے، ایئرپورٹ پر مولانا سیما صاحب مع رفقاء بابا صاحب و یوسف صاحب موجود تھے۔

وہ ہمیں وہیں سے اپنی گاڑی میں نیوکاسل لے گئے، ٹھیک مغرب کے وقت ہم ان کے دارالعلوم میں داخل ہوئے اور مغرب کی جماعت میں شریک ہوگئے، بعد نماز تمام ارکان واساتذہ اور طلبہ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مولانا جلسہ کی تیاری اور انتظامات کی دیکھ بھال میں مصروف ہوئے اور ہم نے کچھ آرام کیا۔ ۱۱ دسمبر کو وہ بڑا جلسہ ہوا جس میں صوبہ ٹرانسوال اور ناٹال و کیپ ٹاؤن سے بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں نے شرکت کی۔

جلسہ کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید اور نعتیہ نظموں سے ہوا۔ پھر جنوبی افریقہ کے ممتاز علماء نے تقریریں کیں۔ احقر نے بھی دارالعلوم نیوکاسل کی اہمیت وافادیت، غرض وغایت اور خاص طور سے علمِ حدیث کی فضیلت وبرتری، اکابر کی علمی ودینی خدمات پر روشنی ڈالی، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی نے انگریزی میں دین وعلم کی عظمت اور بلند مقاصد پر نہایت بصیرت افروز تقریر فرمائی۔

جنوبی افریقہ کے مشہور ومعروف فاضل مولانا عبدالحق صالح عمرجی چیئرمین دارالعلوم ٹرسٹ نے بھی اپنے عالمانہ فصیح و بلیغ ارشادات سے اہلِ جلسہ کو محفوظ فرمایا۔

مولانا قاسم محمد سیما صاحب پرنسپل دارالعلوم نے اپنی مفصل وجامع رپورٹ میں دارالعلوم کے تمام حالات واطوار وتدریجی ترقیات کا خاکہ پیش کرتے ہوئے اپنے آئندہ اعلیٰ عزائم سے بھی واقف کیا۔

طلبہ نے بھی عربی وانگریزی میں مکالمے اور تقریریں کیں۔ آخر میں ختمِ بخاری شریف، تقسیم اسناد وانعامات اور دعا پر بخیر وخوبی جلسہ ختم ہوا۔

اس کے بعد ظہر کی نماز باجماعت اور دارالعلوم کی طرف سے تمام شرکاء اجلاس کے لئے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ تمام انتظامات میں دارالعلوم سے تعلق وخلوص کی بنا پر اہلِ شہر نے بھی مولانا سیما صاحب اساتذہ وعملہ کے ساتھ مکمل تعاون کیا جزاهم الله خير الجزاء۔

یہ بات بھی بڑے شکر واطمینان کی ہے کہ مولانا سیما کو دارالعلوم میں درس ونظم کے سلسلہ میں معتمد وقابل اساتذہ اور باصلاحیت کارکنان میسر ہوگئے ہیں۔ جس سے آئندہ ترقیات کی بجا امید کی جاسکتی ہے۔ و لله الامر من قبل و من بعد۔

دارالعلوم میں ۲۔۳ روز قیام کر کے ہم دونوں ڈربن چلے گئے، وہاں مخلص محترم الحاج موسیٰ پارک کے پاس قیام ہوا انہوں نے اپنے سارے پروگرام اور ضروری کاموں کو مؤخر کر کے ۱۰۔۱۱ روز تک ہم دونوں کے ساتھ ایسے خلوص ومحبت ویگانگت کا برتاؤ کیا کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ وہ وہاں کے بہت بڑے اہلِ ثروت ہیں، مگر اتنے طویل قیام کے کسی ایک لمحہ میں بھی ہم نے تمول کا غرور وتمکنت ان میں نہیں دیکھا، اور کم و بیش یہی بات پورے جنوبی افریقہ کے اہلِ ثروت میں پائی گئی، یہ خدا کا بڑا انعام ہے۔ ان ہی کے قریبی عزیز موسیٰ درسوت بھی برابر ملتے رہے۔

دورانِ قیام ڈربن ہمارے قدیم کرم فرما مولانا عبدالحق صالح عمرجی نے بھی اپنی مخلصانہ شفقتوں سے ہمیں خوب خوب نوازا اعلیٰ درجہ کی دعوتِ طعام کے علاوہ برابر وقت نکال کر ہماری قیام گاہ پر تشریف لاتے رہے، اور اہم مسائل حاضرہ پر علمی مذاکرات ہوتے رہے۔ خاص طور سے انوارالباری کی تکمیل واشاعت کے بارے میں بھی تعلقِ خاطر ظاہر فرما کر مفید مشورے دیئے۔

ڈربن ہی میں ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے تلمیذِ حدیث، جامعہ ڈابھیل کے فارغ مولانا عبدالقادر صاحب ملے بڑے فاضل مقرر وخطیب، حضرت شاہ صاحبؒ کے عاشق اور انوارالباری کے مداح وقدردان، بہت ہی محبت وخلوص کے ساتھ بار بار ملتے رہے۔

دوسرے ایک بہت بڑے فاضل وعارف باللہ حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ مولانا موسیٰ یعقوب صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے جو شہر سے کافی دور ایک زاویۂ خمول میں مقیم ہیں۔ ہمارے جانے سے نہایت مسرور ہوئے، ہم سب کے لئے پرتکلف عصرانہ کا انتظام کرایا۔ ۱۹۳۰ء زمانۂ دیوبند کا ایک واقعہ سنایا کہ حضرت شاہ صاحبؒ رنگون تشریف لے گئے تھے، وہاں آپ نے ایک گھنٹہ تقریر جنت کے وجود پر ایسی فرمائی کہ جس سے جنت کی تمام چیزوں کا ایسا استحضار ہوا کہ جیسے لوگ جنت کو اپنی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

ڈربن ہی میں ایک مخلص دیندار نوجوان تاجر سے تعارف وتعلق ہوا۔ جنہوں نے راقم الحروف کے ساتھ کافی وقت گزارا اور کئی جگہ کی سیر وسیاحت بھی اپنی گاڑی میں لے جا کر کرائی، ان کے خلوص، تعلق، واصرار کی وجہ سے دوروز ان کے مکان پر قیام بھی کیا ان کا نام عمر فاروق امود ہے، اور ان کے بھائی مولانا مفتی بشیر احمد امود صاحب ہیں جو اس وقت باہر تھے، ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا۔ ان ہی کے دوست محمد اسحاق قدرت بھی بڑے خلوص ومحبت سے ملتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو خوش رکھے اور ترقیات سے نوازے۔

ڈربن سے ہم جوہانسبرگ آئے، ایئر پورٹ پر الحاج ابراہیم دادا بھائی اور ایم ایم گارڈی صاحب ملے، اور کھلوڑ ہاؤس میں قیام کرایا، قیام مختصر رہا، اسی میں مولانا گارڈی صاحب کی عیادت کی، جو صاحبِ فراش اور نہایت ضعیف وناتواں تھے، اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے، ۱۹۷۵ء میں جب راقم الحروف افریقہ گیا تھا، تو جوہانسبرگ میں قیام ان ہی کے پاس کیا تھا۔ انوارالباری کے لئے تکمیل واشاعت کے بہت ہی حریص تھے۔ ذاتی طور سے بھی نہایت محبت وخلوص رکھتے ہیں۔ نہایت افسوس ہے کہ مارچ ۸۴ء میں ان کے انتقال کی خبر آئی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ میاں فارم پر بھی دوبار حاضری ہوئی۔ محترم مولانا ابراہیم میاں اس وقت وہاں نہیں تھے، ان کے دوسرے بھائیوں، اور حافظ عبدالرحمٰن میاں صاحب سے ملاقات ہوئی، ایک روز بہت پر تکلف ناشتہ پر بھی مدعو کیا گیا۔ ایک مدت تک مولانا محمد بن موسیٰ میاں صاحب سے میرا بہت ہی قریبی تعلق مجلس علمی، اور حضرت شاہ صاحب کی وجہ سے رہا ہے۔ مجلس علمی کراچی منتقل ہوئی، تو وہاں بھی بلانے پر بہت مصر رہے، آخر وقت تک خط وکتابت رکھی، اور مجلس کے ترکِ تعلق پر بہت تاسف کا اظہار فرمایا کرتے تھے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

زمانۂ قیام جوہانسبرگ میں مولانا عبدالقادر صاحب ملکپوری، مولانا یوسف بھولا، مولانا یوسف عمرواڑی سے ملاقات ہوئی۔ افسوس ہے کہ تنگی وقت کی وجہ سے محترم الحاج عبدالحق صاحب مفتی، الحاج موسیٰ پوڈھانہ، مولانا احمد محمد گردا اور محترم ڈوگرات صاحب الحاج یوسف میاں صاحب اور بہت سے دوسرے احباب ومخلصین سے نہ مل سکا۔ محترم دادا بھائی اور ایم ایم گارڈی صاحب نے ہماری قدر افزائی اور راحت رسانی کے لئے جس قدر اہتمام کیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ جزاهم الله خير الجزاء۔

جوہانسبرگ سے ہم دونوں لوساکہ (زمبیا) آئے، جہاں محترم ابراہیم حسین لمبات کی سعی سے سعودیہ کا ویزا حاصل کیا گیا۔ اور سہ روزہ قیام میں مولانا عبداللہ منصور صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ، ودیگر اساتذہ، نیز دوسرے اعیانِ شہر الحاج محمد جی راوت، وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ قیام محترم فاروق توسارکہ صاحب کے فارم پر رہا جو ہمیں لینے کے لئے ایئر پورٹ آ گئے تھے۔ شہر سے ۱۰-۹ کلومیٹر کئی سو بیگھ کا فارم ہے۔ جس کا کام وہ بڑے اعلیٰ پیمانہ پر چلا رہے ہیں۔ اصلی ساکن ضلع سورت کے ہیں۔ انہوں نے میزبانی وقدر افزائی کا حق ادا کر دیا اور اپنی گاڑی میں صبح وشام شہر لے جا کر سب احباب سے ملاقاتیں کراتے رہے۔ جزاهم الله خير الجزاء۔

لوساکہ سے ہم دونوں نیروبی گئے، وہاں سے الحاج سلیمان حسین صاحب کے پاس ایک روز قیام کیا، جن کا موٹر پارٹس کا بزنس ہے وہاں سے جدہ آ کر پہلے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے، پھر مکہ معظمہ، اور وہاں سے ۱۱ جنوری کو دہلی واپس آ گئے۔ وللہ الحمد۔

مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ اور جدہ میں جن حضرات علماء واعیان سے ملاقاتیں ہوئیں، ان کا ذکر طویل ہے اور کسی دوسری فرصت کا محتاج۔ ان سب کے لئے دلی تشکر وامتنان اور مخلصانہ غائبانہ دعائیں۔

دارالاسلام اور دارالحرب کا مسئلہ

افریقہ کے قیام میں کئی جگہ یہ سوال ہوا کہ ان دونوں دیار کی اصل حقیقت اور متعلقہ شرعی مسائل کی کیا صورت ہے؟ مسائل دوسرے بھی زیر بحث آتے رہے، مگر اس مسئلہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے، اس لئے مختصراً کچھ لکھا جاتا ہے، کہ مسائل مہمہ کی تحقیق وتنقیح بھی انوارالباری

کے مقاصد میں سے ہے۔اور خاص طور سے اس بارے میں حقائق کا اظہار بھی کم ہوا ہے۔
چونکہ اس مسئلہ کے تمام اطراف اور فقہاء ومحدثین کی ابحاث پر بہت سے علماء کی نظر بھی نہیں ہے، وہ محض سرسری معلومات پر اکتفا کر لیتے ہیں اور غیر ذمہ دارانہ باتیں کہہ دیتے ہیں۔اس کا زیادہ احساس بھی افریقہ کے سفر میں ہوا۔اس لئے یہ بحث تو کتاب الجہاد سے متعلق ہونے کی وجہ سے انوارالباری کی آخری جلدوں میں آنی تھی مگر مناسب خیال کیا گیا کہ اس کی ضروری بحث وتحقیق اب ہی کردی جائے، حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ فقہاء نے دارالحرب کے مسائل بہت کم لکھے ہیں۔اس لئے ضرورت ہے کہ دورِ حاضر کے علماء ان کی تحقیق وتفصیل کی طرف توجہ کریں۔یہاں جزئیات کی تفصیل کا تو موقع نہیں ہے۔اصولی وکلی امور پر ضروری بحث پیش کی جائے گی۔و به نستعین.
سب سے پہلے یہ امر منقح کرنا ہے کہ دارالحرب ودارالاسلام کی حدود امارات کیا ہیں۔اس کیلئے ہم حضرت الاستاذ العلام شاہ صاحبؒ کی قلمی تحریر کو بھی پیش کریں گے، جو عرصہ ہوا کہ محترم حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار وجنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء نے دارالاشاعت خانقاہِ رحمانی مونگیر سے شائع کی تھی۔اس میں حضرتؒ نے پورے دلائل کے ساتھ دونوں دار کی تشریح مما لا مزید علیہ فرما دی ہے۔
دوسری اہم بات ان دونوں دار کے احکامِ شرعیہ کی ہے، اس کے لئے یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ دارالحرب کے مسائل میں سے خاص طور سے ربا اور عقودِ فاسدہ وباطلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے۔کیونکہ اس بارے میں کچھ ائمہ فقہ ایک طرف ہیں اور دوسرے دوسری طرف۔دونوں کے پاس نقلی وعقلی دلائل بھی ہیں، ان دلائل کی بہت اچھی تفصیل ووضاحت ہمارے مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ نے اعلاء السنن ص ۱۴/۲۵۴ تا ص ۱۴/۲۷۴ میں کردی ہے، اور مفصل دلائل ذکر کر کے آخر میں لکھا کہ امام اعظم ابوحنیفہ وامام محمدؒ کا فیصلہ در بارہ جوازِ ربا دارالحرب درایت وروایت کی رو سے اتنا قوی ہے جتنا کہ ہو سکتا ہے اور اس کا مبنیٰ صرف مرسل مکحول پر نہیں ہے جیسا کہ اکثر علماء ومصنفین نے خیال کر لیا ہے بلکہ اس کی صحت پر ان کے پاس بہت سے قوی وواضح الدلالۃ دلائل ہیں اور وہ دونوں امام اس مسئلہ میں تنہا بھی نہیں ہیں۔کیونکہ حضرت ابراہیم نخعیؒ بھی دارالحرب میں جوازِ ربا کے قائل ہیں اور حضرت ابن عباس بھی مولیٰ وغلام کے اندر جوازِ ربا کے قائل ہیں اور ان دونوں اماموں کی تائید وموافقت میں اپنے زمانہ کے سید المحدثین حضرت سفیان ثوری بھی ہیں اور اگر امام اعظم وامام محمدؒ کے اس مسئلہ کا ثبوت آثار واقوالِ صحابہ وتابعین سے نہ ہوتا تو حضرت سفیان اس کی تائید ہرگز نہ کرتے۔
اس کے بعد مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت تھانویؒ کے احتیاطی مسلک عدمِ جواز ربا دارالحرب کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی حمایت میں غیر ضروری حد تک بھی لکھ گئے ہیں، حتیٰ کہ ہندوستان کے دارالحرب یا دارالکفر ہونے کو بھی مشکوک سا کر دیا ہے، اس کا ازالہ حضرت شاہؒ کے ارشادات سے بخوبی ہو جاتا ہے، اور اسی لئے راقم الحروف نے پہلے لکھا تھا کہ جہاں تک حضرت شاہ صاحب کی نظر جاتی ہے دوسروں کی نہیں جاتی۔اور اس کا اعتراف خود حضرت تھانویؒ کو بھی تھا۔و للہ درہ۔
افادۂ انور: موقع کی مناسبت سے یہاں حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ بات بھی عرض کر دینا مناسب ہے کہ وہ شرعی احکام میں کتر بیونت یا اپنی طرف سے کسی مصلحت کو سوچ کر مسائل بتانے کو پسند نہ فرماتے تھے، یعنی جو شرعی حکم جس طرح بھی وارد ہے، اس کو گھٹانے بڑھانے کا حق ہمیں حاصل نہیں ہے، مثلاً ہم کسی وقتی یا زمانے کی مصلحت سے کسی مکروہ شرعی کو حرام بتانے لگیں (جیسے غیر مقلدین تمبا کو کھانے یا پینے کو بجائے مکروہ کے حرام کہتے ہیں) یا کسی مکروہ یا جائز تعظیم کو شرک کے درجے میں قرار دیں۔یا کچھ لوگ اولیاء وانبیاء علیہم السلام کی تعظیم میں افراط کرنے لگیں تو ہم ان کی اصلاح کے خیال سے ان حضرات کے لئے ایسے کلمات استعمال کریں، جن سے ان کی توہین وتنقیص ہو، مقابر کی حد سے زیادہ تعظیم کرنے والوں کے مقابلہ میں ہم مقابر کی توہین پر اتر آئیں، حتیٰ کہ قبر مقدس نبوی علی صاحبها الف الف تحیات مبارکہ کا عظیم ترین فضل وشرف بھی ہمیں ایک آنکھ نہ بھائے، اور ساری امت کے متفقہ فیصلہ کو بھی ہم رد کر دیں، غرض اسی طرح صرف اپنی

عقل وفہم ناقص پر بھروسہ کر کے ہم سینکڑوں شرعی مسائل میں ترمیم کر دیں، یہ منصب کسی بھی بڑے سے بڑے امتی کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ حد ہے کہ حضرت عمرؓ جو اس امت کے محدث تھے اور اس کا مرتبہ نبی کے بعد سب سے بڑا ہے، ان کی یہ رائے قبول نہ ہوسکی کہ عورتوں پر حجاب شخصی فرض ہو جائے۔ اور شارع علیہ السلام نے حرجِ امت کا لحاظ فرما کر ضرورتوں کے تحت حجاب و پردہ کی رعایت کے ساتھ گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ شرعی مسئلہ بے کم وکاست بتاؤ، خرابیوں کی اصلاح کے لئے جدوجہد الگ سے کرو۔ اور بعض اوقات حافظ ابن تیمیہ کی سخت گیری اور ان کے تفردات پر بڑا افسوس ظاہر کر کے فرمادیا کرتے تھے کہ شاید انہوں نے یہ خیال کرلیا تھا کہ دین میری ہی سمجھ کے مطابق اترا ہے۔

یہاں یہ بات خاص طور سے لکھنی ہے کہ دارالحرب ودارالاسلام کی الگ الگ حقیقت اور ان کے احکام جاننے کی تکلیف بھی اکثر علماء گوارا نہیں کرتے، نہ قدیم بڑی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں نہ یہ دیکھتے ہیں کہ امام اعظم اور امام محمد کا مذہب درایت وروایت کے لحاظ سے کتنا قوی ہے۔ صاحبِ اعلاء السنن کا بڑا احسان ہے کہ کافی تعداد میں نہ صرف دلائل ایک جگہ پیش کر دیئے۔ بلکہ دوسروں کے جوابات بھی مدلل لکھے۔ مگر آخر میں وہ بھی چوک گئے کہ صاحبین اور امام ابوحنیفہ میں بونِ بعید ثابت کرنے کی سعی کی جبکہ دونوں کی شرائطِ دارالحرب میں زیادہ فرق نہیں ہے، اور حضرت شاہ صاحبؒ نے اس بات کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔

پھر یہ کہ حضرت تھانویؒ کے احتیاطی مسلک کی حمایت میں صرف امام ابویوسف کی وجہ سے ترجیح پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی لکھ دیا کہ چونکہ امام شافعی وغیرہ دوسری طرف ہیں، لہٰذا خروج عن الخلاف کے لئے احسن و احوط دارالحرب میں عدمِ جواز ہی ہے۔

حالانکہ اس طرح تو ہمیں سینکڑوں دوسرے مسائل حنفیہ میں بھی امام اعظم کا اتباع ترک کر کے خروج عن الخلاف کے لئے شافعی مالکی وحنبلی مسلک اختیار کرنا احوط واحسن اور احری واذکی قرار پائے گا۔ وفیہ مافیہ۔

صاحبِ اعلاء السنن نے ص۱۴/۳۷۳ میں ایک دلیل کے تحت یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ اس کی وجہ سے ہمارے بعض اکابر نے فتویٰ دیا ہے کہ دارالحرب کے بینکوں سے مسلمانوں کا سود لینا جائز ہے۔ تاہم وہ اس کو اپنی ضرورتوں میں صرف نہ کریں اور فقراء پر صدقہ کر دیں۔

مولاناؒ نے یہاں یہ نہیں لکھا کہ ایسے مال کا صدقہ کر دینا کیا فرض کے درجہ میں ہے اور اپنی ضرورتوں میں صرف کرنا ناجائز ہے یا مکروہ؟ جب کہ وہ ص۱۴/۲۶۲ میں مبسوط وبدائع کے حوالہ سے یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمدؒ کے نزدیک دارالحرب میں جو اموال وہاں کے کفار سے حاصل ہوں وہ جائز وحلال بلا کراہت ہیں، خواہ وہ معاملات فاسدہ ہی کے ذریعے حاصل ہوں۔ تو ایسے اموال کا صدقہ ضروری کیوں ہوگا، اور اپنی ضرورتوں میں صرف کرنا ناجائز کیوں ہوگا؟ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کی فتاویٰ میں یہ بھی آچکا ہے کہ دارالحرب کے بینکوں سے حاصل شدہ رقم سے ملازمین کی تنخواہ بھی دینا جائز ہے اور اپنے صرف میں بھی لاسکتا ہے، اور ہندوستان مفتی صاحب کے نزدیک دارالحرب ہے، وغیرہ ملاحظہ ہو کفایت المفتی جلد ہفتم۔

ہم حضرت مفتی صاحبؒ کے بعض فتاویٰ بھی آگے درج کریں گے ان شاء اللہ۔ اب ہم پہلے حضرت شاہ صاحبؒ کی پوری تحقیق ان ہی کے الفاظ میں مع ترجمہ کے درج کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ بہت ہی اہم دستاویز ہے، جس کے علماء بھی محتاج ہیں راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر یہ مکمل تحقیق حضرت تھانویؒ اور مولانا ظفر احمد صاحبؒ کے سامنے ہوتی تو وہ بھی اپنی رائے میں ضرور تبدیلی لاتے۔

دارالاسلام اور دارالحرب کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی نہایت گرانقدر تحقیق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باید دانست کہ مدار بودنِ بلدۂ وملکے دارالاسلام یادارالحرب برغلبۂ مسلماناں وکفاراست وبس، لہٰذا ہر موضعیکہ مقہور تحت حکم مسلمین است آں رابلاد اسلام گفتہ خواہد شد وہر محلیکہ مقہور حکمِ کفار است دارالحرب نامیدہ خواہد شد۔

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

یہ جاننا ضروری ہے کہ کسی شہر یا ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کا مدار مسلمانوں یا کفار کے غلبہ پر ہے۔لہٰذا جو خطہ مسلمانوں کے غلبہ وتسلط میں ہوگا اس کو دارالاسلام کہیں گے اور جو کفار کے تسلط وغلبہ کے تحت ہوگا وہ دارالحرب کہلائے گا۔

قال فی جامع الرموز دارالاسلام ما یجری فیہ حکم امام المسلمین و کانوا فیہ آمنین و دارالحرب ما خافوا فیہ من الکافرین، اھ و قال فی الدرالمختار سئل قاریالہدایۃ عن البحرالملح امن دارالحرب اولاسلام؟ اجاب انہ لیس من احدالقبیلتین لانہ لاقہر لاحد علیہ آہ۔

جامع الرموز میں ہے کہ دارالاسلام وہ ہے جہاں امام المسلمین کا حکم جاری و نافذ ہو اور مسلمان وہاں مامون ومحفوظ ہوں۔اور دارالحرب وہ ہے جہاں کے مسلمان کافروں سے خوفزدہ ہوں۔در مختار میں ہے کہ بحرِ ملح (دریائے شور) کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ دارالحرب ہے یادارالاسلام؟ جواب ملا کہ وہ دونوں میں سے نہیں ہے کیونکہ اس پر کسی کا بھی تسلط وغلبہ نہیں ہے۔

غرض ازنقلِ ایں عبارت آن است کہ مدار بودنِ دارِ کفر و اسلام پرغلبۂ کفرواسلام است وبس، اگر در بحرِ ملح قولِ راجح بودن دارِ حرب باشدلکن بوجہے دیگر و ہر مقامیکہ مقہور ہر دو فریق باشد آں را بحکم الاسلام یعلو ولا یعلی ہم دارالاسلام خواہند گفت، مگر بہمین شرطِ مذکور کہ غلبہ بہ بعض وجوہ اہلِ اسلام درانجا باشد نہ آنکہ نفس مقامِ مسلمین درانجا بود یا اظہار بعض شعائر سلام بحکم کفار درانجا بودہ باشد چنانکہ غلبۂ اسلام درداربے واظہارِ شعائرِ کفر باذنِ حکام اسلام بودن راضرر نمی کند، چہ درہر دوشق غلبہ یافتہ نمے شود، وحکمِ غلبہ را است نہ نفسِ وجود وظہوررا، ازینکہ اہلِ ذمہ در دارالاسلام قیام باذنِ اہلِ اسلام مے کنند وشعائرخودرا۔

عبارتِ مذکورنقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دارِکفرواسلام ہونے کا تمام تر دارومدار کفر یا اسلام کے غلبہ پر ہے، پھر بالفرض اگر بحرِ ملح کے بارے میں غلبۂ اسلام و کفر دونوں کے ساتھ راجح شکل دارِحرب ہونے کی بھی ہے اور اسی طرح ہر وہ خطہ بھی جس پر دونوں فریق کا تسلط وغلبہ برابر کا ہو تو اس کو بھی دارالاسلام ہی کہیں گے، کیونکہ اسلام کا بول بالا ہی ہوتا ہے۔نیچا نہیں ہوتا مگر ہر جگہ یہ شرط ضرور ملحوظ رہے گی بعض وجوہ سے اہلِ اسلام کا غلبہ وہاں ضرور ہو۔صرف یہ بات کافی نہ ہوگی کہ وہاں مسلمان رہتے ہیں یا کفار کی اجازت سے وہاں بعض شعائرِ اسلام ادا کرلیتے ہیں، جس طرح کسی خطہ میں اسلام کا غلبہ وتسلط ہو اور مسلمان حاکموں کی اجازت یا غفلت سے وہاں کے کفار و اہلِ ذمہ شعائرِ کفر بجا لائیں تو وہ اس خطہ کے دارالاسلام ہونے سے مانع نہیں ہوتا۔کیونکہ دونوں صورتوں میں غلبہ نہیں پایا گیا۔جبکہ مدار غلبہ پر ہی ہے۔

ظاہر مے نمایند مگر دارِ اسلام بحالِ خود مے ماند و مسلمین در دارالحرب وکفر بامن مے روند وشعائرخود آنجا ظاہر مے کنند وایں امر دارِ کفررا رفع نمی کند۔

ظاہر ہے کہ اہلِ ذمہ کفار ومشرکین دارالاسلام میں قیام و بجا آوری شعائرِ کفر اہلِ اسلام کی اجازت سے کرتے ہیں، اور مسلمان دارالحرب میں امن وامان کی گارنٹی پر قیام و بجا آوری شعائرِ اسلام کفار کی اجازت سے کرتے ہیں اور اس طرح وہ اپنی جگہ دارالاسلام اور یہ دارالحرب ودارالکفر ہی رہتا ہے۔

نہ بینی کہ فخرِ عالم علیہ السلام بجمع کثیر در عمرۃ القضا بمکہ تشریف بردند و جماعت و نماز وغیرہ شعائرِ اسلام و عمرہ باعلان بجا آوردند و ایں قدر جمع داشتند کہ کفار را مقہور فرمانید چنانچہ بہیں قدر لشکر در حدیبیہ عزمِ تاراج کردنِ مکہ میفرمودند، مگر چوں ایں ہمہ اظہار باذنِ کفار بود دراں یوم مکہ دارالاسلام نگشت بلکہ دارالحرب ماند چرا کہ ایں قیام واظہارِ اسلام باذن بود نہ بغلبہ۔

تم نہیں دیکھتے کہ فخرِ عالم سید المرسلین علیہ السلام صحابۂ کرام کی بہت بڑی تعداد کے ساتھ عمرۃ القضا کے لئے مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ تشریف لے گئے وہاں جماعت ونماز وغیرہ شائرِ اسلام اور عمرہ علی الاعلان سب کام کئے اور اتنی تعداد بھی تھی کہ کفارِ مکہ کو مقہور و مغلوب کر سکتے تھے کہ اتنے ہی لشکر سے حدیبیہ کے موقع پر مکہ معظمہ کو فتح کرنے کا عزم بھی پہلے کر چکے تھے، مگر چونکہ یہ سب شعائرِ اسلام کی ادائیگی کفار کی اجازت سے ہو رہی تھی، اس لئے اس دن مکہ معظمہ دارالاسلام نہ بن سکا اور دارالحرب ہی رہا، کیونکہ یہ قیام و اظہارِ شعائرِ اسلام اجازت پر مبنی تھا غلبہ پر نہ تھا۔

الحاصل ایں اصلِ کلی وقاعدۂ کلیہ است کہ دارالحرب مقہورِ کفار است و دارالاسلام مقہورِ اہلِ اسلام، اگرچہ در یک دار دیگر فریق ہم موجود باشد بلا غلبہ وقہر۔

الحاصل! اس اصلِ کلی و قاعدہ کلیہ کو نظر انداز نہ کیا جائے کہ دارالحرب مقہور وزیر تسلط کفار کے ہوتا ہے اور دارالاسلام مقہور وزیر تسلط اہلِ اسلام کے ہوتا ہے۔ اگرچہ کسی ایک میں دوسرے فریق کے لوگ بھی بلا غلبہ وقہر کے موجود ہوں۔

و آں جا کہ قہر ہر دو فریق باشد آں ہم دارالاسلام خواہد بود۔

البتہ جہاں دونوں فریق کا فی الجملہ غلبہ وتسلط موجود ہو تو اس کو بھی ہم دارالاسلام ہی مانتے ہیں۔

ایں اصل را خوب ذہن نشیں باید کرد کہ جملہ مسائل از ہمیں اصل برمے آیند و ہمہ جزئیاتِ ایں باب دائر میں ہمیں اصل ہستند۔

اس اصل کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہئے، کیونکہ تمام مسائل اسی ایک اصل سے نکلتے ہیں اور اس بارے میں ساری جزئیات ایں باب دائر میں بھی اصل ہستند۔

بعد ازیں امر دیگر باید شنید کہ ہر موضعیکہ دارِ کفر بود و اہلِ اسلام براں غلبہ کردند و حکمِ اسلام دراں جاری ساختند آں را جملہ، علماء مے فرمانید کہ دارالاسلام گشت چرا کہ غلبہ وقہرِ مسلماناں یافتہ شد اگرچہ بہ بعض وجوہ غلبۂ کفار ہم دراں جا باقی باشد تاہم بحکم الاسلام یعلو الخ باتفاق دارِ اسلام شد کما وضح سابقا

اس کے بعد دوسری بات سمجھنی چاہئے کہ جو خطہ دارِ کفر تھا پھر اس پر اہلِ اسلام کا غلبہ ہو گیا اور احکامِ اسلام وہاں جاری ہو گئے تو اس کو تمام علماء دارالاسلام کہتے ہیں۔ اگرچہ وہاں ابھی کچھ وجوہ غلبۂ کفر کی بھی موجود ہوں، کیونکہ غلبہ وتسلط مسلمانوں کا ہو چکا اور بحکم "الاسلام یعلوا و لا یعلیٰ" وہ خطہ بالاتفاق دارالاسلام ہو گیا۔

باز واضح کردہ می شود کہ اگر ایں دخول و اظہارِ اسلام بغلبہ نشدہ باشد ہیچ تغیرے در دارِ حرب نخواہد افتاد ورنہ جرمن و روس و فرانس و چین و جملہ ممالکِ نصاریٰ دارِ السلام میشوند و نشانے از دارِ حرب در دنیا پیدا نخواہد شد چرا کہ در جملہ ممالکِ کفار اہلِ اسلام باذنِ کفار احکامِ اسلام جاری مے نمایند و ہذا ظاہر البطلان۔

پھر یہ بات بھی قابلِ وضاحت ہے کہ اگر مسلمانوں کا کسی ملک میں داخلہ و قیام اور اظہارِ احکامِ اسلام غلبہ کی صورت میں نہ ہو تو وہ بدستور دارِ حرب ہی رہے گا۔ ورنہ جرمنی روس، فرانس و چین اور دوسرے تمام ممالک نصاریٰ بھی سب دارِ اسلام بن جائیں گے اور دنیا میں کوئی ملک بھی دارِ حرب نہ رہے گا، کیونکہ تمام ممالک کفار میں اہلِ اسلام کفار کی اجازت سے احکامِ اسلام بجا لاتے ہیں، لہٰذا یہ بات جتنی غلط ہے وہ ظاہر ہے۔

وہر مقامیکہ دارِاسلام بود وکفار براں غلبہ کردند اگر غلبۂ اسلام بالکلیہ رفع شد آں راحکمِ دارالحرب باشد واگر غلبہ کفار متحقق گردید مگر بہ بعض وجوہ غلبۂ اسلام ہم باقی ماندہ باشد آں رادارالاسلام خواہند داشت نہ دارالحرب۔

دریں مسئلہ اتفاق است، اما اینکہ غلبۂ اسلام بالکلیہ رفع شدن راچہ حداست دراں خلاف شد درمیانِ آئمۂ ما صاحبین علیہما الرحمۃ مے فرمایند کہ اجراء احکام کفر علی الاعلان والاشتہار غلبۂ اسلام بالکلیہ رفع مے کند البتہ اگر ہردو فریق احکامِ خودرا باعلان جاری کردہ باشند غلبۂ اسلام ہم باقی است ورنہ درصورتِ اعلان احکامِ کفار وعدمِ قدرت برا جراء احکام خود بغلبۂ خود الا باذنِ کفار غلبۂ اسلام ہیچ قدر باقی نمے ماند وہوالقیاس، چراکہ ہرگاہ کہ کفار چناں مسلط گشتند کہ احکامِ کفر علی الاعلان والغلبہ جاری کردند واہلِ اسلام آں قدر عاجز ومغلوب شدند کہ احکامِ خود جاری کردن نمیتوانند وردِحکمِ کفر را کہ شین وعارِ اسلام است قدرت ندارند پس کدام درجۂ اسلام باقی است کہ آں رادارالاسلام گفتہ خواہد شد بلکہ تسلط وغلبہ بکمال کفار راشد ودارِحرب گشت بالفعل۔

جس مقام میں کہ وہ پہلے سے دارالاسلام ہو اور وہاں کفار کا غلبہ ہوجائے تو اگر اسلام کا غلبہ بالکلیہ رفع ہوجائے۔اس کو دارالحرب کا حکم دے دیا جائے گا۔اور اگر غلبۂ کفار کے ساتھ بعض وجوہ سے غلبۂ اسلام بھی باقی ہو تو اس کو ابھی دارالاسلام ہی کہیں گے دارالحرب نہیں۔

یہاں تک تو اتفاق ہے، پھر یہ کہ غلبۂ اسلام بالکلیہ رفع ہوجانے کی کیا حد ہے اس بارے میں امام ابو یوسف و امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ صرف علی الاعلان اجراءِ احکام کفر ہوجانے سے ہی غلبۂ کفر مان لیا جائے گا اور غلبۂ اسلام بالکلیہ ختم سمجھا جائے گا، البتہ اگر دونوں فریق کے احکام اعلان واشتہار کے ساتھ جاری رہیں تو غلبۂ اسلام بھی باقی رہے گا۔لیکن اگر احکامِ کفر تو اعلان وغلبہ کے ساتھ جاری ہوجائیں اور اسلامی احکام غلبہ کے ساتھ نہیں بلکہ کفار کی اجازت سے جاری رہیں اور مسلمان احکام کفر کو رد کرنے سے عاجز ہوجائیں تو ایسی صورت میں اس ملک کو دارالاسلام قرار دینا صحیح نہ ہوگا اور غلبہ وتسلط کفار مکمل ہوجانے کی وجہ سے اس کو دارِحرب ہی کہا جائے گا۔

البتہ اس معاملے میں امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اس کو دارِحرب قرار دینے میں احتیاط برتی ہے، اور دو شرطوں کا اضافہ فرمایا ہے تا آں کہ غلبۂ کفار کے مزید آثار ظاہر ہوں، یا ان کے تسلط وغلبہ میں کچھ کمزوری ایسی آجائے، جس کی وجہ سے مسلمان ان کے غلبہ کو آسانی سے ختم کرسکیں۔

چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ جب تک دو شرطیں مزید نہ متحقق ہوں۔قدیم دارالاسلام کو دارالحرب قرار نہ دیں گے

بعدازاں ہرچہ خواہد شد خواہد شد مگر الحال در دارِحرب بودن و مغلوبِ کفار شدن بظاہر ہیچ دقیقہ باقی نماندہ ومثالِ دارِقدیم مسلط علیہ کفار شدہ کما ہوالظاہر

وامام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بنظرِ خفی استحسان فرمود دراین کہ دارِ اسلام بحکمِ دارِکفر دہد احتیاط کردہ تا چیزے از آثارِ غلبہ یافتہ شود و یا دراستیلاءِ کفار دہنے محسوس گردد کہ رفع ہر مسلمانان سخت دشوار نیاید حکم بدارِحرب وکفر نباید کرد پس دو شرط زائد دیگر فرمود، یکے آنکہ آں دیہ وبلد مستوئی علیہ الکفار متصل بدارِکفر گردد چناں کہ درمیانِ ایں قریۂ مستولی علیہا ودارِحرب موضع از دارِاسلام حائل نماند کہ بایں اتصال انقطاع از دارِاسلام پیدا مے شود کہ باحرازِ کفار درآید وغلبہ و قہرِ کفار بقوت شد واستخلاص از دست کفرہ دشوار گرد ومقہوریت مسلمین سکان آنجا بکمال رسید۔

ایک شرط یہ ہے کہ جس اسلامی شہر یا ملک پر کفار کا غلبہ ہوا ہے وہ دوسرے دارِحرب وکفر سے متصل ہو کہ دونوں کے درمیان مسلمانوں کی حکومت کا کوئی شہر یا ملک حائل نہ ہو۔

کیوں کہ اس طرح دونوں دیارِ کفر کے اتصال سے معلوم ہوگا کہ کفار کا غلبہ وتسلط اتنا زیادہ قوی ومستحکم ہوگیا کہ مسلمانوں کے لئے اس کو ہٹا دینا اور ان کے تسلط کو زائل کرنا بہت زیادہ دشوار ہوگا۔

اور یہ اس صورت کی طرح ہوگا کہ کفار کے قبضہ میں مسلمانوں کا کچھ مال چلا جائے، تو وہ اگر اس مال کو اپنے ملک میں لے جائیں تو مسلمانوں کی ملکیت ختم ہوجاتی ہے، اور جب تک وہ اپنے ملک میں نہ پہنچا سکیں تو مسلمانوں کی ملکیت باقی رہتی ہے، وہ اس کو ان سے چھین سکتے ہیں۔

واین مشابہ آں است کہ اگر کفار بر حالِ مسلماناں استیلاء یافتند، اگر باحرازِ شاں برسید تملکِ اوشاں میدرآید واگر احرازِ ایشاں بدارِ خودنشدہ انقطاعِ ملک مالک مسلم نمے شود، کما ہو مقرر فی سائر الکتب۔
قال فی الہدایۃ: واذا غلبوا علی اموالنا واحرزوہا بدارِ ہم ملکوہا اھ
وقال انما غیران الاستیلا، لایتحقق الا بالاحراز بالدار لانہ عبارۃ عن الاقتدار علی المحل حالا ومآلا اھ

ہدایہ فقہ حنفی کی کتاب میں ہے کہ کفار مسلمانوں کا مال غصب کرلیں تو وہ اپنے ملک میں لے جا کر ہی مالک قرار دیئے جا سکیں گے اس کے بغیر نہیں۔

اسی طرح اسلامی شہر یا ملک بھی ہوگا کہ اگر اس پر کفار کا تسلط و غلبہ مکمل ہوگیا، جس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ خطہ دوسرے دارِ کفر سابق کے ساتھ متصل ہوگیا تو غلبۂ کفار کو مکمل کہیں گے، ورنہ وہ ابھی دار اسلام ہی کہلائے گا۔ اگر چہ اسلام کا تسلط کمزور ہی ہو چکا ہے۔ کیونکہ اسلام کا بول بالا ہی ہونا چاہئے۔ نیچا نہیں۔

پس ہم چناں اگر ارض وعقارِ بلدے مثلا مستوئی علیہ کفار شد اگر استیلاء تام گشت کہ محرز بہ بلد کفر گشت وآں احراز باتصال اوست بدار کفر وانقطاعِ او از دارِ اسلام پس مقہور ایدی کفرہ گشت، ورنہ ہنوز استیلاءِ اہلِ اسلام باقی است واگرچہ ضعیف باشد بحکمِ الاسلام آہ باید کہ دارِ اسلام بماند۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب کی اس شرط کا منشا بھی وہی اصلِ کلی ہے کہ جہاں کفار کو غلبہ اور مسلمانوں کو مغلوبیت ہو جائے گی، وہ دارِ حرب بن جائے گا دوسری شرط یہ ہے کہ جو امان حاکم اسلام نے اپنی حکومت کے غلبہ کے زمانے میں مسلمانوں کو اسلام کی وجہ سے اور رعایا کفار کو ذمی ہونے کی وجہ سے دیا تھا، وہ باقی نہ رہے۔ کہ اس کو امان دینے کے سبب سے وہ اپنی جان و مال کو محفوظ سمجھتے تھے اور کسی کی ہمت نہ تھی کہ وہ مسلمان یا ذمی کافر کی جان و مال کو کسی قسم کا بھی گزند پہنچا سکے۔

پس حاصل ایں شرط ہم ہموں غلبۂ کفار ومغلوبیۃ اہلِ اسلام است کہ اصلِ کلی اولا بیاں کردہ شد، غلبۂ حکومت خود مسلماناں رابسبب اسلام وکفار رعایا رابوجہ عقدِ ذمہ دادہ بود مرتفع گردد کہ باں اماں کسے برنفس وجان ومالِ خود مامون نماند

جبکہ یہ بات صرف غلبۂ قوت وشوکتِ حاکمِ اسلام کی وجہ سے تھی اور پھر وہ ختم ہوگئی اور دوسرے غلبہ کرنے والے کفار ومشرکین کی امان دہی پر موقوف ہوگئی۔

یعنی چناں کہ بسبب امن دادن حاکمِ اسلام ہمہ ماموں شدہ بودند کہ کسے را بسبب خوفِ حاکم آں مجال نبود کہ تعرض بجان و مال مسلم وذمی نماید واین نبود مگر بسبب غلبۂ قوت وشوکتِ حاکم مسلم۔

پس ظاہر ہے کہ حاکمِ مسلم کے امن دینے کی وجہ سے جب تک ایذا دینے والوں پر رعب و دہشت طاری رہے گی۔ کسی حد تک مسلمانوں کی شوکت وغلبہ کا وجود رہے گا، اور جب وہ چیز باقی نہ رہے گی، اور کفار ومشرکین کا پورا تسلط ہو جائے گا، تو پہلا امان مسلم حاکم کا بالکل ختم ہو جائے گا۔

پس ایں امان باقی نماند کہ کسے بوجہ ایں امان بے خدشہ از تعرضِ جاں ومالِ خود مامون نبود بلکہ ایں امان بے کار محض گردد، وامانیکہ مشرکین مستومین دادند آں موجبِ امن گردد۔

لہٰذا امام اعظمؒ کے نزدیک بھی اجراء احکام کفر علی الاشتہار کے بعد یہ دو شرطیں پائی جانے پر کفر کا غلبہ مکمل طور سے ثابت ہو جائے گا۔ اور غلبۂ اسلام بالکلیہ ختم ہو جائے گا تو اب ضرور ہی اس خطہ کو دار الحرب ماننا پڑے گا۔

پس ظاہراست کہ تابسبب امنِ حاکم مسلم خوف موذی راخواہد بود غلبہ وشوکتہ امنِ مسلم بنوعے باقی خواہد ماند وہرگاہ کہ آں چیزے نماند بلکہ امنِ مشرک متسلط محل نظر گردد، امانِ اول رفع خواہد شد۔

پس نزدِامام علیہ الرحمۃ ہرگاہ بعداجراء حکم علی الاشتہار ایں دوشرط یافتہ شود غلبۂ کفر من کل الوجوہ ثابت شد وغلبۂ اسلام من کل الوجوہ رفع گردید، اکنوں بدارِحرب ناچار حکم خواہد شد۔

اہلِ دانش رازیں معلوم مے شود کہ مدارِایں قول ہم برقہر وغلبہ امت وبس کہ اول دراصل کلی واضح کردہ شد۔

بعدازیں تقریرروایاتِ فقہاء راباید شنید کہ بنقل بعض آں سندِ تقریرایں بندہ حاصل خواہد شد وبداں بعض حالِ کل روایات ایں باب واضح گردد،

قال فی العالمگیریۃ قال محمد فی الزیادات انما یصیر دارالاسلام دارالحرب عند ابی حنیفہؒ بشروط احدہا اجراء احکام الکفر علی سبیل الاشتہار وان لا یحکم فیہا بحکم الاسلام، الثانی ان تکون متصلۃ بدارالحرب لا یتخلل بینہما بلدۃ من بلادالاسلام، الثالث ان لا یبقی مسلم او ذمی آمنا بامانہ الاول الذی کان ثابت قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامہ والذمی بعقد الذمۃ۔

وصورۃ المسئلۃ علی ثلثۃ اوجہ اما ان یغلب اہل الحرب علی دارمن دورنا او یارتد اہل مصروغلبوا واجروا احکام الکفر او ینقض اہل الذمۃ العہد وتغلبوا علی دارہم، ففی کل ہذہ الصور لا یصیر دارالحرب الا بثلاث شرائط وقال ابویوسفؒ ومحمدؒ بشرط واحد وہواظہاراحکام الکفر وہوالقیاس اھ

قال فی جامع الرموز فاما صبرورتہا دارالحرب فعندہٗ بشرائط احدھا اجراءاحکام الکفر اشتہارا بان یحکم الحاکم بحکمہم ولا یرجعون الی قضاۃ المسلمین کمافی الحرہ والثانی الاتصال بدارالحرب بحیث لا یکون بینہما بلدۃ من بلادالاسلام مایلحقہ المدد منہا الخ

اہل دانش جانتے ہیں کہ امام صاحب کے اس قول کا بھی دارومدار قہر وغلبہ اور تسلط کامل ہی کی صورت بتارہا ہے جو صاحبین کی بیان کردہ اصل کلی کا بھی منشا ہے۔

اس کے بعد روایاتِ فقہا دیکھی جائیں تو ان سے بھی تحقیق مذکور کی ہی تائید ووضاحت حاصل ہوگی۔

فتاوے عالمگیری میں ہے: امام محمدؒ نے زیادات میں فرمایا کہ امام صاحب کے نزدیک دارالاسلام اس وقت دارالحرب بن جائے گا کہ چند شرطیں پائی جائیں۔

ایک اجراءِ احکام کفر علی الاشتہار اور یہ کہ وہاں اسلامی احکام نافذ نہ رہیں۔

دوسری یہ کہ وہ شہر یا ملک کسی دارالحرب (ملکِ کفار) سے متصل ہو کہ دونوں میں کوئی اسلامی شہر یا ملک حائل نہ ہو۔

تیسری یہ کہ دارِاسلام کے زمانۂ حکومت اسلامی کا امان وعہد جو تسلطِ کفار سے قبل کا تھا، وہ باقی نہ رہے اور اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو اہلِ حرب باہر کے آکر ہمارے دارِاسلام پر غالب ومسلط ہوجائیں۔ یا خود اسی شہر یا ملک کے لوگ مرتد ہوکر تسلط حاصل کرلیں اور احکام کفر جاری کردیں۔

یا اہلِ ذمہ کفار بدعہدی کرکے اس ملک پر غالب ہوجائیں۔ ان تمام صورتوں میں امام صاحب کی رائے تو یہ ہے کہ وہ ملک بغیر مذکورہ تینوں شرطوں کے دارالحرب نہ بنے گا اور امام ابویوسف وامام محمدؒ صرف ایک شرطِ مذکور پر ہی دارالحرب بن جانے کا فیصلہ کرتے ہیں اور یہی بات قرینِ قیاس ہے۔

''جامع الرموز'' میں اس طرح لکھا ہے کہ سابق دارالاسلام کو دارالحرب جب کہیں گے کہ تین شرطیں پائی جائیں ایک اجراءِ حکمِ کفر اشتہاراً کہ وہاں صرف کفار کا حکم چلے اور قضاۃِ مسلمین کی طرف لوگ رجوع نہ کریں جیسا کہ حرہ میں ہے، دوسرے دارالحرب سے اتصال، کہ دونوں کے درمیان کوئی شہر بلادِاسلام کی حکومت والا نہ ہو، جس سے مسلمانوں کو مدد ونصرت مل سکے۔ الخ

ازیں روایتِ جامع الرموز دوامر معلوم وواضح شد یکے آنکہ مراداز اجراء احکامِ اسلام اظہار حکم اسلام است علیٰ سبیل الغلبۃ نہ مطلق اداءِ جماعت وجمعہ مثلاً چراکہ مے گوید تحکم بحکم ولا یرجعون الیٰ قضاۃ المسلمین، یعنی قضاۃِ مسلمین راہیچ شوکت ووقعت نماند کہ بایشاں رجوع کردہ شود۔

''جامع الرموز کی عبارتِ مذکور سے دوامر واضح ہوئے، ایک یہ کہ اجراءِ احکام اسلام سے مراد اظہارِ احکامِ اسلام بطور غلبہ ہے، نہ صرف اداءِ جماعت و جمعہ مثلاً کیونکہ اس میں احکامِ کفر جاری ہونے اور قضاۃ کی طرف رجوع نہ کرنے کی بات کہی گئی، یعنی قضاۃ مسلمین کی کوئی شوکت ووقعت باقی نہ رہے جس کی وجہ سے لوگ انکی طرف رجوع کرتے اور احکام اسلام کے مطابق قضاءِ شرعی چاہتے۔

وہمچناں از حکم مسلمین ودارالحرب حکم بغلبہ کردن مراداست کما ہو لظاہر بہرحال حکمِ اسلام وحکم کفر ہر دو علیٰ سبیل القوۃ والغلبۃ مراد است نہ محض اداء باظہار

اسی طرح دارالحرب میں بھی حکمِ مسلمین سے مراد حکم بطور غلبہ و شوکت کے ہی مراد ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔ یعنی دونوں جگہ قوت و غلبہ ہی مراد ہے۔ محض ادائیگی احکام مقصود نہیں ہے

دوم اینکہ غرض از شرطِ اتصال وانقطاع ہموں قوۃ است کہ در صورتِ اتصال بدارے مدد بقریۂ معلومہ می رسد بخلاف صورتِ انقطاع از دارِ حرب کہ طوقِ مدد مے تواند۔ پس ہنوز قوۃِ اسلام باقی است

دوسرے یہ کہ شرطِ اتصال وانقطاع سے بھی وہی قوت مقصود ہے کہ بہ صورتِ اتصال دارالحرب، تسلط شدہ خط کو کوئی مدد نہیں مل سکتی، جس سے معلوم ہوا کہ ابھی ایک حد تک قوتِ اسلام باقی ہے۔

وفی خزانۃ المفتیین دارالاسلام لایصیر دارالحرب الا باجراء احکام الشرک فیہا وان تکون متصلاً بدارالحرب لا یکون بینہا وبین دارالحرب مصر آخر للمسلمین وان لا یبقی فیہا مسلم او ذمی آمنا علے نفسہ الا بامان المشرکین اھ

خزانۃ المفتیین میں ہے کہ دارالاسلام دارالحرب نہ بنے گا مگر بسبب اجراء احکام شرک کے، اور بوجہ اتصالِ دارالحرب کے، کہ دونوں میں مسلمانوں کا کوئی شہر فاصل نہ ہو، اور اس وجہ سے کہ وہاں کوئی مسلمان یا ذمی بغیر امان مشرکین کے مامون نہ ہو۔

وفی البزازیۃ قال السید الامام البلاد التی فی ایدی الکفرۃ الیوم لاشک انہا بلاد الاسلام بعد لانہ لم یظہر فیہا احکام الکفرۃ بل القضاۃ مسلمون اھ

''بزازیہ'' میں ہے کہ سیدنا الامام الاعظمؒ نے فرمایا: جو بلاد آج کفار کے قبضہ وتسلط میں ہیں، وہ سب اب بھی بلاشک بلادِ اسلام ہی ہیں کیونکہ ان میں کفار کے احکام نافذ نہیں ہیں بلکہ فیصلہ کرنے والے قاضی سب مسلمان ہیں۔

پس باید دید کہ دلیل بودن آں بلاد بلادِ اسلام مے آرد بقولہ بل القضاۃ مسلمون کہ حکمِ حکامِ اسلام برطورِ اول باقی است ونمی گوید کہ لان الناس یصلون ویجمعون، چراکہ مراداز اجراء حکم، اجراء حکم بطور شوکۃ وغلبہ است نہ اداءِ مراسم دین خود برضاء حاکم غالب۔

لہٰذا دیکھنا چاہئے کہ ان شہروں کے بلادِ اسلام ہونے کی دلیل یہی دی ہے کہ وہاں مسلمان قاضیوں کے فیصلے چلتے ہیں۔ گویا مسلمان حاکموں کے حکم سابقہ طریقہ پر ہی باقی ہیں، یہ نہیں کہا کہ وہاں لوگ نمازیں پڑھتے ہیں اور جمعہ قائم کرتے ہیں کیونکہ اجراء حکم سے مراد اجراء احکام بطور شوکت اور غلبہ کے ہے، صرف اداء مراسم دین، حاکم غالب کافر کی رضا واجازت سے مراد نہیں ہے۔

در درِ مختار مے گوید فی معراج الدرایۃ عن المبسوط البلاد التی فی ایدی الکفار بلاد الاسلام لا بلاد الحرب، لانہم لم یظہروا فیہا حکم الکفر بل القضاۃ والولاۃ مسلمون یطیعونہم عن ضرورۃ او بدونہا۔

''درمختار'' میں ہے کہ معراج الدرایہ میں مبسوط سے نقل کیا گیا جو بلادِ کفار کے قبضہ میں چلے گئے ہیں وہ اب بھی بلادِ اسلام ہی ہیں بلادِ حرب نہیں، کیونکہ ان میں حکم کفر غالب نہیں ہوا بلکہ قاضی و والی مسلمان ہی ہیں جن کی اطاعت وہ تسلط کرنے والے کفار بھی کرتے ہیں ضرورت سے یا بلاضرورت کے۔

وکل مصر فیہ وال من جہتہم یجوزلہ، اقامۃ الجمع والاعیاد والحد ودو تقلید القضاۃ لاستیلاء المسلم علیہم۔
فلوالولاۃ کفار ایجوز للمسلمین اقامۃ الجمعۃ ویصیر القاضی قاضیا براضی المسلمین ویجب علیہم ان یلتمسو اوالیا مسلما اھ

اور ہر شہر میں ان کی طرف سے والی مقرر ہوتا ہے جو جمعہ عید و حدود قائم کرے اور لوگ قضاء کی بات بھی اسی لئے مانتے ہیں کہ ان پر والی مسلمان ہوتا ہے، اور بالفرض کہیں والی بھی کفار ہوں تب بھی مسلمانوں کو اقامت جمعہ کی اجازت ہوتی ہے اور قاضی کا تقرر بھی مسلمانوں کی رائے سے ہوتا ہے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنا والی بھی مسلمان ہی تلاش کریں۔

وفیہ ایضا قلت وبہٰذا یظہر ان مافی الشام من جبل تیم اللہ وبعض البلاد التابعۃ لہا کلہا بلاد الاسلام لانہا وان کان لہا حکام درز او نصاری ولہم قضاۃ علے دینہم وبعضہم یعلنون بشتم الاسلام لکنہم تحت حکم ولاۃ امورنا وبلاد الاسلام محیطۃ ببلادہم من کل جانب واذا اراد الوالامر تنفیذ احکامنا فیہم نفذ ہا۔

پھر یہ لکھا کہ میں کہتا ہوں کہ اس سے ظاہر ہوا کہ شام میں جو جبل تیم اللہ اور اس کے تابع بعض بلاد ہیں وہ سب بلادِ اسلام ہیں۔ کیونکہ اگرچہ وہاں درزی حکام یا نصاریٰ ہیں اور ان کے دین کے مطابق بھی فیصلے دینے والے مقرر ہیں اور بعض لوگ ان میں سے اسلام کے خلاف بھی بکواس کرتے ہیں مگر وہ سب بھی ہمارے مسلمان والیوں کے ماتحت ہیں۔ اور ان کے بلاد کو بلادِ اسلام ہر جانب سے احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اور جب بھی وہاں کے اولوالامر میں سے کوئی بھی ہمارے اسلامی احکام ان میں نافذ کرنا چاہے تو وہ نافذ کر دیتا ہے۔

ازیں ہر دو روایت واضح شد کہ برائے بقاءِ دارالاسلام بعد غلبۂ کفار بقاءِ قوۃ وشوکتِ حکام اسلام وانفاذِ امور بقوتہ وغلبہ مراد مے شود وہمچناں در دارِ حرب اجراءِ حکم اسلام اگر بقوت باشد رفعِ دار حرب میشود، نہ اداء محض شعائرِ اسلام باذن ورضاء حاکم حاکم مخالف دین۔

ان دونوں عبارتوں سے واضح ہوا کہ بعد غلبۂ کفار بقاءِ دارالاسلام کیلئے بقاءِ قوت وشوکتِ حکامِ اسلام اور بقوتِ وغلبہ احکام اسلام نافذ کر سکنے کی پوزیشن موجود ہونا ضروری ہے، اور اسی طرح دارِحرب (کافروں کے ملک) میں بھی اگر بقوت وغلبہ اجراءِ احکام اسلام ہو سکے تو وہ دارِحرب نہ رہے گا لیکن محض اداءِ شعائرِ اسلام جو حاکم مخالف دینِ اسلام کی رضا واجازت سے ہو تو وہ کافی نہیں۔

الحاصل غرض ازیں شروطِ ثلثہ نزد امام واز شرط کہ اجراء حکم اسلام است نزد صاحبین ہموں وجود غلبہ وقوتِ اہلِ سلام مراد است اگرچہ بہ بعض وجوہ باشد وکسے از اہل فقہ نمی گوید کہ در ملکِ کفار اگر کسے باذن ایشان صراحۃ یا دلالۃ اظہار شعائرِ اسلام کند آں ملک دار اسلام مے شود، حاشا وکلا کہ ایں دور از تفقہ است۔

الحاصل: امام صاحب کی تینوں شرائط اور صاحبین کی شرطِ واحد اجراء احکامِ اسلام کا مقصد صرف ایک ہی ہے کہ وجود غلبہ وقوتِ اہل اسلام کا مراد ہے۔ اگرچہ وہ بعض وجوہ سے ہی ہو۔ اور اہلِ فقہ میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ ملکِ کفار میں اگر کوئی مسلمان ان کی اجازت سے شعائرِ اسلام ادا کرے تو وہ دارِ اسلام ہو جائے گا، حاشا وکلا کہ یہ بات تفقہ سے دور ہے۔

چوں ایں مسئلہ منقح شد اکنوں حالِ ہندرا خود بخود فرمایند کہ اجراءِ احکامِ نصاریٰ دریں جا بچہ قوت وغلبہ است کہ اگر ادنیٰ کلکٹر حکم کند کہ در مساجد نمازِ جماعت اداء نہ کنید ہیچ کس از غریب وامیر قدرت نہ دارد کہ اداءِ آں نماید۔

ہندوستان دارالحرب: جب یہ مسئلہ منقح ہو گیا تو اب ہندوستان کا حال تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ یہاں احکام نصاری کس قدر قوت و غلبہ کے ساتھ نافذ ہیں کہ اگر ایک ضلع کا حاکم کلکٹر حکم کر دے کہ مساجد میں نمازِ جماعت ادا نہ کی جائے تو کسی غریب یا امیر مسلمان کی ہمت نہیں کہ اس کو ادا کر سکے۔

وایں اداءِ جمعہ وعیدین وحکم بقواعدِ فقہ کہ مے شود محض با قانونِ ایشان است کہ در رعایا حکم جاری کردہ اند کہ ہر کس بحب دینِ خود کند، سرکار، باوے مزاحمت نیست دامن سلاطین اسلام کہ بود ازاں نامے ونشانے نماندہ۔

اور یہ جو اداء جمعہ وعیدین اور قواعد فقہ کے مطابق حکمِ شرعی ہم بجالاتے ہیں۔ یہ سب محض ان کے اس قانون کی وجہ سے ہے کہ اپنی رعایا کے لئے انہوں نے نافذ کیا ہے کہ ہر ایک کو اپنے دین پر چلنے کی اجازت ہے اور جو امن سلاطین اسلام نے دیا تھا اس کا تو نام ونشان بھی باقی نہیں رہا ہے۔

کدام عاقل خواہد گفت کہ امنیکہ شاہ عالم دادہ، بود، اکنوں بھوں امن مامون نشستہ ایم، بلکہ امن جدید از کفار حاصل شدہ، وہ بھوں امنِ نصاریٰ جملہ رعایا قیام ہند مے کنند۔

کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ جو امن شاہ عالم نے دیا تھا، وہ اب بھی باقی ہے۔ اور ہم اسی کے ماتحت مامون بیٹھے ہیں، بلکہ دوسرا امن جدید کفار سے حاصل ہوا ہے اور اسی امنِ نصاریٰ کی وجہ سے سب رعایا یہاں رہتی ہے۔

واما اتصال پس آں در ممالک واقلیم شرط نیست بلکہ در قریہ وبلدہ ایں شرط کردہ اند کہ مدد رسیدن ازاں مراد ومقصود است وکسے مے تواند گفت کہ اگر مددِ کابل یا شاہ روم آید کفار را از ہند خارج کند حاشا وکلا۔

رہا اتصال کا معاملہ تو وہ ممالک واقالیم میں شرط نہیں ہے بلکہ قریہ وبلاد کے لئے ہے کہ اس سے مدد حاصل ہونی مراد ومقصود ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر کابل سے یا شاہِ روم (ترکی) سے مدد آجائے تو کفار کو ہندوستان سے نکالا جاسکتا ہے، حاشا وکلا!

بلکہ اخراجِ ایشاں بغایت صعب ہست جہاد وجنگ سامان کثیر مے خواہد۔

بلکہ ان کا نکالنا نہایت دشوار ہے، جہاد وجنگ کے لئے بہت زیادہ سامان درکار ہے۔

بہر حال! تسلطِ کفار بر ہند بداں درجہ است کہ در ہیچ وقت کفار را بر دارِ حرب زیادہ نبود واداءِ مراسمِ اسلام از مسلمانانِ محض باجازت ایشاں است۔

بہر حال! ہندوستان پر کفار کا تسلط وغلبہ اس درجہ کا ہے کہ کبھی کسی وقت بھی کفار کا غلبہ کسی دارِ حرب پر اتنا نہیں ہوا ہے اور مراسمِ اسلام کی ادائیگی مسلمان صرف ان کی اجازت کے تحت کرتے ہیں

واز مسلمان عاجز تریں رعایا کسے نیست ہنوز را ہم قدرے رسوخ است، مسلمانانِ را نیست، البتہ در رام پور وٹونک وبھوپال کہ حکام آنجا باوجود مغلوب بودن از کفار، احکامِ خود جاری دارند، دارِ اسلام تواں گفت چنانچہ از روایات رد المختار مستفاد مے شود واللہ اعلم وعلمہ احکم۔

اور مسلمانوں سے زیادہ عاجز ترین رعایا کوئی دوسری نہیں ہے، ہندوؤں کو بھی کچھ عزت ورسوخ حاصل ہے مسلمانوں کو وہ بھی نہیں ہے۔ البتہ رام پور، ٹونک، بھوپال کہ وہاں کے والیاں باوجود کفار سے مغلوب ہونے کے بھی اپنے اسلامی احکام جاری کر لیتے ہیں، ان کو دارِ اسلام کہہ سکتے ہیں جیسا کہ ردالمختار کی روایات سے مستفاد ہوتا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ احکم۔

لمحۂ فکریہ: حضرت اقدس شاہ صاحبؒ کی فارسی تحریر مذکور کتب خانہ رحمانی مونگیر میں محفوظ ہے اور محترم مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیرِ شریعت بہار دام فیوضہم نے اس تحریر کا عکس (فوٹو) ۱۳۸۲ھ میں اپنی تقریب کے ساتھ بڑے اہتمام سے عمدہ کاغذ پر طبع کرا کر شائع فرمادیا تھا۔ جزاھم اللہ خیرا۔

اس طرح حضرتؒ کی ایک نہایت قیمتی اور قلمی یادگار نورِ بصیرت وبصارت بنی تھی، احقر نے اس تحریر کا ذکر اور خلاصہ انوار الباری جلد اول کے (جدید ایڈیشن) کے آخر میں کیا تھا، اور تمنا تھی کہ اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوجائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اتنے عرصے کے بعد اب اس

کے ترجمہ کی توفیق بھی میسر ہوگئی (یہ تحریر تقریباً ۱۹۲۲ء کی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم)۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا دارالحرب و دارالاسلام کے بارے میں ہمارے بہت سے علماء اور مفتیانِ کرام کا مطالعہ بھی بہت کم ہے، اسی لئے وہ کوئی منقح بات نہیں بتا سکتے، اور اس دفعہ افریقہ کے سفر میں جب متعدد احباب نے اس بارے میں تحقیق و تنقیح چاہی تو تو اس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ یہاں لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ہم نے ''نطقِ انور'' (مجموعۂ ملفوظات حضرت علامہ کشمیریؒ) میں ص ۱۴۶ تا ص ۱۶۶ اچھا مواد جمع کر دیا تھا اور اس میں علامہ مودودی و علامہ مناظر احسن گیلانی کی تحقیق و نقد کا بھی کچھ ضروری حصہ آ گیا تھا، اس کا بھی مطالعہ کر لیا جائے۔ تاہم اس کا بھی وہ حصہ جو حضرت شاہ صاحبؒ سے متعلق ہے، یہاں پیش کرتے ہیں۔

حضرتؒ نے اپنے خطبۂ صدارت جمعیۃ علماء ہند (منعقدہ پشاور، دسمبر ۱۹۲۷ء میں ارشاد فرمایا۔

ہمارے علماءِ احناف نے اسی معاہدۂ متبرکہ (معاہدۂ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم با یہودِ مدینہ) کو سامنے رکھ کر دارالحرب اور دارالامان کے بہت سے احکام و مسائل اخذ کئے ہیں۔

(۱) دارالاسلام اور دارالحرب کا شرعی فرق

فقہاءِ احنافؒ نے دارالحرب میں عقودِ فاسدہ کے جواز کا حکم دے کر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ دارالحرب اور دارالاسلام کے احکام میں بہت فرق ہے، عقودِ فاسدہ کے جواز کی اصل ان کے نزدیک یہ آیت کریمہ[۱] ہے۔ **فان کان من قوم عدولکم وھو مومن فتحریر رقبة** (یعنی اگر کسی مسلمان کے ہاتھ سے کوئی ایسا مسلمان مقتول ہو جائے جو دارالحرب میں رہتا تھا اور اس نے ہجرت نہیں کی تو اس قتل پر کفارہ واجب ہوگا، دیت واجب نہ ہوگی)۔

(۲) عصمت کی دو قسمیں

اس مسئلہ کی اصل یہ ہے کہ اسلام کی وجہ سے اسلام لانے والے کی جان و مال معصوم و محفوظ ہو جاتے ہیں، مگر عصمت کی دو قسم ہیں، ایک عصمت مؤثمہ یعنی ایسی عصمت جس کے توڑنے والے پر گناہ تو ہوتا ہے مگر کوئی بدل واجب نہیں ہوتا، دوسری عصمتِ مقومہ ہے جس کے توڑنے والے پر اس کا بدل بھی واجب ہو جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دارالحرب میں رہنے والے مسلمانوں کی جانیں عصمتِ مقومہ نہیں رکھتیں، کیونکہ اس کے لئے دارالاسلام اور حکومت و غلبہ و شوکتِ اسلامی ہونا شرط ہے۔

حضرتؒ نے لکھا کہ میرا مقصد اس بحث کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ دارالحرب کے احکام کا فرق واضح ہو جائے اور مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ دارالحرب میں رہ کر اپنے ہم وطن غیر مسلموں سے مذہبی رواداری اور تمدنی و معاشرتی مصالح پر نظر کر کے باہمی خیر سگالی کے جذبہ کے تحت صلح و معاہدہ کر سکتے ہیں، جس پر دونوں قومیں صدق دل سے عمل کریں، تا کہ وہ کسی ظلم و تعدی کا شکار نہ ہوں اور اس طرح وہ معاہدہ کی رعایت کریں گے تو بیرونِ ملک کے مسلمانوں کو دراندازی کا موقع بھی حاصل نہ ہوگا نہ ان کو ایسا چاہئے۔ حضرتؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں

---

[۱] تفسیر مظہری ص ۱۹۲/۲ تفسیر سورۂ نساء (مطبوعہ جید پریس دہلی میں ہے کہ اس قتل مسلم خطاء میں صرف کفارہ لازم ہوگا۔ کیونکہ اس مقتول مسلم کو اسلام کی وجہ سے عصمتِ مؤثمہ حاصل تھی، لیکن دیت واجب نہ ہوگی جو عصمت مقومہ کے سبب ہوتی، اور دارالاسلام میں رہنے والوں کے لئے خاص ہے۔ وہ یہاں نہیں پائی گئی کیونکہ وہ دارالحرب کا ساکن تھا۔

جہاں دارالحرب (مثلاً ہندوستان) میں قوموں کا باہمی معاہدۂ امن وصلح کر لینا ضروری قرار دیا ہے، وہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر اس دارالحرب میں دفاع کی ضرورت پیش آئے، تو مسلمانوں کو اس میں بھی برادرانِ وطن کے ساتھ تعاون کرنا ضروری ہے، یہاں تک کہ اگر ان کا باہمی معاہدہ مضبوط ومستحکم ہو اور اس پر سب عامل ہوں تو باہر کے مسلمانوں کو بھی یہاں کے مسلمانوں کے معاملات میں دراندازی نہیں کرنی چاہئے۔

ظلم کی صورت

البتہ حضرت شاہ صاحبؒ نے مشکلات القرآن ص۱۹۰ میں آیت نمبر ۷۲، (انفال) **وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر** کی تفسیر میں کتب تفسیر کے حوالہ سے فرمایا کہ اس آیت میں جو یہ حکم ہے کہ دارالحرب کے مسلمان اپنے معاملات میں دارالاسلام کے اعیان وعوام سے مدد طلب کریں تو انہیں مدد کرنی چاہئے بجز اس صورت کے کہ ان دونوں ملکوں میں کوئی باہمی معاہدہ ناجنگ وغیرہ کا ہو چکا ہو، لیکن اس سے ظلم والی صورت[1] مستثنیٰ ہے، کیونکہ اسلام میں مظلوم کی امداد بہرحال ضروری ہے، خواہ وہ کوئی بھی انسان ہو اور کہیں بھی ہو اور خواہ دارالاسلام کے اندر ہی کچھ مسلمان ہی دوسرے مسلمانوں یا اہل ذمہ کفار پر ظلم کریں تو ان مظلوموں کی امداد بھی ضروری وواجب ہے۔

دارالحرب ودارالامان

فقہاء نے دارالحرب ہی کی ایک قسم دارالامان بھی لکھی ہے۔ جیسے انگریزی دور میں ہندوستان تھا۔ اس کے مقابلہ میں دارالخوف ہے، جہاں مسلمانوں کو پوری طرح جان ومال، عزت ومذہب کا تحفظ بھی میسر نہ ہو حضرت شاہ صاحبؒ کے خطبۂ صدارت میں اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

افادۂ مزید: حضرت شاہ صاحبؒ نے درسِ ترمذی شریف دارالعلوم دیوبند باب **لا تفادی جیفۃ الاسیر** میں فرمایا: صاحبِ فتح القدیر شیخ ابن ہمامؒ نے ربوا کی بحث میں فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں کافر کے ہاتھ خمر وخنزیر کی بیع کرے تو اس کی قیمت حلال ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک ربو دارالحرب میں جائز ہے، ان کے پاس اس کی دلیل مشکل الآثار طحاوی کی حدیث ہے اور اس کی فقہی وجہ بھی ہے۔ البتہ شیخ ابن ہمام نے ایک کمی کہ خبث کی اقسام کو واضح نہیں کیا، جبکہ ہمارے یہاں اس کی کئی قسم ہیں، اور خبث الکسب ان میں سے سب سے بدتر ہے، جو خمر وخنزیر کے لین دین اور ان کے کاروبار کی شکل میں ہوتا ہے اور وہ خود حرام ہے، اور ان کا عوض بھی خبیث ہے، چنانچہ دارالاسلام میں تو انکی بیع کافر کے ساتھ بھی جائز نہیں اگرچہ **تراضی طرفین** سے ہو کیونکہ شریعت ایسے عقدِ فاسد کو بطریق نیابت فسخ کر دیتی ہے، البتہ دارالحرب میں (جہاں نہ شریعت کا عمل دخل ہے اور نہ وہ وہاں تائب ہے) اگر مسلمان ان کی بیع کر کے قیمت بھی دارالحرب میں ہی وصول کرے تو وہاں اس میں نہ سبب کی خباثت ہوگی نہ عوض کی۔ اس لئے اس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ ایک خبثِ سبب ہوتا ہے، جیسے چوری، لوٹ، غصب وغیرہ کی اس کی اجازت کفار کے ساتھ دارالحرب میں بھی نہیں ہے۔ اسی لئے وہاں صرف تراضی طرفین ہی کے تحت تمام معاملات جائز قرار دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ وہاں ان کے اموال فی نفسہ مباح ہیں۔ اور ان کی جانیں پھر بھی کسی طرح مباح الدم نہیں ہیں۔ یہاں سے ایک وجہ اور بھی دارالحرب ودارالاسلام میں فرق کی معلوم ہوئی، یعنی شریعتِ اسلامیہ کا تائب ہونا یا نہ ہونا۔

نطق انور ص۱۴۶ میں احقر نے حضرت شاہ صاحبؒ کے اس ارشاد گرامی کا ذکر بھی کیا تھا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور اس میں کفار سے ذریعہ عقود وفاسدہ وعقودِ باطلہ جو بھی منافع حاصل ہوں وہ جائز ہیں۔

حضرت مدنیؒ کے ارشادات

اس میں شک نہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کسی جگہ کسی وقت بھی سود لینا جائز نہیں ہے لیکن امام صاحب فرماتے ہیں کہ مسلم اور حربی

---

[1] اس بارے میں صاحبِ تفہیم القرآن سے مسامحت ہوئی ہے کہ ظلم والی صورت کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ (مؤلف)

میں سود کا وجود ہی نہیں ہوتا، وہ یہ نہیں فرماتے کہ سود جائز ہے، بلکہ سود کی اس معاملہ میں نفی کرتے ہیں، (یعنی حدیث شریف کی وجہ سے اس کو ناجائز سود کے مصداق سے خارج قرار دیتے ہیں) مکتوبات شیخ الاسلام ص ۱/۲۰)۔

(۷) ہندوستان دارالحرب ہے، وہ اس وقت تک دارالحرب رہے گا، جب تک اس میں کفر کو غلبہ حاصل رہے گا، دارالحرب کی جس قدر تعریفات کی گئی ہیں اور جو شروط بیان کی گئی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں، الخ۔

(۸) دارالحرب میں غدر اور خیانت کے سوا ہر طریقہ سے اہلِ حرب سے اموال حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے مباح ہے، اس لئے کہ دارالحرب میں مسلمانوں اور حربی کے درمیان معاملۂ سود پر سود کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ (الخ) مکتوبات شیخ الاسلام ص ۲/۱۲۳)

مکتوب مذکور ۶۶ھ کا اور بہت طویل ہے اس کے سب اجزاء قابلِ مطالعہ ہیں۔ پھر ۱۳۷۰ھ کے ایک مکتوب میں ارشاد فرمایا کہ ہندوستان میں جب سے اقتدارِ اسلام ختم ہوا جب ہی سے دارالحرب ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اپنے زمانہ ۱۸۰۳ء میں دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا اور ہمارے اکابر بھی اسی وقت سے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیتے رہے۔ اور آج بھی وہی حال ہے۔ جمعہ دارالحرب میں یقیناً ہوتا ہے اور فرض ہے، جیسا کہ آپ انگریزی زمانے میں پڑھتے رہے۔ الخ (رر ص ۲/۲۵۱)

حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کا فتویٰ

نمبر ۴۲: سرکاری بینک کی ملازمت اس حیثیت سے کہ اس میں سودی کاروبار ہوتا ہے ناجائز نہیں ہے کیونکہ بحالتِ موجودہ گورنمنٹ برطانیہ محارب اور ہندوستان دارالحرب ہے اور اس میں گورنمنٹ سے سود لینا ناجائز نہیں ہے۔ (کفایت المفتی ص ۸/۵۷)۔

نمبر ۴۹: سودی رقم مسلمان محتاج کو دینا اور مسلمان قرضدار کے قرضہ میں دنیا اور غیر مسلم محتاج کو دینا جائز ہے۔ انشورنس سے ملی ہوئی رقم پسماندوں کو اپنے خرچ میں لانا بھی درست ہوگا۔ (رر ص ۸/۶۱)

نمبر ۵۴: ڈاکخانے سے جمع شدہ رقم کا سود لینا جائز ہے اور اس کو مدرسہ کی ضرورت میں خرچ کیا جاسکتا ہے، تنخواہ میں دینا بھی جائز ہے۔ (رر ص ۸/۶۳)

نمبر ۸۸: دارالحرب میں معاملات ربویہ وقمار کے ذریعہ سے مسلمانوں کو کفار سے فائدہ حاصل کر لینا جائز ہے۔ (رر ص ۸/۸۱) دارالحرب کے مسلمانوں کو آپس میں سود و قمار کے معاملات کرنا مکروہ ہے۔ (رر ص ۸/۸۲)

نمبر ۱۱۳: افریقہ قطعاً دارالحرب ہے، وہاں کفار سے معاملات ربویہ کرنا اور فائدہ اٹھانا مباح ہے (رر ص ۸/۹۷)

نمبر ۱۲۶: میں حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ ہندوستان میرے نزدیک دارالحرب ہے اور اس میں غیر مسلمہ سے استفادہ مال کی ایک محتاط صورت تجویز فرمائی۔ (رر ص ۸/۱۰۶)

نمبر ۱۲۸: ولایتی تاجروں سے بھی جو دارالحرب میں رہتے ہیں معاملاتِ ربویہ جائز ہیں (کفایت المفتی ص ۸/۱۰۷)

حضرت مولانا تھانویؒ کی احتیاط

راقم الحروف کے نزدیک حضرتؒ بھی ہندوستان کو دارالحرب ہی سمجھتے تھے مگر انہوں نے امام ابو یوسفؒ کے مسلک کی رعایت سے احتیاط اختیار فرمائی تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس کے بعد ہم تفصیل و تنقیح مذاہب کے ساتھ امام اعظم وغیرہ کے دلائل نقلیہ وعقلیہ کا ذکر کرتے ہیں۔

مذاہب کی تفصیل: اکابرِ امت حضرت ابراہیم نخعی امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام سفیان ثوری، امام محمدؒ فرماتے کہ دارالحرب میں مسلم وکافر کے درمیان معاملات ربویہ اور دوسرے عقودِ فاسدہ جائز ہیں۔ دونوں کی رضامندی سے وہ سب درست ہیں۔ البتہ امام مالکؒ اتنی شرط لگاتے ہیں کہ اگر کسی دارالحرب اور دارالاسلام کے درمیان معاہدۂ صلح ہے تو وہاں کے مسلمان یہاں کے کفار سے ایسے معاملات نہیں کرسکتے، اگر نہیں ہے تو کرسکتے ہیں۔ (المدونة الكبرىٰ) امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ معاہدۂ صلح کی وجہ سے کوئی دارِکفر، دارِاسلام تو نہیں بن جاتا۔ اور جو معاملات طے ہوتے ہیں۔ وہ باہمی رضامندی ہی سے تو ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کی دقتِ نظر اور نہایت گہرائی فکر کے ساتھ معاملہ فہمی کی شان اور قانونی موشگافیاں دوسرے تمام فقہاءِ اسلام میں نہیں پائی جاتیں۔ دوسرے یہ کہ اعلاء السنن اور دوسری بھی بعض کتب فقہ حنفی میں جو امام مالک کو امام صاحب کے مقابل گروہ کے ساتھ رکھا گیا ہے، وہ غلط ہے۔ نیز یہ کہ اس مسئلہ میں امام صاحب تنہا نہیں ہیں، جبکہ امام مالک محدث وفقیہ اعظم نخعی، امام المحدثین، سفیان، ثوری وامام محمد (استاذ اعظم امام شافعی) ان کے ساتھ ہیں، دوسری طرف بڑوں میں سے امام ابو یوسف کے ساتھ صرف امام شافعی واحمدؒ ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جمہور کا مسلک وہی ہے جو امام اعظمؒ کا ہے، اور فقہ حنفی میں تو یہ طے شدہ بات ہے کہ کسی مسئلہ میں صرف امام ابوحنیفہ ہی کی رائے ایک طرف ہو تو وہی سب پر فائق وراجح قرار دی جاتی ہے۔ پھر یہاں تو ان کے ساتھ دوسرے اکابر بھی ہیں۔

دلائل جواز: صاحبِ اعلاء السنن مستحقِ صدتشکر ہیں کہ انہوں نے اکثر دلائل کو ایک جگہ جمع کرنے کی سعی فرمائی ہے، ملاحظہ ہو ص۱۴/۴/۲۵۴ تا ص ص۱۴/۴/۲۷ اور شروع میں صرف حضرت مکحول کی حدیثِ مرسل پر ہی کئی صفحات میں تحقیق درج کی ہے۔ اس کے بعد مشکل الآثار امام طحاوی وغیرہ سے آثار صحابہ وتابعین کے ذریعہ اس کی تقویت کا صالح مواد جمع کردیا ہے، رواۃ و رجال پر بھی عمدہ بحث کی ہے۔

حدیث مرسل کی حجیت: صاحبِ انوار المحمود نے جو تحقیقی مقدمہ اپنے اساتذہ حضرت شیخ الہند وحضرت شاہ صاحبؒ اور کتب اصول حدیث سے استفادہ کے بعد لکھا ہے، اس میں لکھا کہ کبارِ تابعین کے مراسیل جیسا کہ حضرت سعید بن المسیب، مکحول دمشقی، ابراہیم نخعی، حسن بصری وغیرہم کرتے تھے کہ صحابی کا واسطہ ظاہر کئے بغیر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایاتِ حدیث کی ہیں، وہ سب امام ابوحنیفہ، امام مالک واحمد اور جمہور سلف کے نزدیک حجت ہیں۔ اہل ظاہر اور بعض ائمۂ حدیث ان کو قبول نہیں کرتے، امام شافعیؒ شرائط کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ (ص۱/۳۲)۔

اوجز میں اس طرح ہے: علامہ ابن جریر طبری نے کہا کہ تمام تابعین نے قبولِ مرسل پر اجماع واتفاق کیا ہے پھر ان سے یا بعد کے ائمۂ سے بھی دوصدی تک کسی کا انکار منقول نہیں ہوا، علامہ ابن عبدالبر نے فرمایا کہ گویا دوصدی کے بعد کا اشارہ امام شافعی کی طرف ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اس کو رد کیا اور بعض کی رائے یہ بھی ہے کہ مرسل مسند سے بھی قوی ہے، کیونکہ جس نے کسی حدیث کو مسنداً روایت کیا اس نے تو تم پر چھوڑ دیا اور جس نے مرسلاً روایت کیا تو اس نے ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ علامہ ابن الجوزیؒ اور محدث خطیب بغدادی نے امام احمد سے بھی نقل کیا کہ بسا اوقات مرسل روایت مسند سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے (امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص۲۰۰)

آخر میں نقل کیا کہ مختار تفصیل یہ ہے کہ مرسلِ صحابی تو اجماعاً مقبول ہے، اور قرنِ ثانی وثالث والوں کے مراسیل حنفیہ و مالکیہ کے یہاں مطلقاً مقبول ہیں، امام شافعیؒ کے نزدیک بھی ان کی تائید اگر دوسری مرسل، مسند، قولِ صحابی یا قولِ اکثر علماء سے ہوتی ہو یا اطمینان ہو کہ ارسال کرنے والا صرف عادل سے روایت کرتا ہے۔ تو وہ بھی مقبول ہے۔ (اوجز المسالک ص۱/۶۹)

امام مکحول م ۱۱۸ھ کا تذکرہ

دوسری صدی ہجری کے جلیل القدر تابعی ومحدث۔ صاحبِ تصانیف مسند وغیرہ مسلم شریف وسنن اربعہ اور جزء القراءۃ خلف الامام

امام بخاری کے رواۃ میں سے ہیں۔ آپ نے مصر، عراق، شام، مدینہ طیبہ وغیرہ عالم اسلامی کے علمی اسفار کئے، اور حدیث وفقہ کے بڑے مشہور امام ہوئے، ثقہ، صدوق تھے، ابوحاتم نے کہا کہ شام میں ان سے بڑا فقیہ نہیں تھا، حافظ ابن معین نے کہا کہ پہلے قدریہ کی طرف مائل تھے، پھر رجوع کر لیا تھا، (تہذیب ص۱۰/۲۸۹)

امام مکحول کی جلالتِ قدر علمی کا اندازہ اس سے کیا جائے کہ امام زہری نے فرمایا: "علماء چار ہیں، سعید بن المسیب مدینہ طیبہ میں، شعبی کوفہ میں، حسن بصری بصرہ میں، اور مکحول شام میں۔ (الاکمال فی اسماء الرجال از صاحب مشکوٰۃ)

غرض حدیث" لا ربوا بین المسلم والحربی ثمہ" کے راوی امام مکحول دمشقی ایسے جلیل القدر محدث وفقیہ ہیں، اوران کی تائید وتقویت آثارِ صحابہ وتابعین سے بھی ہوتی ہے اور کوئی مسند یا مرسل حدیث اس کے مضمون سے معارض بھی نہیں ہے، اور امام اعظم، امام مالک و ابراہیم نخعی وامام محمد وامام سفیان ثوری ایسے کبار محدثین وفقہاء نے اس کی تلقی بالقبول کی ہے تو ایسے مرسل کو تو امام شافعیؒ کے اصول پر بھی مقبول ہونا چاہئے۔ لہٰذا جوازِ ربوادارالحرب کا مسلک ہر لحاظ سے نہایت قوی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مجوزین کا تفقہ

امام اعظمؒ اور دوسرے حضرات کا مذکورہ بالا فیصلہ دینی وعلمی تفقہ کی بلندی وبرتری کے لحاظ سے بھی بوجوہ ذیل راجح وقوی معلوم ہوتا ہے۔

(۱) آیتِ کریمہ فان کان من قوم عدو لکم نے واضح اشارہ دیا کہ دارِکفر کے ساکن مسلمان عصمتِ مقومہ شرعیہ ایسی نعمتِ عظیمہ سے محروم ہوتے ہیں، جو دارِاسلام کے ساکن مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے ان دونوں کے احکام بھی الگ الگ ہیں۔

(۲) احادیثِ نبویہ میں بھی اس امر کو پسند نہیں کیا گیا کہ دارِکفر میں مستقل سکونت اختیار کی جائے۔ خصوصاً جبکہ وہاں ان کے دین و عقائد پر بھی زد پڑتی ہو۔ البتہ اگر ایسا نہ ہو اور جان و مال کا تحفظ بھی حاصل ہو تو وہاں کی سکونت جائز ہے اور ایسے دارِحرب کو دارِامان کہا جاتا ہے۔ اور حسبِ تحقیق حضرت شاہ صاحب ایسے ملک میں غیر مسلموں سے باقاعدہ معاہدہ دینی، مالی وجانی حقوق کے تحفظ کا کر لینا چاہئے اس کے بعد وہاں کے مسلمانوں کو اس وطن اور اہلِ وطن کے ساتھ ہر قسم کی معاونت بھی کرنی چاہئے۔

(۳) چونکہ دارِکفر میں اسلامی شریعت کا قانون نافذ نہیں ہوتا، اس لئے وہاں کے ساکنان کے لئے ان کے دین اور جان و مال کا تحفظ اس اعلیٰ سطح کے مطابق نہیں ہو سکتا جو اسلام نے متعین کی ہے، چنانچہ دارِاسلام میں جو مساویانہ حقوق غیر مسلموں کو دیئے گئے ہیں، وہ دنیا کے کسی بھی دارِکفر میں مسلمانوں کے لئے حاصل نہیں ہیں۔ اگر کہیں قانون وضابطہ میں دیئے بھی گئے ہیں، تو عملاً نہ ملنے کے برابر ہیں۔ اور بقول حضرت شاہ صاحبؒ کے ہندوستان کے مسلمانوں کا حال تو سب سے بدتر ہے۔ جہاں ہزارہا فسادات میں لاکھوں مسلمانوں کی جانی و مالی تباہی و بربادی ہوتی ہے اور کوئی دادفریاد نہیں ہوتی۔ امام اعظم وغیرہ نے دیارِکفر کے ایسے ہی حالات کا صحیح ترین اندازہ لگا کر وہاں کے احکام دیارِاسلام کے احکام سے بالکل الگ تجویز کئے تھے۔

(۴) امام صاحب نے یہ دیکھ کر کہ دیارِکفر میں سکونت اختیار کرنے سے مسلمانوں کی پوزیشن نظرِ شارع میں بھی بہت کچھ گر جاتی ہے، اور حق تعالیٰ نے اس کی وجہ سے ان کو قومِ عدو میں سے بھی قرار دے دیا، تو انہوں نے ایک رائے یہ بھی قائم کی ہے کہ دیارِحرب کے جو لوگ وہاں رہ کر اسلام لے آئیں اور پھر وہاں سے دیارِاسلام کی طرف ہجرت بھی نہ کریں تو وہ ضرورت پڑنے پر آپس میں بھی ربوی معاملات کر سکتے ہیں، گو اس بارے میں امام محمدؒ کی رائے ان کے ساتھ نہیں ہے، اور اسی لئے امام صاحب کی یہ رائے مرجوح قرار دی گئی ہے، اور حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کے فتاویٰ میں اس کو مکروہ کہا گیا ہے۔ وہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔

تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ حق تعالیٰ کی نظر میں ایسے مسلمانوں کی اسلامی پوزیشن بہت کمزور سمجھی گئی ہے، اور یہ حقیقت بھی ہے، ہمارے شیخ المشائخ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ تو فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ (انگریزی دور) میں ہندوستان کے باشندے بمنزلۂ اسیر ہیں، جن کی پوزیشن غلام سے بھی بدتر ہوتی ہے، اور اسیر حنفیہ کے نزدیک معاہد نہیں ہوتا، اس لئے قید کرنے والے کا مال مباح ہوتا ہے جس طرح چاہے لے سکتا ہے۔ بشرطیکہ اپنی عزت و جان کو خطرے میں نہ ڈالے اور اسی لئے انگریزی دور میں ہمارے بعض اکابر نے بلاٹکٹ ریلوے سفر وغیرہ کی اجازت دی تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ مدت ہوئی جب نصاریٰ کی طرف سے اسلام پر اعتراضات کا بڑا طوفان اٹھا تھا تو ایک اعتراض یہ بھی ہوا تھا کہ اسلام کا یہ کیا انصاف ہے کہ ایک ہاتھ جس کے کاٹنے کی دیت پوری جان کی آدھی ہوتی ہے، یعنی پچاس اونٹ یا پانچ سو دینار (اشرفیاں) پھر صرف چوتھائی دینار چرانے پر اس کا اتنا قیمتی ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے؟ تو اس کے جواب میں علماءِ اسلام نے کہا تھا کہ جب تک وہ ہاتھ امانت دار رہا اس کی وہی قدر و قیمت تھی۔ پھر جب اس نے چوری کی تو وہ خیانت کی وجہ سے نظر شارع میں اتنا ذلیل و بے قدر ہو گیا، یہی باری تعالیٰ کی حکمت ہے تو شاید کچھ ایسی ہی بات دار الحرب کے ساکن مسلمانوں کی بھی ہے۔ جبکہ وہ باوجود قدرت و سہولت کے بھی ہجرت نہ کریں اور دیارِ کفر کی سکونت کو ترجیح دیں۔ باقی مجبوریوں اور معذوریوں کی صورت میں ان کا عذر عند اللہ مقبول ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

(۵) امام اعظم کے نزدیک کسی دارِ اسلام کو دارِ کفر قرار دینے میں بھی نہایت سختی اور بڑی احتیاط سب سے زیادہ ہے اور پھر دیارِ کفر کی مجبوریوں اور مشکلات کا لحاظ بھی انہوں نے ہی سب سے زیادہ کیا ہے اور شرعی حدود میں رہ کر حل نکالنے کی سعی کی ہے۔ اور یہ حقیقت یہ ہے کہ نقل و عقل کی رو سے وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

(۶) امام صاحب کے نزدیک دارِ اسلام میں مستقل طور سے سکونت کرنے والے کفار اہلِ ذمہ اور ان غیر مسلموں کے لئے بھی جو امن لے کر عارضی طور سے دار اسلام میں داخل ہوں، تمام حقوق تحفظِ دین و جان و مال و عزت کے مسلمانوں کے برابر ہیں، یہاں تک کہ غیر مسلموں کی غیبت اور برائی کی بھی کوئی بات ان کے پیٹھ پیچھے بھی کرنا جائز نہیں ہے، جس طرح کہ مسلمانوں کی غیبت جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی کافر ذمی یا مستامن کو قتل کر دے تو اس مسلمان کو بدلے میں قتل کیا جائے گا جبکہ دوسرے ائمہ کے نزدیک قتل نہیں بلکہ صرف دیت مال کے ذریعہ کافی ہوگی۔ اور غلام کے بدلے میں آزاد مسلمان کو قتل کیا جائے گا۔ اور جن صورتوں میں دیت واجب ہوتی ہے تو مسلم اور غیر مسلم کی دیت برابر رکھی گئی ہے، جبکہ دوسرے اماموں کے یہاں اس میں بھی کمی بیشی ہے۔

غرض یہ کہ ہمارے امام صاحب نے دارِ اسلام میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کے برابر تمام حقوق مکمل طور سے دیئے ہیں، جس کی نظیر دوسرے مذاہب میں نہیں ہے، تو یہ سب رعایتیں صرف اس لئے ہیں کہ دارِ اسلام کے غیر مسلم شریعت اسلام کی سرپرستی قبول کرتے ہیں۔ اور دارِ کفر جہاں کے غیر مسلم اسلامی شریعت کی سربراہی تسلیم نہیں کرتے اور وہاں غلبہ و شوکت بھی احکام کفر کی ہے تو ایسی جگہ امام صاحب کے نزدیک ان کے مال مباح اور غیر معصوم ہوتے ہیں اور ربوی معاملات کے عدمِ جواز کی شرط دونوں طرف کے مال کا معصوم ہونا ہے۔ جب کفار کے اموال دارِ کفر میں معصوم نہیں ہیں تو وہاں ربوا کا تحقق بھی نہیں ہوتا۔ ملاحظہ ہو اعلاء السنن ص ۱۴/ ۲۵۸ بحوالہ بدائع وغیرہ۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام نخعی، امام سفیان ثوری اور امام محمد نے حدیثِ مرسل ''لاربوا بین المسلم والحربی ثمہ (دار الحرب میں مسلم و حربی کے درمیان ربوا نہیں ہوتا) یعنی وہ اگرچہ صورۃً ربوا ہے مگر حقیقۃً نہیں ہے، اور عقودِ فاسدہ و باطلہ کے ذریعہ جو منافع وہاں حاصل کئے جاتے ہیں وہ بھی ان عقود و معاملات فاسدہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے جائز ہیں کہ دار الحرب میں کئے جا رہے ہیں، جہاں اموالِ کفار عصمتِ شرعی کے احاطہ سے باہر ہیں، لہٰذا وہاں صرف تراضیِ طرفین جواز منافع کے لئے کافی ہے، امام شافعی و امام ابو یوسف وغیرہ نے یہ خیال کیا کہ ربوی معاملات کا تعلق عقد سے ہے اور مسلمان کے لئے عقد فاسد کے ذریعہ منفعت حاصل کرنا جائز نہیں، اسی

لئے وہ کہتے ہیں کہ مسلمان کے لئے عقد کے لحاظ سے دارالحرب اور دارالاسلام برابر ہیں، لہٰذا ایسے معاملات دونوں جگہ ناجائز ہیں۔

امام شافعیؒ مرسل کو حجت نہیں مانتے، اس لئے بھی مذکورہ بالا حدیثِ مرسل سے متاثر نہیں ہوئے، حالانکہ وہ آثارِ صحابہ سے مؤید بھی ہے اور ایسی مرسل کو وہ بھی حجت مانتے ہیں۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ عبد وسید کے درمیان ربوا نہیں ہے، وہ بھی اسی طرح ہے کہ گو صورۃً وہ ربوا ہے مگر حقیقت میں ربوا نہیں ہے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے بعض دیارِ حرب والوں کو لکھا کہ تم جزیہ میں اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بیع کر سکتے ہو، اور حضرت یحییٰ بن سعید انصاری نے بھی اس میں کچھ حرج نہیں سمجھا، حالانکہ آزاد اولاد اور عورتوں کی بیع وشرا کا معاملہ دارالاسلام میں کفار سے جائز نہیں ہوسکتا۔ امام طحاویؒ نے حضرت ابراہیمؒ سے نقل کیا کہ دارالحرب میں ایک دینار کی بیع دو دینار سے کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ اور حضرت سفیان سے بھی محدث کبیر ابن مبارک نے ایسا ہی نقل کیا، وغیرہ ان آثارِ صحابہ وتابعین سے بھی دارالحرب کے اندر عقودِ فاسدہ وباطلہ ومعاملاتِ ربویہ کا جواز ہی نکلتا ہے۔ (تفصیل اعلاء السنن جلد ۱۴ میں ہے)

آخر میں گزارش ہے کہ پوری تفصیل ودلائل کے لئے درجِ ذیل کتب کا مطالعہ کریں: مشکل الآثار امام طحاویؒ ص ۲۴۷ جلد رابع۔ تفسیر مظہری ص ۲/۱۵۲، مشکلات القرآن ص ۱۱۴ خطبہ صدارت شاہ صاحبؒ ص ۲۷/۲۰، اعلاء السنن ص ۳۵۴ ۔ ۲۸۰ جلد ۱۴۔ انوارالباری ص ۲۰۰/۱۹۹ جلد اول۔ نطقِ انور ص ۱۶۶/۱۴۶۔ فتاوے عزیزی جلد اول فتاویٰ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلیؒ جلد دوم۔ ہدایہ اولین مع الحواشی اور بدائع ومبسوط وجامع صغیر ودیگر کتب فقہ حنفی۔

(۷) دارِ کفر میں اموالِ کفار کے غیر معصوم ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے اموال چوری، ڈکیتی یا دوسرے غلط طریقوں سے حاصل کئے جائیں کیونکہ ایسا کرنا مسلمانوں کے لئے بہر صورت اور ہر جگہ ناجائز ہے۔ البتہ رضامندی سے جو معاملات باہم طے ہوں وہ سب جائز ہوتے ہیں اور بقول حضرت شاہ صاحبؒ ربوی معاملات ہوں یا عقودِ فاسدہ وباطلہ وہ سب دارِ کفر میں جائز ہوتے ہیں۔ اور اموال کی مذکورہ صورت کے سوا کفار کی جانوں یا دین وعزت وغیرہ سے تعرض کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔

(۸) دارالحرب کے لفظ سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ وہاں کے کفار سے مسلمانوں کی کوئی لڑائی ہے، بلکہ یہ محض اصطلاح ہے بمعنی دارِ کفر جہاں احکام کفر نافذ ہوں اور غلبہ وشوکت غیر مسلموں کی ہو، بمقابلہ دارِ اسلام کے کہ جہاں اسلام ومسلمانوں کا غلبہ وشوکت ہو، اسی لئے دارالحرب ہی کی ایک قسم دارالامان بھی ہے اور ہر دارِ کفر کے دارِ اسلام کے ساتھ معاہدے بھی ہوسکتے ہیں۔ دارالامان، دارالخوف کے مقابل ہے۔ جہاں وہ مامون ومطمئن ہی نہ ہوں لیکن دونوں قسمیں دارالحرب ہی کی ہیں۔

خلاصہ: اوپر کی پوری تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام اعظم اور دوسرے ائمہ واکابر امت کا فیصلہ شرعیہ بابۃ دیارِ کفر نہ صرف دلائل شرعیہ کی رو سے بلکہ عقل ودانش کی روشنی میں بھی نہایت مضبوط ومستحکم ہے۔ ظاہر ہے کہ دیارِ کفر میں مسلمانوں کے دین ومال وعزت کا تحفظ نہایت دشوار ہے، اور کسی ملک کے شریف حاکم ان امور کا تحفظ ضابطوں اور قانون کے ذریعہ کرتے بھی ہیں تو عوام کالانعام کی ظالمانہ یورشوں سے پناہ ملنی مشکل ہوتی ہے۔ اور ان کا ایک بڑا حربہ اقتصادی ومالی نقصان رسانی کا بھی کم نہیں ہوتا۔ اس لئے جب شریعت نے ہمارے لئے صرف ایک دروازہ کھلا رکھا ہے تو اس سے ہم صرفِ نظر کیوں کریں؟!

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب کسی دیارِ کفر میں جان ومال، عزت ودین محفوظ نہ ہو تو اس سے ہجرت ہی کیوں نہ کرلی جائے، کیونکہ صرف مالی مشکلات کا حل وہاں حنفیہ کے مسلک پر نکلتا بھی ہے تو دوسری پریشانیوں کا حل تو پھر بھی کچھ نہیں ہے، تو اس کے لئے عرض ہے کہ ہجرت بھی آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے بھی شرائط ہیں، مثلاً یہ کہ دوسرے ملک میں ہمارے لئے معقول وموزوں جگہ ہو اور وہاں دوسری

مشکلات پیدا نہ ہوں۔ ان سب باتوں کا فیصلہ علماءِ وقت کی صوابدید پر موقوف ہے۔ اور یہ بات ہم اجتماعی ہجرت کے لئے لکھ رہے ہیں۔ انفرادی ہجرت ہر وقت ہو سکتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

آخر میں بحث مذکور کے چند اہم نکات

امام اعظمؒ نے جو مسلک سورۂ نساء کی آیت نمبر ۹۲ **فان کان من قوم عدو لکم** اور آیت نمبر ۹۷ **ظالمی انفسہم** اور احادیثِ صحاح بابۃ ممانعت اقامت دار کفر وغیرہ سے جو دارِ کفر و دارِ اسلام کا فرق متعین کیا ہے، اور دونوں کے احکام بھی الگ الگ کتاب وسنت و آثارِ صحابہ و تابعین کی روشنی میں بتائے ہیں، وہی مذہب نہایت قوی ہے اور امام شافعیؒ نے جو دار الحرب میں قتلِ مسلم خطا میں کفارہ کے ساتھ دیت کو بھی واجب کیا ہے۔ اور وہ آیت بالا نمبر ۹۲ کے بھی خلاف ہے، اور اسی لئے اس بارے میں امام ابو یوسفؒ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور امام صاحب کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ (۲) امام اعظم وغیرہ نے جو دار کفر میں اموال کفار کو مباح الاصل مان کر تمام معاملات کی اجازت صرف تراضی طرفین کی بنا پر دی ہے وہ دار کے فرق ہی پر مبنی ہے، امام شافعیؒ وغیرہ نے دونوں داروں میں فرق نہیں کیا صرف عقود و معاملات پر نظر کی لہٰذا دونوں جگہ کے احکام مساوی کر دیئے۔ (۳) امام صاحب وغیرہ کے مسلک کے لئے عقلی دلائل بھی بہت زیادہ اور مستحکم ہیں۔ ہم نے ۲۵۔ ۲۶ جمع کئے ہیں۔ جو اس مختصر میں ذکر نہیں کئے جا سکتے۔

(۴) موجودہ دور میں جبکہ دنیا کے ڈیڑھ سو ملکوں میں سے تقریباً ایک تہائی اسلامی ملک ہیں باقی سب دیارِ کفر ہیں **الکفر ملة واحدہ**۔ اگرچہ حق تعالیٰ نے خاص نعمتوں سے مسلمانوں کو نوازا ہے، مگر پھر بھی وہ غیر معمولی مشکلات اور پریشانیوں سے دوچار ہیں۔ اور خاص طور سے اقتصادی بدحالی سے ان کو بچانا نہایت ضروری ہے، ورنہ **کاد الفقر ان یکون کفرا**۔

(۵) ہندوستان کے دار الحرب ہونے کو مشکوک سمجھنے والوں کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ کا مضمون نہایت اہم ہے۔

(۶) تقریباً ایک سو دیارِ کفار میں بسنے والے مسلمانوں کی مشکلات اور تحفظ جان و مال کے مسائل کو حل کرنا اور خاص طور سے غیر مسلمین کے ظلم و بربریت سے ان کو بچانا نہ صرف تمام دیارِ اسلام کا فرض ہے۔ بلکہ تمام دنیائے انسانیت کا بھی ہے۔ ہم نے اوپر واضح کیا ہے کہ ظلم کی صورت میں ملکی معاہدات مانع نہیں ہو سکتے۔ اور امداد کی صورتیں غیر محدود ہیں۔

بَابُ خُرُوْجِ الصِّبْيَانِ اِلَى الْمُصَلّٰى

(بچوں کے عیدگاہ جانے کا بیان)

۹۲۲۔ حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَبَّاسٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيٰنُ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَابِسٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ فِطْرٍ اَوْ اَضْحٰى فَصَلّٰى ثُمَّ خَطَبَ ثُمَّ اَتَى النِّسَآءَ فَوَعَظَهُنَّ وَذَكَّرَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ.

ترجمہ۹۲۲۔ عبدالرحمٰن بن عابس روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں عیدالفطر یا عیدالاضحیٰ کے دن نکلا، تو آپ نے نماز پڑھی، پھر خطبہ دیا، پھر عورتوں کے پاس آئے انہیں نصیحت کی، اور انہیں صدقہ دینے کا حکم دیا۔

تشریح:۔ حافظؒ اور علامہ عینیؒ نے لکھا کہ حدیث الباب کی مطابقت ترجمۃ الباب سے نہیں ہے، کیونکہ اس میں حضرت ابن عباسؓ کے صغیرالسن ہونے کا ذکر نہیں ہے، نہ بچوں کی شرکت عید کا ہے۔ لیکن امام بخاری نے اپنی عادت کے مطابق حدیث کے دوسرے طرق کی طرف اشارہ کیا ہے، جو ایک باب کے بعد آنے والی ہے اور اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے صغیرالسن ہونے کا ذکر ولولا مکانی من الصغر ماشہدتہ سے کیا ہے۔

علامہ عینی نے دوسری مطابقت کی صورت یہ بھی بتائی کہ حضرت ابن عباسؓ جب حضور علیہ السلام کے ساتھ نماز عید کو نکلے تو اس وقت آپ کا بچپن ہی تھا، کیونکہ وفات نبوی کے وقت ان کی عمر ۱۳ برس تک پہنچی تھی۔

بَابُ اِسْتِقْبَالِ الْاِمَامِ النَّاسَ فِيْ خُطْبَةِ الْعِيْدِ وَقَالَ اَبُوْ سَعِيْدٍ قَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُقَابِلَ النَّاسِ

(عید کے خطبہ میں امام کا لوگوں کی طرف رخ کرنے کا بیان اور ابوسعید نے کہا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کے سامنے منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے۔)

۹۲۳۔ حَدَّثَنَا اَبُوْ نُعَيْمٍ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ ابْنُ طَلْحَةَ عَنْ زُبَيْدٍ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنِ الْبَرَآءِ قَالَ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ اَضْحٰى اِلَى الْبَقِيْعِ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ اِنَّ اَوَّلَ نُسُكِنَا فِيْ يَوْمِنَا هٰذَا اَنْ نَّبْدَاَ بِالصَّلٰوةِ ثُمَّ نَرْجِعَ فَنَنْحَرَ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَقَدْ وَافَقَ سُنَّتَنَا وَمَنْ ذَبَحَ قَبْلَ ذٰلِكَ فَاِنَّمَا هُوَ شَيْءٌ عَجَّلَهٗ لِاَهْلِهٖ لَيْسَ مِنَ النُّسُكِ فِيْ شَيْءٍ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ ذَبَحْتُ وَعِنْدِيْ جَذَعَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّسِنَّةٍ قَالَ اذْبَحْهَا وَلَا تَفِيْ عَنْ اَحَدٍ بَعْدَكَ.

ترجمہ۹۲۳۔ حضرت براء روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم عیدالاضحیٰ کے دن بقیع کی طرف تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی، پھر ہم لوگوں کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ سب سے پہلی عبادت ہماری اس دن یہ ہونی چاہئے کہ پہلے ہم نماز پڑھیں، پھر واپس ہوں اور قربانی کریں، جس نے یہ کیا، تو میری سنت کے موافق کیا، اور جس نے قبل اس کے ذبح کیا تو وہ گوشت ہے جو

اس نے اپنے گھر والوں کے لئے تیار کیا، قربانی نہیں ہے، ایک شخص کھڑا ہوا، اورعرض کیا کہ یارسول اللہ میں نے تو نماز سے پہلے ذبح کرلیا، اور میرے پاس ایک سال سے کم کا بھیڑ کا بچہ ہے جو سال کے بچے سے زیادہ بہتر ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اسے ذبح کردو، اور تمہارے بعد کسی کے لئے کافی نہ ہوگا۔

تشریح:۔ علامہ عینیؒ نے لکھا کہ امام بخاری کے اس ترجمہ پر اعتراض ہوا ہے، کیونکہ جمعہ کے باب میں بھی خطبہ کے وقت امام کے لوگوں کی طرف متوجہ ہونے کا ترجمہ گزر چکا ہے، پھر یہاں تکرار کی کیا ضرورت تھی، خطبے سب ہی یکساں ہیں، اور حدیث بھی پہلے بـــاب التکبیر للعید میں گزر چکی ہے، جواب یہ ہے کہ کسی کو وہم ہوسکتا تھا کہ عید میں منبر وغیرہ نہیں ہوتا تو ممکن ہے خطبہ کا طریقہ بھی جمعہ کے خطبہ سے مختلف ہو، اس کا ازالہ کیا گیا۔ (عمدہ ص ۳/ ۳۸۸)۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں بـقیـع الـغـرقـد، قبرستان والی بقیع مراد نہیں ہے، جیسا کہ علامہ عینی نے سمجھا بلکہ بـقـیـع المصلیٰ مراد ہے (عیدگاہ والی) جس کے بارے میں شاعر نے کہا۔

الا لیت شعری هل تغیر بعدنا　　　بـقیـع المصلے ام کعهد القرائن

کاش میں جان سکتا کہ کیا ہمارے بعد بـقیـع المصلے میں بھی حوادثِ زمانہ کی وجہ سے تغیر آ گیا ہے یا وہ ابھی تک اسی طرح ہے کہ ہم سب کے گھر آ منے سامنے تھے۔ بقیع اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں مختلف اقسام کے درختوں کی پرانی جڑیں ہوں۔ حافظ ایسی لمبی تحقیقات لغویہ میں جاتے ہی نہیں۔ لہٰذا خاموشی سے گزر گئے۔ عینی سے چوک ہوگئی، جس کی اصلاح حضرتؒ نے فرمادی۔ رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ۔

بَابُ الْعَلَمِ بِالْمُصَلّٰى

(عیدگاہ میں نشان کا بیان)

۹۲۴. حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ سُفْيٰنَ قَالَ حَدَّثَنِيْ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَابِسٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍؓ قِيْلَ لَهُ اَشَهِدْتَّ الْعِيْدَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَعَمْ وَلَوْلَا مَكَانِيْ مِنَ الصِّغَرِ مَا شَهِدْتُهٗ حَتّٰى اَتَى الْعَلَمَ الَّذِيْ عِنْدَ دَارِ كَثِيْرِ بْنِ الصَّلْتِ فَصَلّٰى ثُمَّ خَطَبَ ثُمَّ اَتَى النِّسَآءَ وَمَعَهٗ بِلَالٌ فَوَعَظَهُنَّ وَذَكَّرَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ فَرَاَيْتُهُنَّ يَهْوِيْنَ بِاَيْدِيْهِنَّ يَقْذِفْنَهٗ فِيْ ثَوْبِ بِلَالٍ ثُمَّ انْطَلَقَ هُوَ وَبِلَالٌ اِلٰى بَيْتِهٖ.

ترجمہ ۹۲۴۔ عبدالرحمٰن بن عابس روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے سنا، ان سے پوچھا گیا، کہ کیا آپ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عید کی نماز میں شریک ہوئے ہیں، تو فرمایا ہاں! اگر میرا بچپن نہ ہوتا تو میں اس واقعہ کا مشاہدہ نہ کرسکتا۔ آپ اس نشان کے پاس آئے جو کثیر بن صلت کے گھر کے پاس تھا، آپ نے نماز پڑھی۔ پھر خطبہ دیا، پھر عورتوں کے پاس آئے، اس حالت میں کہ آپ کے ساتھ بلال تھے، آپ نے ان عورتوں کو نصیحت کی اور صدقہ کا حکم دیا، میں نے ان عورتوں کو دیکھا کہ اپنے ہاتھ جھکاتیں، اور بلال کے کپڑے میں ڈالتی جاتی تھیں، پھر آپ اور بلال اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

تشریح:۔ یہاں بتایا گیا کہ پہلے زمانہ میں عیدگاہ کی باقاعدہ باؤنڈری بنا کر جگہ مقرر نہ تھی، بلکہ دارِ کثیر بن الصلت کے پاس ایک نشان اونچا سا تھا، جس سے اس جگہ کی پہچان کی جاتی تھی۔ اور حدیث الباب کتاب الجمعه سے چار باب پہلے بھی گزر چکی ہے۔ باب وضوء الصبیان میں۔ (عمدہ ص ۳/ ۳۸۹)۔

حافظؒ نے یہ بھی لکھا کہ دار کثیر تو حضور علیہ السلام سے بھی بعد کو بنا ہے اور یہاں بعد کے لوگوں کو سمجھانے کے سے اس مقام کی تعیین کی

گئی ہے۔ (فتح ص ۲/ ۳۱۷)۔ قولہ ثم اتی النساء پر حافظ نے لکھا کہ اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے لئے مردوں سے الگ دوسری جگہ تھی اور مردوں عورتوں کا اختلاط نہیں تھا۔

قولہ و معہ بلال۔ حافظ نے لکھا اس سے معلوم ہوا کہ آدابِ شرعیہ میں سے یہ بھی ہے کہ عورتوں کو وعظ و نصیحت کے وقت ضرورت سے زیادہ مرد ساتھ نہ ہوں، کیونکہ یہاں صرف حضرت بلالؓ بطور خادم کے اور صدقہ وصول کرنے کے لئے تھے اور حضرت ابن عباسؓ تو بچے ہی تھے۔ (فتح ۲/ ۳۱۸)۔

بَابُ مَوْعِظَةِ الْإِمَامِ النِّسَآءَ يَوْمَ الْعِيْدِ

(امام کا عید کے دن عورتوں کو نصیحت کرنے کا بیان)

۹۲۵۔ حَدَّثَنَا اِسْحٰقُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ نَصْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ اَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عَطَآءٌ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ قَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْفِطْرِ فَصَلّٰی فَبَدَاَ بِالصَّلٰوةِ ثُمَّ خَطَبَ فَلَمَّا فَرَغَ نَزَلَ فَاَتَی النِّسَآءَ فَذَكَّرَهُنَّ وَهُوَ يَتَوَكَّاُ عَلٰی يَدِ بِلَالٍ وَّ بِلَالٌ بَاسِطٌ ثَوْبَهٗ تُلْقِیْ فِيْهِ النِّسَآءُ الصَّدَقَةَ قُلْتُ لِعَطَآءٍ زَكٰوةُ يَوْمِ الْفِطْرِ قَالَ لَا وَلٰكِنْ صَدَقَةٌ يَّتَصَدَّقْنَ حِيْنَئِذٍ تُلْقِیْ فَتَخَهَا وَيُلْقِيْنَ قُلْتُ لِعَطَآءٍ اَتَرٰی حَقًّا عَلَی الْاِمَامِ ذٰلِكَ وَيُذَكِّرُهُنَّ قَالَ اِنَّهٗ لَحَقٌّ عَلَيْهِمْ وَمَالَهُمْ لَا يَفْعَلُوْنَهٗ قَالَ ابْنُ جُرَيْجٍ وَاَخْبَرَنِی الْحَسَنُ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ طَاؤُسٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ شَهِدْتُّ الْفِطْرَ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِیْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ وَ عُثْمَانَ يُصَلُّوْنَهَا قَبْلَ الْخُطْبَةِ ثُمَّ يُخْطَبُ بَعْدُ خَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَيْهِ حِيْنَ يُجَلِّسُ بِيَدِهٖ ثُمَّ اَقْبَلَ يَشُقُّهُمْ حَتّٰی جَآءَ النِّسَآءَ وَمَعَهٗ بِلَالٌ فَقَالَ يٰاَيُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ الْاٰيَةَ ثُمَّ قَالَ حِيْنَ فَرَغَ مِنْهَا اَنْتُنَّ عَلٰی ذٰلِكَ فَقَالَتِ امْرَاَةٌ وَّاحِدَةٌ مِّنْهُنَّ لَمْ يُجِبْهُ غَيْرُهَا نَعَمْ لَا يَدْرِیْ حَسَنٌ مَنْ هِیَ قَالَ فَتَصَدَّقْنَ فَبَسَطَ بِلَالٌ ثَوْبَهٗ ثُمَّ قَالَ هَلُمَّ لَكُنَّ فِدَآءٌ اَبِیْ وَاُمِّیْ فَيُلْقِيْنَ الْفَتَخَ وَالْخَوَاتِيْمَ فِیْ ثَوْبِ بِلَالٍ قَالَ عَبْدُ الرَّزَّاقِ اَلْفَتَخُ الْخَوَاتِيْمُ الْعِظَامُ كَانَتْ فِی الْجَاهِلِيَّةِ.

ترجمہ ۹۲۵۔ حضرت عطاء حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ان کو کہتے ہوئے سنا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی، پہلے تو نماز پڑھی، پھر خطبہ کہا، جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو منبر سے نیچے اترے، اور عورتوں کے پاس آئے اور انہیں نصیحت کی، اس حال میں کہ بلال کے ہاتھ پر ٹیکا دیئے ہوئے تھے، اور بلال اپنا کپڑا پھیلائے ہوئے تھے، جس میں عورتیں خیرات ڈال رہی تھیں، میں نے عطاء سے پوچھا کیا صدقہ دے رہی تھیں، توانہوں نے کہا نہیں بلکہ خیرات کر رہی تھیں، اس وقت اگر ایک عورت اپنا چھلا ڈالتی تو دوسری بھی ڈالتیں۔ میں نے عطاء سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں امام پر یہ واجب ہے کہ وہ عورتوں کو نصیحت کرے، انہوں نے کہا، کہ بلاشبہ یہ واجب ہے انہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایسا نہیں کرتے، ابن جریج نے کہا کہ مجھ سے حسن بن مسلم نے بہ سندِ طاؤس حضرت ابنِ عباس سے بیان کیا کہ ابن عباس نے کہا کہ میں عید الفطر میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے ساتھ شریک ہوا۔ سب کے سب قبل خطبہ کے نماز پڑھتے، پھر خطبہ دیتے تھے، نبی صلے اللہ علیہ وسلم نکلے، گویا میں آپ کو دیکھ رہا ہوں، جب آپ لوگوں کو اپنے ہاتھوں کے اشارہ سے بیٹھا رہے تھے، پھر آپ ان صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے، یہاں تک کہ عورتوں کے پاس پہنچ گئے اور آپ کے ساتھ بلال تھے، آپ نے آیت یا یها النبی اذا جاء ک (الخ) آخر تک پڑھی، پھر جب اس سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ تم اس پر قائم ہو تو ان عورتوں میں سے صرف ایک عورت نے کہا ہاں، اور اس کے علاوہ کسی عورت نے آپ کی بات کا جواب نہیں دیا،

حسن کو معلوم نہیں کہ وہ کون عورت تھی۔ آپ نے فرمایا تو تم لوگ خیرات کرو۔ اور بلال نے اپنے کپڑے پھیلا دیئے، اور کہا کہ تم لاؤ، میرے ماں باپ تم پر نثار ہوں تو وہ عورتیں اپنی انگوٹھیاں اور چھلے بلال کے کپڑے میں ڈالنے لگیں، عبدالرزاق نے کہا کہ فتخ سے مراد بڑی انگوٹھیاں ہیں، جن کا رواج عہدِ جاہلیت میں تھا۔

تشریح:۔ **باب موعظة الامام النساء** حافظ نے لکھا کہ یہ اس لئے ہوا تھا کہ عورتیں دور تھیں اور وہ حضور علیہ السلام کا خطبۂ عید نہ سن پائی ہوں گی، اور اب بھی ایسا ہی ہے کہ اگر عورتوں کے لئے الگ سے وعظ و نصیحت کرنے کی ضرورت ہو تو جائز ہے بشرطیکہ امن ہو اور کوئی مفسدہ یا خرابی واقع نہ ہو۔ علامہ ابن بطال نے لکھا کہ حضور علیہ السلام جو الگ سے عورتوں کے پاس گئے، اور نصیحتیں فرمائیں، یہ صرف آپ کے لئے جائز تھا کہ آپ ان کے لئے بمنزلہ باپ کے تھے (فتح ص ۲/۳۱۹ وعمدہ ص ۳/۳۹۲)۔

حافظ نے لکھا کہ حدیث الباب سے عورتوں کا عیدگاہ جانے کا جواز بھی معلوم ہوا، جو شافعیہ کا مسلک ہے، ہم اس پر آگے مفصل کلام کریں گے۔ ان شاءاللہ۔

قولہ اتری حقا علی الامام، علامہ عینیؒ نے لکھا کہ بظاہر حضرت عطاء اس کو واجب ہی سمجھتے تھے، اور اسی لئے قاضی عیاض نے لکھا کہ اس کا قائل عطاء کے سوا کوئی نہیں ہے۔ علامہ نووی وغیرہ نے فرمایا کہ علماء نے اس کو مستحب قرار دیا ہے۔ (عمدہ ص ۳/۳۹۱)۔

قولہ قال عبدالرزاق پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ صاحبِ مصنف مشہور ہیں، اور امام احمدؒ سے قبل تک تصانیف میں احادیثِ مرفوعہ اور آثارِ صحابہ و تابعین مختلط ہوتے تھے، امام احمد نے سب سے پہلے مرفوع کو موقوف و آثار سے الگ کیا اور صرف مرفوعات کو مدون کیا، اور امام محمدؒ نے سب سے پہلے فقہ کو حدیث سے الگ کیا، ورنہ سب سے پہلے۔ ملا تھا اور یہی راز ہے نرے محدثین کے حنفیہ سے ناراض ہونے کا۔ یہ کام فقہاء محدثین کا تو پسندیدہ تھا، لیکن محدثین غیر فقہاء کے مزاج و مسلک کے خلاف تھا۔ میں نے نیل الفرقدین میں کچھ چبھتے ہوئے جملے لکھ دیئے ہیں۔

فائدہ مہمہ: حضرتؒ نے فرمایا کہ جرح و تعدیل کے سلسلہ میں ہم نے جو تجربہ کیا اور بعد کو بھی لوگ تجربہ کرلیں گے، وہ یہ کہ جرح و تعدیل والے غیر موضع خلاف میں تو صرف ظاہری حالِ راوی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اگر اس کو صائم و قائم اور غیر مخالفِ ظاہر شرع دیکھا تو بلا نکیر کے توثیق کردی، حتیٰ کہ بعض ایسے لوگوں کی بھی توثیق کردی ہے جن پر کفر کی تہمت بھی لگ چکی ہے، لیکن اس کی وجہ سے بھی کوئی جرح نہ کی اور صرف اس کے ظاہری صلاح پر نظر کی، مگر جب اختلافی موقع آیا تو پھر انہوں نے سارے ضابطے و قاعدے ختم کردیئے، خاص طور سے حنفیہ کے حق میں کہ ان سے تو محدثین ناراض ہی رہے ہیں، حتیٰ کہ بعض نے تو ان سے احادیث بھی روایت نہیں کیں۔ اب یہاں عبدالرزاق ہی کو دیکھ لو کہ ان سے بھی احادیث لی ہیں۔ جبکہ ان پر شیعیت کی مہر لگی ہوئی ہے، اگرچہ وہ سب صحابہ کے مرتکب نہ تھے، مگر احادیثِ حنفیہ سے اعراض ہی رہا ہے۔

لہٰذا معتمد بات اس بارے میں یہ ہے کہ ایک شخص کا حال خود اپنی جگہ دیکھا جائے اگر تحقیق و تتبع کے بعد اس کا صلاح و حفظ ثابت ہوجائے تو پھر اس کے حق میں دوسروں کے اقوال کا لحاظ نہ کیا جائے کہ کسی ایک کیلئے سب لوگوں کی رضامندی حاصل کرنا ناممکن ہے، ہمیں اپنے ہی علم و تجربہ پر فیصلہ کرنا چاہئے، عیاں راچہ بیاں، البتہ اگر کسی کا حال ہمیں خود نہ معلوم ہو سکے تو مجبوری ہے کہ دوسروں پر اعتماد کرنا ہی پڑے گا۔ میرا مقصد اس تفصیل سے یہ نہیں کہ ان کے فیصلوں پر سے اعتماد اٹھا دوں، بلکہ یہ بتانا ہے کہ غور و فکر کیا جائے ان کے کس قول اور فیصلہ کو کس مرتبہ میں رکھنا ہے اور خود بھی غور و تامل اور تحقیق حالات کر کے حقیقتِ حال تک پہنچنے کی سعی کرنا ضروری ہے۔ حضرتؒ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ جرح و تعدیل اور علم الرجال کا علم اب بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کبھی پہلے تھا، اور آج کل جو حضرات درس و تالیفِ حدیث کا شغل رکھتے ہیں ان کو اس فرض سے غافل نہ ہونا چاہئے، علامہ کوثریؒ بھی اسی طرح اس علم کی اہمیت پر زور دیا کرتے تھے۔ اور یوں بھی حدیث کا آدھا علم رجال میں ہے، ہم نے پہلے بھی لکھا تھا کہ علامہ ابن القیم تک کو اکابر علماء حدیث نے ضعیف فی علم الرجال کہا ہے، تو ہم کس شمار میں ہیں؟!

بَابٌ اِذَالَمْ یَکُن لَّهَا جِلْبَابٌ فِی الْعِیْدِ

(عورت کے پاس عید میں چادر نہ ہو (تو کیا کرے)

۹۲۶۔ حَدَّثَنَا اَبُوْ مَعْمَرٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ حَدَّثَنَا اَیُّوْبُ عَنْ حَفْصَةَ بِنْتِ سِیْرِیْنَ قَالَتْ کُنَّا نَمْنَعُ جُوَارِیَنَا اَنْ یُّخْرُجْنَ یَوْمَ الْعِیْدِ فَجَآءَتِ امْرَاَةٌ فَنَزَلَتْ قَصْرَبَنِیْ خَلْفٍ فَاَتَیْتُهَا فَحَدَّثَتْ اَنَّ زَوْجَ اُخْتِهَا غَزَا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّے اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثِنْتَیْ عَشَرَةَ غَزْوَةً فَکَانَتْ اُخْتُهَا مَعَهٗ فِیْ سِتَّةِ غَزَوَاتٍ قَالَتْ فَکُنَّا نَقُوْمُ عَلَی الْمَرْضٰی وَنُدَاوِی الْکَلْمٰی فَقَالَتْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَعَلٰی اِحْدَانَا بَاْسٌ اِذَالَمْ یَکُنْ لَّهَا جِلْبَابٌ اَلَّا تَخْرُجَ فَقَالَ لِتُلْبِسْهَا صَاحِبَتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا فَلْیَشْهَدْنَ الْخَیْرَ وَدَعْوَةَ الْمُؤْمِنِیْنَ قَالَتْ حَفْصَةُ فَلَمَّا قَدِمَتْ اُمُّ عَطِیَّةَ اَتَیْتُهَا فَسَاَلْتُهَا اَسَمِعْتِ فِیْ کَذَا وَکَذَا فَقَالَتْ نَعَمْ بِاَبِیْ وَقَلَّمَا ذَکَرَتِ النَّبِیَّ صَلَّے اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا قَالَتْ بِاَبِیْ قَالَ لِتَخْرُجِ الْعَوَاتِقُ ذَوَاتُ الْخُدُوْرِ اَوْقَالَ الْعَوَاتِقُ وَذَوَاتُ الْخُدُوْرِ شَکَّ اَیُّوْبُ وَالْحُیَّضُ فَتَعْتَزِلُ الْحُیَّضُ الْمُصَلّٰی وَلْیَشْهَدْنَ الْخَیْرَ وَدَعْوَةَ الْمُؤْمِنِیْنَ قَالَتْ فَقُلْتُ لَهَا الْحُیَّضُ قَالَتْ نَعَمْ اَلَیْسَ الْحَآئِضُ تَشْهَدُ عَرَفَاتٍ وَّتَشْهَدُ کَذَاوَتَشْهَدُ کَذَا.

ترجمہ ۹۲۶۔ حضرت حفصہ بنت سیرین روایت کرتی ہیں کہ ہم اپنی لڑکیوں کو عید کے دن نکلنے سے روکتی تھیں۔ایک عورت آئی اور قصر بنی خلف میں اتری، میں اس کے پاس پہنچی تو اس نے بیان کیا کہ اس کی بہن کا شوہر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بارہ غزوات میں شریک ہوا تھا، تو اس کی بہن چھ غزوات میں اپنے شوہر کے ساتھ تھی، اور اس نے بیان کیا کہ ہم لوگوں کا کام مریضوں کا علاج اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا تھا، تو اس نے کہا کہ یارسول اللہ کیا ہم لوگوں میں سے کسی کے لئے اس باب میں کوئی مضائقہ ہے کہ وہ (عید کے دن) نہ نکلے اگر اس کے پاس چادر نہ ہو، آپ نے فرمایا کہ اس کی ہم جولی اسے اپنی چادر اڑھادے۔اور چاہئے کہ وہ لوگ نیک کام میں شریک ہوں، اور مومنین کی دعا میں حاضر ہوں۔حفصہ نے کہا کہ جب ام عطیہ آئیں تو میں ان کے پاس پہنچی اور ان سے پوچھا کہ آپ نے اس کے متعلق کچھ سنا ہے۔تو انہوں نے کہا ہاں، آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں، اور جب کبھی بھی وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا نام لیتیں تو یہ ضرور کہتیں کہ میرے ماں باپ ان پر فدا ہوں، آپ نے فرمایا کہ پردے والی جوان عورتیں باہر نکلیں، یا یہ فرمایا کہ پردے والی جوان عورتیں نکلیں، ایوب کو شک ہوا اور حائضہ عورتیں بھی نکلیں لیکن وہ نماز کی جگہ سے علیحدہ رہیں اور نیک کام اور مومنین کی دعا میں شریک ہوں، حفصہ کا بیان ہے کہ میں نے ام عطیہ سے کہا کہ کیا حائضہ عورتیں بھی نکلیں، انہوں نے کہا کہ کیا حائضہ عرفات میں اور فلاں فلاں جگہ میں نہیں جاتی ہے۔

تشریح:۔علامہ عینیؒ نے لکھا کہ حدیث الباب اول باب" شهود الحائض العيدين "میں بھی گزری ہے۔اور وہاں تشریح و بحث آچکی ہے، مقصد یہ ہے کہ کسی عورت کے پاس چادر نہ ہو تو دوسری اس کو عاریۃً دے دے تاکہ وہ ستر کے ساتھ عیدگاہ جاکر نماز یا دعا میں شرکت کرسکے (عمدہ ص ۳/۳۹۳)۔

بَابُ اِعۡتِزَالِ الۡحَيَّضِ الۡمُصَلّٰى

(حائضہ عورتوں کا نماز کی جگہ سے علیحدہ رہنے کا بیان)

۹۲۷. حَدَّثَنِیۡ مُحَمَّدُ بۡنُ الۡمُثَنّٰی قَالَ حَدَّثَنَا ابۡنُ اَبِیۡ عَدِیٍّ عَنِ ابۡنِ عَوۡنٍ عَنۡ مُحَمَّدٍ قَالَ قَالَتۡ اُمُّ عَطِیَّةَ اُمِرۡنَا اَنۡ نَخۡرُجَ فَنُخۡرِجَ الۡحُيَّضَ وَالۡعَوَاتِقَ وَذَوَاتِ الۡخُدُوۡرِ وَقَالَ ابۡنُ عَوۡنٍ اَوِالۡعَوَاتِقَ ذَوَاتِ الۡخُدُوۡرِ فَاَمَّا الۡحُيَّضُ فَيَشۡهَدۡنَ جَمَاعَةَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ وَدَعۡوَتَهُمۡ وَيَعۡتَزِلۡنَ مُصَلَّاهُمۡ.

ترجمہ ۹۲۷۔ محمد، ام عطیہ سے روایت کرتے ہیں کہ ام عطیہ نے فرمایا کہ ہمیں حکم دیا گیا کہ باہر نکلیں، چنانچہ حائضہ اور نو جوان اور پردے والی عورتیں باہر نکلیں) عیدگاہ کے لئے) اور ابن عون نے کہا کہ **یاعواتق ذوات الخدور** (یعنی پردے والی نو جوان عورتیں) چنانچہ حائضہ عورتیں مسلمانوں کی جماعت اور انکی دعاؤں میں حاضر ہوتیں، اور ان کی نماز پڑھنے کی جگہوں سے علیحدہ رہتی تھیں۔

تشریح:۔ حافظؒ نے لکھا: حدیث الباب سے جو عورتوں کے لئے نماز عید کے لئے نکلنے کا وجوب اخذ کیا گیا ہے وہ تو محل نظر ہے، کیونکہ اس میں وہ بھی مامور ہیں جو مکلف نہیں ہیں، البتہ ان کے خروج کے مستحب ہونے کا حکم ضرور نکلتا ہے، خواہ وہ عورتیں جوان ہوں یا نہ ہوں اور اچھی شکل و صورت کی ہوں یا نہ ہوں، اور سلف سے اس بارے میں اختلاف نقل ہوا ہے، قاضی عیاض نے حضرت ابوبکر و علی وابن عمرؓ سے وجوب نقل کیا ہے اور ہمارے سامنے ابن ابی شیبہ کا اثر بھی حضرت ابوبکر و علی سے ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہر عورت پر حق ہے کہ وہ عیدین کے لئے نکلے، اس میں حق کے لفظ سے وجوب بھی متحمل ہے اور تاکد استحباب بھی حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حسب استطاعت اپنے اہل کو عیدگاہ لے جاتے تھے، اس سے بھی وجوب کی صراحت نہیں ملتی، بلکہ ان سے ممانعت بھی مروی ہے، ممکن ہے دو مختلف احوال کے لئے ایسا ہوا ہو اور بعض نے ان کے فعل کو استحباب پر ہی محمول کیا ہے، اور اسی کو شافعیہ میں سے جرجانی نے اور حنابلہ میں سے ابن حامد نے اختیار کیا ہے۔ لیکن امام شافعیؒ سے ام میں اچھی صورت شکل والی عورتوں کا استثناء ثابت ہوتا ہے، آپ نے فرمایا کہ میں نماز میں بوڑھی اور کم رو عورتوں کا حاضر ہونا پسند کرتا ہوں اور ان کا عیدوں کے موقع پر شرکت کرنا اور بھی زیادہ پسند کرتا ہوں، امام شافعیؒ نے یہ بھی فرمایا کہ ایک حدیث روایت کی گئی ہے کہ عورتوں کو عیدین جانے کے لئے چھوڑ دیا جائے، پس اگر یہ حدیث صحیح ثابت ہے تو میں بھی اس کا قائل ہوں۔ محدث بیہقی نے کہا کہ یہ ثابت ہے، اور بخاری و مسلم میں بھی ہے، یعنی حدیث ام عطیہ (یہی حدیث الباب بخاری) لہٰذا تمام شافعیہ کو اسی کا قائل ہونا چاہئے لیکن امام طحاوی نے کہا کہ احتمال ہے حضور علیہ السلام نے شروع اسلام میں پردہ نشین اور جوان عورتوں کے نکلنے کا حکم اس لئے کیا ہو کہ اس وقت مسلمان کم تھے۔ عورتوں کی وجہ سے کثرت معلوم ہوگی اور دشمنوں پر رعب قائم ہوگا، اب اس کی ضرورت نہیں ہے، اس پر اعتراض ہوا کہ نسخ تو احتمال کے ذریعے ثابت نہیں ہوسکتا، حافظ نے لکھا کہ ام عطیہ کا فتویٰ بھی امام طحاوی کے خلاف ہے، جو حضور علیہ السلام سے مدت بعد کا ہے۔ پھر یہ کہ کسی صحابی سے بھی اس کی مخالفت ثابت نہیں ہوئی، اور حضرت عائشہؓ کا ارشاد کہ "حضور علیہ السلام اس زمانہ کی عورتوں کے طور طریقوں کو دیکھتے تو ان کو مساجد جانے سے روک دیتے، نادر ہے، اس لئے ام عطیہ کے فتوے سے معارض نہیں ہوسکتا خاص طور سے جبکہ حضرت عائشہؓ نے ممانعت کا صریح فتویٰ بھی نہیں دیا ہے، اور دشمنوں پر رعب کی بات بھی محل نظر اس لئے ہے کہ عورتوں سے مدد لینا اور جنگ کے وقت ان کی وجہ سے اپنی کثرت ظاہر کرنا اپنی کمزوری بتانا ہے، لہٰذا اولیٰ یہ ہے کہ جوان عورتوں کا عیدگاہ جانا امن کی صورت پر رکھا جائے کہ ان کے وہاں جانے سے نہ وہ خود مبتلائے فتنہ ہوں، اور نہ ان کی وجہ سے مرد فتنہ میں پڑیں تو جاسکتی ہیں بشرطیکہ راستوں میں اور جمع ہونے کے مواضع میں بھی مردوں کے ساتھ مزاحمت واختلاط نہ ہو۔ (فتح ص ۳۲۰/۲)

علامہ عینی کی طرف سے اور جواب

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ جو پردہ دار عورتیں گھروں میں رہنے والی ہیں وہ عیدگاہ کے لئے نہ نکلیں اور امام طحاوی نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے، پھر علامہ نے حافظ کے مذکورہ بالا دلائل کا رد کیا ہے اور لکھا کہ دشمنوں پر رعب نہ پڑنے کی بات اس لئے درست نہیں کہ بہر حال عورتوں سے بھی تکثیر سواد ہوتی ہے اور دشمن کثرت سے ڈرتا ہے، اسی لئے آتا ہے کہ اکثر صحابہ بعض فتوحاتِ اسلامیہ میں عورتوں کو بھی ساتھ لے جایا کرتے تھے تا کہ کثرت سے دشمن مرعوب ہوں بلکہ بعض مواضع میں انہوں نے مردوں کی امداد بھی کی ہے اور قتال میں بھی حصہ لیا ہے، مردوں کو بہادری اور جوانمردی کے جوہر دکھانے پر اکسایا بھی ہے۔) اور بعض عورتیں تو مردوں سے بھی زیادہ قوی القلب ہوتی ہیں اور بعض مردوں سے بھی زیادہ میدانِ حرب میں ثابت قدم نکلتی ہیں، اور یہ کہنا کہ عورتوں کی...... کمزوری کی وجہ سے ان پر جہاد بھی فرض نہیں ہوا ہے۔ یہ بھی نا قابل تسلیم ہے کیونکہ نفیر عام کے موقع پر تو عورتوں اور غلاموں پر بھی جہاد فرض ہو جاتا ہے اور وہ بھی اس شان سے کہ وہ اپنے شوہروں اور مالکوں سے بھی اجازت کی محتاج نہ ہوں گے۔

رہا یہ کہ ام عطیہ نے فتویٰ دیا تھا، تو میں کہتا ہوں کہ ان کی ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مقابلہ میں کیا حیثیت ہے؟ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تو مساجد کے بارے میں فرمایا تھا، پھر شہر سے باہر عیدگاہ جانے کو تو وہ اس سے بھی زیادہ ناپسند کرتی ہوں گی۔ (عمدہ ص ۳/۳۹۴)۔

بَابُ النَّحرِ وَالذَّبحِ يَوْمَ النَّحرِ بِالمُصَلّٰى

(عیدگاہ میں نحر اور ذبح کرنے کا بیان)

۹۲۸ . حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِيْ كَثِيْرُ بْنُ فَرْقَدٍ عَنْ نَّافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَنْحَرُ اَوْ يَذْبَحُ بِالْمُصَلّٰى

ترجمہ ۹۲۸۔ حضرت نافع حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نحر یا ذبح عیدگاہ میں کرتے تھے۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ زیادہ بہتر یہی تھا کہ عیدگاہ میں قربانی ہو اور سلاطینِ اسلام بھی عیدگاہ میں ہی قربانی کیا کرتے تھے، حضرت شیخ الہندؒ نے بیان کیا کہ بہادر شاہ عیدگاہ میں جاتا تھا اور نماز پڑھتے ہی اونٹ کو جو کنارہ عیدگاہ پر ہوتا تھا، نحر کرتا تھا، پھر خطبہ میں شرکت کرتا تھا، اور بعد خطبہ کے کباب کھاتا تھا کہ اس عرصہ میں کباب وغیرہ تیار ہو جاتے تھے۔

ظاہر ہے یہ امور دار الاسلام کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ اور دار الحرب کی زندگی میں بہت سے شعائر وسنن سے محرومی ظاہر ہے، اور مجبوری بھی ہے۔ واللہ المسئول ان یوفقنا لما یحب ویرضی بجاہ سید نا النبی الکریم صلے اللہ علیہ وسلم۔

بَابُ كَلَامِ الْاِمَامِ وَالنَّاسِ فِيْ خُطْبَةِ الْعِيْدِ وَاِذَا سُئِلَ الْاِمَامُ عَنْ شَيْءٍ وَّهُوَ يَخْطُبُ

(خطبۂ عید میں امام اور لوگوں کے کلام کرنے کا بیان، اور جب امام سے کچھ پوچھا جائے، جب کہ وہ خطبہ پڑھ رہا ہو)۔

۹۲۹ . حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُو الْاَحْوَصِ قَالَ حَدَّثَنَا مَنْصُوْرُ بْنُ الْمُعْتَمِرِ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ النَّحْرِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَقَالَ مَنْ صَلّٰى صَلٰوتَنَا وَنَسَكَ نُسُكَنَا فَقَدْ اَصَابَ النُّسُكَ وَمَنْ نَّسَكَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فَتِلْكَ شَاةُ لَحْمٍ فَقَامَ اَبُوْ بُرْدَةُ بْنُ نِيَارٍ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللهِ وَاللهِ لَقَدْ نَسَكْتُ قَبْلَ اَنْ اَخْرُجَ اِلَى الصَّلٰوةِ وَعَرَفْتُ اَنَّ الْيَوْمَ يَوْمُ اَكْلٍ وَّشُرْبٍ فَتَعَجَّلْتُ

وَاَکَلْتُ وَاَطْعَمْتُ اَھْلِیْ وَجِیْرَانِیْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تِلْکَ شَاۃُ لَحْمٍ قَالَ فَاِنَّ عِنْدِیْ عَنَاقًا جَزَعَۃً لَّھِیَ خَیْرٌ مِّنْ شَاتَیْ لَحْمٍ فَھَلْ تَجْزِیْ عَنِّیْ قَالَ نَعَمْ وَلَنْ تَجْزِیْ عَنْ اَحَدٍ بَعْدَکَ.

۹۳۰. حَدَّثَنَا حَامِدُ بْنُ عُمَرَ عَنْ حَمَّادِ بْنِ زَیْدٍ عَنْ اَیُّوْبَ عَنْ مُحَمَّدٍ اَنَّ اَنَسَ ابْنَ مَالِکٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَلّٰی یَوْمَ النَّحْرِ ثُمَّ خَطَبَ فَاَمَرَ مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلٰوۃِ اَنْ یُّعِیْدَ ذَبْحَہٗ فَقَامَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ جِیْرَانٌ لِّیْ اِمَّا قَالَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ وَّاِمَّا قَالَ بِھِمْ فَقْرٌ وَّاِنِّیْ ذَبَحْتُ قَبْلَ الصَّلٰوۃِ وَعِنْدِیْ عَنَاقٌ لِّیْ اَحَبُّ مِنْ شَاتَیْ لَحْمٍ فَرَخَّصَ لَہٗ فِیْھَا.

۹۳۱. حَدَّثَنَا مُسْلِمٌ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَۃُ عَنِ الْاَسْوَدِ عَنْ جُنْدُبٍ قَالَ صَلَّی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ النَّحْرِ ثُمَّ خَطَبَ ثُمَّ ذَبَحَ وَقَالَ مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ اَنْ یُّصَلِّیَ فَلْیَذْبَحْ اُخْرٰی مَکَانَھَا وَمَنْ لَّمْ یَذْبَحْ فَلْیَذْبَحْ بِاسْمِ اللّٰہِ.

ترجمہ ۹۲۹۔ شعبی، براء بن عازب سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد یوم نحر میں خطبہ دیا تو آپ نے فرمایا کہ جس نے میری نماز کی طرح نماز پڑھی اور ہماری قربانی کی طرح اس نے قربانی کی، تو اس کی قربانی صحیح ہوئی اور جس نے نماز سے پہلے ذبح کیا تو یہ گوشت کی بکری ہے۔ ابو بردہ بن نیار کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ میں نے تو عید گاہ جانے سے پہلے ہی قربانی کردی اور میں نے سمجھا کہ آج کھانے اور پینے کا دن ہے اس لئے میں نے جلدی کی۔ اور میں نے خود کھایا اور اپنے گھر والوں کو اور پڑوسیوں کو کھلایا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو گوشت کی بکری ہے، ابو بردہ نے کہا، کہ میرے پاس ایک سال سے کم کا بچہ ہے یہ گوشت کی دو بکریوں سے زیادہ بہتر ہے، کیا وہ میری طرف سے کافی ہوجائے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں لیکن تمہارے بعد کسی دوسرے کے لئے کافی نہ ہوگا۔

ترجمہ ۹۳۰۔ حضرت انس بن مالک نے فرمایا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عیدالاضحیٰ کے دن نماز پڑھائی، پھر خطبہ دیا، تو اس خطبہ میں آپ نے حکم دیا کہ جس نے نماز سے پہلے قربانی کی ہے وہ دوبارہ قربانی کرے، انصار میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ میرے پڑوسی ہیں اور وہ فقیر محتاج ہیں اور میں نے نماز سے پہلے ہی (ان کی وجہ سے) ذبح کردیا ہے، اور میرے پاس ایک سال سے کم کا جانور ہے، جو گوشت کی دو بکریوں سے بہتر ہے، آپ نے اسے اس کی اجازت دے دی۔

ترجمہ ۹۳۱۔ حضرت جندبؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عیدالاضحیٰ کے دن نماز پڑھی، پھر خطبہ دیا، پھر ذبح کیا اور فرمایا کہ جس نے نماز سے پہلے ذبح کیا، تو اس کی جگہ پر دوسرا جانور ذبح کرے، اور جس نے ذبح نہیں کیا ہے، تو وہ اب اللہ کے نام سے ذبح کرے۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ کتب حنفیہ میں ۸۔۱۰ خطبے گنوائے ہیں، جن کا سننا واجب ہے، حتیٰ کہ خطبۂ نکاح اور خطبۂ ختم قرآن مجید بھی ہے، شاید کسی لڑکے کا ختم قرآن ہوتا تھا تو جمع ہوکر خطبہ ہوتا ہوگا، کیونکہ یہ مروج ہے، باقی تراویح کے ختم پر تو ہے ہی نہیں، میرے نزدیک خطبۂ جمعہ تو واجب ہے اور عید کا اس سے کچھ کم ہے، اور باقی سب مثل مواعظ کے ہیں کہ کوئی اٹھ جائے، کوئی بیٹھا رہے، عید کا کم اس لئے کہتا ہوں کہ حدیث میں مصرح ہے کہ جس کا جی چاہے چلا جائے اور جو چاہے بیٹھا رہے، ارسال وغیرہ کے جھگڑے پڑے ہوئے ہیں، مگر بے سود۔

رہا خطبہ سننا اور دوسری باتوں وغیرہ میں مشغول نہ ہونا تو ابن الہمام سے تصریح ملی ہے کہ استماع وخاموشی کا حکم ماسوی الامام کے لئے ہے امام کلام کرسکتا ہے اور سوال کا جواب بھی دے سکتا ہے اور شاید امام بخاری نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ بھی خطبۂ عید میں بہ نسبت جمعہ کے وسعت سمجھتے ہوں گے جو میرا بھی مختار ہے، اگرچہ ہماری کتابوں میں دونوں کو برابر کا درجہ دیا گیا ہے۔

قولہ فلیذبح باسم اللہ حضرتؒ نے فرمایا کہ ذبح کے لئے ماثور بسم اللہ واللہ اکبر واو کے ساتھ بھی ہے اور بغیر داد کے بھی

ہے اور ایسے ہی کھانے کے وقت بھی ہے، البتہ وضو سے پہلے معجم طبرانی میں بسم اللہ و الحمدللہ وارد ہے، عینی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے، مگر میں نے اس میں علت دیکھی ہے پھر فرمایا کہ اہلال کے لئے تکبیر ہی آئی ہے، اسی لئے وہ نماز سے پہلے بھی ہے اور ذبح کے وقت بھی بخلاف تسبیح وغیرہ کے کہ وہ ان کے لئے کہیں وارد نہیں ہوئیں، کیونکہ اہلال کسی چیز کو خالص اللہ کے لئے گردانتا اور قرار دینا ہے، جو نماز و ذبح دونوں کے لئے ضروری ہے، کیونکہ غیر مسلم بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور ان ہی کے نام پر ذبح بھی کرتے ہیں۔

بَابُ مَنْ خَالَفَ الطَّرِيْقَ اِذَارَجَعَ يَوْمَ الْعِيْدِ

(عید کے دن راستہ بدل کر واپس ہونے کا بیان)

۹۳۲. حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ قَالَ اَخْبَرَنَا اَبُوْ تَمِيْلَةَ يَحْيَى بْنُ وَاضِحٍ عَنْ فُلَيْحِ بْنِ سُلَيْمَانَ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْحَارِثِ عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ يَوْمُ عِيْدٍ خَالَفَ الطَّرِيْقَ تَابَعَهُ يُوْنُسُ بْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ فُلَيْحٍ عَنْ سَعِيْدٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَحَدِيْثُ جَابِرٍ اَصَحُّ.

ترجمہ ۹۳۲۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ جب عید کا دن ہوتا تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم واپسی میں راستہ بدل کر آتے۔

تشریح:۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ عیدگاہ کو ایک راستہ سے جانا اور دوسرے سے آنے میں نیک فال ہے، کیونکہ اسی سے واپسی ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جیسے پہلے کام کو ادھیڑ دیا، دوسرے اس میں اظہارِ شوکت بھی ہے، اور اسی لئے وہ بچوں اور عورتوں کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ کابل میں امیر حبیب اللہ کے زمانہ تک بادشاہ بھی عیدگاہ جاتا تھا، اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہ بھی، غرض شوکت کا اظہار جس طرح ہو بہتر ہے۔ علامہ عینی نے بیس وجہ راستہ بدلنے کی ذکر کی ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں: دونوں راستے گواہی دیں گے، دونوں راستوں کے جن وانسان گواہ ہوں گے، دونوں راستوں کے ساکن اس خوشی میں شریک ہوں گے۔ راستہ بدلنے میں فال نیک ہے کہ حال بھی بدلا ہے اور حق تعالیٰ کی رضا اور مغفرت لے کر لوٹے ہیں۔ دونوں راستوں کے اقارب احیاء واموات کی زیارت حاصل ہوگی۔ (عمدہ ص ۳/ ۳۹۷)۔

بَابٌ اِذَا فَاتَهُ الْعِيْدُ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ وَكَذٰلِكَ النِّسَآءُ وَمَنْ كَانَ فِي الْبُيُوْتِ وَالْقُرٰى لِقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا عِيْدُنَا يَا اَهْلَ الْاِسْلَامِ وَاَمَرَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ مَوْلَاهُ ابْنَ اَبِيْ عُتْبَةَ بِالزَّاوِيَةِ فَجَمَعَ اَهْلَهٗ وَبَنِيْهِ وَصَلّٰى كَصَلٰوةِ اَهْلِ الْمِصْرِ وَتَكْبِيْرِهِمْ وَقَالَ عِكْرِمَةُ اَهْلُ السَّوَادِ يَجْتَمِعُوْنَ فِي الْعِيْدِ يُصَلُّوْنَ رَكْعَتَيْنِ كَمَا يَصْنَعُ الْاِمَامُ وَقَالَ عَطَآءٌ اِذَا فَاتَهُ الْعِيْدُ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ۔ (جب عید کی نماز فوت ہو جائے تو دو رکعتیں پڑھ لے عورتیں بھی، اور جو لوگ گھروں میں اور گاؤں میں ہوں، ایسا ہی کریں، کیونکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اے مسلمانو! یہ ہماری عید کا دن ہے، اور انس بن مالک نے اپنے غلام ابن ابی عتبہ کو زاویہ میں حکم دیا، تو انہوں نے ان کے گھر والوں اور بیٹوں کو جمع کیا اور شہر والوں کی نماز اور تکبیر کی طرح نماز پڑھی اور عکرمہ نے کہا کہ دیہات کے لوگ عید میں جمع ہوں، اور دو رکعت نماز پڑھیں، جس طرح امام کرتا ہے، اور عطا نے کہا کہ جب اس کی عید کی نماز فوت ہو جائے تو دو رکعتیں پڑھ لے۔)

۹۳۳. حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ اَبَابَكْرٍ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا جَارِيَتَانِ فِيْ اَيَّامِ مِنًى تُدَفِّفَانِ وَتَضْرِبَانِ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَغَشٍّ بِثَوْبِهٖ فَانْتَهَرَهُمَا اَبُوْبَكْرٍ فَكَشَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَّجْهِهٖ فَقَالَ دَعْهُمَا يَا اَبَابَكْرٍ فَاِنَّهَا اَيَّامُ عِيْدٍ وَّتِلْكَ الْاَيَّامُ اَيَّامُ مِنًى وَّقَالَتْ عَآئِشَةُ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتُرُنِيْ وَاَنَا اَنْظُرُ اِلَى الْحَبَشَةِ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ فِي

الْمَسْجِدِا فَزَجَرَهُمْ عُمَرُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّے اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْهُمْ اَمْنًا بَنِي اَرفَدَةَ يَعْنِي مِنَ الاَمْنِ.

ترجمہ۹۳۳۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ ان کے پاس آئے اور ان کے پاس ایام منی میں دولڑکیاں تھیں جو دف بجا کر گا رہی تھیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنا چہرہ کپڑے سے ڈھانپے ہوئے لیٹے تھے۔ حضرت ابوبکر نے ان لڑکیوں کو ڈانٹا تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا کہ اے ابوبکرؓ ان دونوں کو چھوڑ دو اس لئے کہ یہ عید کے دن ہیں، اور یہ دن منی کے ہیں۔ اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم مجھے چھپا رہے ہیں، اور میں حبشیوں کی طرف دیکھ رہی ہوں، کہ وہ مسجد میں کھیل رہے ہیں، ان کو عمرؓ نے ڈانٹا، تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں چھوڑ دو اے بنی ارفدہ تم اطمینان سے کھیلو۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں دو مسئلے ہیں ایک تو دیہات میں عید کی نماز جائز ہونے کا، دوسرے اس کی قضا کا مثل اداء کے مع تکبیرات کے کہ وہ جمعہ کی طرح نہیں ہے، جس کی قضا نہیں ہے، اور اس کی جگہ ظہر پڑھی جائے گی امام بخاری نے دونوں مسئلوں کو ایک ہی ترجمۃ الباب میں رکھ دیا ہے، اسی لئے وہ عورتوں کا ذکر بھی لائے ہیں اور ان لوگوں کا بھی جو دیہات میں رہتے ہیں، جبکہ جمعہ کے بیان میں امام بخاری نے عورتوں اور بچوں کو مستثنیٰ کیا تھا، لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ جو بھی عید کی نماز کا دیہات میں قائل ہو وہ جمعہ فی القریٰ کا بھی قائل ہو، پھر یہ کہ ہمارے یہاں درمختار میں مسئلہ ہے کہ سنتوں کی قضا نہیں ہے، اس میں مسامحت ہوئی ہے، عنایہ شرح ہدایہ میں ہے کہ ان کی بھی قضا ہے لیکن وہ مرتبہ سنت میں نہیں رہتی، بدرجۂ مستحب ہو جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت کا ثبوت حضور علیہ السلام کے استمرار فعل سے ہوتا ہے اور اس فعل کا تعلق اسی وقت کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب وقت چلا گیا تو اس کی اہمیت بھی وہ نہ رہی، بخلاف فرض و واجب کے کہ وہ امر و قول سے ثابت ہوتا ہے، لہٰذا وقت کے بعد بھی وہ امر متوجہ رہے گا اور مطالبہ باقی رہے گا، اسی سے علماءِ اصول نے لکھا ہے کہ موجب وقت میں امر ہے، اگر وقت پر ادا نہ کیا تب بھی مطالبہ مستمر رہا، سنن فعلی ہیں، لہٰذا وہ وقت کے ساتھ مخصوص ہو گئیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ مالکیہ کی ''مختصر خلیل'' میں عجیب بات دیکھی کہ سنن کی قضا حرام ہے، اس کو دیکھ کر تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، کس طرح ایسی بات لکھ دی۔

غرض جب ہمارے یہاں بھی سنتوں کی قضا ہے تو فوت ہونے پر بعد کو پڑھ لے گا، مگر تکبیرات نہ ہوں گی، یہ میں کہتا ہوں ورنہ کتب فقہ میں تکبیرات کے بارے میں کچھ نہیں ہے۔ ضمناً فرمایا کہ مولانا عبدالحیٔ صاحب صاحب لکھنویؒ کی سعایہ اور کتابوں سے اعلیٰ سے مولوی عبدالحق خیرآبادی کی بھی بہت سی کتابیں دیکھ چکا ہوں، سوائے حل لغات کے کچھ نہیں ہے۔ ان سے زیادہ معقول مولانا عبدالحیٔ صاحب کو آتی تھی۔ لیکن دینیات میں ان کے پاس صرف نقل تھی۔ فرمایا کہ اگر کسی مصنف کی کتابیں پڑھ کر اس کے علم کا درجہ معلوم نہ کر سکے تو ایسے مطالعہ سے کیا فائدہ؟

حضرت انسؓ کا اثر بھی امام بخاری نے یہاں پیش کیا ہے، جو جمعہ فی القریٰ کے قائل نہ تھے کہ جب وہ بصرہ میں آتے تھے تو جمعہ پڑھا کرتے تھے، اور نہ ظہر۔ اور عید کی قضا کے قائل ہم بھی ہیں۔ لہٰذا قضا ماننے سے یہ لازم نہیں کہ اس کو وہ دیہات میں فرض مانتے ہوں، البتہ حضرت عکرمہ دیہات میں نماز عید قائم کرنے کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت عطاء نے جمعہ فی القریٰ میں حنفیہ کی موافقت کی ہے، لہٰذا وہ بھی حنفیہ کی طرح قضاءِ عید کے قائل ہوں گے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ کوئی صراحت امام بخاری سے بھی اس امر کی نہیں ہے کہ وہ دیہات میں عید قائم کرنے کے قائل ہیں، کیونکہ انہوں نے فائتہ کا مسئلہ لکھا ہے، ہوسکتا ہے کہ اعادہ فوات کے سبب کیا ہو، نہ اس کے لئے کہ نمازِ عید دیہات میں فرض ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ علماء نے جو جمعہ کی قضا نہیں رکھی، اور اس کے فوت ہونے پر ظہر پڑھنے کو کہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل ظہر ہے اور جمعہ اس کا بدل ہے، اسی لئے جمعہ قائم کرنے کے لئے شرائط ہیں جن کے تحقق و یقین کے بغیر اس کو قائم نہیں کر سکتے اور جہاں جمعہ کی

شرائط پوری ہوں، وہاں اس کو قائم کرنا بھی ضروری ہے (لہٰذا عید اگر جمعہ کے دن واقع ہو تو اس دن میں جمعہ کو ساقط کر دینا بھی بغیر کسی حجتِ شرعیہ قطعیہ کے صحیح نہ ہوگا) اس کی بحث عنقریب آ رہی ہے۔ ان شاء اللہ۔

بَابُ الصَّلٰوةِ قَبْلَ الْعِيْدِ وَبَعْدَهَا وَقَالَ اَبُو الْمُعَلّٰى سَمِعْتُ سَعِيْدًا عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ كَرِهَ الصَّلٰوةَ قَبْلَ الْعِيْدِ

(عید کی نماز سے پہلے اور اس کے بعد نماز پڑھنے کا بیان، اور ابوالمعلے نے کہا، میں نے سعید کو ابن عباس کے متعلق کہتے ہوئے سنا کہ انہوں نے عید کی نماز سے پہلے نماز کو مکروہ سمجھا)

۹۳۴۔ حَدَّثَنَا اَبُو الْوَلِيْدِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ اَخْبَرَنِىْ عَدِىُّ ابْنُ ثَابِتٍ قَالَ سَمِعْتُ سَعِيْدَ بْنَ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمَ الْفِطْرِ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهَا وَلَا بَعْدَهَا وَمَعَهٗ بِلَالٌ

ترجمہ ۹۳۴۔ حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن نکلے اور دو رکعت نماز اس طرح پڑھی کہ نہ تو اس سے پہلے نماز پڑھی اور نہ اس کے بعد پڑھی اور آپ کے ساتھ بلالؓ تھے۔

تشریح:۔ عید کے دن نمازِ عید سے قبل نوافل حتیٰ کہ نمازِ اشراق بھی مکروہ ہے، البتہ بعد کو نفل پڑھ سکتے ہیں مگر وہ بھی گھر واپس آ کر، عید گاہ میں وہ بھی نہ پڑھے، کیونکہ حضور علیہ السلام سے وہاں پڑھنا ماثور نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تکملہ بحث نمازِ جمعہ وعیدین

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جمعہ فی القریٰ کا مسئلہ موافقِ حنفیہ کے بخاری ص ۸۳۵ کتاب الاضاحی میں ہے، جہاں حضرت عثمانؓ سے نمازِ عید جمعہ کے دن پڑھانے کا ذکر ہے اور آپ نے خطبۂ عید میں فرمایا کہ تم میں سے جو اردگرد کے دیہات کے لوگ ہیں وہ چاہیں تو جمعہ کی نماز تک ٹھہریں اور جو لوٹنا چاہیں، ان کو اجازت ہے جا سکتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ دیہات کے لوگوں پر جمعہ نہیں ہے، اگر شہر میں ہوں تو پڑھ لیں، ورنہ نہیں، دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ عید جمعہ کے دن ہو تو اس دن بھی شہر میں نمازِ جمعہ ہوگی، جس کی بحث ہم یہاں ذرا تفصیل سے لکھیں گے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت علیؓ سے تو لا جمعة و لا تشريق الا فى مصر جامع او مدينه عظيمة وارد ہے (مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲/۱۰۱) اور حضرت عمرؓ سے بھی شہروں کے لئے ہی جمعہ کا ثبوت ہے، (حضرت لیث بن سعد نے نقل کیا کہ حضرت عمر و عثمانؓ کے زمانوں میں، ان کے حکم سے اسکندریہ، مدائن مصر اور مدائنِ سواحل کے لوگ جمعہ پڑھا کرتے تھے، (اعلاء السنن ص ۸/۸) اور حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا تھا کہ جمعہ کہاں قائم کریں تو آپ نے انہیں لکھا کہ جہاں تم لوگ (عامل و گورنر و حکام) رہتے ہو، وہاں قائم کرو (اعلاء ص ۸/۹) معلوم ہوا کہ تینوں خلفاء کے زمانوں میں جمعہ دیہات میں نہ تھا۔ اور صرف شہروں میں قائم تھا۔ مصنف میں باب قائم کر کے حضرت حذیفہ وغیرہ سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ جمعہ صرف شہروں کے لئے ہے۔ مفصل بحث جمعہ کے باب میں گزر چکی ہے۔

اجتماعِ عیدین کے دن جمعہ ساقط نہ ہوگا

اس کیلئے ایک دلیل تو ابھی بخاری ص ۸۳۵ سے نقل ہوئی ہے جس پر حافظ نے ص ۲۰/۱۰ میں لکھا: قوله فقد اذنت له سے اس نے استدلال کیا ہے جو عید کی نماز پڑھنے سے جمعہ کو ساقط کرتے ہیں، اور یہ قول امام احمدؒ سے بھی نقل ہوا ہے جواب یہ کہ اجازت دینے سے اس امر کی تصریح نہیں ملتی کہ وہ نہ لوٹیں، اسلئے بہت سے لوگوں نے لوٹ کر جمعہ پڑھا بھی ہوگا، دوسرے ظاہرِ حدیث سے معلوم ہوا کہ جن کو اجازت

دی تھی وہ اہلِ عوالی تھے، یعنی قریبی بستیوں کے رہنے والے جن پر دور ہونے کی وجہ سے جمعہ واجب نہیں تھا، تیسرے یہ کہ اصل مسئلہ (وجوبِ جمعہ) کیلئے حدیث مرفوع موجود ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دیہات والوں پر جمعہ حافظ کے نزدیک بھی فرض نہیں ہے، واللہ اعلم۔

علامہ عینی رحمہ اللہ: ص۲۱/۱۶۱ میں لکھا: عوالی، عالیہ کی جمع ہے، اس سے مراد مدینہ طیبہ سے ملحقہ شرقی دیہات ہیں، جن میں سے زیادہ قریب تین چار میل کے فاصلہ پر تھے اور زیادہ دور والے آٹھ میل پر تھے، **قولہ فلینتظر** سے مراد یہ ہے کہ اتنی دیر کریں کہ جمعہ پڑھ سکیں۔ قولہ ان یرجع سے مراد اپنے اپنے گھروں کو لوٹنا ہے کہ اس کی حضرت عثمانؓ نے اجازت دی، اس سے امام احمدؒ نے سقوطِ جمعہ پر استدلال کیا ہے، اور امام مالک نے بھی ایک مرتبہ ایسا کہا تھا جواب یہ ہے کہ وہ لوگ قریبی دیہات سے عید و جمعہ کے لئے شہر میں آتے تھے، جن پر آنا واجب نہیں تھا، لہٰذا حضرت عثمانؓ نے ان کو لوٹ جانے کی اجازت بتائی۔

علامہ ابن رشدؒ: لکھا: ایک دن میں عید اور جمعہ دونوں جمع ہوں تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ عید کی نماز کافی ہے اور اس دن جمعہ وظہر فرض نہیں صرف عصر کی نماز پڑھے گا، یہ عطاء کا قول ہے اور حضرت ابن زبیر و علیؓ سے بھی مروی ہے، دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ یہ رخصت صرف دیہات والوں کے واسطے ہے جو شہروں میں خاص طور سے عید اور جمعہ کے لئے آجاتے ہیں جیسا کہ حضرت عثمانؓ نے خطبۂ عید میں جمعہ کے دن فرمایا کہ باہر کے دیہات والوں میں سے جو جمعہ کا انتظار کرنا چاہے وہ انتظار کرے اور جو لوٹنا چاہے وہ لوٹ جائے، (موطّا وامام مالک) اور ایسا ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے بھی مروی ہے، اور یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے اور امام مالک وابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ جب عید و جمعہ ایک دن میں جمع ہوں تو مکلّف بندہ دونوں کا مخاطب ہے، عید کی نماز سنت ہونے کی وجہ سے اور جمعہ کی فرض ہونے کے سبب سے اور کوئی ایک نماز دوسری کے قائم مقام نہ ہوگی، یہی اصلِ شرعی ہے الا یہ کہ اس بارے میں دوسری اصلِ شرع آئے، جس پر عمل کریں اور حضرت عثمانؓ کے قول سے بھی استدلال اس لئے ہے کہ انہوں نے ایک ایسی بات کہی جو رائے سے نہیں کہی جا سکتی ہے، اور وہ امرِ توقیفی ہے۔ لہٰذا وہ بھی اصولِ شرعیہ کے تحت ہی ہے، البتہ فرضِ ظہر اور جمعہ کا اسقاط نمازِ عید کی وجہ سے، یہ بات بغیر دوسری دلیل واصلِ شرع کے ہے اور اصولِ شرع کے بہت ہی زیادہ خلاف ہے۔ (بدایۃ المجتہد ص۱/۱۸۶)

حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ

آپ نے امیر یمانی کا قول نقل کیا کہ حدیثِ ابن زبیرؓ سے ثابت ہوا کہ نمازِ عید پڑھ لینے کے بعد نمازِ جمعہ رخصت واختیاری ہے، چاہے کوئی پڑھے یا نہ پڑھے البتہ امام اور تین آدمی اس کے ساتھ نمازِ جمعہ پڑھیں گے عطاء کے نزدیک یہ حکم رخصت کا سب کے لئے ہے، امام وغیرہ کا استثناء بھی نہیں ہے۔ پھر حضرتؒ نے امام شافعیؒ کا ارشاد ام سے نقل کر کے لکھا کہ حدیثِ ابی داؤدؒ میں انا مجمعون صریح وواضح ہے کہ اہلِ مدینہ پڑھیں گے اور رخصت صرف اہلِ قریٰ کے لئے تھی اور ابن عباس وابن زبیر دونوں صغیر السن بھی تھے، ممکن ہے انہوں نے اس اعلان کو سبھی کے لئے سمجھ لیا ہو اور اس پر عمل کر لیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابن زبیر نے جو تاخیر کر کے قبل الزوال دو رکعت پڑھیں وہ جمعہ ہی کی نیت سے پڑھی ہوں اور اسی میں نمازِ عید کی نیت کر لی ہو تا کہ دیہات کے لوگوں کو نصیحت ہو، اور شاید وہ بعض دوسروں کی طرح قبل الزوال جمعہ کو درست مانتے ہوں، (بذل ص۲/۱۷۳) یہ توجیہ اس لئے بہتر ہے کہ حضرت ابن زبیرؓ کی طرف یہ نسبت کرنا کہ اس روز انہوں نے نہ جمعہ کی نماز پڑھی نہ ظہر اور یہ کہ عید کے بعد صرف عصر پڑھی، ان کی شان سے بہت مستبعد ہے۔

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم

حافظ کے قول و ھو المحکی عن احمد یہ لکھا کہ میں نے الروض وغیرہ ان کی فروع کی کتابوں میں امام احمد کا قول ایسا نہیں پایا۔

۱ے اوجز ص۲/۳۴۲ میں ہے کہ کتب فروع حنابلہ الروض وغیرہ میں امام احمدؒ سے اس کی نقل نہیں ہے، لہٰذا اس کے قائل بعض حنابلہ اور ابن تیمیہ ہی معلوم ہوتے ہیں واللہ اعلم

۲ے اوپر ہم نے بخاری شریف ص۸۳۵ سے بھی یہی حدیث نقل کی ہے، چونکہ وہ غیر مظان میں ہے، اس لئے اکثر بحث کرنے والے اس کا حوالہ نہیں دیتے، واللہ اعلم (مؤلف)

باقی نقل اس کو عینی نے بھی کر دیا ہے بلکہ انہوں نے امام مالک کی طرف بھی نسبت کی ہے۔ اس کے بعد حضرت نے امام شافعیؒ کی ام اور رافعی کی شرح الاحیاء کی عبارات نقل کیں کہ شہر کے لوگوں کے واسطے عید کے دن ترکِ جمعہ بلا عذر جائز نہیں ہے، صرف دیہات والوں کے لئے یہ گنجائش ہے کہ وہ عید پڑھ کر اپنے دیہات کو لوٹ جائیں اور جمعہ کے لئے نہ ٹھہریں، امام شافعی کے قولِ جدید و قدیم میں اسی طرح مصرح ہے، اور ایک شاذ قول یہ بھی ہے کہ ان کو بھی جمعہ کے لئے ٹھہرنا چاہئے۔

مالکیہ اور حنفیہ بھی اسی کے قائل ہیں ان کی دلیل ایک تو یہی ہے کہ اجازت صرف اہلِ عالیہ کے لئے ہے، دوسرے یہ بھی حدیث میں ہے کہ ہم جمعہ پڑھیں گے۔ یہ شہر والوں کے لئے صریح حکم معلوم ہوا، طحاوی میں بھی ذکوان سے مروی ہے کہ ہم جمعہ پڑھیں گے۔ اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں نمازِ جمعہ کی فرضیت ہے اس میں عید کے دن کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے سب دنوں کے لئے یکساں حکم ہے اس کے مقابلہ میں کوئی دلیل اسقاطِ جمعہ کے لئے ثابت نہیں ہے۔ (اوجز ص ۲/۲۴۱)

جد ابن تیمیہؒ کی رائے

جد ابن تیمیہ ابوالبرکات مجدالدین عبدالسلام معروف با بن تیمیہ م ۶۵۲ھ نے اپنی گرانقدر حدیثی تالیف منتقی الاخبار میں " **باب ما جاء فی اجتماع العید و الجمعه** " قائم کر کے زید بن ارقم، حضرت ابو ہریرہ، وہب بن کیسان اور عطاء کے مرویہ آثار ذکر کئے اور ابن الزبیرؓ کا اثر نقل کر کے یہ بھی لکھا کہ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ جمعہ قبل الزوال کے قائل ہوں گے، لہٰذا جمعہ کو مقدم کر دیا ہوگا اور اس کو نمازِ عید سے بھی کافی سمجھا ہوگا۔

اس کو نقل کر کے شارح المنتقی، علامہ شوکانی م ۱۲۵۰ھ نے ریمارک کیا کہ اس توجیہ میں جو تعسف (بے راہ روی یا کج روی ہے، وہ ظاہر و باہر ہے، پھر موفق مغنی بن قدامہ کی عبارت نقل کر دی، جس میں طرفین کے دلائل کا ذکر ہے (بستان الاحبار ص ۱/ ۳۹۷)۔

علامہ ابن تیمیہ کے ارشادات

ناظرین کے سامنے امیر یمانی کا استدلال اور شوکانی کی درازلسانی آ چکی اب علامہ ابن تیمیہؒ م ۷۲۸ھ کی تحقیق بھی ملاحظہ کی جائے، جو نہ صرف اپنے نانا جان کے خلاف ہے، بلکہ جمہور کے بھی مخالف ہے اور خاص طور سے ان کے حسبِ عادت دعاوی اور عقلی دلائل قابلِ مطالعہ ہیں۔

(۱) عید اگر جمعہ کے دن واقع ہو تو علماء کے اس بارے میں تین قول ہیں۔ ۱۔ نمازِ عید پڑھنے والے پر نمازِ جمعہ بھی واجب ہے جیسے کہ اور سب دنوں میں واجب ہے دلائلِ وجوب عامہ کی وجہ سے۔ ۲۔ ملحقہ دیہات و عوالی کے لوگوں سے جمعہ ساقط ہے، کیونکہ حضرت عثمانؓ نے ان کو نمازِ عید پڑھا کر ترکِ جمعہ کی رخصت دی تھی۔ ۳۔ جو بھی نمازِ عید پڑھ لے، اس سے جمعہ ساقط ہو جائے گا، لیکن امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ جمعہ قائم کرے تا کہ جو پڑھنا چاہے وہ پڑھ لے اور وہ بھی پڑھ لیں جنہوں نے عید کی نماز نہیں پڑھی ہے۔

یہی تیسری صورت صحیح ہے اور یہی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ، حضرت عمرؓ، عثمانؓ، ابن مسعود...... ابن عباسؓ و ابن زبیرؓ و غیرہم سے منقول ہے اور صحابہ میں سے کسی سے اس کا خلاف معروف نہیں ہے۔

پہلے دو قول جن کے ہیں ان کو اس بارے میں سنتِ نبویہ کا علم نہیں ہوا کہ حضور علیہ السلام نے عید کی نماز پڑھا کر جمعہ کے بارے میں لوگوں کو رخصت دے دی تھی اور ایک روایت ان الفاظ سے ہے کہ تم نے (عید پڑھ کر) خیر حاصل کر لی، اب جس کا جی چاہے وہ جمعہ پڑھے، لیکن ہم تو جمعہ پڑھیں گے۔ (علامہ نے غور نہیں فرمایا کہ یہ تقسیم کیوں تھی؟ اس لئے تو تھی کہ باہر کے لوگ واپس جا سکتے تھے اور مدینہ کے لوگ حضور علیہ السلام کے ساتھ جمعہ پڑھنے والے تھے) دوسرے یہ کہ جب ایک شخص نے نمازِ عید میں شرکت کر لی تو اجتماع کا مقصد حاصل ہو چکا۔ (یعنی جمعہ کا مقصودِ اجتماع عید سے پورا ہو گیا) اب اگر وہ جمعہ نہ پڑھے گا اور اس کی جگہ ظہر اس کے وقت میں پڑھ لے گا تو کام پورا ہو گیا کہ عید

سے مقصودِ جمعہ بھی حاصل ہو گیا تھا۔ تیسرے یہ کہ اگر جمعہ کو بھی عید کے دن واجب قرار دیں تو لوگوں پر تنگی و سختی ہوگی، اوران کی عید کا مقصود فوت ہوگا کہ ان کے لئے عید کے دن سرور وانبساط تجویز کیا گیا ہے، اگران کو اس سے روک دیں گے تو عید کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ چوتھے یہ کہ جمعہ کا دن بھی عید ہے اور فطر ونحر کا دن بھی عید ہے، اور شارع علیہ السلام کی سنت ہے کہ جب دو عبادتیں ایک جنس کی جمع ہوتی ہیں تو ایک کو دوسری میں داخل اور مدغم کر دیا جاتا ہے، جیسے وضو غسل کے اندر اور ایک غسل دوسرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں ہوگا۔ واللہ اعلم (فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۱/۱۵۰ طبع مصر ۱۹۶۶ء)۔

(۳) دوسری بار پھر ایک کے سوال پر تحریر کیا کہ اس بارے میں فقہاء کے تین قول ہیں۔ ا۔ جمعہ عید پڑھنے والے پر بھی ہے اور نہ پڑھنے والے پر بھی۔ امام مالک وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ ۲۔ جمعہ ان لوگوں سے ساقط ہے جو نواحی وسوادِ مصر کے ساکن ہیں، جیسا کہ حضرت عثمان سے مروی ہے کہ انہوں نے دیہات کے لوگوں کو جانے کی اجازت دی، اس کو امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے۔ ۳۔ جس نے عید پڑھ لی، اس سے جمعہ کی نماز ساقط ہوگئی، لیکن امام کو جمعہ قائم کرنا چاہئے، جیسا کہ سنن میں ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے عید کی نماز پڑھا کر جمعہ کی رخصت دے دی۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ نے رخصت دے کر فرمایا کہ ہم تو جمعہ پڑھیں گے۔ ان کے علاوہ سنن میں تیسری حدیث بھی ہے کہ ابن الزبیرؓ نے اول دن میں دونوں نمازوں کو جمع کیا، پھر صرف نمازِ عصر پڑھی (یعنی جمعہ کی نماز نہیں پڑھی) اور کہا کہ حضرت عمرؓ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ پھر یہی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم، نیز آپ کے خلفاء وصحابہ سے بھی ثابت ہے۔ اور یہی قول ان کا ہے جن کو اس کی خبر مل گئی جیسے امام احمد وغیرہ اور جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی ہے وہ ہیں جن کو اس بارے میں سنن وآثار نہیں پہنچے ہیں۔ واللہ اعلم۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۱/۱۷۳) حنابلہ وہ علامہ ابن تیمیہ کے جواب میں مزید تفصیل ودلائل کے لئے ملاحظہ ہو اعلاء السنن ص ۸/۵۲ واوجز ص ۲/۲۴۱ و بدایۃ المجتہد ص ۱/۱۸۶ وانوارالباری ص ۱۵/۱۰۹)۔

ابواب الوتر (احادیث نمبر ۹۳۵ تا ۹۴۸)

یہاں سے ہم متنِ بخاری شریف اور ترجمہ کا التزام ختم کرتے ہیں، کیونکہ اس سے شرحِ بخاری کا حجم بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ ابھی چوتھے پارے کے بھی سات ورق باقی ہیں، اور انوارالباری کا مع مقدمہ کے یہ اٹھارواں حصہ چل رہا ہے خیال ہے کہ اگر متن وترجمہ کا التزام آخر تک رکھا جائے گا تو پوری کتاب پینتالیس سے بھی زیادہ حصوں میں آئے گی عربی شروحِ حدیث مطبوعہ ہند، فیض الباری، لامع الدراری، العرف الشذی وانوار المحمود وغیرہ میں بھی متن وترجمہ کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ پاکستان والے متن وترجمہ کو بھی ساتھ کر دیں، وہاں بھی خدا کا شکر ہے۔ انوارالباری کی طباعت واشاعت کا انتظام ہو گیا ہے بلکہ مقدمہ کی دونوں جلدیں بہت عمدہ طباعت کے ساتھ، خوب صورت سنہری جلد میں شائع ہو چکی ہیں، اور موجودہ سترہ جلدیں شائع کرنے کے بعد وہ باقی حصے بھی وہیں طبع کرا کر شائع کرتے رہیں گے ان شاء اللہ العزیز۔ وہاں قوتِ خرید بھی زیادہ ہے اور قدر دان بھی ماشاء اللہ بہت زیادہ ہیں۔

امام بخاریؒ نے وتر سے متعلق سات ابواب وتراجم قائم کئے ہیں، جن میں ۱۳ حدیث مرفوع اور ایک اثرِ صحابی ذکر کیا ہے۔ پہلے باب میں نمازِ وتر کی اہمیت زیادہ واضح کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وجوبِ وتر کے مسلک میں امام ابوحنیفہؒ کی موافقت کر رہے ہیں، اور حافظ ابن حجرؒ نے امام بخاری کے سواری دابہ کے وقت جوازِ وتر سے جو امام صاحب کی مخالفت سمجھی ہے، اس پر علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ یہ کیا ضروری ہے کہ حنفیہ وشافعیہ کی طرح وہ بھی دابہ پر فرض وواجب نماز کو بلا عذر غیر درست ہی سمجھتے ہوں، وہ کسی کے مقلد تو ہیں نہیں، یا حالت سفر کو عذر کا درجہ دیا ہو، اور شاید اسی لئے امام بخاریؒ نے باب الوتر علے الدابہ کا عنوان دیا ہے۔ کیچڑ، دلدل یا بارش وغیرہ کو تو حالتِ عذر

سب ہی مانتے ہیں کہ اس میں فرض بھی سواری پر درست ہوتے ہیں۔ اور امام طحاویؒ نے لکھا کہ قدارتِ قیام کے وقت وتر بیٹھ کر پڑھنا بھی سب کے نزدیک بالاتفاق ناجائز ہے، اس سے بھی وجوب کی شق راجح ہوتی ہے۔

افادۂ انور: حضرتؒ نے فرمایا کہ ابوابِ وتر میں ایک بات سب سے اہم یہ بھی ہے کہ صلوٰۃ اللیل (نماز تہجد) اور وتر دو الگ الگ نمازیں ہیں یا ایک ہیں، تمام محدثین تو ہر ایک کیلئے باب الگ الگ ہی قائم کرتے ہیں، امام بخاریؒ نے بھی ایسا ہی کیا ہے، پھر چونکہ دونوں میں باہم ایک قسم کا رابطہ واتصال بھی ہے۔ اسی لئے صلوٰۃ اللیل کا ذکر ابواب وتر میں اور برعکس بھی آتا ہے۔ اور یہی حنفیہ کا نقطۂ نظر بھی ہے، کہ نمازِ وتر صلوٰۃ اللیل کا ایک ٹکڑا ہے جو اس سے بہ لحاظِ صورت، قراءت ورکعات وغیرہ الگ مستقل وممتاز ہے، برخلاف شافعیہ کے کہ ان کے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں بجز اس کے کہ وتر کی صرف ایک رکعت ہے، اسی لئے ان کے یہاں ایک ہزار رکعت بھی ایک سلام کے ساتھ مشروع ہیں۔

یہی وجہ ہوئی کہ جن کے نزدیک دونوں میں فرق نہیں، وہ وجوبِ وتر کے بھی قائل نہ ہو سکے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کا اپنے اہل کو وتر کے لئے اٹھانا، (نہ کہ تہجد کے لئے) اور جو سو کر آخر رات میں نہ اٹھ سکے، اس کو اول شب میں اداءِ وتر کا حکم فرمانا، فوت ہونے پر قضاء کا حکم کرنا، وتر کے لئے الگ سے قراءتِ سور کی تعیین، اور وتر کے لئے وقت ورکعات کی بھی تعیین، پھر ترکِ نمازِ وتر کو بھی جائز نہ رکھنا، یہ سب امور ایسے ہیں جو وجوب کی کھلی علامات ہیں۔ پھر صرف اس میں نزاع رہ جاتا ہے کہ اس پر لفظِ وجوب کا اطلاق کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ یہ بات نزاع کا سبب بننے کے لائق نہیں ہے۔

تفردِ امام اعظمؒ کا دعویٰ

مندرجہ بالا وضاحت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ وجوب وسنیتِ وتر کے مسئلہ کو ضرورت سے زیادہ نزاعی ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامہ عینی نے لکھا کہ قاضی ابوالطیب نے یہ بھی دعویٰ کر دیا کہ سارے علماء وائمہ تو ایک طرف ہیں جو وتر کو سنت مانتے ہیں حتیٰ کہ امام ابو یوسف وامام محمد بھی، اور صرف امام ابوحنیفہ دوسری طرف وجوب کے قائل ہوئے اور وہ اس مسئلہ میں منفرد ہیں۔ اسی طرح شیخ ابوحامد نے بھی دعویٰ کیا کہ وتر تو صرف سنتِ موکدہ ہیں، نہ فرض ہیں نہ واجب، اور یہی سواء امام ابوحنیفہ کے سارے ائمہ کا مسلک ہے، علامہ عینی نے دونوں علماء کا قول نقل کر کے لکھا کہ یہ سب تعصب کی بات ہے، اور تعجب ہے کہ ایسی صریح غلط بات انہوں نے کیسے کہہ دی جبکہ وہ مشہور امام ہیں، کیونکہ امام ابوحنیفہؒ اس مسئلہ میں تفرد کے الزام سے بالکل بری ہیں، ملاحظہ ہو قاضی ابوبکر بن العربی نے مشہور محدث وفقیہ سحنون اور اصبغ بن الفرج سے بھی وجوب نقل کیا ہے، ابنِ حزم نے امام مالکؒ کا قول نقل کیا کہ جو شخص وتر نہ پڑھے اس کو سزا دی جائے اور اس کی شہادت قبول نہ ہوگی۔ یہی بات ابنِ قدامہ نے المغنی میں امام احمد سے بھی نقل کی۔ مصنفِ ابن ابی شیبہ میں بھی حضرتِ مجاہد کا قول بھی بسندِ صحیح وجوب (غیر فرض) کا مروی ہے اور حضرت ابن عمرؓ سے بسندِ صحیح یہ روایت بھی نقل کی کہ مجھے سرخ اونٹ بھی ترکِ وتر کے عوض پسند نہیں علامہ ابنِ بطال نے حضرت ابنِ مسعود، حذیفہ وابراہیم نخعیؒ سے بھی وجوب کا قول نقل کیا، امام شافعیؒ کے شیخ یوسف بن خالد السمتی سے بھی وجوب ثابت ہے، ابن ابی شیبہ تھے حضرت سعید بن المسیب وابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود اور ضحاک سے بھی وجوب نقل کیا ہے۔

ان سب حضرات اکابر واجلہ کی تائید وموافقت کے ہوتے ہوئے بھی امام صاحب پر تفرد کا دعویٰ کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟! (اوجز ص ۱/۴۳۰) وحاشیہ بخاری ص ۱۳۶) امام رازی نے تفسیر سورۂ روم میں تحت قوله تعالىٰ **فسبحان الله حين تمسون الآیه** امام صاحب کے قول وجوبِ وتر ثلاث رکعات کو اقرب للتقویٰ قرار دیا۔

علامہ محقق کاسانیؒ نے اپنی مشہور ومعروف تالیف بدائع الصنائع میں بہت اچھی بحث وجوبِ وتر کی لکھی ہے۔ جس کو اوجز ص ۱/۴۳۰ میں

نقل کیا گیا ہے، اس میں حضرت حسن بصریؒ سے وجوب وتر پر اجماع بھی نقل کیا ہے اور امام طحاوی نے بھی اس پر اجماعِ سلف نقل کیا، ایسے ثقہ حضرات غلط بات نہیں کہہ سکتے، بدائع وغیرہ میں امام شافعیؒ کے استاذ وشیخ کا یہ واقعہ بھی نقل ہوا کہ ''انہوں نے امام اعظمؒ سے وتر کے بارے میں گفتگو کی، اور آپ نے واجب بتایا تو وہ برداشت نہ کر سکے، غصہ سے کہا کہ آپ تو کافر ہو گئے، کیونکہ پانچ فرض نمازوں پر زیادتی کر دی، امام صاحب نے فرمایا کہ میں تمہارے حکمِ کفر سے نہیں ڈرتا، اس لئے کہ میں فرض وواجب میں فرق کو خوب جانتا ہوں کہ وہ زمین وآسمان میں فرق جیسا ہے، پھر امام صاحب نے ان کو فرق کی تفصیل اچھی طرح سمجھائی تو وہ مطمئن ہو گئے، اور معذرت کی، پھر آپ سے تلمذ کا شرف بھی حاصل کیا۔''

یہاں ایک سوال یہ ہوسکتا ہے کہ جب مسئلہ کی نوعیت ایسی تھی تو امام اعظمؒ کے دونوں محترم تلامذہ امام ابو یوسف وامام محمد وجوب کے قائل کیوں نہ ہوئے؟ تو راقم الحروف اس کا جواب بھی عرض کرتا ہے۔ بدایۃ المجتہد ص ۱/ ۶۷ میں امام اعظمؒ کے ساتھ آپ کے اصحاب کا قول بھی وجوب کا نقل ہوا ہے۔ حاشیۂ ہدایہ ص ۱۳۷ میں ہے کہ امام صاحب سے ظاہر میں کوئی منصوص روایت نہیں ہے لیکن یوسف بن خالد سمتی نے آپ سے وجوب نقل کیا، جو آپ کا مشہور مذہب قرار پایا، اور نوح بن ابی مریم نے آپ سے سنت کا قول نقل کیا جس کو امام ابو یوسف و امام محمد نے اختیار کیا، اور حماد بن زید نے آپ کا قول فرضیت کا نقل کیا، جس کو امام زفر نے اختیار کیا۔ صاحب ہدایہ نے لکھا کہ وتر کے منکر کو کافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کا وجوب سنت (غیر متواترہ) سے ثابت ہوا ہے اور یہی مراد ہے امام صاحب سے وتر کے سنت ہونے کی روایت کی۔ (پھر چونکہ واجب عملاً فرض کے درجہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے فرضیت کی روایت بھی نقل ہوئی، اگرچہ عقیدۃً وہ فرض نہیں ہے۔)

وجوبِ وتر کے لئے مرفوع احادیث بھی بہ کثرت ہیں، جن میں ابوداؤد، نسائی، ترمذی وابن ماجہ وغیرہ کی بھی ہیں۔ اوجز ص ۱/ ۴۳۱ میں ۲۴ ذکر کی گئی ہیں۔ ابوداؤد کی حدیث کے ایک راوی پر امام بخاری نے نقد کیا ہے، جس پر علامہ عینی نے لکھا کہ یہ حدیث صحیح ہے، اسی لئے حاکم نے بھی نقل کی اور تصحیح کی۔ اور امام بخاری کے متکلم فیہ راوی ابوالمنیب کو حاکم نے ثقہ کہا اور ابن معین نے بھی توثیق کی ہے۔ ابنِ ابی حاتم نے ابوحاتم سے توثیق نقل کی، اور امام بخاری کی تضعیف پر ان کی نکیر کو بھی ذکر کیا ہے۔

اس سلسلہ میں صرف ایک اثر حضرت ابنِ عمرؓ کا پیش کیا جاتا ہے کہ انہوں نے سواری پر وتر پڑھے۔ تو ہوسکتا ہے کہ کسی عذر سے پڑھے ہوں، دوسرے یہ کہ امام طحاوی وغیرہ نے ایسی روایات بھی پیش کی ہیں، جن سے ان کا سواری سے اتر کر پڑھنا بھی ثابت ہے تو اس سے دونوں روایتوں کا جمع کرنا بھی دشوار نہ رہا۔ دوسرے صحابہ حضرت عمرؓ وغیرہ سے بھی وتر پڑھنا سواری سے اتر کر...... ثابت ہوا ہے چنانچہ مصنفِ ابن ابی شیبہ میں ہے کہ صحابۂ کرام زمین پر اتر کر وتر پڑھا کرتے تھے، لہٰذا ان کا یہ اہتمام بھی وجوبِ وتر کے لئے دلیل بنتا ہے۔

قنوت کا مسئلہ: وجوبِ وتر کے بعد دوسرا اہم مسئلہ قنوتِ وتر کا ہے، کہ وہ کن نمازوں میں ہے اور رکوع سے قبل ہے یا بعد۔ اس میں حنفیہ وامام احمد کا مسلک یہ ہے کہ نمازِ وتر میں تمام سال تیسری رکعت کے رکوع سے قبل دعاءِ قنوت پڑھی جائے، اور قنوتِ نازلہ صرف بڑے حوادث ونوازل کے وقت پڑھی جائے جو رکوع سے قبل وبعد دونوں طرح درست ہے لیکن بہتر بعد میں ہے۔ یہ دعاءِ قنوت حنفیہ وامام احمد کے نزدیک صرف فجر کی نماز میں ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک سب نمازوں میں ہے۔ امام مالک کسی نماز میں بھی اس کے قائل نہیں۔ (بدایۃ المجتہد ص ۱/ ۱۷۴)۔

امام شافعی کے نزدیک وتر میں قنوت صرف نصف آخر رمضان میں ہے، اور فجر کی نماز میں تمام سال پڑھی جائے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری کے پاس قنوتِ وتر کی حدیث نہ ہوگی۔ اس لئے صرف قنوتِ نازلہ والی حدیث لا کر قنوتِ وتر کی طرف اشارہ کیا، کہ ان کے نزدیک بھی وہ درست ہے، اس طرح اس مسئلہ میں بھی حنفیہ وحنابلہ کی موافقت کی ہے۔

وقتِ نمازِ وتر: امام بخاری نے باب ساعات الوتر سے بتایا کہ نمازِ وتر کا وقت تمام رات ہے، حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ حنفیہ نے دوسری احادیثِ بخاری وابوداؤد کی وجہ سے یہ فیصلہ بھی صحیح کیا کہ اس کو نمازِ عشاء پر مقدم کرنا صحیح نہیں۔ کیونکہ ان احادیث میں وتر کو شب کی آخری نماز

بنانے کا حکم کیا گیا ہے، اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ وتر کے بعد جو دو رکعت نفل بیٹھ کر حضور علیہ السلام سے ثابت ہیں، وہ اس کے منافی نہیں کیونکہ ان کی ہیئت وصورت بدل گئی ہے۔ حضرتؒ کی رائے گرامی اسی وجہ سے بیٹھ کر پڑھنے کی فضیلت بھی تھی وللہ درہ۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ ایسا بیانِ جواز کے لئے کیا گیا، تیسری یہ کہ مراد حدیث میں آخری فرض وواجب نمازِ وتر کو بتانا ہے، لہٰذا نوافل اس کے خلاف نہیں ہیں۔ (راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اسی لئے جو شخص پوری نمازِ عشاء اور وتر پڑھ کر سو جائے کہ شاید آنکھ نہ کھلے، پھر جاگ کر آخر شب میں نوافل تہجد پڑھے تو وہ بھی حدیثِ مذکور کے خلاف نہیں ہے، واللہ اعلم، لامع الدراری اور بذل المجہود میں زیادہ مفصل بحث پڑھ لی جائے۔

وتر کی تین رکعات ایک سلام سے اور امام بخاری کی مخالفت

حضرت علامہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ بابِ وتر میں صرف یہ مسئلہ ایسا ہے کہ جس میں امام بخاری نے حنفیہ کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے حزم کر لیا کہ دو سلام ہونے چاہئیں۔ لیکن وہ اس کے لئے کوئی حدیثِ مرفوع نہ لا سکے۔ اس لئے صرف اثرِ ابن عمر سے استدلال کیا ہے، جبکہ حنفیہ کے پاس دوسرے اکابر صحابہ حضرت عمر، حضرت علی و ابن مسعود وغیرہ ہیں جو ایک سلام سے تین رکعت بتاتے ہیں۔

مدونہ باب قیام رمضان میں ہے کہ آخری نماز تراویح کے بعد وتر کی تین رکعات تھیں۔ امام طحاوی نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا فیصلہ نقل کیا ہے کہ فقہاءِ سبعہ مدینہ طیبہ کی رائے پر وتر کی تین رکعات ایک سلام سے پڑھنے کا حکم فرمایا، اور امام طحاوی نے دوسرے اکابر فقہاء سے بھی یہی رائے نقل کی، پھر اس روایت میں اگرچہ عبدالرحمٰن بن ابی الزناد ہے، جس میں کچھ ضعف ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ اس راوی سے امام بخاری نے بابِ استسقاء میں تعلیقاً روایت لی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اس موقع پر دوسرے حضرات نے یہ دلیل بھی پیش کی ہے کہ قول کو فعل پر ترجیح ہے، لہٰذا قولی حدیث مثنیٰ مثنیٰ والی راجح ہونی چاہئے۔ حضور علیہ السلام کی فعلی حدیث پر کہ آپ نے تین رکعات ایک سلام سے پڑھیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں معاملہ برعکس۔ اس لئے ہے کہ حضور علیہ السلام کا مدۃ العمر کا عمل تین رکعات وتر ملا کر پڑھنے کا مروی ہے، جس کو حضرت عائشہؓ نے ہمیشہ ملاحظہ فرمایا اور حضرت ابن عباسؓ نے بھی جو حضور کی نمازِ وتر دیکھنے کے لئے ہی شب میں حضور کے ساتھ رہے، یہی بتایا، اس کے مقابلہ میں قولِ مذکور مبہم ہے، اور اس میں دوسری وجوہ نکل سکتی ہے۔

ایسی صورت میں کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا کہ قول کو فعل پر ترجیح دی جائے، وہ تو جب ہی ہے کہ قول سے تشریع عام مفہوم ہو رہی ہو اور فعل واقعہ جزئیہ ہونے کی وجہ سے خصوصیتِ حال پر محمول ہو، پھر یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ کسی امر کو حضور علیہ السلام کے لئے خصوصیت پر محمول کرنے میں یہ بھی دیکھنا چئے کہ وہ فعل باب عبادات میں آپ کے لئے افضل و اعلیٰ بھی بن سکے۔ جیسے صومِ وصال وغیرہ، بخلاف استقبال واستدبارِ بوقت قضاءِ حاجت کے مثلاً، اس لئے کہ اگر ہم اس کو خصوصیت پر محمول کریں گے، تو وہ دلیلِ افضلیت نہیں بن سکتا، کیونکہ ہو سکتا ہے حضور علیہ السلام کا وہ استقبال اس لئے ہو کہ آپ فی ذاتہ کعبہ معظمہ سے افضل تھے، اور اسی لئے کراہتِ استقبال کی علت اٹھ گئی ہو، جو تحقیر کعبہ معظمہ ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ ہم مثنویت کی احادیث پر بھی عمل کرتے ہیں اور ان کو دو رکعت پر درمیانی قعدہ پر محمول کرتے ہیں، شافعیہ نے سلام کو بھی اس کے ساتھ لازم کر لیا ہے (الخ) ملاحظہ ہو کشف الستر وفیض الباری وغیرہ۔ حضرتؒ نے مسئلہ وتر پر مستقل رسالہ کشف الستر لکھا ہے جو احقر کے زمانہ نظامت مجلس علمی ڈابھیل میں شائع ہو گیا تھا، اس کو اور آپ کے دوسرے رسائل پڑھ کر آپ کے علومِ حدیث میں تبحر اور علمِ معقول ومنقول کے کمالات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے، اور علومِ حدیث کے نوع بہ نوع دروازے کھلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ جب ہی ہے کہ آپ کی تالیفات کا مطالعہ پوری دقتِ نظر کے ساتھ اور بار بار کیا جائے، ورنہ سطحی نظر سے تو ایک بڑا عالم بھی نہ کچھ سمجھے گا نہ جانے گا،

حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ فرماتے تھے کہ میں نے وتر کے مسئلہ میں تمام محدثین کی ابحاث وتحقیقات کا مطالعہ کرچکنے کے بعد کشف الستر کا مطالعہ کیا اور صرف ایک بار نہیں بلکہ سترہ بار کیا تب میں سمجھ سکا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے کن کن مشکلات کو حل فرمادیا ہے، اور کس طرح علوم حدیث کے تحقیقاتی گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔ رحمہما اللہ رحمۃ واسعۃ۔

اس مختصر مگر عظیم حدیثی معلومات کے خزینہ کی حضرت محدث وفقیہ مشہور مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہجہانپوری صدر مفتی دارالعلوم دیوبند نے اتنی قدر کی کہ اپنی محققانہ شرح کتاب الآثار امام محمد کے ص ۱۵۸ تا ص ۲۰۴ میں مکمل رسالہ درج کردیا اور حاشیہ میں تسہیل وتائید کے ساتھ دلائل کی تکمیل بھی فرمائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

امام بخاری کا جواب: اس عنوان سے چونکئے نہیں کہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے، کیونکہ ہم امام بخاری کی دلیل اثر ابن عمر کا جواب ان دونوں سے کہیں بڑے حضرات کے اقوال وآثار سے پیش کریں گے، اور پھر حسب اشارۂ لطیفہ حضرت شاہ صاحبؒ امام بخاری تو کوئی مرفوع حدیث بھی استدلال میں نہ لاسکے، ہوسکتا ہے وہ ان کی شرط پر نہ ہو مگر نہایت ادب سے گزارش ہے کہ جب محدث اسحٰق بن راہویہ کی تحریک و مشورہ پر صحیح مجرد کا مجموعہ مرتب کرکے پیش کرنے کا ارادہ ہوا تھا تو اس میں حدیث اپنی شرط پر نہ ملنے کی صورت میں یہی کیا ضروری تھا کہ اپنی ضرورت سے مجبور ہوکر اثرِ صحابی ہی سے کام نکال لیا جائے، نام رکھا "الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سننہ و ایامہ" اور اس میں جگہ جگہ فقہ البخاری پر استدلال کی مجبوری کے تحت آثارِ صحابہ وتابعین بھی درج ہوئے ہیں، کہیں باب وعنوان میں اور کہیں متونِ حدیث کی جگہ بھی۔ جیسے یہاں باب الوتر کی پہلی حدیث کے تحت یہ بھی ذکر فرمادیا کہ حضرت ابن عمرؓ وتر کی دو رکعت پڑھ کر اپنے خدام سے باتیں بھی کرلیا کرتے تھے، تاکہ فقہ البخاری کا ایک مسئلہ وتر دو سلام کے ساتھ ثابت کیا جاسکے۔ اور آخر ابواب الوتر میں بھی حدثنا کے تحت بھی صرف اثرِ انس بن مالک کو ذکر کیا، وہاں بھی کوئی حدیثِ مرفوع نہیں لائے۔

ہماری مشکلات: یہ زمانہ علمی انحطاط کا ہے، ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے زمین وآسمان کا فرق ہوگیا۔ ابھی ہم نے حضرت علامہ کشمیری، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور حضرت علامہ عثمانی جیسے اکابر محدثین کو مسندِ حدیث کا صدر نشین دیکھا تھا، اور حضرت تھانویؒ کی جامعیت کی شان بھی دیکھی تھی کہ فنِ حدیث میں خود "جامع الآثار" لکھی اور اپنے تلامذہ سے اعلاء السنن کی ۱۸ ضخیم جلدیں چھپوا کر شائع کرادیں۔ اور اب دیکھتے ہیں تو یک دم میدان خالی نظر آنے لگا، کیا میں غلط لکھ رہا ہوں، اس دور کے شیوخِ حدیث پر ایک نظر ڈال لیجئے، کتنے اس کے اہل ہیں کہ درسِ بخاری شریف کا حق ادا کرسکیں، اور ان کی نظر کتبِ حدیث ورجال پر بقدرِ کفاف وضرورت ہی ہو، نتیجہ یہ ہے کہ غیر مقلدوں کے وارے نیارے ہیں، خوب خوب مغالطہ آمیزیاں کرکے مذاہب ائمہ اربعہ کے خلاف زہر افشانی کرنے کے محبوب مشغلہ میں منہمک ہیں۔ اور جن پر جواب دہی کی ذمہ داری ہے وہ خوابِ غفلت کا شکار ہیں والی اللہ المشتکی۔

ہمارے محترم مولانا عبداللہ خاں صاحب کرت پوری (تلمیذ رشید حضرت علامہ کشمیریؒ) کو اپنی اس بات پر بڑا اصرار ہے کہ بخاری شریف کو دورۂ حدیث میں اب نہ رکھو کیونکہ اس دور کے اساتذۂ حدیث اس کا جواب تو دے نہیں سکتے، لہٰذا تلامذہ کا رجحان غیر مقلدیت کی طرف بڑھتا ہے، اور وہ فارغ التحصیل وسند یافتہ ہوکر عوام کے سامنے جاتے ہیں اور غیر مقلدوں کا جواب شافی نہیں دے سکتے، تو ہر جگہ کے عوام بھی غیر مقلد بنتے ہیں۔

خود انوار الباری کے بہت سے ناظرین ہمیں لکھتے ہیں کہ ہم تو غیر مقلدوں کے غلط پروپیگنڈہ کی وجہ سے سمجھتے تھے کہ فقہ حنفی میں بڑی خامیاں ہیں، اب انوار الباری کی وجہ سے ہماری حنفیت کو استحکام ملا ہے، اور ہم عدمِ تقلید کے فتنہ سے محفوظ ہوئے ہیں۔

ہمارے ضلع بجنور میں چونکہ حضرات اکابر دیوبند کی آمد ورفت کافی رہی ہے، اور یہاں نہ صرف تقلید وحنفیت بلکہ دیوبندیت پر بھی

عوام بڑی پختگی سے قائم رہے ہیں۔مگر اب کچھ عرصہ سے دہلی و بمبئی کے غیر مقلدوں کے اثرات ادھر بھی آنے لگے ہیں۔ کیونکہ یہاں کے لوگ وہاں ملازمت وکاروباری سلسلہ سے جاتے ہیں۔

ایک واقعہ: چندروز قبل ایک قریبی بستی کے کچھ حنفی مسلمان اپنے ساتھ ایک عزیز کو لائے، جو بمبئی جا کر غیر مقلد بن چکا ہے اور یہاں جب آتا ہے تو اپنی بستی کے لوگوں سے کہتا ہے کہ تمہاری نمازیں صحیح نہیں ہوتیں کیونکہ تم امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے ،اور یہ بھی کہتا ہے کہ ہم نے دیوبند سے فتویٰ منگا لیا ہے کہ غیر مقلد امام کے پیچھے مقلدوں کی نماز ہو جاتی ہے۔لہٰذا دیوبند والوں نے بھی ہماری نماز کو صحیح مان لیا ہے،مگر تمہاری نمازیں حدیث کے خلاف ہیں۔

وہ غیر مقلد صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ آپ بتائیں کہ ان لوگوں کی نسبت سے ہماری نماز زیادہ صحیح ہے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ نماز کا مسئلہ تو پھر سوچئے گا،آپ یہ بتائیں کہ جس کی نماز آپ پڑھتے ہیں وہ کہاں ہے اور اس کے بارے میں آپ کا عقیدہ کیا ہے؟

کہنے لگے کہ خدا تو عرش کے اوپر بیٹھا ہے اور زمین وآسمان اور تمام کائنات اس کے اور ہمارے درمیان حائل ہے اور وہیں سے وہ ہم سب کو دیکھتا ہے،اس کا وجود سب جگہ نہیں ہے،اور ہونا بھی نہ چاہئے،کیا اس کی مقدس ذات ہر جگہ اور غلیظ وگندی جگہوں پر بھی ہو سکتی ہے؟

میں نے کہا کہ یہی مغالطہ آپ کے بڑوں کو بھی ہوا ہے،سلف کا عقیدہ تو اتنا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود مخلوق سے بائن اور جدا ہے باعتبار ذات وصفات کے۔ یہ لوگ یہ سمجھ گئے کہ وہ مخلوق سے بہت دور بھی ہے حتیٰ کہ پہاڑ کی چوٹیوں پر جو لوگ ہیں وہ بہ نسبت زمین والوں کے اللہ کے نزدیک ہیں اور وہ آسمانوں سے بھی اوپر اپنے عرش پر بیٹھا ہے،اور وہیں سے بیٹھ کر سب کو دیکھتا ہے اور سب کی باتیں سنتا ہے۔

سلف کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایک جگہ یا مکان میں محدود نہیں ہے،نہ وہ عرش پر بیٹھا ہے اور وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ میں اس کی یہی صفت بتائی گئی ہے،وہ حد و جہت سے بھی منزہ ہے،اور عرش پر بیٹھا ہوا مانیں تو اس کے لئے،حد، جسم اور جہت بھی ماننی پڑے گی،جو اس کی شان "لیس کمثلہ شیئ" کے خلاف ہے۔مگر ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا کا وجود بہت بڑا ہے جو عرش عظیم پر بھاری ہے، بلکہ ساری دنیا کے بھاری پہاڑوں وغیرہ سے بھی زیادہ بوجھل ہے،اسی لئے عرش اس کا تحمل نہیں کر سکتا اور کجاوے کی طرح چوں چوں کرتا رہتا ہے۔

حضرت تھانوی کا ارشاد

آپ نے لکھا کہ حق تعالیٰ کے لئے تمکن علی العرش کے دعوے کو فقہاء نے بناء علیٰ انکار النص کفر کہا ہے (فتاویٰ امدادیہ ص۴/۱۲۶)۔

ایک مسامحت: حضرت تھانویؒ کی نہایت اہم تحقیقاتِ عالیہ علمیہ بابۃ استواء علی العرش جوئی جگہ بوا درالنوادر میں مذکور ہیں۔اہلِ علم کے لئے ان کا مطالعہ نہایت ضروری واہم ہے البتہ ایک جگہ بعض مفسرین کی مسامحت کی وجہ سے حضرتؒ نے سلف کی طرف استواء بمعنی استقرار منسوب کیا ہے،وہ صحیح نہیں۔

استواء کے معنی سلف سے استعلاء رفعِ رتبی وغیرہ ضرور منقول ہے،لیکن استقرار وتمکن ،یاجلوس علی العرش کے معانی صحیح طور سے منقول نہیں ہوئے ہیں۔وللتفصیل محل آخر۔

میں نے ان لوگوں کے سامنے ذات وصفات کی مزید تشریح اور غیر مقلدوں کے دوسرے عقائد کی بھی غلطی بیان کی، پھر یہ بھی کہا کہ جس کسی نے غیر مقلد کی اقتدا کو جائز کہا ہے اس کو آپ لوگوں کے عقائد سے واقفیت نہ ہوگی۔ تاہم اس کو یہ قید ضرور بڑھانی تھی کہ فروعی اختلاف تک تو صحتِ اقتدا کی گنجائش ہے،لیکن عقائد میں بھی سلف کی مخالفت ہو تو کسی طرح بھی جواز نہیں ہے۔

غیر مقلدوں کے بارے میں حضرت تھانوی کے ارشادات

(۱) غیر مقلد بہت طرح کے ہیں بعض ایسے ہیں کہ ان کے پیچھے نماز پڑھنا خلافِ احتیاط یا مکروہ یا باطل ہے۔ اس لئے احتیاط یہی ہے کہ ان کی اقتدا نہ کی جائے۔ (فتاویٰ امدادیہ ص ۱/۹۰)۔

(۲) ہمارا نزاع غیر مقلدوں سے فقط بوجہ اختلاف فروع و جزئیات کے نہیں ہے، اگر یہ وجہ ہوتی تو حنفیہ شافعیہ کی کبھی نہ بنتی، لڑائی دنگا رہا کرتا، حالانکہ ہمیشہ صلح و اتحاد رہا، بلکہ نزاع ان لوگوں (غیر مقلدوں) سے اصول میں ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ سلف صالح خصوصاً امام اعظم کو طعن و تشنیع کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور چار نکاح سے زیادہ جائز کہتے ہیں اور حضرت عمرؓ کو در بارہ تراویح بدعتی بتاتے ہیں اور مقلدوں کو مشرک سمجھ کر مقابلے میں اپنا لقب موحدین رکھتے ہیں۔ اور تقلید ائمہ کو مثل رسمِ جاہلانِ عرب کہتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے **وجدنا علیہ آبائنا معاذ اللہ**. **استغفر اللہ** اور وہ خدا تعالیٰ کو عرش پر بیٹھا ہوا مانتے ہیں اور فقہاء کو مخالفِ سنت ٹھہراتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس بہت سے عقائد باطلہ رکھتے ہیں۔ پھر اس پر عادت تقیہ کی ہے کہ موقع پر چھپ جاتے ہیں اور اکثر باتوں سے مکر جاتے ہیں اور منکر ہو جاتے ہیں (فتاویٰ امدادیہ ص ۳/۱۵۰)۔

جمہور سلف کے خلاف تفرد کے ہم سختی سے مخالف ہیں اور انوار الباری میں حسب موقع اس پر لکھتے بھی رہتے ہیں۔ عن قریب تفرداتِ اکابر امت پر مزید تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

دلائل حنفیہ ایک نظر میں

اعلاء السنن ص ۶/۱۷ میں ایک اہم باب قائم کیا ہے، جس میں ۳۷ روایات مرفوعہ و آثارِ صحابہ و تابعین ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں، جن میں وتر برکعت واحدہ کی ممانعت، **وجوب قعدہ علی الرکعتین من الوتر، ذکرِ قرأت فی الوتر، حکمِ ایتار بثلاث موصولہ** اور **عدمِ فصل بایں رکعات الوتر** کا بیان مع حواشی و تعلیقات ص ۶/۴۲ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۱) امام شافعیؒ کے نزدیک وتر ایک رکعت ہے اور نفل نماز ایک رکعت کی بھی جائز ہے۔ دوسرے سب حضرات ایک رکعت کو مستقل نماز نہیں مانتے اور امام مالک بھی جو وتر کو ایک رکعت کہتے ہیں، یہ شرط کرتے ہیں کہ اس سے قبل کم از کم دو رکعت کا شفعہ ضروری ہے۔ لہٰذا ممانعت نماز ایک رکعت کی احادیث و آثار سے امام شافعیؒ کا رد ہو جاتا ہے۔

(۲) **وجوبِ قعدہ علی الرکعتین** کی روایات سے حنفیہ کی تائید اور انکی تردید ہو جاتی ہے جو بعض مبہم روایات سے استدلال کر کے ہر دو رکعت پر قعدہ کو واجب نہیں کہتے۔

(۳) جن روایات میں تین رکعات وتر کا ذکر اور اس کے ساتھ یہ تفصیل بھی ہے کہ ان تینوں رکعات میں حضور علیہ السلام نے کون کون سی سورتیں پڑھی ہیں، ان سے وتر کی تین رکعات اور وہ بھی موصول ہونا یعنی ایک سلام سے ہونا ثابت ہے۔

(۴) جن روایات میں نمازِ وتر کو نمازِ مغرب سے تشبیہ دی گئی ہے، اور جن میں مطلق تین رکعات پڑھنے کا ذکر ہے ان سب سے بھی تین رکعاتِ وتر کا موصول اور سلام واحد سے ہونا ثابت ہے۔ حضرت ابن عمر سے بھی ایک روایت مرفوع مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں موجود ہے کہ دن کی نمازِ مغرب کی طرح ہی رات کی نمازِ وتر ہے۔

(۵) نسائی شریف، مستدرکِ حاکم، اور مسندِ احمد وغیرہ کی احادیث مرفوعہ میں صراحت ہے کہ حضور علیہ السلام نے وتر کی تین رکعات ایک سلام سے پڑھیں اور درمیان میں دو رکعت پر سلام نہیں پھیرا۔ اور حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابن عباس اور فقہاء سبعہ مدینہ طیبہ، پھر تابعین نے بھی وتر کی تین رکعات ایک سلام سے ہونے کا فیصلہ کیا ہے، اسی لئے حضرت حسن بصری نے فرمایا تھا کہ حضرت ابن

عمر سے زیادہ فقیہ تو ان کے والد ماجد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس لئے ان کے مقابلے میں حضرت ابن عمر کا قول وفعل پیش کرنا بے سود ہے، اور حضرت حسن بصریؒ نے یہ بھی فرمایا کہ سارے مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہو چکا ہے کہ وتر کی نماز تین رکعات ہیں، جن کے صرف آخر میں ایک سلام ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ)۔

حضرت امام طحاویؒ نے وترِ حنفیہ کے دلائل مع محدثانہ محققانہ ابحاث کے اپنی کتاب شرح معانی الآثار میں جمع کئے ہیں اور امانی الاحبار جلد رابع میں علامہ عینی کی تحقیق بھی قابلِ مطالعہ ہے، امام طحاوی نے سند کے ساتھ ذکر کیا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فقہاءِ مدینہ منورہ کی رائے کے مطابق تین رکعات وتر ایک سلام سے پڑھنے کا فیصلہ صادر کیا تھا۔ اور لکھا کہ اس وقت کسی ایک شخص نے بھی اس فیصلہ پر اعتراض نہیں کیا۔ پھر آخر میں لکھا کہ اس کے خلاف کسی کو بھی نہ کرنا چاہئے، کیونکہ یہ حضور علیہ السلام کی حدیث، پھر طریقۂ صحابہ اور اکثر کے اقوال کے مطابق ہے۔ پھر اسی پر تابعین نے بھی اتفاق کیا ہے۔ (امانی الاحبار ص۴/۲۹۳)۔

وتر کے بعض مسائل پر امام اعظم پر تفرد کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس لئے ہم نے حتی الوسع بحث کو مفصل ومکمل کیا ہے۔ چونکہ ہم تفرد کو خود ہی ہمیشہ نام رکھتے آئے ہیں، ہمیں یہ الزام بہت ناگوار ہوا اب ناظرین خود فیصلہ کریں گے کہ الزام تفرد کے مستحق حنفیہ ہیں یا دوسرے حضرات اکابر، رحمہم اللہ تعالیٰ۔

افادۂ انور: ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ دعوے کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ امام ابو حنیفہؒ کے حدیث سے متعلق فقہی جزئیات میں سے ایک جزئیہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں ان کے ساتھ سلفِ صالحین میں سے کوئی نہ ہو؟ اور باب افتراق ہذہ الامۃ کے تحت حدیث "**ما انا علیه و اصحابی**" کا مصداق واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "**معرفت ما انا علیه و اصحابی** کا طریقہ سلفِ صالحین کا تعامل وتوارث ہے، اور جب ان میں بھی اختلاف ہو تو حق دونوں طرف ہوتا ہے۔" (یہ ارشاد العرف الشذی ص ۱۵۲۱ور ص ۵۲۶ میں بھی ہے۔)

وتر سے متعلق کچھ تفصیل، دلائل وجوابات ہم جلد اول ص ۲۷ تا ص ۳۲ میں بھی لکھ چکے ہیں، اس کا بھی مطالعہ تازہ کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابواب الاستسقاء احادیث نمبر ۹۴۹ تا نمبر ۹۷۹ (بخاری ص ۱۳۶/۱۴۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: قحطِ باراں کی صورت میں استسقاء کئی طرح ہوتا ہے، عام احوال واوقات میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا، نمازوں کے بعد دوسری دعاؤں کی طرح بارش کے لئے دعا کرنا اور خاص طور سے عیدگاہ میں جا کر دعا کرنا، اور اس میں ہمارے بڑے امام صاحب کے نزدیک قراءت سری ہے اور خطبہ نہیں ہے مگر صاحبین کے نزدیک قراءت جہری ہے اور خطبہ بھی ہے اور تحویلِ رداء بھی صرف امام کے لئے مستحب ہے اور اسی پر حنفیہ کا عمل ہے (کمافی فتح القدیر) پھر متونِ حنفیہ میں جو نمازِ استسقاء کی نفی ذکر ہوئی ہے وہ نفی وجوب ہے، جس کی تفصیل شرح المنیہ میں دیکھی جائے، کیونکہ علامہ سروجی نے شرح ہدایہ میں روایتِ وجوبِ عیدین وکسوف کے ساتھ روایتِ وجوبِ استسقاء بامر الامام بھی نقل کی ہے۔

علامہ حمویؒ نے حاشیۂ الاشباہ میں تصریح کی کہ امرِ قاضی کی وجہ سے روزہ بھی واجب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے حکم سے نمازِ استسقاء بھی واجب ہو سکتی ہے اور علامہ نوویؒ نے بھی وجوب بامر الامام کا فتویٰ دیا ہے (کمافی شرح الجامع الصغیر) اگرچہ ان کے زمانے میں علماء نے اس کی مخالفت کی تھی۔

تاہم یہ امر بھی متحقق ہے کہ جو وجوب امرِ قاضی یا امام کی وجہ سے ہوگا وہ اس کے زمانۂ امارت تک رہے گا پھر ختم ہو کر اپنی اصل پر لوٹ

جائے گا اور یہ سب انتظامی امور میں ہے، کیونکہ امورِ تشریعی میں امرِ امام کو کوئی دخل نہیں ہے۔ البتہ خلفاءِ اربعہ راشدین کا حکم امرِ امیر پر بھی فائق ہے، اور وہ تشریع کے تحت آجاتا ہے، لہٰذا اس کا اتباع انتظامی امور کی طرح بعض امورِ تشریعی میں بھی ضروری ہوگا۔ جیسے جماعتِ تراویح میں کیا گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے انتظامی امور میں جو فیصلے حضرت عمرؓ نے کئے تھے، ان کو حنفیہ نے بطور مذہب کے اختیار کیا ہے۔ یعنی ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو شرعیات کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کی نظیر چاروں مذاہب میں موجود ہیں اور اسی طرح ہونا بھی چاہئے، کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے "میرے بعد ابوبکر و عمر کی اقتداء پیروی کرنا (ترمذی مسند احمد وغیرہ جامع صغیر سیوطی ص ۱/۵۱)

مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے کہ تم پر میری سنت اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کا اتباع لازم و ضروری ہے اس کو خوب مضبوطی کے ساتھ تھامے رہنا اور بدعات سے سخت احتراز کرنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے (ابوداؤد ترمذی احمد ابن ماجہ)

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ قضاۃ، وولاۃ کے فیصلوں اور اوامر کی بڑی اہمیت تھی اور وہ چونکہ اکثر اہلِ علم ہی ہوتے تھے، اس لئے وہ شریعت کے ماتحت ہی ہوتے تھے اور غیر منصوص احکام میں ان کے احکام کی تعمیل گویا شریعت ہی کے احکام کا اتباع ہے۔ اسی لئے دارالاسلام میں کسی قسم کی تنگی و دشواری پیش نہیں آتی۔

دارالحرب کی مشکلات

البتہ دیارِ حرب میں ضرور مشکلات پیش آتی ہیں۔ کیونکہ وہاں نہ قضاۃ وولاۃ ہوتے ہیں، نہ ان کے فیصلے، جو غیر منصوص امور میں ناطق فیصلہ کریں۔ حضرت علامہ تھانویؒ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: میں نے ایک انگریز کا قول دیکھا ہے کہ بغیر حنفی مذہب کے سلطنت چل نہیں سکتی، کیونکہ اس قدر توسع اور مراعاتِ مصالح دوسرے اسلامی فقہی مذاہب میں نہیں پائی جاتیں، مگر باوجود اتنے توسع کے پھر بھی وجدان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرات اس وقت ہوتے تو اس زمانہ کی حالت پر نظر کر کے غالباً اور بھی توسع کرتے۔ مگر ہماری تو ہمت نہیں ہوتی، اپنے اندر قوتِ اجتہاد بھی نہیں۔ پھر نااہلوں سے بھی ڈر لگتا ہے، نہ معلوم کیا گڑبڑ کریں۔ پھر اس کی مثال میں کہ بعض جزئیات میں غالباً زیادہ توسع فرماتے یہ فرمایا کہ مثلاً اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت دارالحرب میں رہتی ہو تو اس کے متعلق بعض ابواب سیاسیہ میں کیا احکام ہیں۔ مفصل مستقل طور پر مدون نہیں ہیں۔ اور یہ غالباً اس لئے کہ ان حضرات کو اس کا وہم وگمان بھی نہ ہوا ہوگا کہ کبھی مسلمان کفار کے ماتحت ہوں گے، باقی استقلال و تفصیل کی نفی سے نفسِ احکام کا غیر مذکور ہونا لازم نہیں آتا۔ اور وہ بھی کافی ہے اور کسی کے اجتہاد کی ضرورت نہیں رہتی۔ (الخ)

(الافاضات الیومیہ ملفوظ ص ۴۳۲، ص ۴/ ۲۷۵)۔

علامہ اقبال اور حضرت شاہ صاحبؒ

اس موقع پر یاد آیا کہ علامہ اقبالؒ کو ہندوستان کے اندر بہت سے احکام و مسائل کے بارے میں فکر و تشویش رہتی تھی، اور وہ ایسے مسائل میں حضرت الاستاذ علامہ کشمیریؒ سے رجوع کرتے تھے۔ اور حضرتؒ خود فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے اہم مسائل و مشکلات کے بارے میں جس قدر استفادہ علامہ اقبال نے کیا ہے، دوسرے بہت سے میرے تلامذہ نے بھی نہیں کیا، اور پھر حضرتؒ کی وفات کے بعد علامہ اقبال کی تمنا تھی کہ ان کو کوئی ایسا جید عالم میسر ہو جائے، جس کو وہ اپنے پاس رکھ کر ان مسائل و مشکلات کے فیصلے منضبط کرائیں اور راقم الحروف کو بھی کئی خط لکھے جن میں ایسے عالم کی تلاش و استشارہ تھا، مگر میرا خیال ہے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ اور نہ اب تک علامہ اقبال

لے اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ خلفائے راشدین کے کسی فیصلہ کو صرف سیاست و تعزیر پر محمول کرنا اور اس کو امرِ تشریعی کی حیثیت نہ دینا درست نہ ہوگا۔

جس طرح علامہ ابن تیمیہ و ابن القیم نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ کا طلاقِ ثلاث بہ لفظ واحد کو نافذ کرنا صرف وقتی عقوبت و تعزیر تھی امر تشریعی نہ تھا، چنانچہ اکابرِ علماءِ نجد و حجاز نے بھی ان دونوں حضرات کی اس دلیل کو رد کرتے ہوئے جمہور سلف و خلف کے فیصلے کو قبول کر کے دولتِ سعودیہ میں نافذ کرا دیا ہے۔ والحمد للہ علی ذلک

کے استفادات علمیہ انوریہ کی پوری تفصیل سامنے آ سکی ہے۔ سنا ہے کہ اب کچھ خطوط لاہور میں طبع ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم۔
علامہ کہا کرتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی نظیر پانچ سو سال کے اندر نہیں ہے۔ اور محقق علامہ کوثریؒ نے بھی لکھا ہے کہ شیخ ابن ہمامؒ (م ۸۶۱ھ) کے بعد ایسی بے نظیر متجر محدث فقیہ نہیں ہوا۔ ہمارا خیال ہے کہ امام طحاوی کے بعد سے ایسا محقق نہیں ہوا۔
راقم الحروف نے بھی بہت سے مسائل دارالحرب کے بارے میں حضرتؒ سے استفسارات کئے تھے، اور حضرتؒ کے خطبۂ صدارت جمعیۃ علماء ہند اجلاسِ پشاور میں بھی مہمات مسائل درج ہوئے ہیں۔
اوپر جو کچھ حضرتؒ اور حضرت تھانویؒ کے ارشادات نقل ہوئے، وہ بھی محققین اہلِ علم کی بصیرت کو دعوتِ فکر ونظر دیتے ہیں۔ ع۔ کس نے آید بمیداں، شہ سواراں راچہ شد؟! دارالحرب کی مفصل بحث ص ۱۶۵/۱۴۵ میں آ رہی ہے۔

نمازِ استسقاء اور توسل

امام بخاری نے باب سوال الناس قائم کر کے حضرت عمرؓ کا ارشاد ذکر کیا کہ ہم حضور علیہ السلام کے زمانۂ مبارکہ میں آپ کا توسل[1] کر کے حق تعالیٰ سے بارانِ رحمت طلب کیا کرتے تھے، اور اب (یہاں عیدگاہ میں) آپ کے چچا حضرت عباسؓ کے توسل سے استقاء کر رہے ہیں،...... حسبِ تخریج حافظ ابن حجرؒ حضرت ابن عباسؓ نے دعا اس طرح کی۔ "یا اللہ! کوئی بلا اور مصیبت بغیر گناہوں کے نہیں اترتی اور اس کا ازالہ صرف توبہ ہی سے ممکن ہے، یہ سب لوگ آپ کے نبی اکرم سے میری قرابت کے سبب، مجھے آپ کی بارگاہِ رحمت میں لے کر حاضر ہوئے ہیں، اور اب ہم سب کے گناہ آلود ہاتھ آپ کی جنابِ رفیع میں اٹھ رہے ہیں اور ہماری پیشانیاں توبہ وانابت کے ساتھ آپ کی بارگاہ میں جھک گئی ہیں۔ لہٰذا آپ ہمیں بارش کی نعمت سے بہرہ ور فرمائیں۔"
اس سے معلوم ہوا کہ یہ توسل بھی گویا حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے منسوب ومتعلق تھا اور چونکہ آپ کی تشریف آوری عیدگاہ میں اس وقت نہ ہو سکتی تھی، اس لئے آپ کے نائب حضرت عباسؓ قرار پائے تھے اور اس سے غائبانہ توسل کی نفی بھی نہیں ہوتی۔ صرف توسل بالنائب کا ثبوت ہوتا ہے۔

توسلِ قولی کا جواز

یہی بات یہاں سے اکابرِ امت نے سمجھی ہے کہ جس طرح توسلِ فعلی حضور علیہ السلام سے جائز تھا، آپ کے نائبین سے بھی جائز ہے، رہا توسلِ قولی، تو گو اس کا جواز اس حدیثِ بخاری سے نہیں نکلتا، مگر وہ دوسری حدیثِ ترمذی وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی بات ہمارے حضرت الاستاذ شاہ صاحبؒ کے تلمیذِ رشید حضرت مولانا محمد صاحب لائلپوری انوری قادری (خلیفۂ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ) نے انوارِ انوری ص ۹۱ میں نقل فرمائی ہے، ملاحظہ ہو۔

۸۔ توسل فعلی وقولی

فرمایا کہ بخاری شریف میں حضرت عمرؓ کا قول اللھم انا کنا نتوسل الیک بنبینا صلے اللہ علیہ وسلم فستقینا وانا نتوسل الیک بعم نبینا فاسقنا (بخاری ص ۱۳۷) یہ توسلِ فعلی ہے، رہا توسلِ قولی، تو وہ حدیثِ ترمذی شریف میں۔ اعمیٰ کی حدیث میں ہے: اللّٰھم انی اتوجه الیک بنبیک محمد نبی الرحمة الی قوله فشفعه فی۔

---

[1] باب مذکور کی پہلی حدیث نمبر ۹۵۲ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ بھی ہے کہ امساکِ باراں کے زمانہ میں جب حضور علیہ السلام مدینہ منورہ میں منبر پر طلبِ باراں کے لئے تشریف رکھتے تھے اور میں ابو طالب کا یہ شعر وابیض یستسقی الغمام بوجہہ یاد کر کے آپ کے چہرۂ مبارک کی طرف نظر جما کر دیکھتا تو معاً بارش ہونے لگتی اور آپ کے منبر سے اترنے سے پہلے مدینہ منورہ کے پرنالے پانی سے بھر جاتے تھے۔ (بخاری ص ۱/ ۱۳۷)

(ف) یہ حدیث ترمذی کے علاوہ زادالمعاد میں بھی ہے اور تصحیح فرمائی ہے، مستدرک حاکم میں بھی ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے، علامہ ذہبی نے تصحیح حاکم کی تصویب کی ہے۔(انوارانوری، مجموعہ ملفوظات علامہ کشمیریؒ)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی شریف ص۲۸۲/۴ میں بھی مفصل تخریج ہے۔توسل کی مستقل ومفصل بحث انوار الباری جلد۱۳/۱۱ میں گزر چکی ہے، یہاں بھی کچھ باتیں جدید اور کچھ بطور قندمکرر پیش کی جاتی ہیں، کیونکہ " **ھوالمسک ما کررتہ یتضوع**"

آگے ہم زیادرۂ نبویہ کی اہمیت اس حیثیت سے بھی واضح کریں گے، کہ جس مقام میں اس وقت افضل الخلق علی الاطلاق، اشرف البریہ بکل معنی الکلمہ اور باعثِ ایجادِ کون ومکان جلوہ افروز ہیں، وہ مقام بھی اشرف البقاع علی الاطلاق، افضل ترینِ امکنۂ سموات وارضین بکل معنی الکلمہ اور تجلی گاہِ اعظم رب العالمین ہے، **جل مجدہ و غراسمہ و تعالت کلماتہ، وقال الشیخ الانورؒ تعالیٰ الذی کان ولم یک ماسویٰ واول ماجلی العماء بمصطفیٰ**.

جس ذاتِ مقدس واقدس کے نورِ معظم سے تمام کائنات کو تجلی ومنور فرمایا گیا تھا، اور اسی لئے ہم اس کو بجاطور پر تجلی گاہِ اعظم کہتے ہیں اور مانتے ہیں، کیا کوئی عاقل ان کے مقامِ جلوہ افروزی کو برترِ عالم ماننے میں ادنیٰ تامل بھی کرسکتا ہے، لیکن حیرت زائے عالم میں ناممکن کوئی چیز بھی نہیں ہے۔اسی لئے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو اشرف الخلق وافضل الخلق مان کر بھی بعض لوگوں نے اس حقیقت سے صاف انکار کردیا کہ بقعۂ مبارکہ قبرِ نبوی کا وہ حصہ جو جسدِ مبارک نبوی سے ملاصق ہے، مساجد ومعابد یا کعبہ معظّمہ سے افضل واشرف ہوسکتا ہے۔پھر حیرت در حیرت اس پر کیجئے کہ اس استبعاد کے قائل بھی سب سے پہلے علامہ ابن تیمیہ ہوئے ہیں۔ورنہ اس سے پہلے ساری امت بقعۂ مبارکہ کے افضل علی الاطلاق ہونے پر متفق رہی ہے۔اور اس بحث کو بھی ہم بقدرِ استطاعت وبصد اعترافِ عجز پیش کریں گے، ان شاءاللہ۔

ایک اہم اشکال وجواب

ہمارے استاذ الاساتذہ حضرت اقدس مولانا نانوتویؒ نے ایک نہایت تحقیقی رسالہ "قبلہ نما" لکھا ہے، جو معاندینِ اسلام کے اس اعتراض کا جواب ہے کہ جس طرح احجار واصنام کی پرستش قابلِ ترک وملامت ہے، اسی طرح صلوٰۃ الی الکعبہ بھی ممنوع ہونی چاہئے۔حضرتؒ کے مکمل ومفصل جواب وتحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں کعبۂ مکرمہ کی طرف توجہ اس کے تجلی گاہِ خداوندی ہونے کی وجہ سے ہے، اور وہ در حقیقت مسجود نہیں بلکہ مسجود الیہ ہے۔پھر اسی ضمن میں حضرتؒ یہ تحقیق بھی فرماگئے کہ حقیقتِ محمدیہ، حقیقتِ کعبہ سے افضل ہے۔

پس جب کعبہ معظمہ (بہ صورت احجار وبیت) حضور علیہ السلام کے مرتبۂ عالیہ کے اعتبار سے مفضول ہے، تو وہ آپ کے لئے عقلاً مسجود ومعبود بھی نہیں ہوسکتا، (الخ) پورا رسالہ علوم وحقائق کا گنجینہ اور بے بہا خزینہ ہے مگر اس کے مضامین نہایت ادق بھی ہیں، راقم الحروف نے کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں قیام کرکے اس کی تسہیل وتصحیح کا کام کیا تھا اور کئی سو کتابت کی اغلاط دور کرکے کئی سو عنوانات بھی اس میں قائم کئے تھے، جس کے بعد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ کتاب اب سمجھ میں آنے لگی، حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم صاحب نے فرمایا تھا کہ تمہارے آنے سے پہلے ہم تینوں (مع قاری صاحب ومولانا اشتیاق احمد صاحب) اس کتاب کا مذاکرہ کرتے رہے ہیں مگر بہت جگہ گاڑی اٹک جاتی تھی۔اور ہم میں تعیین مراد کے بارے میں اختلاف ہوجاتا تھا۔

اسی کام کے دوران احقر بھی علامہ موصوف سے استفادہ کرتا رہا، اور یاد رہے کہ ایک روز قبیل مغرب آپ کے دولت کدہ پر حاضر ہوکر ایک مقام میں اشکال پیش کیا تو حضرت نے ایک مراد بتائی اور احقر نے دوسری تو خاموش ہوگئے، پھر بعد مغرب فرمایا کہ تم جو کہتے ہو وہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

احقر نے تسہیل وغیرہ سے فارغ ہو کر اس پر ایک مختصر مقدمہ بھی لکھا تھا۔ جس میں خاص طور سے اس اشکال کا جواب بھی دیا تھا کہ حضرت مجدد صاحب قدس سرہ نے مکاتیب عالیہ میں حقیقتِ کعبہ معظّمہ کو حقیقتِ محمد یہ سے افضل قرار دیا ہے۔ جبکہ ابھی ہم نے اوپر حضرت نانوتویؒ کی تحقیق اس کے برعکس نقل کی ہے۔

احقر کے نزدیک تطبیق کی صورت یہ ہے کہ صورتِ کعبہ معظّمہ (احجار و بیت) حضرت مجدد صاحبؒ کے نزدیک بھی مفضول ہے۔ حقیقتِ محمد یہ سے (کیونکہ آپ افضل الخلائق اور افضل اشرف عالم و عالمیاں ہیں) اور وہ صورتِ کعبہ ان کے نزدیک بھی مسجود نہیں بلکہ مسجود الیہ ہے۔

البتہ حقیقتِ کعبہ معظّمہ ضرور مسجود ہے۔ اور وہ افضل بھی ہے حقیقتِ محمد یہ سے کیونکہ وہ اس عالم سے نہیں ہے۔ (فرمودند کہ حقیقتِ کعبہ از عالم عالم نے) لہٰذا بات صاف ہوگئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نانوتویؒ کی مراد حقیقتِ کعبہ سے صورتِ کعبہ ہے، جس سے حضور علیہ ضرور افضل ہیں۔ اور وہ مسجود بھی نہیں ہے۔ صرف مسجود الیہ اور جہتِ سجود ہے۔ اس طرح حضرتؒ سے تعبیر میں کچھ کوتاہی معلوم ہوتی ہے یا یہ بھی کتابت کی دوسری اغلاط کی طرح سے ایک غلطی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ وعلمہ احکم واتم۔

علامہ ابن تیمیہ کے تفردات

معلوم ہوا کہ جس طرح علامہ کے دوسرے اصولی فروعی تفردات بہ کثرت ہیں، ان میں یہ بھی کم اہم نہیں کہ وہ بقعۂ مبارکہ قبر نبوی کے لئے وہ منقبت و مزیت ماننے کے لئے کسی طرح آمادہ نہ ہو سکے، جس کو جمہور امت نے آپ سے قبل و بعد مسلّم قرار دیا تھا۔

ہم نے انوار الباری ص ۱۵/۱۸۹ میں ذکر کیا تھا کہ اکابر امتِ محمد یہ نے کسی بڑے سے بڑے عالم کے بھی تفردات کو قبول نہیں کیا ہے اور مثال میں صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا بھی ذکر کیا تھا جو کثیر التفر دات تھے اور نہ صرف دوسرے اکابر امت نے بلکہ علامہ ابن تیمیہ نے بھی ان کے تفردات پر نقد کیا ہے جبکہ بقول حافظ ابن حجر عسقلانی وہ صاحبِ مناقبِ جلیلہ و فضائل عظیمہ بھی تھے، تو ظاہر ہے کہ جمہور امت کے خلاف علامہ ابن تیمیہ کے تفردات کو بھی رد و نقد سے محفوظ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

علماءِ نجد و حجاز کو مبارکباد

میں یہاں ان حضرات کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں، جنہوں نے ''حکمِ طلاق ثلاث بلفظ واحد'' کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ کے تفرد کو رد کر کے جمہور امت کے فیصلے کو نجد و حجاز میں نافذ کرا دیا ہے۔ یہ فیصلہ پوری تفصیل کے ساتھ ''مجلۃ البحوث العلمیہ والافتاء والدعوۃ والارشاد'' کے جلد اول بابۃ ماہ شوال و ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ میں ص ۱۶۵ تا ص ۱۷۳) شائع ہوا تھا۔

جس کو پھر الگ سے بھی بعنوان'' فتوے کبار العلماء والمحققین'' بڑی تعداد میں شائع کیا گیا ہے، یہ بات کم حیرت و مسرت کی نہیں کہ اس دور کے نجدی کبار علماء و محققین نے بھی علامہ ابن تیمیہ کے ایک تفرد کے خلاف ایسی جرأت و وضاحت کے ساتھ اقدام کیا۔ جزاهم الله خير الجزاء۔

ہماری تمنا ہے کہ اسی طرح وہ حضرات دوسرے اہم اصولی و فروعی تفردات پر بھی کھلے دل سے بحث و فکر کر کے دادِ تحقیق دیں، اور احقاقِ حق و ابطالِ باطل کا فریضہ ادا کریں۔ واللہ الموفق۔

مولانا بنوریؒ کی یاد

اس موقع پر شیخ سلیمان الصنیعؒ (رئیس هيئة الامر بالمعروف والنهي عن المنكر) کی یاد تازہ ہوگئی، جن سے احقر اور علامہ بنوری بزمانۂ قیام مکہ معظّمہ ۱۹۳۸ء گھنٹوں اصولی و فروعی اختلافی مسائل پر بحث کیا کرتے تھے، اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب بھی نجدی

علماء میں تعصب کم ہوگا وہ تم لوگوں سے قریب تر ہو جائیں گے اور حق بات کا اعتراف کرلیں گے، اس وقت ان میں علم کی کمی اور تعصب کی زیادتی ہے۔ پھر جب مولانا بنوریؒ کی آمد و رفت حرمین کی بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ تو احقر سے کہا تھا کہ علماءِ نجد میں بڑی صلاحیت ہے اور وہ بہت سے مسائل میں ہماری بات مان لیتے ہیں۔ پھر اب تو طلاقِ ثلاث جیسے نہایت مہم مسئلہ میں ان علماء کا قبولِ حق تو بہت ہی قابلِ قدر ہے، اور شیخ ابن باز ایسے چند کے علاوہ خیال ہے کہ اکثریت بے تعصب علماء کی ہوگئی ہے، کمی یہ ہے کہ ہم میں سے جن کی رسائی وہاں تک ہے وہ علم و مطالعہ کی کمی اور جرأتِ اظہارِ حق سے محرومی کا شکار ہیں۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

اکابرِ حنفیہ کی دینی و علمی خدمات

سید المرسلین رحمۃ للعالمین علیہ وعلےٰ آلہ و صحبہ الف الف تحیات مبارکۃ طیبہ نے امتِ مرحومہ کی نجاتِ ابدی و فلاحِ سرمدی کے لئے ارشاد فرمایا تھا کہ میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر چلنا، اس سے جتنی بھی دوری ہوگی وہ حق و صواب سے دوری ہوگی، اسی لئے اکابر نے طے کیا کہ حضور علیہ السلام کے تمام اقوال و افعال کو صحیح سے صحیح تر صورتوں میں حاصل کر کے منضبط کریں۔ تمام صحابہ کرام اور تابعین وائمہ مجتہدین و محدثین نے اپنے عزیز ترین اوقات و عمریں اسی سعی میں صرف کر دیں تب ہی ہمارے سامنے ان کی مساعی کے ثمرات کتابی شکل میں آئے اور ہر دور کے علماء نے ان سے استفادات کئے۔

اس سلسلہ میں صحابۂ کرام کے بعد سب سے پہلے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی خدمات قابلِ ذکر ہیں کہ پہلے اسلام کے اصول و عقائد پر ہمت و قوت صرف کی، فرقِ باطلہ کا مقابلہ بے جگری سے کیا، پھر چالیس محدثین فقہاء کی جماعت بنا کر اپنی سرپرستی و نگرانی میں فقہِ اسلامی کے مسائل مرتب کرائے، اصول و فروعِ دین کی ان ہی خدماتِ جلیلہ کا صدقہ ہے کہ آج ہمارے سامنے ملت بیضاء کا لیل و نہار برابر ہے کہ کوئی ادنیٰ چیز بھی زاویۂ خمول میں نہ جا سکی اور نہ حق و باطل میں التباس و اشتباہ کی صورت پیدا ہو سکی، اور اس طرح حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ترکتکم علےٰ ملۃ بیضاء لیلھا و نہار ھا سواء (میں تمہیں ایسی روشن ملت پر چھوڑ کر جا رہا ہوں جس کا رات و دن برابر ہے) کی صداقت ظاہر ہوئی۔

آثارِ صحابہ و تابعین

جس طرح قرآن مجید کی شرح احادیث نبویہ ہیں کہ بغیر حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے ہم اس کی مراد و مقصد کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح سے احادیثِ نبویہ کے معانی و مقاصد کا پوری طرح سمجھنا فقہِ اسلامی پر موقوف ہے اور ان کو سمجھنے کے لئے ہم آثارِ صحابہ و تابعین کے محتاج ہیں۔ اسی لئے وہ لوگ غلطی پر رہے جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے احادیث کی ضرورت نہ سمجھی اور وہ بھی جو معانی احادیث کو سمجھنے میں آثارِ صحابہ و تابعین سے استغنا ظاہر کرتے ہیں۔

فقہِ حنفی کی بڑی عظیم خصوصیت

یہ ہے کہ وہ احادیث و آثار دونوں سے ماخوذ ہے، اور جن حضرات نے فقط مجرد صحیح سے فقہی استباط کا دعویٰ کیا، وہ بھی سینکڑوں مسائل میں بغیر آثارِ صحابہ کے کام نہ چلا سکے۔ بلکہ بعض ایسے بڑے بول والوں نے تو یہ بھی کیا کہ جب ان کو اپنی طے کردہ فقہی رائے کی تائید میں احادیث نہ مل سکیں تو آثارِ صحابہ ہی پر انحصار کر لیا بلکہ بعض مسائل میں تو آثارِ صحابہ کو باوجود مخالفتِ احادیث بھی قبول کر لیا، ویا للعجب! ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ تو اس کے بہت ہی خلاف تھے کہ فقہ سے حدیث کی طرف جایا جائے، وہ فرماتے تھے کہ حدیث سے فقہ کی طرف جانا چاہئے۔ کہ پہلے خالی الذہن ہو کر احادیث کے سارے طرق و متون پر نظر کر کے اس کی مراد متعین کی جائے۔ پھر فقہی رائے قائم کی جائے، اور اس کے برعکس طریقہ صحیح نہیں ہے۔

امام اعظم کی اولیت

عقائد واصول میں آپ کی اولیت اوپر ذکر ہوئی اور علامہ ماتریدی دو واسطوں سے آپ کے تلمیذ ہیں جن کا علم کلام میں تبحر اور گرانقدر اعلیٰ مقام مشہور ومعروف ہے حتیٰ کہ امام بخاری نے بھی حق تعالیٰ کی صفتِ تکوین کا اثبات ان ہی پر اعتماد کر کے کیا ہے، جس کا بقول حضرت شاہ صاحبؒ حافظ ابن حجر ایسے متعصب حنفیہ نے بھی اعتراف کرلیا ہے۔ اس کے بعد فقہ میں تو امام صاحب کی اولیت امام شافعی اور دوسرے اکابر وائمہ نے بھی مان لی ہے اور فقہ حنفی میں آثارِ صحابہ وتابعین سے جتنا زیادہ استفادہ کیا گیا وہ بھی سب کو معلوم ہے، اسی لئے امام طحاوی نے خاص طور سے علوم صحابہ واختلاف میں تخصص حاصل کیا، اپنی مشہور کتاب کا نام بھی شرح معانی الآثار رکھا، جو علمِ حدیث میں نہایت بلند پایہ تالیف ہے کہ اس سے دوسرے بھی مستغنی نہیں ہو سکے۔

امام طحاوی: حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ محمد بن نصر (م ۲۹۴ھ) محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) محمد بن المنذر نیساپوری (م ۳۱۸ھ) اور امام طحاوی (م ۳۲۱ھ) سب ہم عصر تھے، اور علومِ صحابہ جمع کرنے میں ساعی تھے مگر امام طحاویؒ مذاہب صحابہ کی نقل وجمع میں سب سے آگے تھے۔ اسی لئے ان کی نقل پر بہت زیادہ اعتماد کیا گیا ہے، ان کے بعد حافظ ابوعمر ابن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) نے بھی بڑا کام کیا ہے۔

زیارۃ سید المرسلین رحمۃ للعالمین

(علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وتابعیہ الی یوم الدین افضل الصلوات والبرکات الف الف مرۃ بعد و کل ذرۃ)

سرورِ کائنات سیدنا رسولِ معظم صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت بالاجماع اعظمِ قربات وافضل طاعات ہے، اور ترقی درجات وحصولِ مقاصد کے لئے تمام اسباب ووسائل سے بڑا وسیلہ ہے۔

بعض علماء نے اہلِ وسعت کے لئے اس کو قریب واجب کے لکھا ہے۔ درمختار میں ہے کہ زیارتِ قبرِ شریف مندوب ہے۔ بلکہ اس کو اہلِ وسعت کے لئے واجب کہا گیا ہے۔ محقق ابن الہمامؒ نے فرمایا کہ سفرِ مدینہ کے وقت صرف قبرِ نبوی کی نیت کرنی چاہئے، پھر جب مسجد نبوی میں داخل ہوگا تو اس کو اس کی زیارت بھی حاصل ہو ہی جائے گی، کیونکہ اس خالص نیت میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعظیم واجلال زیادہ ہے اور اسی کی تائید حدیثِ نبوی سے بھی ہوتی ہے، جس میں ہے کہ جو شخص میری زیارت کے لئے آئے گا جبکہ اس کی نیت بجز میری زیارت کے کسی دوسرے مقصد کے لئے نہ ہوگی تو مجھ پر لازم ہوگا کہ قیامت کے دن اس کے لئے شفاعت کروں۔ نیز حضرت عارف ملا جامیؒ سے نقل ہوا ہے کہ وہ حج کے علاوہ بھی صرف زیارتِ قبرِ نبوی کے لئے سفر کرتے تھے، تاکہ ان کا مقصدِ سفر کوئی دوسری غرض نہ ہو۔ فتح الملہم ص ۳/۳۷۸ اور خود حضور علیہ السلام نے اس کی ترغیب دی ہے اور باوجود قدرت ووسعت کے زیارۃ قبرِ نبوی نہ کرنے والوں کو ظالم وبے مروت فرمایا ہے۔

لہٰذا خوش نصیب ہے وہ شخص جس کو اس دولت وشرف سے نوازا جائے اور بدبخت ہے وہ شخص جو باوجود قدرت ووسعت کے اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہے۔

علامہ محدث قسطلانی شافعیؒ شارحِ بخاری شریف اور علامہ محدث زرقانی مالکیؒ شارحِ موطأ امام مالک نے لکھا کہ ہر مسلمان کو نبی اکرم صلے اللہ کی زیارت کے قربتِ عظیمہ ہونے کا اعتقاد رکھنا چاہئے، کیونکہ اس کے لئے صحیح احادیث وارد ہیں جو درجۂ حسن سے کم نہیں ہیں، اور آیتِ قرآنی (ولو انھم اذ ظلموا انفسھم نمبر ۶۴ سورہ نساء) بھی اس پر دال ہے (اگر وہ لوگ ظلم ومعصیت کے بعد آپ کے پاس آکر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول بھی ان کے لئے استغفار وسفارش کرتے تو یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔)

لہٰذا جولوگ قبرِ مبارک پر حاضر ہوکر استغفار کریں گے، ان کے لئے آپ کی شفاعت واستغفار ضرور حاصل ہوگی، اور علماءِ امت نے اس آیت کے عموم سے یہی سمجھا ہے کہ آپ کی شفاعت مغفرتِ ذنوب کے لئے جس طرح آپ کی دنیوی حیاتِ طیبہ میں تھی، اسی طرح آپ کی حیاتِ برزخیہ میں بھی ہے۔ اسی لئے علماء نے قبرِ مبارک پر حاضر ہونے والوں کے لئے اس آیت کی تلاوت کو بھی مستحب قرار دیا ہے کیونکہ آپ کی عظمتِ مرتبت موت کی وجہ سے ختم نہیں ہوگئی اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی استغفار امت کے لئے جیسی حیاتِ دنیوی میں تھی، وہ اب باقی نہیں رہی، نیز لکھا کہ تمام مسلمانوں کا زیارتِ قبور کے استحباب پر اجماع رہا ہے۔ جیسا کہ محدث نووی شارح مسلم شریف نے نقل کیا ہے اور ظاہریہ نے اس کو واجب کہا ہے۔

پھر لکھا کہ زیارتِ روضۂ مطہرہ نبویہ کا مسئلہ کبار صحابہ کے زمانہ میں بھی مشہور ومعروف تھا، چنانچہ جب حضرت عمرؓ نے بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت کعب احبار آپ کے پاس حاضر ہوئے اور اسلام لائے تو بڑی مسرت کا اظہار فرمایا، اور یہ بھی ارشاد کیا کہ تم میرے ساتھ مدینہ منورہ چلو تو بہتر ہے، تاکہ قبرِ مبارک نبوی کی زیارت کا شرف حاصل کرو، کعب احبار نے فرمایا کہ ضرور حاضر ہوں گا۔

(ظاہر ہے کہ شام سے مدینہ منورہ تک کتنی طویل مسافت ہے، اور اس سفرِ زیارت کی ترغیب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دے رہے تھے، جبکہ حضور علیہ السلام نے اپنے بعد حضرت ابوبکر وعمرؓ کے اتباع کی تاکید وحکم دیا تھا۔ لہٰذا اس سفر کو سفرِ معصیت قرار دینے والوں کو سوچنا چاہئے کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر رہے ہیں۔)

آگے علامۂ محدث قسطلانیؒ نے یہ بھی لکھا کہ حضرت عمرؓ اور دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز دونوں کے عمل سے زیارت نبویہ کے لئے سفر کرنا قربت وطاعت ثابت ہوا اور شیخ ابن تیمیہ نے اس بارے میں جو کلامِ قبیح وشنیع کیا ہے، وہ قابلِ تعجب بھی ہے کہ اس کو سفرِ معصیت قرار دیا (جس میں نمازِ قصر بھی درست نہیں ہے) اسی لئے ان کی تردید میں علامۂ محدث شیخ تقی الدین سبکیؒ[۱] نے (بے نظیر کتاب)

---

[۱] علامہ محدث شیخ الاسلام تقی الدین ابوالحسن علی بن عبدالکافی شافعی م ۷۵۶ھ کا مختصر ذکر مقدمہ انوارالباری ص ۲/۱۴۳ میں ہوا تھا مگر انکی جلالتِ قدر کے پیش نظر مزید تعارف کرانا ضروری ہوا، علامۂ محدث مولانا عبدالحئی لکھنویؒ نے لکھا: شیخ صلاح صفدریؒ نے فرمایا کہ لوگ ان کی مدح میں کہتے ہیں کہ امام غزالیؒ کے بعد ان جیسا جامع عالم نہیں ہوا، میرے نزدیک یہ ان پر ظلم اور ان کے مرتبۂ عالیہ سے کم ہے۔ کیونکہ وہ میرے نزدیک حضرت سفیان ثوری جیسے تھے، اور ان کی تصانیف جلیلہ ساٹھ سے زیادہ ہیں، جو علامہ سیوطیؒ نے حسن المحاضرہ میں درج کی ہیں اور ان کو مجتہدین میں شمار کیا ہے۔ (حاشیہ فوائد بہیہ ص ۴۴) پھر دوسری جگہ لکھا کہ عجائب خبط میں سے ہے کہ صاحبِ اتحاف النبلاء (نواب صدیق حسن خاں قنوجی) نے ان علامہ ابوالحسن تقی سبکی کے تذکرے میں لکھ دیا کہ وہ ابن تیمیہ سے بڑا تعصب رکھتے تھے۔ لیکن آخر عمر میں اس سے رجوع کر لیا تھا پھر نقل کیا کہ انہوں نے علامہ ذہبی کو ایک خط بھی بطور معذرت کے لکھا تھا، حالانکہ وہ خط علامہ ابوالحسن تقی سبکی کا نہیں تھا بلکہ ان کے لڑکے ابوالنصر تاج الدین سبکی م ۷۷۱ھ کا تھا۔ نواب صاحب نے یہ بھی لکھا کہ میں نے یہ خط اس لئے نقل کر دیا ہے تاکہ مخالفین کا یہ گھمنڈ ختم ہو جائے کہ علامہ سبکی نے علامہ ابن تیمیہ کا خوب رد کیا ہے (گویا ان کے رجوع سے ان کے ردود کا وزن بھی بے قیمت ہوگیا) مولانا عبدالحئیؒ نے لکھا کہ آپ سب ہی جانتے ہیں کہ مسئلہ زیارۃ نبویہ میں ابن تیمیہ کا رد کرنے والے تقی سبکی ہیں (تاج الدین سبکی نہیں) اور انہوں نے تعصب کی وجہ سے رد نہیں کیا بلکہ وہ اپنے رد میں حق وصواب پر ہیں۔ جس کی شہادت بڑے بڑوں نے دی ہے اور ذہبی کو جس نے ابن تیمیہ کی تعریف کا خط لکھا، وہ ان کے بیٹے تاج الدین کا خط تھا۔ جو لوگ تاریخ پر وسیع نظر رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو جانتے ہیں، پھر بھی اگر کوئی دعویٰ کرے کہ وہ خط تقی سبکی کا ہے تو اس کو اصحابِ تواریخ وطبقات کی تصریح دکھانی پڑے گی، جو محال ہے۔ (حاشیہ فوائد ص ۱۹۶ طبع مصر)

عجیب بات: جس تاریخی غلطی کا ذکر ابھی اوپر مولانا عبدالحئی نے کیا ہے، اسی غلطی کا ارتکاب محترم مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب سے بھی تاریخ دعوت وعزیمت ص ۲/۱۴۴ میں ہوا ہے۔ آپ نے طبقات الشافعیہ کا حوالہ بھی دیا ہے اس وقت میرے سامنے وہ کتاب نہیں ہے، تاہم اس مکتوب کے الفاظ ہی بتا رہے ہیں کہ تاج سبکی نے ذہبی سے تلمذ وشاگردی کی وجہ سے ہی ایسے ارادتمندانہ کلمات لکھے ہوں گے اور اس طرح کی مدح انہوں نے دوسری جگہ بھی کی ہے اگرچہ انہوں نے اپنے استاذ ذہبی پر بہت کافی نقد بھی کیا ہے۔ جس سے علامہ ذہبی کے غلط رجحانات واقدامات کی بھی تفصیل ملتی ہے، اس کے لئے السیف الصقیل دیکھی جائے ص ۱۷۹/۱۷۷، وھو مھم جدا۔ باقی ان کے والد ماجد شیخ الاسلام تقی سبکیؒ تو علامہ ذہبی ۷۴۸ھ کے معاصر تھے، اور تمام علوم فنون میں ذہبی سے بہت فائق تھے، اور انہوں نے تو حق کہنے میں علامہ ابن تیمیہؒ کی بھی کوئی رعایت نہیں کی، اور کئی کتابوں میں رد شدید وافر کیا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

''شفاء السقام''، لکھی جس نے سب مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈا کر دیا (شرح المواہب اللدنیہ ص ۸/ ۱۹۹)

واضح ہو کہ یہ علامہ سبکی بہت بڑے متکلم، فقیہ و محدث گزرے ہیں اور ہمارے استاذ الاساتذہ علامہ محدث مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ فرمایا کرتے تھے کہ وہ علامہ ابن تیمیہ سے ہر علم وفن میں فائق تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ علامہ سبکی تمام علوم وفنون میں علامہ تیمیہ پر فائق تھے۔ غرض رجوع کی بات نہایت غلط اور بہت بڑی غلط فہمی ہے۔

تاج سبکی کی پیدائش ۷۳۹ھ کی ہے اور ذہبی کی وفات ۷۴۸ھ میں ہوگئی، یعنی کل ۱۹ سال انہوں نے ذہبی کی زندگی کے پائے اور غالباً اسی ابتدائی عمر کے تلمذ کے زمانے میں وہ اتنے مرعوب رہے ہوں گے کہ اپنے کو استاذ کا مملوک وغلام لکھا۔ پھر بڑے ہو کر تو انہوں نے اپنے ان ہی استاذ محترم کی نہایت ادب کے ساتھ بڑی بڑی غلطیاں بھی پکڑی ہیں۔ اور ان کو تعصب مفرط کا بھی مرتکب گردانا ہے۔ اگرچہ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی کی طرح عمر زیادہ نہ ہوئی، صرف ۴۲ سال تقریباً۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بڑے حق گو بھی تھے، اور اگر اپنے والد ماجد میں کچھ تفردات وشذوذ پاتے، تو اس کو بھی ضرور برملا لکھ جاتے۔ انہوں نے فنون کی تعلیم اپنے والد اور دوسرے اساتذۂ کاملین سے پائی تھی اور جوانی میں ہی ماہر فنون اور جلیل القدر کتابوں کے مصنف ہو گئے تھے۔ الجوامع، م منع الموانع۔ شرح منہاج البیضاوی، طبقات الشافعیہ وغیرہ تصنیف کیں۔ اپنے والد کی جگہ شام کے قاضی القضاۃ بھی ہو گئے تھے۔

شیخ ابوالمحاسن دمشقیؒ م ۷۶۵ھ نے ذیل تذکرۃ الحفاظ میں تقی سبکی کو امام، حافظ، علامہ اور بقیۃ المجتہدین، علم حدیث کے ساتھ نہایت شغف رکھنے والا اور تمام علوم اسلام اور فنون علم سے حظ وافر رکھنے والا کہا اور لکھا کہ ان کی تصانیف وفتاویٰ ساری دنیا میں پھیل گئے، زہد، ورع، عبادتِ کثیرہ تلاوت شجاعت اور شدۃ فی الدین میں ضرب المثل تھے۔

ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں، **التحقیق فی مسئلۃ التعلیق**، جو شیخ ابن تیمیہ پر ردِ کبیر ہے۔ **رفع الشقاق فی مسئلۃ الطلاق شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام**، وہ بھی ابن تیمیہ کے رد میں ہے۔ **السیف المسلول علی من سب الرسول**، **شرح المہذب للنووی** کو پانچ جلدوں میں مکمل کیا۔ اور الابہاج فی شرح المنہاج للنووی لکھی۔ (ص ۴۰ ذیل) ان کے علاوہ بڑی اہم اور مشہور تصنیف ''السیف الصقیل فی الرد علی ابن زفیل'' ہے، جس میں علامہ ابن القیم کے طویل قصیدہ نونیہ کے غلط نظریات بابۃ اصول وعقائد کا رد کیا گیا ہے، اور حواشی میں مزید دلائل سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب اہلِ علم کے لئے نہایت گرانقدر علمی دستاویز ہے۔ جس کا مطالعہ بہت اہم اور ضروری ہے۔

زمانہ کی نیرنگیوں میں سے یہ بھی ہے کہ جس عظیم القدر علمی شخصیت کی تصانیف کی مقبولیت عامہ وخاصہ کا وہ دور تھا جس کی طرف علامہ دمشقی نے اشارہ کیا ہے۔ آج اس کی اشاعت کا کوئی سروسامان نہیں ہے، اور علامہ ابن تیمیہ وغیرہ کی وہ کتابیں جو پانچ سو برس تک زاویۂ خمول میں رہیں، اب ان کی اشاعت بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہی ہی، علامہ تقی سبکیؒ کی **السیف الصقیل** عرصہ ہوا مصر سے علامہ کوثری کی تعلیقات کے ساتھ شائع ہوئی تھی پھر دوبارہ شاید نہیں چھپ سکی اور شفاء السقام بھی عرصہ ہوا دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہوئی تھی۔ وہ بھی ایسی عظیم النفع کتاب ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونی چاہئے۔ میں نے ایک دفعہ حضرت شیخ الاحدیثؒ کو توجہ دلائی تھی، تو بڑی مایوسی کے انداز میں تحریر فرمایا تھا کہ کون چھاپے گا، کتب خانہ والے تو اب صرف نفعِ عاجل کے طالب ہیں اور ایسی علمی کتابیں مدت میں نکلتی ہیں، پھر یہ کہ جو اس کا ترجمہ کرے گا اور شائع کرے گا اس کو سلفی خیال کے لوگ پریشان کریں گے۔

علامہ سیوطیؒ نے ذیل طبقات الحفاظ میں علامہ تقی سبکی کو **الامام الفقیہ المحدث الحافظ المفسر الاصولی المتکلم المجتہد** لکھا۔ ان کی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ بتائیں، اور لکھا کہ ان کی تصانیف ان کے **تبحر فی الحدیث** وغیرہ اور **وسعتِ نظر فی العلوم** کی گواہ ہیں۔ (ذیل ص ۳۵۲)۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی ان کے علم وفضل، زہد وورع کی بڑی مدح کی ہے، علامہ زین العراقی نے کہا ایک جماعت ائمہ نے ان سے تفقہ حاصل کیا اور ان کی شہرت اور تالیفات سارے اطراف میں پھیل گئیں۔ ان کے بعد ان جیسا کوئی نہ ہوا۔

محقق استنویؒ نے فرمایا کہ اہلِ علم میں ان جیسا صاحبِ نظر ہم نے نہیں دیکھا، اور نہ ان جیسا جامع العلوم اور امورِ دقیقہ میں بہترین کلام کرنے والا، پختہ کاری اور نہایتِ انصاف سے اور مباحث میں رجوع الی الحق کرنے والا خواہ مقابلہ میں کوئی ادنیٰ طالب علم ہی ہوتا، علامہ ذہبی نے بھی تذکرۃ الحفاظ میں ان کے مناقب عالیہ کا ذکر کیا ہے بہت سے اکابر نے ان کے لئے مرتبۂ اجتہاد کا اقرار کیا ہے، ایسے امام جلیل کی تنقیص کینہ پرور اہل بدعت ہی کر سکتے تھے، **شذاذو التفردات** کے مقابلہ میں ننگی تلوار تھے، **دفاع عن السنت** اور **ردِ حشویہ** میں بڑے ثابت قدم تھے۔ باوجود قاضی القضاۃ اور دوسرے اہم عہدوں پر رہنے کے ان کے ترکہ اور میراث میں کوئی حبہ بھی غلط آمدنی کا نہیں پایا گیا۔ بلکہ اپنے پیچھے ۳۲ ہزار درہم کا قرضہ چھوڑ گئے۔ جن کو دونوں بیٹوں تاج سبکی اور بہار سبکی نے ادا کیا۔ نہایت متقشفانہ زندگی گزارتے تھے۔

ان کی تصانیف میں سے یہ ہیں: **السیف الصقیل**، جس سے ابن القیم کے نونیہ کا رد کیا ہے، **شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام**، جس سے ابن تیمیہ کا رد کیا ہے۔ اس کے رد کا ارادہ شمس بن عبدالہادی نے الصارم المنکی میں کیا ہے، لیکن علماء نے اس کے رد میں بھی متعدد تالیفات کی ہیں، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

افادات اکابر: حضرت علامہ کشمیریؒ فرماتے تھے کہ مسئلۂ سفر زیارت نبویہ میں جمہور امت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہمیشہ سے سلفِ صالحین روضۂ شریفہ کے لئے سفر کرتے رہے ہیں، اور یہ تواترِ عملی کی صورت ہے جس کی شرعاً بڑی اہمیت ہے، اور جو کچھ اس کا جواب علامہ ابن تیمیہ اور ان کے اتباع نے دیا ہے، وہ اس درجہ کا نہیں ہے جس کو ذوقِ سلیم قبول کر سکے۔ پھر یہ کہنا اور بھی غلط ہے کہ وہ سب لوگ مسجدِ نبوی کی نیت سے سفر کرتے تھے، روضۂ مطہرہ کی نیت سے نہیں کرتے تھے کیونکہ ایسا ہوتا تو وہ مسجدِ نبوی کی طرح مسجدِ اقصیٰ کی طرف بھی سفر کرتے کہ حدیث میں تو تینوں مسجدوں کی فضیلت وارد ہے۔

یہی بات علامہ شوکانیؒ سے بھی منقول ہے، جن کے علم و فضل پر سارے سلفی اور غیر مقلدین بھی اعتماد کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ مشروعیتِ سفر زیادۃ نبویہ کی دلیلِ شرعی یہ بیان کی گئی ہے کہ ہمیشہ سے ہر زمانہ میں مختلف بلاد و مذاہب کے مسلمان حج کرنے والے مدینہ منورہ کا سفر زیارۃ نبویہ ہی کے ارادہ سے کرتے رہے ہیں اور اس کو افضل اعمال سمجھتے رہے ہیں، اور کسی نے اس عمل پر نکیر بھی نہیں کی ہے، لہٰذا یہ مسئلہ سب کا اجماعی و اتفاقی رہا ہے۔ (فتح الملہم ص ۳/۳۷۸)۔

علامۂ محدث ملا علی قاری حنفی شارحِ مشکوٰۃ شریف نے فرمایا کہ ابن تیمیہ نے بڑی تفریط کی کہ زیارۃ نبویہ کے لئے سفر کو حرام کہا، جس طرح دوسرے بعض لوگوں نے افراط کی کہ زیارت کو ضروریات دین میں شمار کر کے اس کے منکر کی تکفیر کی۔

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ زیارت نبویہ افضلِ اعمال اور اجلِ قربات الٰہیہ میں سے ہے اور اس کی مشروعیت محلِ اجماع بلانزاع ہے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے اوجز المسالک شرح موطأ امام مالک میں لکھا کہ مشروعیت زیارۃ نبویہ پر علماء کرام نے آیت **ولو انهم اذظلموا انفسهم** الخ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) مثلاً علامہ ابن علان نے **المبرد المهكى فى رد الصارم المنكى** لکھی، اور علامہ سمنودی نے **نصرة الامام السبكى برد الصارم المنكى** لکھی۔ وغیرہ۔ **التحقيق فى مسئلة التعليق**، جو ابن تیمیہ پر ردِ کبیر ہے۔ **رفع الشقاق، الدرة المضية فى الرد على ابن تيميه ۔الاعتبار فى بقاء الجنة والنار** وغیرہ۔ الخ **(مقدمه فتاویٰ السبكى)** دو ضخیم جلدوں میں شائع شدہ ہے۔ مبارک صد مبارک باد کے مستحق یہی حضرات تھے جنہوں نے امتِ مرحومہ محمدیہ کو خلافِ جمہور اقوال و شذاذ کے فتنوں سے خبردار کیا، ان کے دفاع میں اپنی علمی توتیں صرف کیں اور مسلک جمہور کی بھرپور حفاظت کے لئے کوششیں کیں۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

اسی طرح ہم ان نامسعود مساعی کو ہرگز پسند نہیں کر سکتے جو شذاذ و تفردات والوں کی تائید میں روا رکھی گئی ہیں، خاص طور سے ہم ان افرادِ امت سے بیزار و نفور ہیں جنہوں نے متاعِ دنیا کی خاطر ایسا کیا ہے، والی اللہ المشتکی۔

الحق يعلو ولا يعلى: خدا کا شکر ہے خلودِ نار کی حقیت اور اس کے انکار کی رکاکت سب ہی عوام و خواص امت کے لئے واضح ہو چکی ہے اور طلاقِ ثلاث کے ایک طلاق ہونے کے دعوے کو خود علامہ ابن تیمیہ کے نہایت عقیدت مندوں نے بھی غلط مان لیا ہے۔ اور ہم خدا کے فضل و کرم سے مایوس نہیں ہیں۔ **السيف الصقيل** اور **شفاء السقام** کی مساعیِ علمیہ بھی ضرور ضرور بار آور ہوں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

شیخ الاسلام کا لقب: جس طرح دوسرے بہت سے اکابر علماءِ امت کو دیا گیا ہے، ہمارے زیر ترجمہ علامۂ محدث تقی سبکی کو بھی اس سے نوازا گیا ہے، خدا کی شان کہ ایک یہ بھی شیخ الاسلام تھے جنہوں نے جمہور امت کے خلاف اقوالِ شاذہ کا ردِ وافر کیا اور ان کو برداشت کر ہی نہ سکتے تھے اور دوسرے ان ہی کے مقابل وہ بھی شیخ الاسلام تھے جن کے ۹۸ اقوال و دعاوی جمہور و سلف کے خلاف تھے اور وہ بھی نہ صرف فروع میں بلکہ اصول و عقائد میں بھی، جن کے بارے میں ان کے غالی مداح علامہ ذہبی کو بھی کہہ دینا پڑا کہ میں اصول و فروع میں ان کا شدید مخالف بھی ہوں۔ حافظ ابن حجر اور استاذ محترم علامہ کشمیریؒ کی طرح ہم بھی علامہ ابن تیمیہ کے غیر معمولی فضل و تبحر اور علمی گرانقدر تحقیقاتِ عالیہ کے قائل ہیں۔ مگر ان کے کثیر تفردات و شذاذ بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے، اسی لئے جس طرح ان دونوں حضرات اور دوسرے سینکڑوں علماءِ امت نے ایسے اقوال و دعاوی کہ تردید ضروری سمجھی ہے۔ ہم بھی اس فرض کو ادا کرنے سے قاصر رہنا نہیں چاہتے واللہ المستعان۔ تاریخ دعوت و عزیمت ص ۲/۲۱۸ میں **الرد على البكرى** کے حوالہ سے امام مالکؒ کی طرف قبر انور کے پاس دعا کے بدعت ہونے کی صراحت نقل کی ہے۔ ایسی عظیم شخصیت کی طرف اتنی بڑی بات کے لئے فقر مالکی کی کسی معتمد کتاب کا حوالہ ضروری تھا۔ جبکہ کبارِ مالکیہ سے **دعا و استشفاع عند القبر النبوى** کے لئے **شفاء السقام** وغیرہ میں معتمد نقول موجود ہیں اور خود امام مالک نے بھی خلیفہ ابوجعفر کو طلب **شفاعت عند القبر النبوى** کا حکم دیا تھا۔ تو وہ اس کو بدعت کیوں کہہ سکتے ہیں؟ پھر دوسرے تینوں ائمۂ مجتہدین اور ان کے کبار تابعین بھی ان دونوں باتوں کے قائل ہیں۔ تو یہ بدعت کیسے ہو سکتی ہے؟

استدلال کیا ہے اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں، جیسا کہ حدیثِ بیہقی میں وارد ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں، محدث بیہقی نے حیاۃ انبیاء کے اثبات میں مستقل رسالہ لکھا ہے، شیخ ابومنصور بغدادی نے فرمایا کہ متکلمین محققین کا فیصلہ ہے کہ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے بعد زندہ ہیں، لہٰذا بعد وفات کے آپکے پاس آنا ایسا ہی ہے جیسے وفات سے پہلے تھا۔

اس کے بعد آپ نے پندرہ احادیث نقل فرمائیں، جن میں حضور علیہ السلام نے زیارتِ قبرِ مکرم پر شفاعت کا وعدہ فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ جس نے میری وفات کے بعد میری قبر کی آیات کی، اس نے گویا میری حیات میں زیارت کی۔ اور جس نے باوجود استطاعت کے میری زیارت نہ کی تو اس کے لئے کوئی عذر نہیں ہے۔ اور جس نے مکہ تک آکر حج کیا پھر میری نیت سے میری مسجد میں آیا تو اس کے لئے دو حج مبرور ومقبول لکھے جائیں گے۔

علامہ علی قاری نے فرمایا کہ اس بارے میں احادیث بہ کثرت ہیں اور مشہور ہیں۔ علامہ شوکانیؒ نے فرمایا کہ زیارتِ نبویہ کا ثبوت ایک جماعتِ صحابہ سے ہے، جن میں سے حضرت بلالؓ کی روایت ابن عسا کرنے بہ سندِ جید کی ہے، اس میں ہے کہ آپ نے حضور علیہ السلام کو خواب میں دیکھا ارشادِ نبوی ہوا کہ اے بلال! یہ کیا بے مروتی ہے، کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ میری زیارت کے لئے مدینہ طیبہ آؤ؟ اس پر وہ شدِ رحیل کر کے دارِیا (شام) سے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور زیارتِ مبارکہ سے مشرف ہوئے (اوجزص ۱/۳۶۴) امید ہے سلفی حضرات اس روایت پر ضرور غور کریں گے، کیونکہ علامہ شوکانی نے سندِ جید اور زیارتِ قبرِ نبوی کے لئے شدِ رحیل و سفر کا بھی اعتراف کیا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثِ صحیح بخاری میں ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا، پھر اگر خواب کی بات کو حجتِ شرعی نہ بھی مانا جائے تو صحابی جلیل القدر سیدنا حضرت بلالؓ نے اتنا طویل سفر کیسے گوارا فرمالیا، یعنی علامہ ابن تیمیہ کی بات اگر صحیح ہوتی کہ زیارۃ قبرِ نبوی کے لئے سفر معصیت کا سفر اور حرام ہے، جس میں قصر بھی جائز نہیں، گویا ایسا ہے کہ جیسے کوئی چوری ڈکیتی کے سفر پر نکلا ہو تو کسی صحابی سے ایسے سفر کا صدور ممکن ہوسکتا تھا؟!

حضرت بلالؓ کی تشریف آوری مدینہ طیبہ کا واقعہ بہت مشہور[1] ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت سیدنا حسن وسیدنا حسینؓ وغیرہ کے اصرار پر آپ نے مسجدِ نبوی میں اذان بھی دی تھی، جس کے آدھے کلمات بھی آپ ادا نہ کر پائے تھے۔ کہ مدینہ میں زلزلہ سا آگیا تھا اور گھروں میں پردہ نشین عورتیں تک بے چین ومضطرب ہوگئی تھیں۔ کیونکہ ان کے لئے حضور علیہ السلام کے زمانہ کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔

آج بھی جس وقت مسجدِ نبوی میں اذان ہوتی ہے تو زائرین وحاضرین کے دلوں پر جو کیفیت گزرتی ہے، وہ بیان نہیں ہوسکتی پھر جب حضرت بلالؓ قبرِ نبوی پر حاضر ہوئے تو اس کے پاس بیٹھ کر رونے لگے اور اپنا چہرہ قبر مبارک پر رگڑتے تھے معلوم نہیں آج کل سلفی ان کے اس فعل کو کتنی بڑی بدعت بلکہ شرک بھی کہہ دیں گے، کیونکہ ان کے یہاں تو ہر نئی چیز بدعت اور ہر تعظیم شرک ہے۔ یہ روایت ابن عساکر سے مروی ہے۔ جس کی سند کو تقی سبکی نے شفاء السقام میں جید قرار دیا۔

شفاء السقام ہی میں...... مدینہ طیبہ میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر ان کے میزبان حضرت ابوایوب انصاری کا فعل التزام قبرِ نبوی کا نقل کیا گیا ہے۔ جس پر مروان نے نکیر کی تھی تو آپ نے اس کی جہالت کے جواب میں فرمایا تھا کہ میں کسی پتھر کے پاس نہیں آیا ہوں بلکہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ہوں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرمایا: **مارا لا بداست کہ بحرمین محترمین رویم دروئے خود رابر آں آستانہا بمالیم**" (ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ حرمین شریفین جایا کریں اور اپنے چہروں کو ان آستانوں پر ملا کریں) پھر لکھا کہ ہماری

---

[1] انوارالباری ص ۱۱/۴۰ میں بھی پورا واقعہ نقل ہوا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو اعلاء السنن ص ۸/۲۰۸

سعادت اور خوش نصیبی اسی میں ہے اور ہماری شقاوت و بدبختی اس مسلک سے روگردانی اور اعراض میں ہے۔ (حجاز و ہند کے سلفی الخیال حضرات اس عبارت کو بار بار پڑھیں۔)

حضرت شاہ صاحبؒ نے "انفاس العارفین" اور فیوض الحرمین میں ان فیوض و برکاتِ عالیہ کی طرف بھی اشارات کئے ہیں جو آپ کو وہاں کے قیام میں حاصل ہوئے تھے۔ (علامہ ابن تیمیہ[1] اور ان کے ہم عصر علماء ص ۲۷)

سفرِ زیارت نبویہ

اس مسئلہ کی کافی تفصیل انوارالباری جلد ۱۱ میں آچکی ہے، اس کی مراجعت کی جائے، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس کی غایتِ اہمیت و عظمت کے سبب یہاں بھی کچھ لکھ دیا جائے، واللہ الموفق، بعض مادحین علامہ ابن تیمیہؒ نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ توحید کا غایتِ اہتمام اور شرک و مشرکانہ رسوم کے ذرائع مسدود کرنا ضرور بہتر ہے، اس سے کسی صاحبِ علم کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے لئے زیارتِ قبر نبوی کو مطلقاً روکنا ذکاوتِ حس اور تشدد سے خالی نہیں معلوم ہوتا اور یہ بات نہ ان کی علمی و دینی عظمت کے منافی ہے نہ ہمارے حسنِ اعتقاد اور ان کے کمالات کے اعتراف کے لئے مانع۔ نہ یہ مسئلہ اتنا سنگین تھا کہ اس کے لئے ان کو (یعنی ابن تیمیہ کو) محبوس کیا جائے اور اسی حالتِ اسیری میں وہ دنیا سے رخصت ہوں (تاریخ دعوتِ وعزیمت ص ۲/ ۱۱۸) دوسری جگہ لکھتے ہیں جن لوگوں کی فقہ وخلاف کی تاریخ اور ائمہ مجتہدین کے اقوال ومسائل پر وسیع نظر ہے ان کے لئے تو یہ "تفردات" کوئی وحشت کی چیز اور ابن تیمیہ کے فضل وکمال کے انکار کا موجب نہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر ائمۂ مشہورین اور اولیائے مقبولین کے تفردات اور مسائلِ غریبہ جمع کر دیئے جائیں تو یہ تفردات بہت ہلکے اور معمولی نظر آنے لگیں الخ (ص ۲/ ۱۶۰) سوال ہلکے بھاری کا نہیں ہے۔ کیا دوسروں کے تفردات بھی کبھی ایسے اہتمام کے ساتھ شائع کرائے گئے تھے؟۔

مؤلف "شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ" نے اسی بات کو ذرا سنبھال کر پیش کرنے کی سعی کی ہے اور لکھا کہ اصولی درجہ میں اس توافق اور طرزِ فکر میں اسی یگانگت کے باوجود بعض نظریات ومسائل میں ہمارے اکابر دیوبند وعلماء نجد میں کچھ فرق بھی ہے، مثلاً سفر زیارت نبویہ، توسل بالنبی صلے اللہ علیہ وسلم، سوالِ شفاعت، نظم یا نثر میں حضور علیہ السلام کو نداءِ غائبانہ، تارکینِ صلوٰۃ کی تکفیر وعدم تکفیر۔ مؤلف علام دام ظلہم نے حافظ ابن تیمیہ وشیخ محمد بن عبدالوہاب سے بیسیوں مسائلِ اصول وفروع میں اختلاف کو ذکر نہ کر کے بطور اختصار یہی پانچ ذکر کئے ہیں۔

راقم الحروف کے دل میں ان دونوں محترم حضرات کے علم وفضل اور گرانقدر علمی وملی خدمات کی بڑی قدر ہے مگر افسوس کہ اس سلسلے میں ان دونوں کے اقوال ونظریات غیر ذمہ دارانہ ہیں۔ وللتفصیل محل آخر۔

یہاں اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ سفرِ زیارتِ نبویہ کی تحریم اور توسل نبوی پر حکمِ شرک لگانا اور اس قسم کے تفردات پر اس وقت کے تمام معاصرین علماءِ مذاہب اربعہ کا اجتماعی فیصلہ معمولی بات نہیں تھی، جس کے متعلق حضرات شاہ عبدالعزیزؒ کو یہ لکھنا پڑا کہ "......ابن تیمیہ کے زمانہ میں ان کے تفردات کا رد جہابذۂ علماءِ شام ومغرب ومصر نے کیا تھا، پھر ابن القیم نے اپنے استاذ ابنِ تیمیہ کے نظریات کی توجیہ میں بڑی کوشش کی، لیکن اس کو بھی علماء نے قبول نہیں کیا۔ حتیٰ کہ حضرت والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے زمانہ میں شیخ مخدوم معین الدین سندی نے بھی ردِ ابن تیمیہؒ میں رسالہ لکھا، اور جب ان کے دعاوی علماء اہلِ سنت کی نظر میں قابلِ رد تھے ہی تو رد کرنے والے کیسے موردِ طعن بن سکتے ہیں؟

یہ بھی آپ نے لکھا کہ منہاج السنہ وغیرہ میں ان کے اقوالِ سخت وحشت میں ڈال دیتے ہیں، خاص کر تفریط حق اہل بیت، مع زیارۃ

---

[1] یہ کتاب محقق عصر حضرت مولانا شاہ زید ابوالحسن فاروقی مجددی دامت برکاتہم نے لکھی ہے، جو حضرت شاہ ابوالخیر اکاڈمی دہلی نمبر ۶ سے دوبارہ شائع ہوئی ہے جو علامہ ابن تیمیہ کے حالات پر تحقیقی دستاویز اور ان کے بعض تفردات پر گرانقدر نقد ہے۔ اس پر مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا تبصرہ اور ڈاکٹر مولانا محمد عبدالستار خان صاحب نقشبندی وقادری دامت فیوضہم کا تقدمہ بھی نہایت محققانہ اور بصیرت افروز ہے۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

نبویہ، انکارِ غوث وقطب وابدال اور تحقیر وتوہینِ صوفیہ وغیرہ اور یہ سب مضامین میرے پاس نقل شدہ موجود ہیں (فتاویٰ عزیزی ص ۸۰/۲)

علامہ ابنِ تیمیہ کی قید کے زمانہ میں ان کے کچھ لوگ ہم خیال اور ہمدرد بھی تھے، اور ان کی بار بار کی قید وبند کی تکالیف سے تو موافق مخالف سب ہی متالم ومتاثر تھے، اور سعی کرتے تھے کہ وہ ایسے مسائلِ غریبہ سے رجوع کرلیں اور قید سے رہائی پائیں، مگر علامہ کسی مسئلہ سے بھی رجوع کرنے کو تیار نہ ہوئے، اپنی دانست میں یہ انہوں نے بہت بڑا جہاد کیا ہے، اگرچہ اس سے امتِ مرحومہ کے لئے بہت سے فتنوں کے دروازے چوپٹ کھل گئے۔ واللہ المستعان۔

ہمیں اس وقت صرف زیارۃ نبویہ کی عظمت واہمیت سے متعلق ہی کچھ مزید لکھنا ہے۔ علامہ ابن القیمؒ نے زاد المعاد کے شروع میں بڑی اہم بحث فضیلتِ ازمنہ وامکنہ پر لکھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے کچھ ذواتِ قدسیہ، کچھ اوقات وازمنہ اور کچھ مقامات وامکنہ کو خاص طور سے فضل وشرف بخشا ہے۔ چنانچہ سات آسمانوں میں سے سب سے اوپر کے آسمان کو خاص شرف بخشا اور اس کو ملائکہ مقربین کا مستقر بنایا اور اپنی کرسی سے اور اپنے عرش سے قرب کی وجہ سے اس کو دوسرے آسمانوں پر افضلیت دی، اگر حق تعالیٰ کا قرب نہ ہوتا تو اس کو نیچے کے دوسرے آسمانوں پر فضیلت ہرگز نہ ہوتی، کیونکہ مادہ کے لحاظ سے سب آسمان برابر تھے۔

پھر جنت الفردوس کو بھی دوسری جنتوں پر اسی لئے افضل کیا کہ اپنے عرش کو اس کی چھت بنایا تھا اور بعض آثار میں یہ بھی آیا ہے کہ حق تعالیٰ نے جنت الفردوس کو اپنے ہاتھ سے بنایا تھا اور اس کو اپنی چنیدہ مخلوق کے لئے مخصوص کیا ہے۔ پھر فرشتوں میں سے بھی جبرئیل، میکائیل و اسرافیل کو خاص فضل وشرف دیا۔

پھر بنی آدم میں سے انبیاء علیہم السلام کو چنا جو ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے، ان میں سے تین سو تیرہ کو رسول کا مرتبہ دیا اور ان میں سے پانچ اولوالعزم بنائے، حضور علیہ السلام، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ وحضرت عیسیٰ علیہم السلام۔

پھر رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو افضل ترین قبیلہ سے پیدا فرما کر سید اولادِ بنی آدم قرار دیا، ان کی شریعت کو افضل الشرائع ان کی امت کو خیر الامم بنایا۔

اس کے بعد علامہ نے لکھا کہ اماکن وبلاد میں سب سے زیادہ اشرف بلدِ حرام کو بنایا۔ اور اسی وجہ سے مناسکِ حج وہاں اور اس کے قرب وجوار میں ادا ہوتے ہیں۔ اور وہیں کعبۃ اللہ ہے، جس کی طرف سب نماز پڑھتے ہیں۔

لہٰذا یہ بھی معلوم ہوا کہ وہی تمام بقاعِ ارض میں سے سب سے افضل واشرف ہے۔ اور اس کے اختصاص وتفصیل کی بڑی علامت یہ ہے کہ ساری دنیا کے قلوب اس کی طرف جذب ہوتے ہیں اور سب کو اس بلدِ امین سے ہی محبت کا سب سے اونچا درجہ حاصل ہے۔

اس کا سر (راز) یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے طہر بیتی فرما کر اس بیتِ محترم کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ اس کے بعد علامہ نے ازمنہ کے شرف پر بھی سیر حاصل کلام کیا ہے، جو قابلِ مطالعہ ہے۔

آخر میں کہا کہ دنیا کے تمام افعال واعمال میں حق تعالیٰ کے نزدیک مقبول ومردود ہونے کا فیصلہ صرف انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔ لہٰذا اپنے نبی کی معرفت اور اس کے احکام کی اطاعت ضروری ہے اس لئے ہم نے یہ کتاب لکھی ہے کہ حضور علیہ السلام کی سیرتِ طیبہ، آپ کے اخلاقِ فاضلہ، اور احکام سے مکمل واقفیت ہوسکے۔ اس کے بعد علامہ نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت وحالات پر چار جلدوں میں کافی وشافی مواد جمع فرما دیا ہے۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

اس ابتدائی تمہید میں جو خاص اہم امور اپنے خاص نظریہ کے تحت لکھے ہیں، وہ یہ ہیں۔

ا۔ ساتویں آسمان کو شرف وفضل حق تعالیٰ نے اس لئے دیا ہے کہ وہ اس کی کرسی وعرش سے قریب ہے، ورنہ سب آسمان برابر ہوتے۔

۲۔ جنت الفردوس کوفضل وشرف اس لئے حاصل ہوا کہ اس کی چھت خدا کا عرش ہے۔
۳۔ بیت اللہ کوتمام بقاعِ ارض پرفضیلت ہے۔جس میں سر یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔
۴۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کوکسی مکان یا زمان میں فضیلت دی ہوتو وہ مکان اور زمان بھی تمام مکانوں اور زمانوں سے افضل ہوجائے۔
۵۔ نبی کی معرفت اس لئے ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ احکامِ خداوندی معلوم ہوتے ہیں۔

افضلِ بقاع العالم

علامہ ابن تیمیہؒ کے ممدوحِ معظم اور معتمد علمی علامہ ابن عقیل حنبلیؒ م۵۱۳ھ کا ارشاد ہے کہ زمین وآسمانوں میں سب سے افضل واشرف جگہ وہ بقعۂ مبارکہ ہے، جہاں افضل الخلق رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم استراحت فرما ہیں، وہ جگہ عرشِ اعظم سے بھی زیادہ افضل ہے،اور علامہ محقق قاضی عیاض مالکیؒ نے اس جگہ کو بیت اللہ سے بھی افضل ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔علامہ ابنِ تیمیہ کو یہ بات پسند نہ آئی،اس لئے دعویٰ کردیا کہ یہ بات صرف قاضی عیاض نے نکالی ہے، نہ ان سے پہلے کسی نے کہی نہ بعد کو اس کی تفصیل تو مع دلائل کے ہم آگے کریں گے، یہاں یہ اشارہ کرنا ہے کہ زادالمعاد کے شروع میں علامہ ابن القیم کو اپنے استاذِ محترم کے نظریہ ہی کی تائید بڑی خوش اسلوبی سے کرنی تھی، چنانچہ کرگئے۔
کیونکہ جب زمین میں سب سے اشرف کعبۂ مکرمہ ہوا، کیونکہ وہ بیت اللہ ہے،اور آسمانوں پرسب سے افضل عرش ہے کیونکہ اس پر خدا کا استواء بمعنے استقرار وتمکن وقعود وغیرہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ افضل کون سی چیز ہوسکتی ہے۔
اس طرح انہوں نے دوسرے سب حضرات محققین امت کی بات بھی کاٹ دی اور اپنا خاص نظریہ بھی قارئین زادالمعاد کے دلوں مین اتار دیا۔ہمارے نزدیک نہ تو عرش خدا کا مستقر ومکان ہے۔نہ بیت اللہ خدا کا گھر ہے، بلکہ دونوں حق تعالیٰ کی تجلی گاہ ہیں،جس طرح قبر نبوی بھی اس کی تجلی گاہ ہے۔اور جمہور امت کے نزدیک چونکہ سب سے بڑی تجلی گاہ قبر نبوی یا بقول علامہ ابن عقیل حنبلی مشہدِ معظم ہے،اس لئے وہی ساری اشیاءِ عالم میں سے سب سے زیادہ اشرف وافضل بھی ہے۔اور سید المرسلین اول الخلق بھی ہیں اور افضل الخلق بھی۔
نشر الطیب میں حضرت تھانویؒ نے مصنف عبدالرزاق سے حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کی حدیث نقل کی کہ حق تعالیٰ نے سب اشیاءِ عالم سے پہلے نبی کا نور پیدا کیا، پھر قلم، پھر لوح پھر عرش (ص ۵) اور یہ روایت بھی نقل کی کہ حق تعالیٰ نے فرمایا میں نے کوئی مخلوق ایسی پیدا نہیں کی جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ میرے نزدیک مکرم ہو، میں نے ان کا نام عرش پر اپنے نام کے ساتھ آسمان وزمین اور شمس وقمر پیدا کرنے سے بیس لاکھ برس پہلے لکھا تھا۔الحدیث ص ص ۱۵۷)۔
قرآن مجید میں آیتِ میثاق بھی اس کی بڑی دلیل ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سب انبیاء علیہم السلام سے افضل تھے،اور آپ کی نبوت کا عہد سب سے لیا گیا تھا۔جبکہ خود تمام انبیاء علیہم السلام بھی دوسری تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ابتدا ہی سے خلعتِ نبوت سے سرفراز تھے اور خاتم النبیین بھی آپ ہی ہیں۔
پھر خیال کیا جائے کہ جو ذات مجمع الصفات آفرینش عالم سے بھی بیس لاکھ سال قبل سے مہبطِ انوار الٰہیہ اور مرکزِ فیوض وتجلیات ربانیہ ہمیشہ سے رہی اور ہمیشہ تک رہے گی،اس کی ذاتِ اقدس سب مخلوقات سے افضل ومشرف اور آپ سے مشرف شدہ سارے اماکن مقدسہ اور آپ کی موجودہ وآئندہ استراحت گاہیں سب اماکن سے زیادہ افضل واشرف کیوں نہ ہوں گی۔